تزکیۂ نفس

خواتین کی تربیتی نشستوں کے لیے چند مضامینِ اخلاق و احسان کا مجموعہ

قَدْ أَفْلَحَ مَنْ تَزَكَّىٰ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ

یقیناً کامیاب ہو گیا وہ جو پاک ہو گیا۔ اور ذکر کرتا رہا اپنے رب کے نام کا پھر پڑھتا رہا نماز



انجمن خدام القرآن سندھ کراچی رجسٹرڈ

www.QuranAcademy.com



تزکیۂ نفس

مرحوم ومغفور مؤسس انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی دیرینہ خواہش اور عمل کے عین مطابق، انجمن ہٰذا اپنی تمام تصنیفات، تالیفات اور خطابات (آڈیوز/ وڈیوز) کو طبع اور تیار کر کے چاہے قیمتاً یا مفت تقسیم کرنے کی مکمل اجازت دیتی ہے، اس ضمن میں ہمارا "محفوظ حقوق" کا کوئی تقاضا بھی نہیں۔ البتہ اجراء کنندہ ان تمام مواد کے نسخے/ نقل، اجراء سے قبل انجمن کو تحریری اطلاع کے ساتھ بھیجنے کا پابند ہوگا اور ان میں کسی قسم کی تبدیلی کرنے کا مجاز نہیں ہوگا۔ یہ تبدیلی یعنی الفاظ، غلط اقتباس، سیاق وسباق سے الگ کر کے جملے کا حوالہ یا اس کا ایسا استعمال جس سے انجمن ہٰذا اور اس کے مولفین کی صحیح ترجمانی نہ ہوتی ہو اور اس سے ہماری عزت وشہرت پر حرف آئے، تو ہم اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتے ہیں۔

نام کتاب	تزکیۂ نفس
ناشر	شعبۂ مطبوعات، انجمن خدام القرآن سندھ کراچی
مرکزی دفتر	B-375 علامہ شبیر احمد عثمانیؒ روڈ بلاک 6، گلشن اقبال، کراچی،
فون	+92-2134993436-7
ای میل	publications@quranacademy.com
ویب سائٹ	www.QuranAcademy.edu.pk
طبع 01 تا 03	2750
طبع 04	شوال المکرام 1445ھ مئی 2024ء
تعداد	1100
ہدیہ	950/=



ملک بھر میں قرآن اکیڈمیز و مراکز

Karachi:
Quran Academy Defence 021-35340022-4
Quran Academy Yaseenabad 021-36337361-36806561
Quran Academy Korangi 021-35074664
Quran Institute Gulistan-e-Johar 021-34030119

Hyderabad:
Quran Academy Qasimabad 022-2106187
Quran Institute Latifabad 022-3860489

Sukkur:
Quran Markaz Sukkur 071-5807281

Quetta:
Quran Academy Quetta 081-2842969

Jhang:
Quran Academy Jhang 047-7630861-7630863

Faisalabad:
Quran Academy Faisalabad 041-2437618

Lahore:
Quran Academy Lahore 042-35869501-3

Multan:
Quran Academy Multan 061-6510451-6520451

Islamabad:
Quran Academy Islamabad 051-2605725

Gujranwala:
Quran Markaz Gujranwala 055-3891695 - 0334-4600937

Peshawar:
Quran Markaz Peshawar 091-2584824 - 2019541

Malakand:
Quran Markaz Temargara 0945-601337

Azad Kashmir:
Quran Markaz Muzaffarabad 0982-2447221

دیباچہ	11
پیش لفظ	16
باب اول	
مفہوم اور مقصد	18
نظام طہارت	18
تزکیہ ایک مسلسل عمل	19
دل و دماغ کی طہارت	20
تزکیہ کے چار پہلو	21
تزکیہ کی شرائط	21
تزکیہ اندرونی حسن کا ذریعہ	21
اسلام کا تصور اخلاق	22
تزکیہ کے ذرائع	23
مقاصد بعثت رسول ﷺ	24
جنت میں جانے کے راستے	25
نیکیوں کی حفاظت	25
جنت کے اعلیٰ درجات کا حصول	26
تزکیہ اور اخلاق	27
قرآن وسنت کے علم کی ضرورت	27
تزکیہ کی راہ میں احتیاط	28
تزکیہ میں اعتدال اور حقیقت بینی کی اہمیت	29
تزکیہ اور قرآن	30
معرفت انسان کی اہمیت	30
انسان کی فطرت	33
انسان کی جبلت	33
انسانی عادات	34
فطرت اور جبلت بامقصد ہیں	36
تناسب کی ضرورت	36
اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے	37
سوچ اور جذبے کی بگاڑ کا سبب	37
اللہ کا ذکر: دل کی اصلاح کا ذریعہ	38
جبلت وفطرت کے توازن سے اندرونی وبیرونی امن	41
شیطان کے ہاتھوں فطرت وجبلت میں بگاڑ	41
بنیادی انسانی قوتوں میں اعتدال وتوازن	43
1: قوت علم	43
2: قوت عقل	44
3: قوت غضب	45
4: قوت شہوت	45
5: قوت عدل	46
ادب	
اللہ کا ادب	47
قرآن کا ادب	49
جناب رسول اکرم ﷺ کا ادب	50
انسانوں کا ادب	52
عمر میں بڑوں کا ادب	52
بچوں کو خادمین کا ادب کرنا سکھایئے	52
عہدے میں بڑوں کا ادب	53
رتبے میں بڑوں کا ادب	53
ادب کے لیے کھڑا ہونا ضروری نہیں	54

کسی قوم کے بڑے کا ادب	54
آج بے ادبی کا کلچر عام ہے	55
بڑوں کا ادب کیسے ہو؟	55
اسلاف میں علماء اور اساتذہ کی عزت	56
ادب اور حکم میں تصادم	56
قوانین کا احترام	58
قانون کے فوائد	59
اسلام میں پابندی، اطاعت اور نظم ونسق	60
عادتوں کو فطرت کے قریب کیا جائے	61
''ادب'' اور ''احترام''	62
انا	
انا	65
انسانی امتحان کے لیے شعور ذات واختیار	67
اللہ کی ''انا'' اور انسان کی ''انا''	67
انسان کے لیے اپنے مقام ومرتبے کی پہچان	68
عزت وبقائے نفس	71
تقویٰ اور اس کا اثر	74
انا میں اعتدال	75
باب دوم	
اسراف	
لفظ اسراف کا مفہوم	77
اسراف اور غلو کے لغوی معنی	78
آواز کا اسراف	78
باتوں میں اسراف	79
جسمانی حرکات میں اسراف	80
اعتراض میں اسراف	81
تنقید کرنے میں اسراف	81
تعریف میں اسراف	82
جذبات کا اسراف	84
خوشی غمی کے موقع پر وقت کا اسراف	85
عام زندگی میں وقت کا اسراف	86
اسراف کا تعین	86
پیسے میں اسراف	87
خواہشات اور اسراف	88
نمود ونمائش اور اسراف	89
اسراف کی حدود اور اس سے بچنے کی تدبیر	89
اسراف کے متعلق اصل تصور	90
کھانے میں اسراف	93
قدرتی وسائل میں اسراف	95
بخل	
بخل	97
بخل کا دائرہ	99
مال میں بخل	99
کفالت میں بخل	100
عبادات میں بخل	100
مروت میں بخل	101
بخل نفرت کا سبب	103
مروت میں بخل کی ایک اور مثال	104

صدقہ میں بخل	105
بخیل کی بدنصیبی	107
لباس میں بخل	108
سلام میں بخل	108
بچوں کو بخیلی سے بچائیں	108
مہمانوں کے ساتھ بخل	109
فالتو چیزوں میں بخل	110
جذبات میں بخل	110
تعریف میں بخل	111
معذرت کرنے میں بخل	112
غفلت کا بخل	112
روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء میں بخل	112
بخل کا علاج	113
بخل اور اسراف یکجا	115
بخل اور کفایت شعاری کا فرق	116
خلاصہ	117
دکھاوا	120
دکھاوا اور بطر کے معاشی اثرات	121
جشن تہنیت	122
بچوں میں بطر	123
دوسروں سے بھی دکھاوے کا تقاضا	124
بطر کے فوری نقصانات	127
دکھاوے اور بطر کا علاج	128
بطر کی علامات	129
راہ عمل	131
باب سوم	
تکبر و تذلل	
تکبر کیا چیز ہے؟	133
تکبر کی شناخت اور درجات	134
تکبر کا پہلا مرحلہ "عجب"	135
عجب کی پہچان	135
دوسرا مرحلہ "فخر"	136
تیسرا مرحلہ "اصل تکبر"	136
فخر اور تکبر کی پہچان	137
خاندان پر فخر و تکبر	139
خاندانی تکبر سے بچنے کا طریقہ	141
مسلمان امت پر شیطان کا ایک حملہ	141
حُسن پر فخر	143
عجب کا ایک اظہار	143
تکبر کی ضد: تذلل	145
فرقہ ملامتیہ کا طرز عمل	147
تذلل کے نقصانات	148
تذلل پیدا ہونے کے اسباب	148
تذلل کا علاج	149
تذلل والوں کی مدد اور علاج	150
تواضع	
تواضع کی فضیلت	152

تواضع کی حقیقت	152
تکبر اور تذلل کا تزکیہ	153
دوسرے کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنا ذکر کرسکتے ہیں	154
عجب اور تکبر سے بچنے کے اور طریقے	155
تواضع کی صورت	156
تکبر کا علاج	159
تواضع حاصل کرنے کا طریقہ	159
تکبر، تذلل اور تواضع کی مثالیں	160
ریاکاری	
سمعہ	165
ریاری کاری کی نشانیاں	166
ریاکاری کے مختلف انداز	168
خرچ کرنے میں ریاکاری	168
لباس میں ریاکاری	168
گناہوں پر افسوس کرنے میں ریاکاری	169
محفل اور تنہائی کی نماز وغیرہ	169
ریا کی ایک اور علامت	170
ریا کے سہارے کوئی عمل قبول نہیں	171
ریا کا تعلق نیت سے ہے	173
ریا کا علاج	174
ریاکاری کا خوف	176
سرکشی	
کمتر سرکشی	177
بڑی سرکشی	178
ماتحتوں کی سرکشی	179
بغاوت کا ضرر	180
بغاوت کرنے والوں کا رویّہ	180
ازراہِ مذاق سرکشی	182
مطالبات میں سرکشی	184
سرکشی ترک کرنے کے لیے صحیح انسان بننا	184
قیامت میں سرکشی کا حساب	186
باب چہارم	
توقعات	189
اپنے آپ سے توقع	189
اچھی توقع کا فائدہ	190
توقعات پر پورا اترنے کے لیے ذہنی تیاری ضروری ہے	190
اللہ سے توقع	191
دوسروں سے توقعات	194
دوسروں کی ہم سے توقعات	195
دوسرے سے کچھ کرنے کی توقع	195
رشتہ داروں کا خیال بلا توقع اللہ کے لیے رکھا جائے	197
دنیا میں راحت سے رہنے کا ایک ہی نسخہ: مخلوق سے توقع نہ رکھنا	198
والدین کی اولاد سے بے جا توقعات	198

نہ شکریہ مانگو نہ شکایت کرو	198
تصورات	
تخیل	206
اَمانی	208
تصور تخیل اور وسوسے میں فرق	210
حمیت	
حمیت سب سے پہلے اللہ اور اس کے دین کے لیے	212
حیا	211
حیا انسان کا خاصہ	215
حیا انسان کی فطرت میں ہے	215
منکرات میں مبتلا ہونا	216
حیا کا روایتی تصور	217
حیا ایک پورے رویے کا نام ہے	217
اللہ تعالیٰ سے حیا	217
والدین سے حیا	218
موجودہ دور میں حیا کی جگہ بے حیائی نے لے لی	219
بچوں کو حیا کی راہ پر ڈالیں	220
حیا بہادری و مردانگی دکھانے میں رکاوٹ نہیں	221
لڑکے کیا لڑکیاں بھی حیا کھو بیٹھیں	222
حیا کی زندگی	222
حیا کا تقاضا	2223
جسم اور ذاتی معاملات میں حیا	223
حیا اور بے حیائی کی تاثیر	224
بچوں کی تربیت میں حیا کا خاص خیال رکھا جائے	225
دو چیزوں میں حیا نہیں	227
باب پنجم	
حُبّ	225
حُبّ	229
شیطان محبت کا غلط استعمال سکھاتا ہے	230
محبت کی اقسام	231
واجب محبت	231
اللہ سے محبت میں اپنا ہی سکون و اطمینان ہے	232
انسانوں سے محبت بھی اللہ کی خاطر ہو	232
اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت	232
دل میں اللہ کی محبت پیدا کے لیے مشق کی ضرورت ہے	234
رسول اللہ ﷺ سے محبت	236
قرآن سے محبت	238
کعبہ سے محبت	238
صحابہ کرام j اور آل محمد ﷺ سے محبت	239
دین کے مددگاروں سے محبت	239
اللہ سے سچی محبت کی نشانی	240
مباح محبتیں	240
مباح محبتوں کی اہمیت	241
مباح محبتوں کی حدود	242
اللہ سے دنیوی خوشیوں کے لیے محبت رکھنا	244

اصل حق اللہ اور اس کے دین کا ہے	244
حرام محبت	244
مختلف محبتوں کی نشاندہی	248
حرص	
مطلوب حرص	251
بری حرص	253
آخرت کا حریص پرسکون، دنیا کا حریص بے سکون	254
حرص کے مقابلہ میں قناعت	255
حرص اور بخل	258
خیانت	
نفاق	258
مختلف امانتیں	260
اللہ کی امانت	260
اپنی ذات کی امانت	261
انسانوں کی امانتیں	262
عہدے کی امانت	263
خیانت کے جواب میں خیانت	264
مریض کی بات امانت	265
خیانت پر خیانت	266
کسی کا فون یا چھپی بات سننا	266
دھوکا اور خیانت	266
وعدہ اور خیانت	267
مشورے کی امانت	270
دفتر کے متعلق امانت	272
پبلک مقامات وغیرہ کی خیانت	272
گھریلو مکالمات میں خیانت	273
میاں بیوی کے متعلق بات	273
بجلی میں خیانت	274
سسرال کی امانت	274
میکے کی امانت	275
سب سے بڑی خیانت	276
اساتذہ کی خیانت	276
باب ششم	
غصہ	
غصہ	277
دین اور اللہ کی خاطر غصہ	278
غصے کی وجوہ	282
غصے کا علاج	282
غصے کے مفاسد	284
غصے کی دوسری وجہ	285
غصے کے لیے تدابیر	285
علاج	286
غصے کی تیسری وجہ	289
علاج	290
غصے کی چوتھی وجہ	291

غصے کی پانچویں وجہ	293
غصے کے بعد معذرت اور افسوس	296
ناگزیر غصہ	296
غصہ کا غلط اور صحیح اظہار	296
غصے کا سلسلہ وار ردعمل	298
غصے کی ضرر رسانی	298
بعض لوگوں کا غلط خیال	299
علاج	299
غصہ کی وجہ سے مختلف عوارض	300
مزید اثرات ونقصانات	301
غصے کے متعلق راہ عمل	301
خاموش غصہ	302
غصہ کیسے ختم کیا جائے	303
غصہ پر قابو پانے کے فائدے	304
غصے کا ایک مثبت پہلو	305
غصے کے وقت درست حکمت عملی	307
حلم اور بربادی کا ایک واقعہ	308
غصے کا مناسب اور اصلاحی اظہار	309
غصہ کسی مسئلہ کا حل نہیں	310
مزاج سے غصہ میں نہیں آنا چاہیے	311
خواتین تھکن وغیرہ کی وجہ سے بدمزاج نہ ہوں	311
خواتین کے لیے خصوصی نصیحت	312
بغض	
بغض	314
بغض کا محل	314
سسرالی رشتوں میں بغض	315
بغض سے بچاؤ	316
بغض کی دوسری وجہ	320
اس بغض کا علاج	321
بغض کی ایک اور وجہ	322
بغض کا علاج	323
باب ہفتم	
جھوٹ	
جھوٹ، منافق کی علامت	325
جھوٹ کی وجوہ	326
ناگوار صورت حال میں جھوٹ	327
دل رکھنے کو جھوٹ	327
علاج کی ضرورت	329
سستی اور کاہلی کی وجہ سے جھوٹ	330
غیر حقیقی وعدہ	330
بھول جانے کی وجہ سے جھوٹ	331
بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ	332
اپنا یا دوسروں کا مرتبہ بڑھانے کے لیے جھوٹ	332
ٹالنے کے لیے جھوٹ	333
پیسے دینے میں جھوٹ	333
عجلت اور تاخیر والا جھوٹ	334

لاڈ میں جھوٹ	335
خوابوں میں جھوٹ	336
تعریف میں جھوٹ	337
ٹکٹ وغیرہ میں رعایت کے لیے جھوٹ	337
دام کم کروانے کے لیے جھوٹ	338
احادیث میں جھوٹ	339
جھوٹی قسم	340
جھوٹی گواہی	342
جھوٹی گواہی کی مختلف شکلیں	343
وہ مواقع جن میں جھوٹ بولنا جائز ہے	344
حسد	
حسد کی وجوہ	346
حسد کا علاج	347
حسد کے درجے	348
حسد کا دوسرا درجہ	350
شکوے کے بجائے شکر کریں	351
حسد کا تیسرا درجہ	355
بچوں کے حسد کی حقیقت	355
حسد کی خرابی	355
رشک	356
حسد کی ابتداء اور ظہور	356
حسد سے اصل نقصان حاسد ہی کا ہوتا ہے	357
رشک کی صورت حال	357
حسد کا علاج	358
جس کو یہ اندیشہ ہو کہ لوگ مجھ سے جلتے ہیں وہ کیا کرے	359
کسل	
کسل	360
کاہلی کو چھپا کر عذر پیش کرنا	361
مصروفیت کی اہمیت	362
سستی کا مقابلہ کیا جائے	365
نعمتوں کی بڑی تقسیم	367
نسیان النعمۃ	368
دنیاوی نعمتوں میں آزمائش	369
کراہیت الذم، لوگوں کی طرف سے مذمت کی پروانہ کریں	372
کراہیت الموت	376
موت کی تیاری	377
موت کو یاد رکھنے کے فوائد	378
موت سے فرار کفار کی علامت	379
موت سے فرار ہونے کی خرابیاں	379

دیباچہ

ہمیشہ سے اللہ کا یہ قانون رہا کہ وہ صرف اس کو ہدایت دیتا ہے جس کے اندر ہدایت کی طلب پاتا ہے، پھر یہ طلب جیسے جیسے بڑھتی جاتی ہے ویسی ہی اللہ اسے نیکیوں میں بڑھاتا چلا جاتا ہے۔ اسے صراط مستقیم دکھا کر چھوڑ نہیں دیتا بلکہ منزل تک پہنچنے میں اس کی مدد فرماتا ہے۔

کیا ہم میں سے کوئی کہہ سکتا ہے کہ مجھ سے کبھی کوئی غلطی نہیں ہوتی، مجھ میں کوئی خامی یا کمزوری نہیں۔ یہ دعویٰ کوئی نہیں کرسکتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آدمی اپنے سے زیادہ کسی سے واقف نہیں ہوتا۔ جیسا کہ قرآن میں آتا ہے {بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ} ''بلکہ انسان خود ہی اپنے آپ کو خوب جانتا ہے'' (سورہ القیامہ:14)

حقیقت پر پردہ ڈالنے سے انسان کا تزکیہ یا اصلاح ہونا نہایت مشکل ہے اور اگر بات صرف اسی دنیا تک محدود ہوتی تو اس کا یہ طرز عمل شاید قابل قبول ہوتا کہ اس دنیا میں آئے، زندگی گزاری، اپنی مرضی کے مطابق لوگوں سے معاملات کیے اور اس دنیا سے چلے گئے۔ مگر مسئلہ تو یہ ہے کہ جو کچھ اس دنیا میں کر رہے ہیں آخرت میں اس کا جوابدہ ہونا پڑے گا۔ اسی لیے اپنے آپ سے کترانا کسی طرح مناسب نہیں۔ یہ عمل انسان کے حق میں بہت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔ دوسروں پر انگلیاں اٹھانا یا ان کی اصلاح کی بات کرنا بہت آسان ہوتا ہے مگر اپنی ذات کو اصلاح کا ہدف بنانا ہی اصل کمال ہے۔

پھر ہمارا دین بھی ہمیں اسی بات کی تعلیم دیتا ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو ایک کرو۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اپنے اندر جھانک کر کیا کریں؟ وہاں تو سوائے اندھیروں کے کچھ دکھائی نہیں دیتا، اپنی برائیوں کو کیسے پہچانیں؟ انھیں کیسے دور کریں؟ اپنے باطن کو ظاہر کے مطابق کیسے ڈھالیں؟

یہ سوالات انھیں الجھائیں گے جو قرآن سے دور ہوگا۔ کیونکہ قرآن ہی وہ روشنی ہے جو انسان کے اندر کے اندھیروں کو دور کرتی ہے۔ اس روشنی میں اسے اپنا آپ اتنا واضح اور صاف نظر آتا ہے کہ انسان خود حیران رہ جاتا ہے کہ ''یہ میں ہوں؟'' پھر وہ اسی روشنی کے سہارے اپنے اندر کی برائیوں کو نکالتا ہے اور اچھائیوں کو پروان چڑھاتا ہے، یہی عمل دراصل ''تزکیہ'' کہلاتا ہے، جو کہ قرآن کے بغیر ممکن نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب نبی اکرم ﷺ کو نبوت عطا کی تو فرمایا:

{هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَ دِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ} ''وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا تا کہ اس (دین) کو (دنیائے) تمام دینوں پر غالب کر دے'' (سورہ التوبہ:33)۔ اس مقصد بعثت کی خاطر نبی اکرم ﷺ نے اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو ایک خاص طریقہ کار سکھایا جس کا ذکر قرآن میں 4 مقامات پر آتا ہے۔

{هُوَ الَّذِیۡ بَعَثَ فِی الۡاُمِّیّٖنَ رَسُوۡلًا مِّنۡهُمۡ یَتۡلُوۡا عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِهٖ وَیُزَکِّیۡهِمۡ وَیُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡحِکۡمَةَ} ''وہی تو ہے جس نے ان پڑھوں میں ان ہی میں سے (محمد ﷺ) کو رسول (بنا کر) بھیجا جو ان کے سامنے اس کی آیتیں پڑھتے اور ان کو پاک کرتے اور (اللہ) کی کتاب اور دانائی سکھاتے ہیں'' (سورہ جمعہ:2) اس بے مثال کامیابی تک پہنچنے کے لیے آپ ﷺ نے اور آپؐ کے مبارک ساتھیوں نے اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر قتال فی سبیل اللہ میں قدم آگے بڑھائے اور میدان پر میدان مارتے گئے۔

''رکتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا''

مگر ہر تاریخ کا طالب علم اس حقیقت سے واقف ہوگا کہ تیر و تلوار کے ذریعے علاقے تو فتح کیے جا سکتے ہیں مگر دل نہیں اور اگر دل فتح نہ کیے جائیں تو ایسی فتح پائیدار نہیں ہوتی۔ اسلامی فتح کو پائیدار بنانے کے لیے ضروری تھا کہ دلوں کو فتح کیا جائے، اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو بے مثال اخلاق سے نوازا تھا۔ {وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ} ''اور (اے محمدؐ) بلاشبہ آپ ﷺ اخلاق حسنہ کی بلندیوں پر فائز ہیں'' (سورہ القلم:4)۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''میزان میں حسن اخلاق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ رکھی جائے گی'' (ترمذی)۔ ایک اور مقام پر آپ ﷺ نے فرمایا ''سب سے زیادہ کامل ایمان والے وہ لوگ ہیں جو مسلمانوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق والے ہیں'' (ابوداؤد)۔ یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ حق کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کے لیے ظاہری تبدیلی کافی نہیں ہوتی سطحی طور پر تبدیلی عارضی ہوتی ہے یعنی جب تک جڑ پائیدار نہ ہو عمل مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا {یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا ادۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّةً} ''مومنو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ'' (سورہ البقرۃ:208)۔ یعنی پورے چوبیس گھنٹوں کے ساتھ اندرونی، بیرونی، ظاہری، باطنی، جسمانی، روحانی اور دلی طور پر

اسلام میں داخل ہونا ہے۔ ہم دعا کریں {اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ} ''بے شک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ رب العالمین کے لیے ہے'' (سورہ الانعام:162) لہٰذا کرنے کا کام یہ ہے کہ زندگی کے ہر گوشے میں للّٰہیت پیدا کرنی ہے۔ جب آپ ﷺ کو اللہ نے ایسے عظیم اخلاق پر فائز کیا تو آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں ایک کام نفوسِ انسانی کا تزکیہ بھی تھا۔ {یَتْلُوْا عَلَیْھِمْ اٰیٰتِہٖ وَیُزَکِّیْھِمْ} ''وہ ان کے سامنے اس (اللہ) کی آیتیں پڑھتے ہیں اور ان کو پاک کرتے ہیں'' (سورہ جمعہ:2)۔ اسی لیے دل، ذہن، سوچ اور جذبات کی پاکیزگی کے ساتھ پہلے کلمہ طیبہ دلوں اور ذہنوں میں موکد کیا اور اس کے بعد باقی دنیا اس شجر طیبہ کی بہار سے فیض یاب ہوئی۔

{قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی ○ وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی} ''بے شک مراد کو پہنچ گیا وہ جو پاک ہوا اور اپنے پروردگار کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا'' (سورہ الاعلیٰ:14، 15)۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں سے وہ کام لیا جو فرشتوں کے بھی بس کا نہیں تھا۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان ہونا ۔ مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

اتنے اعلیٰ اخلاق پر فائز ہونے کے باوجود آپ ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے ((اَللّٰھُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِی فَاَحْسِنْ خُلُقِی)) ''اے اللہ تو نے میری صورت بہت اچھی بنائی پس میری سیرت بھی بہت اچھی کر دے'' (احمد)۔ اخلاق دراصل ارادے کی عادت کا نام ہے۔ انسان پہلے محنت، مشقت اور ارادہ کر کے عادتوں پر کام کرے پھر رفتہ رفتہ اچھا اخلاق اس کی فطرتِ ثانیہ (second nature) بن سکتا ہے۔ اس مقام پر میں ضروری سمجھتی ہوں کہ اخلاق کی صحیح تعریف بیان کی جائے۔ ہمارے معاشرے میں یا کہیں بھی اخلاق کی کئی قسمیں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر کاروباری اخلاق جس میں انسان دوغلی شخصیت کے ساتھ زندگی گزار رہا ہوتا ہے، فائدہ ہوا تو اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کریں گے، فائدہ نہیں ہوا یا کوئی دیکھ نہیں رہا تو بداخلاق۔ اسی طرح ایک ہے خانقاہی اخلاق، اس میں عام سوچ یہ ہے کہ عفو و درگزر کرنا اچھا ہے اور بدلہ لینا برا ہے، امن اچھا ہے اور جنگ بری ہے، معاف کرنا اچھا ہے اور غصہ کرنا برا وغیرہ۔ عام طور پر لوگوں کے آگے یہی خانقاہی اخلاق کا تصور ہوتا ہے اور وہ اس کو اچھا اخلاق تصور کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کو نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اخلاق کے بارے میں شکایات اور غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ سمجھنے کی بات

یہ ہے کہ اللہ اپنے رسولوں کو ایک unique اخلاق پر پیدا فرماتا تھا اور وہ اخلاق کی تیسری قسم ہے یعنی تبلیغی یا مجاہدانہ اخلاق۔ اسی اخلاق کے تحت آپ ﷺ نے صلح حدیبیہ بھی کی اور فتح مکہ بھی، معاف بھی کیا اور سزا بھی دی، درگزر بھی کیا اور غصہ بھی کیا۔ اور اسی اخلاق کے تحت نبی اکرم ﷺ نے اپنے صحابہ کرامؓ کی تربیت بھی کی۔ آج ہمیں اپنے معاشرے میں اسی طریقۂ تعلیم و تربیت کی کمی نظر آتی ہے۔ جگہ جگہ قرآن تو پڑھا پڑھایا جا رہا ہے مگر تزکیے کے بغیر۔ اسی لیے معاشرے میں بہتری نظر نہیں آ رہی، کیونکہ قرآن کی تعلیم دینا اور تزکیہ کرنا دو مختلف ذمہ داریاں ہیں، جس کی دلیل ہم نے سورہ جمعہ کی آیت میں دیکھی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی اسی سنت پر عمل پیرا ہو کر میں نے تزکیے کے موضوع پر چند لیکچرز ترتیب دیے، جس میں کوشش کی گئی کہ ان تمام امور پر بات ہو سکے جو ایک انسان کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں مددگار ثابت ہوں۔ میں نے اپنے ان لیکچرز کو اپنے ادارے العلم کے قرآنی نصاب کا حصہ بنایا، جو کہ الحمدللہ 2007ء سے مسلسل قرآن کی تعلیم کے ساتھ پڑھایا جا رہا ہے۔

ساتھ ہی یہ امید کرتی ہوں کہ ان لیکچرز سے وہی فائدہ اٹھائیں گے جن کے اندر اپنی اصلاح و تربیت کی طلب ہوگی ورنہ محض ''علمی سیر'' یا ''معلومات میں اضافے'' کے لیے ان کو پڑھا گیا تو اس کا اصل جوہر حاصل نہ ہوگا۔ ان اخلاقی بیماریوں کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے آپ کو ایک مالی کی طرح ان کی کٹائی چھٹائی کرنی پڑے گی۔ جیسے ایک مالی اگر پودوں کی کاٹ چھانٹ وقت پر نہ کرے تو وہ ہرے بھرے پودے اور پھول جھاڑ جھنکار میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بیماریاں بھی اگر شخصیت کا حصہ بنی رہیں گی تو انسان کی شخصیت بھی ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے۔

سچائی، امانت، تواضع، انکساری، غصے پر قابو پانا، دل کو کینہ، حسد اور بغض سے پاک رکھنا، زبان کو جھوٹ، طعنہ، طنز اور غیبت سے دور رکھنا وہ اوصاف ہیں جس سے ایک حسین و جمیل کردار بنتا ہے۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے محنت اور وقت درکار ہے۔ جب دنیا میں کوئی چیز بغیر محنت کے حاصل نہیں ہوتی تو ایک خوبصورت شخصیت کا ظہور اپنی عادتوں پر محنت کیے بغیر کیسے ہوگا؟

ہم اگر چاہیں کہ لوگ محض درس قرآن سے، تقاریر سے، کتابوں اور نعروں اور جلوسوں سے دین کی طرف آئیں تو یہ خواہش مشکل ہے کہ پوری ہو۔ یہ اس وقت ممکن ہو سکے گا جب تک وہ ہمارے کرداروں میں ان اخلاق کی جھلک نہ دیکھ لیں جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا یہی اسوہ و کردار تھا، بے مثال ضبط و تحمل، عفو و درگزر، رحمت اور شفقت کا معاملہ نہ صرف انسانوں بلکہ چرند پرند اور چھوٹے بڑے جانوروں تک تھا۔ یہی وہ اخلاق تھا جس کی بنا پر لوگ آپ ﷺ کے پاس کھنچے چلے آئے اور بالآخر اسلام قبول کر لیا۔ رحمت، محبت و شفقت ایک بنیادی صفت ہے۔ دل کی سختی، زبان کی سختی، برتاؤ کی سختی یہ ایمان کے ساتھ نہیں بچتی۔ ایمان کے ساتھ تو معاملات میں نرمی ہی اچھی لگتی ہے۔ وہ نرمی جس کے نبی ﷺ مظہر تھے۔ ان لیکچرز سے فائدہ اٹھانے کی صورت یہ ہے کہ ایک انسان اپنی اصلاح و تربیت کے لیے پہلے درجے پر اپنا جائزہ لے، دوسروں سے اپنے بارے میں پوچھے، ان کی رائے لے اور پھر اپنے اندر پائی جانے والی کمزوریوں پر کام کرنا شروع کرے۔ اگر اس میں تکبر وانا، جھوٹ، حسد، کینہ، بدگمانی یا غصہ جیسی باطنی بیماریاں ہیں تو ان کو ایک ایک کر کے دور کرنے کی کوشش شروع کر دے۔

یاد رکھیے تزکیہ و تربیت کے لیے محض علم اور برائیوں کی نشاندہی کافی نہیں، بلکہ جو کچھ انسان پڑھا تا اور سیکھتا جائے اس پر فوری عمل کرے۔ تزکیہ عمل سے ہوتا ہے، صرف پڑھنا اور سننا کافی نہیں۔ میرے انہی لیکچرز کو قرآن اکیڈمی نے کتابی شکل دی تا کہ انھیں آپ کے بھی نصاب کا حصہ بنایا جا سکے۔ اللہ تعالیٰ ان کی کوششوں کو قبول فرمائے اور اس کو ان کے لیے بہترین صدقہ جاریہ کا سبب بنائے (آمین)۔ بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ ان مضامین کے ذریعے رب کائنات ہمیں ایک ایسے کردار میں ڈھال دے جو کہ مطلوب رب ہے۔ اور ہم مل کر ایک ایسا معاشرہ تشکیل دے سکیں جو ہمارے دین کی عکاسی کرے۔

آخری بات اور وہ یہ کہ مانا کہ اپنی برائیوں کو چھانٹنا اور ان کو accept کرنا ایک تکلیف دہ عمل ہے مگر یاد رہے کہ سونا بھٹی میں تپ کر ہی کندن بنتا ہے، ایک خاص پتھر پر cuts لگتے ہیں تب ہی وہ ہیرا بنتا ہے۔ زندگی مسلسل کوشش کا نام ہے۔ کوشش اس بات کی کہ ہمارے آنے والا کل گزرے ہوئے کل سے بہتر ہو۔ یہی کوشش انسان کو آخرت میں کامیابی سے ہمکنار کر سکتی ہے۔ قرآن بھی اسی بات کو بیان کرتا ہے۔ {وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ○ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى} ''اور یہ کہ ہر انسان کے لیے وہی ہے جس کی خود اس نے کوشش کی اور یہ کہ بے شک اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی'' (سورہ النجم: 39، 40)۔

(ہما نجم الحسن)

پیش لفظ

(بہ موقع اشاعت سوم)

بفضل للہ تعالیٰ ''تزکیۂ نفس ــــــــ اشاعتِ سوم شعبۂ مطبوعات انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی جانب سے پیش خدمت ہے۔ تزکیۂ نفس کے مبحث کا دین میں مطلوب ومقصود کا درجہ رکھنا ہر قسم کے ریب وشک سے بالاتر ہے۔ نصوصِ دین اس بات پر شاہد ہیں کہ انسان کے افعال واعمال کا عنداللہ مقبول ہونا اخلاصِ نیت پر موقوف ہے، جس کی جہدِ مسلسل کا عنوان تزکیۂ نفس ہے۔ مزید برآں جہاں انسانی شخصیت میں افکار واعمال کی اصلاح مطلوب ہے، وہیں انسانی طبیعت ومزاج کا تزکیہ فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے، جسے حدیثِ جبرئیل علیہ الصلوۃ والسلام میں درجۂ احسان قرار دیا گیا ہے۔ تزکیہ وتصوف ہی وہ مضبوط ڈھال ہے جو بندۂ مؤمن کو تعلیم وتعلم، دعوت وتبلیغ، اور جہاد واقامتِ دین کے حد درجے عظیم لیکن نہایت پرخطر میدانوں میں شرورِ نفسانی اور وساوس شیطانی سے محفوظ ومامون رکھتی ہے، اور وہ تریاق ہے جو حبِ دنیا اور مادہ پرستی کے سمِ قاتل کو بے اثر بنا کر انسان کو طالبِ آخرت بناتا ہے۔ ایسے ہی نفوس مزکیٰ کے لیے فلاحِ اخروی اور جنت میں داخلہ مخصوص ہے:

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ: 14) ترجمہ: فلاح اس نے پائی ہے جس نے پاکیزگی اختیار کی۔ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى (طه 76) ترجمہ: وہ ہمیشہ رہنے والے باغات جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی، جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہ صلہ ہے اس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔

انسانی عقل حیاتِ دنیوی کے بارے میں افراط وتفریط کے دھکوں کا شکار رہی ہے۔ حیوانیتِ محض اور رہبانیت کی انتہاؤں کے مابین وحیِ ربانی نے زہد وتبتل کے مطلوب ومعتدل

رویے کی جانب رہنمائی کی ہے، جسے ہر دور کے اہل علم و رشد نے اپنے زمانے کی مناسبت سے واضح کیا ہے۔ زمانۂ جدید کے اعتبار سے تزکیۂ نفس کے اصول وطریقۂ کار کی تشریح وتوضیح کے کام میں ایک مفید اضافہ محترمہ ہما نجم الحسن صاحبہ کے ان بیانات کا ہوا ہے جن میں محترمہ نے خواتین سے خطاب کرتے ہوئے تزکیۂ نفس کے عمومی اصول اور خاص کر خواتین سے متعلق امور کی وضاحت کی ہے۔

ان بیانات کو تنظیم اسلامی حلقۂ خواتین سے منسلک چند رفیقات نے محنت وعرق ریزی کے ساتھ کیسٹ سے صفحۂ قرطاس پر اتارا، جسے انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کے شعبۂ تحقیق میں فنی-editing کے مراحل سے گزار کر شائع کیا گیا۔ واضح رہے کہ ۲۰۱۴ء میں اس کتاب کی اولین اشاعت ۷ متفرق کتابچوں کی صورت میں کی گئی تھی، جنہیں افادۂ عام کی غرض سے ۲۰۱۷ء میں یکجا کر کے شائع کیا گیا۔ بحمد للہ اب کتاب کی اشاعتِ سوم پیشِ خدمت ہے کوشش کی گئی ہے کہ پچھلی اشاعت میں جو غلطیاں سہواً ہوگئی تھیں اُن کو درست کر لیا جائے، لیکن بہر حال انسانی کاوشوں میں غلطی کا احتمال رہتا ہے آپ سے درخواست ہے اگر کوئی غلطی نظر سے گزرے تو اس کی نشاندہی فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں اس کو درست کر لیا جائے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ سے دعا ہے کہ اس کاوش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت عطا فرمائے اور ادارے کے جملہ افراد کے حق میں صدقۂ جاریہ بنائے۔ آمین۔!

۲۱/ جولائی ۲۰۲۰

۲۹/ ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ

شعبۂ مطبوعات

انجمن خدام القرآن، سندھ

تزکیہ

مفہوم اور مقصد:

تزکیہ کے معنی ہیں کہ انسان بُرائیوں سے اپنے آپ کو پاک کرلے اور اپنی اچھائیوں کو پروان چڑھائے۔ بنیادی طور پر تزکیہ کا مقصد اور حاصل یہ ہے کہ انسان کو گناہوں سے نجات مل جائے اور وہ زیادہ سے زیادہ نیکیاں کرنے لگے۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کی دُعا کے الفاظ درج ذیل ہیں:

اَللّٰھُمَّ آتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکَّاھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلٰھَا (۱)

''اے اللہ تو میرے نفس کو اُس کا تقویٰ عطا کردے اور تو اس کو پاک کردے، تو بہترین اس (نفس) کو پاک کرنے والا ہے۔ تو ہی اس کا ولی ہے اور تو ہی اس کا مولا ہے۔''

تزکیہ کے لیے کسی بھی زبان میں کوئی متبادل لفظ ڈھونڈنا آسان نہیں ہے، لفظ ''پاکی'' (Purity) بھی ایک محدود تصوّر دماغ میں لاتا ہے۔ اسی طرح لفظ ''صفائی'' سے بھی ایک محدود تصور ابھرتا ہے۔ لفظ تزکیہ اُن الفاظ میں سے محسوس ہوتا ہے کہ جن کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم اس بحث میں کسی دوسری زبان کا کوئی متبادل لفظ استعمال کرنے کے بجائے تزکیہ کے لیے تزکیہ ہی کا لفظ استعمال کریں گے۔ اسی قبیل کا ایک اور لفظ ''تقویٰ'' ہے۔ اس لفظ کے لیے بھی ہم دنیا کی کسی اور زبان میں کوئی متبادل لفظ نہیں ڈھونڈ سکتے۔

نظامِ طہارت:

انسان جب اپنے چاروں سمت نظر دوڑاتا ہے، تو اس کا مشاہدہ اس جانب رہنمائی کرتا ہے کہ ہر جاندار ایک ایسے نظام کے تحت زندگی بسر کر رہا ہے جو اُس کے جسم کی اندرونی گندگی کو خود بخود صاف کرتا رہتا ہے، صحت مند جسم کے لیے یہ نظامِ صفائی نہایت ضروری ہے۔ اگر کوئی بہترین غذا استعمال کرتا ہو لیکن اس کا نظامِ صفائی درست نہ ہو تو وہ صحت مند نہیں رہ سکتا، بہترین غذا کا استعمال بھی صحت مند زندگی کا ضامن نہیں۔ جہاں تک جسم کی اندرونی صفائی کا تعلق ہے، یہ خود بخود (automatically) ہوتی رہتی ہے، جب کہ جسم کو ظاہری طور پر صاف ستھرا رکھنا ہر مخلوق کی اپنی

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

ذمہ داری ہے، یہ عمل دولحاظ سے ضروری ہے، اوّلاً صحت کے طبی اصولوں (medical principles) کے تحت اپنے آپ کو پاک وصاف رکھنا ضروری ہے اور ثانیاً اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر جو جمالیاتی حس رکھی ہے، اُس کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے آپ کو صاف رکھے، چنانچہ انسان نہ صرف اپنے آپ کو صاف رکھتا ہے بلکہ زینت بھی اختیار کرنا چاہتا ہے۔ یہ تقاضا انسان میں فطری طور پر موجود ہے۔ نہ صرف انسان بلکہ یہ شعور جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنی ذات بلکہ اپنے بچوں کو بھی ظاہری طور پر صاف ستھرا رکھیں۔

ظاہری صفائی کا یہ عمل ایک دفعہ کے لیے کافی نہیں بلکہ خود کو مستقل صاف رکھنا مطلوب ہے جو کہ ایک مسلسل عمل ہے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے ایک دن اپنے آپ کو صاف کرلیا تھا چنانچہ اب ایک ہفتے تک مجھے اپنے آپ کو صاف کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے ایک دن دانت صاف کر لیے تھے اس لیے اب ایک ہفتہ مسواک کرنے یا برش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، یا ایک بار میں غسل کر چکا لہٰذا اب ایک مہینہ مجھے نہانے کی ضرورت نہیں۔ درحقیقت انسان اپنے آپ کو صاف کرتا ہے، پھر کچھ نہ کچھ گندگی اُس کو لاحق ہوجاتی ہے جس کو دور کرنا ناگزیر ہوتا ہے۔ یعنی اپنے ظاہری وجود کی طہارت ایک مسلسل عمل ہے۔

تزکیہ ایک مسلسل عمل:

ظاہری طہارت کی طرح تزکیہ بھی ایک مسلسل اور زندگی بھر کا عمل ہے۔ جیسے ہم ظاہری صفائی حاصل کرتے ہیں اور ساتھ ہی دنیا کے کام بھی نمٹاتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تزکیہ کوئی ایسی چیز نہیں کہ بندہ کہے کہ پہلے میں یہ کام کرلوں اور اس کے بعد زندگی کے باقی سارے کام شروع کروں گا۔ جیسا کہ روزمرّہ کے معمول (routine) میں ہم صفائی کرتے ہیں اور باقی زندگی کے کام بھی کرتے رہتے ہیں اسی طرح تزکیہ کا عمل ہم باقاعدہ اپنی روزمرّہ زندگی کے دوسرے کاموں کے ساتھ ساتھ جاری رکھیں گے۔ جب تک ہم زندہ ہیں اس کو اپنی زندگی کا حصہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ کوئی جُز وقتی کام نہیں ہے بلکہ زندگی بھر کا عمل ہے۔ تزکیہ کا عمل ایسا نہیں ہے کہ چند دنوں میں یا چند سالوں میں اس کو مکمل کرلیا جائے، یہ محدود وقت میں مکمل نہیں ہوسکتا کیوں کہ بندہ اپنا تزکیہ کرتا ہے تو کوئی اور بُرائی اس کے ساتھ شامل ہوجاتی ہے پھر اُس بُرائی کو دُور کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے اور اگر کوئی بُرائی نہ بھی لگے تب بھی جب تک زندہ ہیں بُرائیوں سے پالا پڑنے کا امکان تو بہرحال موجود ہے،

اسی لیے تزکیہ کا زندگی کے آخری لمحے تک مسلسل جاری رہنا ضروری ہے۔

گندگی کو دور کرنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ پہلی یہ کہ انسان کو گندگی کی پہچان ہو، اسے معلوم ہو کہ یہ گندگی ہے، نجاست ہے اور اس بات کا احساس ہو۔ دوسری یہ کہ اُس کے پاس ایسے ذرائع ہوں جن سے وہ خود کو اس گندگی سے پاک وصاف کر سکتا ہو۔ جب انسان کی ظاہری گندگی دُور ہوتی رہتی ہے تو وہ خود صحت مند رہتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ دوسروں کے لیے اُس کا وجود خوش گوار ہوتا ہے۔ اُس کی موجودگی (presence) دوسروں کے لیے خوش گوار (pleasant) ہو جاتی ہے۔ لوگ اُس کی صحبت میں بیٹھتے ہوئے گھبراتے نہیں جب کہ گندے لوگوں کے پاس بیٹھنے سے گھبراتے ہیں۔ پاک وصاف لوگوں کے پاس بیٹھنا لوگوں کو اچھا اور خوش گوار لگتا ہے۔

یہاں تک جو معاملہ بیان ہوا وہ انسانوں اور جانوروں میں یکساں ہے یعنی جسمانی اور ظاہری صفائی کا معاملہ ان دونوں مخلوقات میں یہاں تک مشترک ہے۔ پالتو جانوروں کو ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی گندگی کو کھود کر دبا دیتے ہیں، اپنے آپ کو مٹی میں لوٹ پوٹ کر صاف کر لیتے ہیں۔ اس سے آگے اب معاملہ مختلف ہو جاتا ہے۔ جانور تو صرف جسم کی ہی صفائی پر اکتفا کرتے ہیں کیوں کہ جانور کی اصل جسم ہی ہے یعنی (جان + ور)، اس کے اندر کوئی اور جہت (dimension)، یا وجود کا کوئی اور طبقہ (level) ہے ہی نہیں۔ جانور صرف جسمانی سطح پر زندہ رہتا ہے۔ جب کہ انسان نرا جانور نہیں ہے بلکہ اُس کے وجود کے کئی پہلو یا جہتیں ہیں۔ ایک پہلو انسان کی سوچ ہے جس کا تعلق ذہن سے ہے، ایک پہلو انسان کی روح ہے اور روح کا تعلق دل سے ہے۔

دل و دماغ کی طہارت:

انسان کو چاہیے کہ جسم کے ساتھ ساتھ دل و دماغ کی طہارت کا بھی خیال رکھے، تاکہ وہ ذہنی اور روحانی طور پر بھی صحت مند رہے۔ اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو پاکیزہ رکھنا دراصل صحت مند شخصیت کا راز ہے۔ جانوروں اور انسانوں میں فرق یہی ہے کہ جانور کی کوئی شخصیت (personality) نہیں ہوتی۔ اُسے اپنے ہونے کا احساس نہیں ہوتا، جب کہ انسان کی ایک شخصیت ہوتی ہے، جس کا اُسے احساس بھی ہوتا ہے۔ صحت مند شخصیت کے لیے اپنے جذبات اور خیالات کو پاکیزہ رکھنا ہوگا۔ اس طرح انسان خود اپنے لیے فائدہ مند (productive) ہو جاتا ہے اور مخلوق سے بھی تعلق بہتر طریقے پر نبھاتا ہے۔ پُر وقار، خوش گوار شخصیت کا حامل ہونے کے

ساتھ ساتھ خوش اخلاق بھی ہوتا ہے۔عقیدہ کو پاک رکھنے سے روح کو پاکیزگی حاصل ہوتی ہے،اس سے دلوں کو اطمینان نصیب ہوتا ہے۔خالق سے درست تعلق، درست اور پاکیزہ عقیدہ ہی پر منحصر ہے۔

تزکیے کے چار پہلو:

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق تزکیے کے چار پہلو ہیں۔(۱) عقیدے کو شرک سے پاک رکھنا۔ (۲) دل کو حسد، تکبر، نفاق وغیرہ سے پاک رکھنا۔ (۳) جسم کو بُری حرکتوں سے پاک رکھنا۔ (۴) لباس اور جسم کو گندگی سے پاک رکھنا۔اِن چار پہلوؤں سے انسان کو اپنا تزکیہ کرنے کی ضرورت ہے۔یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگر پہلی دو باتوں میں انسان کو کامیابی مل جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ باقی دو خود بخود انسان کو حاصل ہو جائیں گی۔

تزکیہ کی شرائط:

عقیدہ وسوچ اور اعمال واخلاق کو پاک کرنے کی وہی دو شرائط ہیں جو جسمانی پاکیزگی کی ہیں یعنی گندگی اور بُرائی کی پہچان ہو،احساس ہو اور پاکی حاصل کرنے کے ذرائع موجود ہوں کہ جن سے انسان اپنے آپ کو پاک کر سکے۔

جہاں تک پہلی چیز کا تعلق ہے، پہچان اور احساس، یہ انسان کی فطرت میں ودیعت شدہ (ingrained) ہے اور اس کی جینیات (genes) کے اندر موجود ہے۔اللہ تعالیٰ نے انسان کے بارے میں ارشاد فرمایا:

{فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا} (الشمس:۸)

''پس اُس نے اُس (نفس) میں الہام کر دیا اُس کا فسق وفجور اور اُس کا تقویٰ۔''

یہ چیز انسان کے اندر موجود ہے کہ وہ اپنی برائی اور اچھائی کو جانتا ہے۔

تزکیہ باطنی حسن کا ذریعہ:

تزکیہ انسان کو باطنی طور پر خوبصورت اور حسین بناتا ہے۔انسان فطرتاً حسن پسند واقع ہوا ہے، خوبصورتی کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ بھی خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔حدیث میں آتا ہے (اِنَّ اللّٰہَ جَمِیْلٌ یُحِبُّ الْجَمَالَ) [۱] ''بے شک اللہ خوبصورت ہے اور وہ خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔'' انسان بھی خوبصورتی میں کشش (attraction) محسوس کرتا ہے یعنی خوبصورت مناظر اُسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔جہاں تک انسانی شکل وصورت کا تعلق ہے، وہ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے، وہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ

ہمارے بس میں نہیں لیکن اپنے باطن، سوچ، عقیدہ، دل اور ذہن کو خوبصورت بنانا ہمارے اختیار میں ہے۔ جو اپنی سوچ، عقیدے اور عمل کو خوبصورت بنالے وہ اللہ کی نظر میں حسین بن جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ دُعا فرمایا کرتے تھے:

((اَللّٰھُمَّ کَمَا اَحْسَنْتَ خَلْقِیْ فَاَحْسِنْ خُلُقِیْ)) (۱)

''اے اللہ جیسے تو نے میری تخلیق خوب صورت کی ہے، میرا اخلاق بھی خوبصورت کردے۔''

اسلام کا تصورِ اخلاق:

ہمارے ہاں عام طور پر جو اخلاق کا تصور پایا جاتا ہے، وہ اُس اخلاق کے تصور سے مختلف ہے جس کا ذکر ہمیں قرآن واحادیث میں ملتا ہے۔ دنیاوی لحاظ سے ہم اُس شخص کو خوش اخلاق کہتے ہیں جو باتونی ہو، لوگوں کو خوش کرسکتا ہو، جب وہ لوگوں کے درمیان موجود ہو، تو اُس کا اخلاق بہت اچھا ہو۔ یہ چند چیزیں ہیں جن کو ہم اچھا اخلاق کہتے ہیں، یعنی ظاہری طرزِ عمل کو ہم اخلاق کہتے ہیں کہ لوگوں کے ساتھ اس کا ظاہری معاملہ کیسا ہے۔ جہاں تک اسلام کا تعلق ہے، اُس کے تصورِ اخلاق میں یقیناً یہ چیزیں بھی داخل ہیں کہ دوسروں کے ساتھ آپ کا رویّہ کیسا ہے۔ دوسروں کے ساتھ اچھا خوش گوار رویہ رکھنا بھی اچھے اخلاق کا حصہ ہے، مگر یہ کُل اخلاق نہیں بلکہ اچھے اخلاق کا معیار اس سے کہیں زیادہ جامع (comprehensive) ہے۔ اس میں صحیح عقیدہ، نیت، دل کا خلوص، دل کی پاکیزگی بھی داخل ہے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ کی دُعا جو مندرجہ بالا سطور میں درج کی گئی، اُس میں ظاہری اور باطنی تمام چیزوں کو سمیٹ لیا گیا ہے۔ دل کی صفائی، سوچ کی صفائی، دوسروں کے ساتھ اچھا رویہ، اللہ کے ساتھ اچھا رویّہ، دل کے اندر اخلاص اور خلوص ہو، بناوٹ نہ ہو، دورُخا پن نہ ہو، دوسروں کے ساتھ اچھا بننے کے لیے منافقت نہ کرنی پڑے بلکہ جیسا انسان ظاہر میں دوسروں کو بہتر نظر آرہا ہو، دل کے اندر بھی وہ ویسا ہی ہو۔ یہ دراصل اسلام میں اچھے اخلاق کا تصور ہے اور رسول اللہ ﷺ کے بارے میں تو قرآن کی گواہی ہے۔

{وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ} (القلم: ۴)

''بے شک آپ ﷺ تو اخلاق کے اعلیٰ ترین درجہ پر ہیں۔''

اگر کوئی شخص دنیا اور دنیا والوں کی اصلاح کو اپنی زندگی کا مقصد بنانا چاہتا ہے تو اُس کی

(۱) مسند احمد، مسند المکثرین، مسند عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ

بنیادی ضرورتوں میں سے ایک ضرورت اچھا اخلاق ہے۔ اب یہ سمجھنا ضروری ہے کہ اگر انسان بُرے اخلاق سے نجات چاہتا ہے اور اچھے اخلاق اپنانا چاہتا ہے تو اُس کے لیے اُسے کوئی ذریعہ بھی چاہیے۔

تزکیہ کے ذرائع:

اوپر ذکر آچکا ہے کہ تزکیہ کی دو شرائط ہیں، پہلی شرط یہ کہ اپنی اصلاح کا احساس ہو اور دوسری شرط اُس ذریعے کا حصول ہے جس سے تزکیہ ہو سکے۔ یاد رکھیں تزکیہ کا ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام، نبی اکرم ﷺ کے طور طریقے اور پاکیزہ لوگوں کے پاکیزہ کام اور باتیں ہیں، پاکیزہ صحبت بھی اس میں معاون ثابت ہوتی ہے، اس سے بھی انسان کا تزکیہ اور اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ ان ذرائع سے انسان کی بُرائیاں دُور ہو جاتی ہیں اور اچھائیاں پروان چڑھتی ہیں، پاکیزگی حاصل ہوتی ہے۔

دیکھا جائے تو کسی شے میں حُسن اُسی وقت آتا ہے جب اُس کے عیب دُور ہو جائیں اور خوبیاں نکھر جائیں۔ اگر کسی شے میں عیوب موجود ہوں، گندگی ہو اور دوسری طرف کوئی خوبی بھی موجود ہو تو ہم اُس شے کو خوبصورت نہیں کہتے۔ مثال کے طور پر کسی انسان سے بو آ رہی ہو، جسم پر مٹی کی تہہ جمی ہوئی ہو، بال بکھرے ہوں، ناخنوں میں میل ہو، دانت پیلے ہوں، لباس میلا ہو اور وہ بہت خوبصورت زیور پہن لے، بہت قیمتی خوشبو لگا لے، انتہائی فیشن ایبل جوتے پہن لے تو ہم اس کو خوبصورت انسان نہیں کہیں گے۔ اسی طرح اگر گھر گندہ ہو، بو آ رہی ہو، کیڑے مکوڑے پھر رہے ہوں، دیواروں پر جالے لگے ہوں، مہنگی مہنگی آرائشی چیزیں (decoration pieces) رکھی ہوں اور اُن پر بھی ڈھیر مٹی پڑی ہو۔ تو ایسے گھر کو ہم خوبصورت نہیں کہتے۔ یہ زینت تو ہے مگر خوبصورتی نہیں ہے۔ اس کے برعکس آپ کسی کے گھر جائیں جو بالکل سادہ ہو، قیمتی اشیاء سے تزئین و آرائش نہ کی گئی ہو لیکن وہاں اچھی طرح صفائی ہوئی ہو، چیزیں سلیقے سے رکھی ہوں، تو ہم کہیں گے کہ یہ گھر خوبصورت ہے۔ پس خوبصورتی کے لیے بُرائیوں اور گندگی کا دُور ہونا اور ساتھ ساتھ خوبیوں کا اختیار کرنا ضروری ہے۔ اس دوہرے عمل کا نام ''تزکیہ'' ہے۔ اس کے لیے اصطلاح مستعمل ہے: ''تخلّی عن الرذائل و تحلّی بالفضائل۔'' (بری خصلتوں سے خالی اور اچھی خصلتوں سے آراستہ ہو جانا) بُرائیاں دُور کی جائیں، اچھائیوں کو اختیار کیا جائے اور اُن کو پروان چڑھایا جائے، اُن کی حفاظت کی جائے تو انسان کے تزکیے کا عمل پورا ہوتا ہے اور اس کے لیے اللہ کی مدد و رحمت

بہر حال ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے:

{وَ لَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّ لٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ} (النور: ۲۱)

''اور اگر نہ ہوتا اللہ کا فضل تم پر اور اُس کی رحمتنہ پاکیزہ رہ سکتا تم میں سے کوئی بھی کبھی بھی اور لیکن اللہ پاکیزہ کرتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے۔''

معلوم یہ ہوا کہ اللہ کے فضل و رحمت اور اُس کے کلام (قرآن حکیم) کے بغیر کوئی بھی پاکیزگی اور تزکیہ حاصل نہیں کر سکتا۔

مقاصدِ بعثت رسول ﷺ:

اللہ کے رسول ﷺ کی بعثت کے جو مقاصد قرآن میں بیان ہوئے ہیں وہ یہ چار ہیں: تلاوت، تزکیہ، تعلیمِ کتاب اور تعلیمِ حکمت۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا:

{لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ ۚ وَ اِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ} (آل عمران: ۱۶۴)

''یقیناً احسان فرمایا اللہ نے مومنوں پر جب بھیجے اُن میں ایک رسول ﷺ اُنہی میں سے وہ تلاوت کرتے ہیں اُن پر اللہ کی آیات اور تزکیہ کرتے ہیں اُن کا اور سکھاتے ہیں اُنہیں احکامات اور حکمت اور بے شک وہ لوگ تھے اِس سے پہلے یقیناً کھلی گمراہی میں۔''

یعنی نبی اکرم ﷺ لوگوں کو اللہ کی آیات پڑھ کر سناتے تھے تاکہ اُن کا تزکیہ ہو اور کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے تھے، اس سے پہلے تو یہ لوگ سراسر گمراہی میں تھے۔ ان کو پتہ ہی نہ تھا کہ پاکیزگی کیسے حاصل کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں فرمایا ہے:

{وَ مَنْ يَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓئِكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ۝ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ۝} (طٰہٰ: ۷۵، ۷۶)

''اور جو آئے گا اُس کے پاس ایسا مومن ہو کر کہ جس نے واقعی عمل کیا تھا اچھا تو یہ وہ خوش نصیب

ہیں جن کے لیے بلند درجات ہیں یعنی ہمیشہ بسنے والے باغات بہہ رہی ہیں جن کے نیچے نہریں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ان میں یہ بدلہ ہے اُس کا جس نے پاکیزگی اختیار کی۔"

جنت میں جانے کے راستے :

جنت میں جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک بہت آسان، پُرتعیش اور لذتوں بھرا اور دوسرا مشقت والا جس میں قدم قدم پر آزمائشیں اور تکالیف ہیں۔ بعض لوگ پہلا راستہ اختیار کرنا چاہتے ہیں جو بڑا خطرناک ہے، کیونکہ وہ دوزخ سے ہوکر جاتا ہے۔ تو ایسا راستہ کیوں اختیار کریں جس میں اتنی مصیبت لاحق ہونے کا خطرہ ہو۔ دوسرا راستہ تھوڑا لمبا، طویل، مشکل اور کٹھن تو ہے مگر سیدھا جنت کی طرف جاتا ہے۔ اس راستے میں بھٹکنے کی گنجائش نہیں ہے۔ تو کیوں نہ تھوڑی سی محنت ومشقت کرلیں اور براہِ راست جنت میں جانے کی کوشش کریں۔ اللہ بڑا مہربان ہے اُس سے امید رکھنی چاہیے کہ وہ ہمیں ضرور جنت میں پہنچائے گا لیکن جنت نری تمناؤں اور خواہشوں سے تو ملنے والی شے ہے نہیں۔ صرف خواہشات (wishful thinking) سے کام نہیں چلے گا بلکہ اس کے لیے مومن ہونا شرط ہے۔ ایمان لاؤ، پھر عمل صالح کرو؛ صحیح عمل اور سلامت عمل۔ اُردو میں ہم صحیح سلامت مکمل چیز کو کہتے ہیں۔ تو عملِ صالح کی ایک علامت یہ ہے کہ انسان جو نیکی کرے اُسے مکمل کرے، ادھورے کام نہ کرے۔ اچھے اخلاق اختیار کرے۔ گھر والوں، باہر والوں، چھوٹے بڑوں اور سب کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آئے، اندر کچھ باہر کچھ یہ دوُرخا پن نہ ہو۔ دوسری چیز جو صالح عمل میں آتی ہے وہ یہ کہ اُس عمل کی حفاظت بھی کی جائے۔

نیکیوں کی حفاظت :

نیک عمل کرنا نسبتاً آسان ہے لیکن اُس کو سنبھال کر رکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ نیکیوں کی اس طرح حفاظت کرنی ہے کہ وہ ضائع نہ ہوں، اُن پر گناہ کی گرد نہ پڑے۔ نفاق یا تکبر کا کیڑا نہ لگے جو ہماری ساری نیکیاں چٹ کر جائے۔ کہیں دکھاوے کا شکار نہ ہو جائیں۔ لہٰذا انسان ایسے بڑے بڑے گناہوں سے بچے اور کوشش کرے کہ دوسروں کی بُرائی نہ کرے۔ خدانخواستہ ہماری نیکیاں کسی اور کے کھاتے میں چلی جائیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔ نیکیاں ہم نے کیں، شب بیداریاں ہم نے کیں، نوافل ہم نے پڑھے، صدقات ہم نے دیئے مگر قیامت کے دن یہ نیکیاں اپنے اعمال نامے میں ڈھونڈ رہے ہیں لیکن نہیں مل رہیں۔ پتہ چلا کسی نوکر کی دل آزاری کی تھی، ہمسائے کی ٹوہ لگائی تھی،

رشتہ داروں کی غیبت کی تھی، چنانچہ تمام نیکیاں اُن کے پاس چلی گئیں۔ چُغلی، طنز، حسد یا غیبت ایسے اعمال ہیں جو ہماری محنت دوسروں کے نام کروا دیتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی نفسیات یہ ہے کہ کسی نیک عمل کا اُس کو پتہ چلتا ہے تو بہت جوش وخروش سے وہ کام کرنا شروع کرتا ہے، دل جمعی کے ساتھ اس نیک کام کو کرتا رہتا ہے، مگر آہستہ آہستہ اُس نیک کام سے اُس کا دل بھر جاتا ہے اور پھر ایک اور نیکی کا پتہ چلتا ہے تو اب وہ پہلی نیکی کو چھوڑ کر دوسری کرنا شروع کر دیتا ہے۔ پھر کچھ دن اُس کا جوش و جنون چڑھا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک اور نیکی کا علم ہوتا ہے تو اب وہ دوسری کو چھوڑ کر تیسری نیکی شروع کر دیتا ہے۔ تو یہ طرزِ عمل نیکیوں کو پروان چڑھانے والا تو نہ ہوا۔ اس کی مثال یوں سمجھیں کہ ایک باغ ہے اُس میں آپ نے ایک پودا لگایا اُس کی خوب حفاظت کی۔ جب وہ ہرا بھرا ہو گیا تو آپ نے ایک اور پودا لگایا، اب دوسرے پودے پر اتنی توجہ ہو گئی کہ پہلے کی طرف سے بالکل لاپروا ہو گئے اور اُس کو نظر انداز کر دیا۔ اب آپ اگر اس میں پانی اور کھاد نہیں دیتے ہیں، نہ دیکھ بھال کرتے ہیں، تو وہ مرجھا جائے گا اگر آپ کی یہی روش رہی تو کبھی بھی مکمل باغ نہیں بن سکے گا۔ اسی طرح اگر پچھلی نیکیوں کو نظر انداز کیے جائیں اور نئی نیکیاں کرتے چلے جائیں تو نیکیوں کا باغ نہیں لگ سکتا، آپ کی زندگی میں نیکیوں کی بہار نہیں آ سکتی۔ تو ہمیں پچھلی نیکیوں کی بھی حفاظت کرنی ہے اور مزید نیکیوں کا بھی اہتمام کرنا ہے۔

جنت کے اعلیٰ درجات کا حصول:

جو انسان اپنا تزکیہ کرنا اور جنت کے اعلیٰ درجے حاصل کرنا چاہے تو اُس کے لیے اہلیت، درست طریقہ اور شوق ہونا چاہیے۔ اگر شوق کے ساتھ اہلیت بھی ہو تو اس سے اچھا امتزاج (combination) کوئی ہو ہی نہیں سکتا۔ جیسا کہ آج کل کہا جاتا ہے کہ بہترین کام (best job) وہ ہے جو آپ کا مشغلہ (Hobby) بھی ہو تو اللہ کرے ہمیں اس بہترین کام (best job) کا شوق پیدا ہو جائے، سُستی اور غفلت کو چھوڑ دیں، مصلحتوں کو نظر انداز کر دیں۔ بہت مصلحت پرست (diplomatic) بن کر رہنا، سب کو راضی کرنے کی کوشش کرنا، یہ چیز بھی تزکیۂ نفس کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ بہرحال فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن لوگوں کے لیے جنت تیار کی ہے جو خود کو پاک رکھیں اور اپنا تزکیہ کریں۔

اپنا تزکیہ کرنا دراصل خود کو جنت کا شہری بنانے کی کوشش ہے۔ یہ جنت کا شہری بننے کی مشق

ہے جو ہمیں کرائی جاتی ہے۔ سورۃ الشّمس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا o وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا o }(الشمس : ۹، ۱۰)

''یقیناً وہ کامیاب ہوگیا جس نے پاک کرلیا اُس (نفس) کو۔ اور یقیناً وہ ناکام ہوگیا جس نے خاک میں دبادیا اُسے۔''

تزکیہ اور اخلاق:

جس کا تزکیہ ہوگیا، وہ پاک ہوگیا، اُس کے اخلاق سنور گئے، وہ حسین ہوگیا۔ اللہ کو پاک صاف رہنے والے بہت پسند ہیں۔

{وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ}(التوبة:۱۰۸)

''اللہ پاک رہنے والوں سے محبت فرماتا ہے۔''

احادیث مبارکہ میں اعلیٰ اخلاق حاصل کرنے کی بھی بڑی ترغیب آئی ہے یعنی تزکیہ دراصل اعلیٰ اخلاق ہے اور اعلیٰ اخلاق دراصل تزکیہ ہی ہے۔

(اِنَّ مِنْ خِيَارِكُمْ أَحْسَنَكُمْ أَخْلَاقًا) (۱)

''تم میں سے بہترین وہ ہیں جن کے اخلاق سب سے اچھے ہیں۔''

(مَنْ شَيْئٌ أَثْقَلَ فِي مِيْزَانِ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ خُلُقٍ حَسَنٍ) (۲)

''قیامت کے دن مومن کی میزانِ عمل میں اچھے اخلاق سے زیادہ وزنی چیز کوئی نہ ہوگی۔''

(بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ حُسْنَ الْأَخْلَاقِ) (۳)

''میں اس واسطے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاقی خوبیوں کو کمال تک پہنچادوں۔''

قرآن وسنت کے علم کی ضرورت:

خود کو اعلیٰ اخلاق سے آراستہ کرنے کے لیے انسان کو قرآن اور سنت کے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ یہ علم انسان کے روحانی وجود کی پاکی کے لیے ایسے ہی ضروری ہے جیسے مادّی جسم کے لیے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المناقب، باب صفة النبی صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) جامع الترمذی، کتاب البر والصلة، باب ما جاء فی حسن الخلق

(۳) موطأ امام مالک، کتاب الجامع، وحدثنی عن مالک انه قد بلغه۔۔۔

پانی۔ جب ہم پانی پیتے ہیں تو وہ جسم میں گردش کرتا ہے، جس سے جسم نرم رہتا ہے اور زہریلے مادے جسم سے دُھل کر نکل جاتے ہیں، زندگی قائم رہتی ہے، صفائی کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح قرآن و سنت کا علم باطنی تزکیے اور صفائی کا سبب بنتا رہتا ہے۔ اللہ کی آیات پڑھتے ہی تمام بُرائیوں سے نجات نہیں مل جاتی بلکہ بُرائیاں دُور کرنے کی طلب پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پڑھتے ہی انسان میں ساری اچھائیاں پیدا نہیں ہوجاتیں بلکہ اچھائیاں حاصل کرنے کی طلب جنم لیتی ہے۔ یہ طلب (Urge) کہ مجھے اچھا بننا ہے، یعنی اچھائیاں اچھی لگنے لگیں، بُرائیاں بُری لگنے لگیں اور یہ تڑپ پیدا ہوجائے کہ مجھے خود کو درست کرنا ہے۔ یہی تزکیہ کا نقطۂ آغاز ہے۔ یہ طلب ہمارے اندر کلامِ الٰہی پیدا کرتا ہے کہ ہم اپنے آپ کو پاک کریں، اپنی اصلاح کریں، ٹیڑھ سیدھی کرلیں اور قبلہ درست کرلیں۔ جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ منہ تو کھا کر فارغ ہوجاتا ہے لیکن نظامِ ہاضمہ (Digestive system) گھنٹوں غذا پر کام کرتا ہے۔ ہمارا نظامِ ہاضمہ کتنی دیر تک غذا کو مختلف قسم کے مادّوں اور رطوبتوں (Juices) وغیرہ کی مدد سے ہضم کرتا رہتا ہے تاکہ اسے ہمارے جسم کا حصہ بنائے۔ اسی طرح گو کہ قرآن کو محدود مدّت میں پڑھا جاتا ہے مگر اُس کو جذب کرتے رہنا، اور اللہ کی آیات کو تزکیہ کا ذریعہ بنانا مسلسل کرتے رہنے کا کام ہے۔ قرآن حکیم کو ہم اپنے حافظے (memory) میں محفوظ تو کرلیتے ہیں لیکن اس کو عملی زندگی کا حصہ بنانے کے لیے سالوں درکار ہیں، بلکہ یوں سمجھیں کہ پوری زندگی چاہیے۔ ہم سب اس راستے کے نئے نئے مسافر ہیں۔

تزکیہ کی راہ میں احتیاط:

اگر ہم تزکیہ کا عمل شروع کرنا چاہتے ہیں تو اس بارے میں محتاط روش اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ انسان کے اخلاقی عیوب یا بُرائیاں اُس کی روح پر زخم کی مانند ہوتی ہیں۔ جیسے انسان کے جسم پر چوٹ لگ جائے تو اسے صفائی کی ضرورت ہوتی ہے، اسی طرح روح کے زخموں کو بھی صفائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک اور بات یہ کہ ہر شے کی صفائی کا طریقہ مختلف ہوتا ہے۔ کوئی برتن گندہ ہوجائے تو اُس کو سختی کے ساتھ مانجھا جاتا ہے۔ اب اگر اتنی ہی سختی کے ساتھ زخم کو صاف کیا جائے، اُسے رگڑا جائے تو کتنی اذیت اور تکلیف ہوگی اور زخم ٹھیک ہونے کے بجائے مزید خراب ہوجائے گا۔ اس لیے ہمیں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے کہ ''اے اللہ جہاں سختی کی ضرورت ہو وہاں ہمیں سختی کرنے کی ہمت دے اور جہاں نرمی کی ضرورت ہو وہاں نرمی برتنا سکھا دے۔'' شیخ حمزہ یوسف کہتے

ہیں کہ جو اس راستے کا نیا نیا مسافر بنے اُسے ہوشیار رہنا چاہیے، خبردار رہنا چاہیے، محتاط رہنا چاہیے کہ وہ اپنے اوپر بہت زیادہ سختی نہ کرے اور دوسری طرف اُسے یہ بھی احتیاط کرنی چاہیے کہ وہ فرائض میں کوتاہی کرنا شروع نہ کردے۔

انسان جب تزکیہ کا عمل شروع کرتا ہے تو ہوسکتا ہے اُسے یہ خیال آئے کہ ابھی تو ہمارے اندر، ہماری نیت میں، خیالات میں اتنا بگاڑ موجود ہے تو پہلے ہم خود کو اندر سے ٹھیک کرتے ہیں، اُس کے بعد ہم شریعت کی ظاہری شکل پر عمل شروع کریں گے۔ یہ احکامات تو بعد کی باتیں ہیں ہمارے تو اپنے اندر بڑی گندگی ہے، پہلے اُس کو صاف کرلیں۔ یہ شیطان کی طرف سے صرف ایک بہلاوا ہے۔ دراصل تزکیہ کسی وقت کے ساتھ نہیں ہے، یہ پہلے یا بعد کا عمل نہیں ہے کہ پہلے ہم یہ کرلیں اور پھر بعد میں شریعت پر عمل کریں گے۔ دراصل جہاں شریعت کا حکم آئے گا اُس پر عمل ہوتا رہے گا اس کے ساتھ ساتھ کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوں گی، اس لیے تزکیہ نفس بھی ساتھ ہی جاری رہے گا۔ اُن غلطیوں کی اصلاح کرتے جائیں گے اور شریعت پر عمل کرتے جائیں گے یعنی یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ ہیں۔

تزکیہ میں اعتدال اور حقیقت بینی کی اہمیت:

جب تزکیہ کے نام پر احکامِ شریعت کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو بگاڑ شروع ہوجاتا ہے یعنی کوئی اس طرح سوچے کہ ابھی تو ہم غیبت کرتے ہیں، جھوٹ بولتے ہیں اور بھی نہ جانے کتنے گناہ کرتے ہیں، پہلے ہم ان سے نجات پالیں پھر ہم ظاہری احکامات پر عمل شروع کریں گے، نماز پڑھیں گے، گھر سے باہر بھی باپردہ ہوکر نکلیں گے، گھر کے اندر کا پردہ بھی کریں گے۔ یاد رکھیں یہ تزکیہ کے راستے میں ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ اس دھوکے سے بچنا ہے، اپنے ساتھ نہ بے جا سختی کرنی ہے اور نہ بے جا نرمی۔ جہاں تزکیہ کا عمل شروع ہوگا وہاں کئی اخلاقی عیوب کا سامنا ہوگا، ایسا محسوس ہوگا کہ ہر برائی ہمارے اندر موجود ہے۔ جیسے وہ طالب علم جو طب (medicine) پڑھتے ہیں اور بیماریوں کی علامات (symptoms) انہیں پتہ چلتی ہیں تو بعض کا کہنا یہ ہے کہ ہر علامت پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیماری میرے اندر موجود ہے۔ تزکیہ کا معاملہ بھی یہی ہے لیکن جہاں یہ چیز مفید ہے وہاں یہ بعض دفعہ انسان کو مایوسی کی طرف لے جاتی ہے، جھنجھلاہٹ میں مبتلا کردیتی ہے۔

اس لیے ضروری ہے کہ مایوس نہ ہوں بلکہ تزکیۂ نفس کی طلب پیدا کرنے کی کوشش کریں اور پھر اس کے بعد خود کو تھوڑا وقت دیں۔ آج ہی سے یہ سلسلہ شروع کر دیں۔ ان خرابیوں کو دور ہوتے ہوتے اور اندر سے نکلتے نکلتے وقت لگے گا اور شعوری طور پر جان لیں کہ مکمل طور پر برائیوں سے نجات نہیں مل سکتی۔ ہم سے فرشتہ بننے کا مطالبہ نہیں کیا گیا بلکہ ہم سے کہا گیا ہے کہ تم اپنا تزکیہ کرتے رہو۔ برائیوں پر ضرور نظر رکھو، انہیں پہچانو اور دُور کرنے کی کوشش کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{فَلَا تُزَكُّوٓا اَنْفُسَكُمْ} (النجم: ۳۲)

''سو مت پاکیزہ بتاؤ اپنے آپ کو۔''

یعنی اپنی پاکیزگی کے دعوے مت کرو۔ انسان تو فطرتاً کمزور واقع ہوا ہے اور ایک حد تک ہی پاکیزگی حاصل کر سکتا ہے لیکن اس میں احساس اور شعور ہونا چاہیے، شعوری طور پر اپنے آپ کو درست اور ٹھیک کرتا رہے۔ جب انسان اپنے لیے اس طرح کا مبنی بر حقیقت ہدف بناتا ہے تو اُس کے اندر نہ جھنجلاہٹ (irritation) پیدا ہوتی ہے اور نہ مایوسی اسے گھیرتی ہے۔

تزکیہ اور قرآن:

تزکیہ کا عمل شروع کرنے کے لیے روحانی توانائی درکار ہوتی ہے۔ اللہ کی آیات پڑھ کر ایمان میں گرمی اور حلاوت آتی ہے، اسی کی مدد سے تزکیہ ہو سکتا ہے۔ جس طرح تو اگر م کر کے روٹی ڈالیں تو صحیح پکتی ہے، نرم ہوتی ہے، مزیدار ہوتی ہے، صحیح آنچ لگتی ہے، خوب پھولتی ہے لیکن اگر ٹھنڈے توے پر روٹی ڈالیں گے تو کچی ہی رہے گی اور سخت ہو کر پاپڑ بن جائے گی۔ اسی طرح جب اللہ کی آیات سے دل نرم ہو جاتے ہیں تب تزکیہ کا عمل شروع کیا جائے تو فائدہ مند رہے گا۔

معرفتِ انسان کی اہمیت:

چونکہ تزکیہ کسی نفس کا ہوتا ہے اسی لیے اُس نفسِ انسانی کا ادراک بہت ضروری ہے کہ ہم جانیں کہ انسان کی حقیقت کیا ہے؟ جیسے کسی مشین کو کام میں لانا ہو تو اُس مشین کے بارے میں بنیادی معلومات ہونی چاہیے مثلاً اس کے کون کون سے حصے ہیں، کل پُرزے کتنے ہیں، ان کا آپس میں ربط کیا ہے، کس طرح چلتے ہیں، اسی طرح انسان کے بارے میں بھی یہ علم ہونا ضروری ہے کہ اس کی اصل حقیقت کیا ہے، اس کے مشتملات کیا کیا ہیں، کس حصہ کی کیا اہمیت ہے۔ اور اگر ہم اس

مشین کو صحیح جگہ استعمال کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں پتہ ہونا چاہیے کہ اس کی قوت کیا ہے؟ اور یہ کیا کچھ کر سکتی ہے؟ اگر ہمیں کسی چیز کی قدر و قیمت کا احساس نہیں ہوگا تو اس کا کیا خیال رکھیں گے؟ یوں سمجھیں کہ کسی کے پاس ایک قیمتی ہیرا ہے لیکن وہ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف ہے، اس کی قیمت کا اندازہ ہی نہیں کہ میرے پاس جو ہیرا ہے یہ کوہِ نور ہے۔ جب وہ اس کی قدر و قیمت سے ناواقف ہوگا، اس کی اہمیت سے انجان ہوگا، اس کی حقیقت نہ جانتا ہوگا تو وہ یہی سمجھے گا کہ یہ محض ایک کانچ کا ٹکڑا ہے۔ وہ اس کو بیکار و بے وقعت سمجھے گا اور ہوسکتا ہے وہ اُسے کسی کچرے خانے میں پھینک دے یا کسی پالتو جانور کے گلے میں لٹکا دے یا کھلونا سمجھ کے بچوں کو دیدے لیکن جو شخص اس ہیرے کی قدر و قیمت سے واقف ہوگا، اس کی اہمیت و حقیقت سے آشنا ہوگا تو وہ اُسے کسی بادشاہ کے حضور پیش کرے گا، کسی قدردان کے پاس لے کر جائے گا۔ بالکل اسی طرح اپنی ذات کو دُرست جگہ پر استعمال کرنے کے لیے، صحیح ہستی کی غلامی اختیار کرنے کے لیے، صحیح ہستی کی خدمت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے آپ کو پہچانیں۔ ہم سب میں سے ہر ایک کو پتہ ہو کہ میں کون ہوں؟ کس قابل ہوں؟ کیا میں حقیر سا کانچ کا ٹکڑا ہوں جس کو کسی جانور کے گلے میں باندھ دیا جائے؟ یا کھلونے کے طور پر برتا جائے؟ کیا میں جانوروں کی غلامی کے قابل ہوں؟ یا میں اعلیٰ و ارفع ہوں، بہت قیمتی ہوں، انمول ہوں، شاہکار (master piece) ہوں، نایاب (unique) ہوں۔ اتنا اعلیٰ ہوں کہ کسی بادشاہ کا غلام بننے کے قابل ہوں۔ تو جو قدر و قیمت ہماری اپنی نگاہ میں ہوگی اسی کے مطابق ہم فیصلہ کریں گے کہ ہمیں اپنی جبلّت کے تابع رہنا ہے یا اپنے روحانی وجود کے؟ کیا اس ہستی کی غلامی کروں جو میرا رب ہے، جو کائنات کا بادشاہ ہے، یا دنیا کے مال و متاع کی، یا اپنے نفس کی؟ یہ فیصلہ تو اسی وقت ہو سکے گا جب مجھے اپنے بارے میں علم ہوگا کہ میں کون ہوں، میں کس قابل ہوں؟ خود شناسی (self recognition) دراصل خدا شناسی (God recognition) میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ہم اپنے آپ کو پہچانیں گے تو اپنے رب کی معرفت بھی حاصل کر سکیں گے۔ اگر ہم اپنے آپ کو نہیں پہچانیں گے تو اپنے رب کو بھی نہیں پہچان پائیں گے۔

انسان کے وجود کے کئی پہلو ہیں، کئی جہتیں (Dimensions) ہیں۔ ایک ہے انسان کی فطرت جو کہ اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے۔ سورۃ الروم آیت ۳۰ میں ارشادِ الٰہی ہے:

{ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا }(الروم:۳۰)

''اللہ تعالیٰ کی وہ فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔''

کچھ اقدار ایسی ہوتی ہیں جو انسان کسی کے سکھانے سے نہیں سیکھتا بلکہ سیکھا سکھایا دنیا میں آتا ہے۔ کچھ اچھائیوں کی پہچان اس کے اندر موجود ہوتی ہے۔ مثلاً توحید، حیا، اللہ کی فرمانبرداری کرنا فطرت میں داخل ہیں۔ انسان کی فطرت میں گُندھی ہوئی ہے۔ علم کی طلب اور دوسروں کو سکھانے کا جذبہ بھی انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ پھر اپنا محاسبہ (accountability) کرنے کا احساس بھی موجود ہے۔ بُرا کام کر کے گناہ کا احساس بھی پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح انسان فطرتاً یہ احساس لے کر دنیا میں آتا ہے کہ یہ دنیا میرا گھر نہیں ہے، یہ میرا دائمی ٹھکانہ نہیں ہے، یہ شعور انسان میں موجود ہے۔ اس حوالہ سے سورۂ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۳۸ کا مطالعہ مفید رہے گا۔ ان آیات میں تخلیقِ آدم کا قصہ بیان ہوا ہے، ان آیات پر تھوڑا سا غور و فکر کر لیا جائے تو بہت سی باتیں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ان خوبیوں کے ساتھ کچھ بُرائیوں کی پہچان بھی انسان میں فطرتاً موجود ہے۔ کوئی شخص کسی جنگل میں رہتا ہو، کبھی کسی نبی کی دعوت نہ سنی ہو، نہ دنیاوی تعلیم حاصل کی ہو۔ لیکن فطرتاً اسے معلوم ہوگا کہ جھوٹ بولنا بُری بات ہے، دھوکہ دینا بُری بات ہے، چوری کرنا بُری بات ہے۔

{ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَ تَقْوٰىهَا }(الشمس:۸)

''پھر اللہ نے الہام کر دی اس پر اس کی بدی اور پرہیزگاری''

چونکہ فطرت کے لحاظ سے ہر انسان مومن ہے لہٰذا مومن بننا کوئی مصنوعی چیز نہیں، بلکہ پیدائشی طور پر ہر انسان مومن ہوتا ہے، دینِ فطرت لے کر اس دنیا میں آتا ہے، چاہے ہندو کے گھر پیدا ہوا ہو، عیسائی کے گھر، یہودی، آتش پرست یا بت پرست کے گھر پیدا ہوا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ مَوْلُودٍ يُولَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ فَأَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ أَوْ يُنَصِّرَانِهِ أَوْ يُمَجِّسَانِهِ))(۱)

''ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے، وہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ یہ تو اُس کے والدین ہیں جو یا تو اُس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی۔''

یعنی فطرت کے اندر بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔ فطری طور پر انسان کے اندر یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ فرشتوں سے بڑھ کر مقام حاصل کر لے لیکن یہ اُس وقت ہوگا جب کہ وہ اپنی فطرت پر قائم رہے۔ پھر ہی مسجودِ ملائک اور اشرف المخلوقات کہلانے کے لائق ہوگا۔ سورۃ التین میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب ماقیل فی اولاد المشرکین

{لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ} (التین:۵)

''یقیناہم نے انسان کو بہترین ساخت پر بنایا ہے۔''

انسان کی فطرت:

فطرت کا تعلق روح سے ہے اور روح کا حُسن فطرت پر قائم رہنے میں ہے۔ روح صرف انسان میں ہوتی ہے، فطرت بھی صرف انسان کی ہوتی ہے، جانوروں کی کوئی فطرت نہیں ہوتی۔ جو انسان فطرت کی سطح پر زندگی گزارتا ہے اُس کو دنیا میں چین نہیں آتا۔ وہ لوٹ کر اپنے رب کے پاس جانا چاہتا ہے جہاں سے وہ آیا تھا۔ دراصل روح دنیا کی شے ہے ہی نہیں اسی لیے یہاں اجنبیت محسوس کرتی ہے۔ روح لطیف شے ہے، یہ لوٹ کر اللہ کے پاس جانا چاہتی ہے، اللہ سے ملاقات کا شوق رکھتی ہے۔ دنیا میں اس کا دل نہیں لگتا۔ تو جو فطرت پر زندگی گزارتے ہیں آخرت میں اُن کا نفس مطمئن رہتا ہے۔ سورۃ الفجر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ o ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً o} (الفجر:۲۸،۲۷)

(نیک روح سے خطاب ہوگا) ''اے نفس مطمئنہ! اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اس حال میں کہ تم اس سے راضی، وہ تم سے راضی۔''

انسان کی جبلّت:

دوسری سطح ''جبلّت'' (instinct) ہے۔ انسان کی فطرت کی طرح اُس کی جبلّت بھی اللہ ہی نے بنائی ہے۔ کچھ افعال (actions) ایسے ہیں کہ جو انسان سیکھا سکھایا دنیا میں آتا ہے۔ کسی کے سکھانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مثلاً بچہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کو پتہ ہوتا ہے کہ اس کو غذا کیسے حاصل کرنی ہے چنانچہ ماں کے جسم سے وہ اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔ پھر خوف کا احساس ہے، بچے بھی خوف محسوس کرتے ہیں، ڈرتے ہیں، چونک جاتے ہیں یہ جبلّت کا تقاضا ہے۔ اپنی حفاظت کرنا، اپنی نسل آگے بڑھانا یعنی بقائے نسل اور بقائے ذات کے لیے جدوجہد کرنا بھی جبلّت میں داخل ہے۔ جہاں تک جبلّت کا تعلق ہے یہ انسانوں اور حیوانوں میں مشترک ہے۔

جبلّت کا تعلق انسان کے حیوانی پہلو سے ہے۔ اس لیے اس کو حیوانی جبلّت (animal instinct) بھی کہتے ہیں۔ اب یہ جو انسانی وجود کی دو جہتیں (dimensions) ہیں، ''فطرت اور جبلّت''، ''روحانی وجود اور حیوانی وجود'' ان کے ملنے کی جگہ، دونوں کے ملاپ کی جگہ دل ہے۔

یوں سمجھیں کہ دونوں کی گرہ دل میں لگی ہوئی ہے، جب یہ گرہ کھل جاتی ہے تو دل دھڑکنا بند ہوجاتا ہے۔ روح جہاں سے آئی تھی وہاں لوٹ جاتی ہے۔ جسم مٹی سے بنا تھا اُسی مٹی میں مل جاتا ہے۔ جبلّت کی تمام ضروریات زمین سے پوری ہوتی ہیں۔ جب ضروریات پوری ہوجاتی ہیں تو خواہشات سر اُٹھانے لگتی ہیں اور شیطان انہی خواہشات پر کام کرتا ہے۔ دل میں دنیا کی محبت پیدا ہوتی ہے، خواہشات بڑھنے لگتی ہیں اور پھر یہ گناہوں کی طرف لے جاتی ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور ان کی جو فطری ضروریات تھیں وہ بھی پوری کیں۔ اُن کو علم دیا اور جو جبلّی ضروریات تھیں، اُن کا بھی اللہ تعالیٰ نے بھرپور انتظام کیا۔ رہنے کو گھر دیا، کھانے پینے کو بافراغت چیزیں مہیا فرمائیں، جسم ڈھانپنے کے لئے لباس دیا، ساتھی کے طور پر بیوی دی، یہی کچھ جبلّت کی ضروریات ہیں۔ پھر شیطان نے وسوسہ اندازی کی اور خواہشات کو اُبھارا۔ جب ضروریات پوری ہوگئیں تو خواہشات نے سر اُٹھایا اور اس حد تک وہ ابھریں کہ حضرت آدم علیہ السلام سے خطا ہوگئی۔

جبلّت کا تعلق جسم سے ہے اور جسم مٹی سے بنا ہے۔ جو لوگ جبلّت کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں وہ دنیا سے جانا نہیں چاہتے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں یہ بات فرمائی ہے کہ ان میں سے تو ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس کی زندگی اُس کو مل جائے۔ جبلّت انسان کو زمین سے بہت قریب کردیتی ہے۔ جو لوگ اپنی فطرت کو بالکل بھول جاتے ہیں، اسے نظر انداز کرتے ہیں اور صرف جبلّت پر زندگی گزارتے ہیں تو وہ اُس کے غلام بن جاتے ہیں، زمین سے لپٹ جاتے ہیں۔ ﴿ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ ﴾ (الاعراف: ۱۷۶) کی سی کیفیت ہوجاتی ہے اور ایک طرح سے وہ جانوروں ہی کے مشابہ ہوجاتے ہیں۔ اصل میں ان کا صرف حیوانی وجود زندہ رہ جاتا ہے، اُن کی روح ختم ہوجاتی ہے۔ اس حقیقت سے غافل ہوجاتے ہیں کہ ان کے اندر ایک روح بھی موجود ہے جو روحِ ربّانی ہے، اور ان کی اپنی فطرت بھی ہے۔ اس طرح ان کی فطرت مسخ ہوجاتی ہے۔

انسانی عادات:

اب ایک طرف تو فطرت ہے، جو کہ انسانیت کا اعلیٰ ترین درجہ ہے اور دوسری طرف ہے جبلّت جو کہ کمتر درجے پر ہے۔ اگر ہم صحیح ترتیب (order) بنائیں تو یوں سمجھیں کہ فطرت حاکم (controlling authority) ہے۔ اُس کو حاکم ہونا چاہیے۔ اور جبلّت معاونین (staff) کی طرح ہے، نوکر چاکر کی طرح ہے۔ ان دونوں کے بیچ ایک اور چیز عادت ہے۔ عادت کو یوں

سمجھیں کہ رعایا کی طرح ہے۔ فطرت وجبلت میں سے انسان پر جس کی حکمرانی ہوتی ہے، رعایا اُس جیسی ہوجاتی ہے۔ اگر حاکم اچھا ہوتا ہے تو رعایا بھی اچھی ہوجاتی ہے۔ اگر حاکم نیچ اور گھٹیا ہوتا ہے تو رعایا بھی گھٹیا حرکتیں کرنے لگتی ہے۔ یہ تین درجے یا منزلیں ہیں۔ ایک طرف فطرت ہے، دوسری طرف جبلّت ہے۔ فطرت کا تعلق روح سے ہے اور جبلت کا تعلق جسم سے ہے۔ جو لوگ جبلّت کو حاکم بنا دیتے ہیں، پھر وہ خیر حاصل نہیں کر سکتے۔ ان دونوں کے بیچ میں عادت ہے۔ ہم نے بات کی کہ فطرت اور جبلّت اللہ نے بنائی ہیں جب کہ عادتیں انسان خود بناتا ہے اور وقت کے ساتھ یہی عادتیں مل کر ہماری طبیعت بن جاتی ہیں۔ ہم کہتے ہیں اُس کی طبیعت ایسی ہے۔ یہ عادتیں ہی مل کر طبیعتیں بنتی ہیں۔ شیطان عادتوں پر کام کرتا ہے اور انسانی عادتوں کو پستی کی طرف گھسیٹتا ہے، جبلّت کی طرف لے جاتا ہے۔ کہتا ہے صرف اپنے حیوانی تقاضوں کو یاد رکھو اور حیوانی تقاضوں کے تحت ہماری عادتیں بنانا چاہتا ہے۔ جب عادتیں جبلّت کے تابع ہوجائیں تو پھر انسان پستی میں گر جاتا ہے، عادتیں پست ہوجاتی ہیں۔

{ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ} (التین:۵)

”پھر ہم نے لوٹا دیا اُسے پست سے پست تر حالت میں“

اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی لوگوں کا ذکر فرمایا:

{لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ}

(الاعراف:۱۷۹)

”ان کے دل ہیں لیکن وہ ان سے سمجھتے نہیں ہیں، ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھتے نہیں ہیں، ان کے کان ہیں لیکن وہ ان سے سنتے نہیں ہیں۔ یہ لوگ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گذرے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو کہ غفلت میں ہیں۔“

شیطان عادتوں پر کام کر کے اُن کو اپنے قابو میں کرنا چاہتا ہے اور شریعت بھی عادتوں پر کام کرتی ہے، عادتوں کو بلند کرتی ہے، اُن کو فطرت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتی ہے، فطرت کے ماتحت کرنا چاہتی ہے، فطرت کے حساب سے عادتوں کو ڈھالنا اور بنانا چاہتی ہے۔ اسی لیے اسلام کو دینِ فطرت کہا جاتا ہے۔ عادتوں کو جبلّت کے تابع کرنا شیطان کا کام ہے جو

انسان کو کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ عادتوں کو فطرت کے مطابق بنانا انسان کو اللہ کی طرف لاتا ہے۔ انسان کو اشرف المخلوقات، فرشتوں سے بھی اعلیٰ اور احسن تقویم کے درجے پر لے جاتا ہے۔ تو اصل چیز جو انسان کے اخلاق کو متعین کرتی ہے اور انسان کے اخلاق کا فیصلہ کرتی ہے وہ اس کی عادتیں ہیں۔ عادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا اخلاق اچھا ہے یا بُرا۔ اگر فطرت عادتوں پر حاکم ہے، عادتیں فطرت کے تحت ہیں تو اخلاق اچھا ہوگا اور اگر عادتیں جبلّت کے تحت ہیں تو اخلاق بُرا ہوگا۔

فطرت اور جبلت با مقصد ہیں:

ایک بات یاد رکھیں کہ فطرت اور جبلّت کے اندر جو خصوصیات ہیں ان میں سے کوئی چیز بے کار نہیں ہے اور نہ اپنی ذات میں بُری ہے۔ جو چیز جس مقصد کے لیے بنی ہے وہ اس کے لیے ہی کام کر رہی ہے۔ جب وہ چیزیں اپنی جگہ سے ہٹ جائیں تو پھر وہ بیماری اور نقصان کا سبب بنتی ہیں اور بیماری کے علاج کے لیے علم کی ضرورت پڑتی ہے۔ بیماری ایک بُرائی ہے، عیب ہے، بدصورتی ہے جب کہ علم خوب صورتی، اچھائی اور خوبی ہے۔

تناسب کی ضرورت:

ہم کسی شخص کو اُس وقت خوبصورت کہتے ہیں، جب اُس کی آنکھیں، ناک، ہونٹ وغیرہ آپس میں متناسب ہوں۔ تب ہی ہم کہتے ہیں یہ شکل خوبصورت ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو اندرونی خوبصورتی حاصل کرنی ہے، حسنِ اخلاق حاصل کرنا ہے تو انسان کے اندر باطنی طور پر چار قوتوں کا متناسب اور معتدل ہونا ضروری ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق کے مطابق انسان کے اندر درج ذیل چار قوتیں ہیں:

1- قوت علم (Power of Knowledge)

2- قوت غضب (Power of Passion)

3- قوت شہوت (Power of Appetites)

4- قوت عدل (Power of Justice)

جب ان قوتوں میں توازن ہوتا ہے تو انسان کا اخلاق اعلیٰ ہوتا ہے لیکن اگر یہ قوتیں غیر معتدل ہو جائیں، کسی ایک انتہا پر چلی جائیں تو یہ اخلاقی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے:

جس طرح جسمانی بیماری کا آغاز پہلے جسم کے اندرونی حصے سے ہوتا ہے پھر اُس کی علامات خارجی طور پر ظاہر ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح اخلاقی بیماریوں کا آغاز دل سے ہوتا ہے اور پھر اس کی علامات بُری عادتوں کی شکل میں ظاہر ہوتی ہیں، دل کو جسم اور روح دونوں لحاظ سے اہمیت حاصل ہے۔ مختلف زبانوں میں کسی کے رویّے کو ظاہر کرنے کے لیے دل کا ذکر ضرور کیا جاتا ہے۔ ہم کہتے ہیں سنگدل، رحمدل، دل کانپ گیا، دل چاہ رہا تھا۔ قرآنِ حکیم اور احادیثِ مبارکہ میں بھی دل کا بہت ذکر کیا گیا ہے۔

دماغ کے بننے سے پہلے ہی بچے کا دل ماں کے پیٹ میں دھڑکنا شروع کر دیتا ہے۔ اگر دل اور دماغ کے سارے رابطے کاٹ بھی دیئے جائیں، پھر بھی دل دھڑکتا رہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ سوچنے سمجھنے کا سارا کام صرف دماغ کا ہے، صرف اُسی کے پاس سوچنے کی صلاحیت ہے۔ یہ خیال غلط ہے، دل بھی سوچتا ہے۔ تو یہ محض استعارہ نہیں ہے، کوئی محاورہ نہیں ہے بلکہ آج سائنس نے بھی دل کا سوچنا ثابت کر دیا ہے کہ واقعی دل سوچتا ہے اور سمجھتا بھی ہے۔ دل کا اپنا ایک نظام ہے۔ دل میں تقریباً 40,000 نیورونز (neurons) موجود ہیں۔ دماغ دل کو پیغامات پہنچاتا ہے اور دل دماغ کو یعنی یہ دوطرفہ عمل ہے۔ دل کی اپنی ذہانت (intelligence) ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

(اِنَّ فِی الْجَسَدِ مُضْغَةً اِذَا صَلُحَتْ صَلُحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ وَاِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ أَلَا وَهِیَ الْقَلْبُ) (۱)

”جسم میں ایک گوشت کی بوٹی ہے، جب وہ ٹھیک رہتی ہے، پورا جسم ٹھیک رہتا ہے، اور جب اُس میں بگاڑ آ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ آگاہ ہو جاؤ، وہ دل ہے۔“

سوچ اور جذبے کے بگاڑ کا سبب فطرت اور جبلّت کا بگاڑ ہے:

جب دل میں بگاڑ آتا ہے تو دماغ تک اُس کا اثر جاتا ہے، انسان کی سوچ اور اُس کے جذبے بیمار ہو جاتے ہیں اور رویوں میں اُس کا اثر ظاہر ہونے لگتا ہے۔ دراصل ہر بُری عادت، ہر گناہ کا بیج بگڑی ہوئی سوچ یا بگڑا ہوا جذبہ ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب فضل من استبرء لدینه

اس بگاڑ کی دو بنیادی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ فطرت میں بگاڑ اور دوسری جبلّت میں بگاڑ ہے۔فطرت میں شبہات کی وجہ سے بگاڑ آتا ہے۔اسلام چاہتا ہے کہ فطرت بگڑنے نہ پائے۔اسی لیے قرآن کا آغاز {لَا رَیْبَ فِیْہِ} سے ہوا ہے یعنی ''اس میں کوئی شک نہیں۔'' اسی طرح ایک اور مقام پر {وَلَا تَکُنْ فِیْ مِرْیَۃٍ} ''تم کسی شک میں مت پڑے رہنا'' اور ''مِرْیَۃٌ'' بھی شک کو کہتے ہیں۔ یہ اس لیے ارشاد ہوا تا کہ انسان قرآن کے بارے میں کسی شک میں نہ رہے۔فطرت کا بگاڑ ٹھیک کرنا بہت مشکل کام ہے لہٰذا فطرت کو ہر حال میں بگڑنے سے بچانا چاہیے۔ جبلّت کا بگاڑ آجائے تو اس کو ٹھیک کرنا نسبتاً آسان ہے۔

جبلّت میں بگاڑ شہوات (appetites) کی وجہ سے آتا ہے۔جب شہوات بے قابو ہو جائیں، شریعت کی حدود توڑنے لگیں تو جبلّت میں بگاڑ واقع ہو جاتا ہے۔ جائز خواہشات کو جائز طریقہ سے پورا کرنے کی شریعت میں پوری گنجائش موجود ہے۔لیکن جب ہم یہ حدیں پار کرنے لگتے ہیں تو قرآن انہی خواہشات کے لیے ''ھواء'' کا لفظ استعمال کرتا ہے یعنی ایسی خواہشات جو کہ شریعت کی حدود کو توڑ کر پوری کی جائیں اور شریعت کا لحاظ نہ کیا جائے، اگر ہم شریعت کے دائرے کے اندر مطمئن نہ رہیں۔ وہ خواہشات پھر بڑھ کر ''ھواء'' بن جاتی ہیں اور انسان شہوت کا غلام بن کر رہ جاتا ہے۔قوتِ عدل، قوتِ علم بے قابو ہو جائیں تو فطرت کے اندر شبہات آتے ہیں اور قوتِ غضب اور قوتِ شہوت بے قابو ہو جائیں تو شہوات کو شہ ملنے لگتی ہے اور وہ بھڑکنے لگتی ہیں۔

اللہ کا ذکر۔دل کی اصلاح کا ذریعہ :

اگر کوئی دل کی اصلاح چاہتا ہے تو اللہ کی یاد اُس کا اصل ذریعہ ہے۔ دل کی زندگی، اُس کا اطمینان اللہ کی یاد میں ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{اَلَا بِذِکْرِ اللّٰہِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ} (الرعد:۲۸)

''آگاہ ہو جاؤ، اللہ کے ذکر ہی سے دل اطمینان پاتے ہیں۔''

دل سلامت ہو تو یہ بڑی نعمت ہے۔اس کا مطلب ہے کہ انسان کی فطرت سلامت ہے اور ایسا دل قیامت کے روز سب سے قیمتی متاع ہوگا۔سورۃ الشعراء:۸۸،۸۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ o اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ}

''جس روز فائدہ نہ دیں گے مال اور نہ ہی بیٹے۔سوائے اُس کے جو لایا اللہ کے پاس

پاکیزہ دل۔"

قرآن حکیم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تعریف میں فرمایا:

{اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ} (الصّٰفّٰت:۸۴)

"جب وہ آیا اپنے رب کے پاس قلبِ سلیم لے کر۔"

مومنین کی ایک پہچان یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ کا ذکر سن کر {وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ} "ان کے دل کانپ جاتے ہیں"۔ اس کے برخلاف دنیا کی محبت دل کو بیمار کر دیتی ہے، بگاڑ دیتی ہے۔ قرآن میں ایسے بیمار دل کا بھی ذکر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ} (البقرۃ:۱۰) "اُن کے دلوں میں مرض ہے۔"

{رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ} (المطففین:۱۴) "اُن کے دلوں پر زنگ آگیا ہے۔"

{تَعْمَى الْقُلُوْبُ} (الحج:۴۶) "دل اندھے ہوجاتے ہیں۔"

{عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا} (محمد:۲۴) "ان کے دلوں پر تالے پڑ گئے ہیں۔"

{قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ} (البقرۃ:۷۴) "تمہارے دل سخت ہو گئے۔"

فطرت اور جبلّت میں بگاڑ اس طرح پیدا ہوا کہ لوگوں نے فطرت کو تو بہت اچھا سمجھا اور جبلّت کو بہت برا سمجھا۔ انھوں نے سوچا کہ ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم جبلّت کے سارے تقاضوں کو مار ڈالیں۔ نفس کُشی کریں۔ جبلّت اگر کھانا مانگتی ہے تو کھانا مت دو، شادی بیاہ مت کرو۔ جسم آرام مانگتا ہے تو آرام مت دو۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ جب انھوں نے یہ سوچا تو تزکیہ کا رُخ بالکل غلط ہو گیا، سوچ میں بگاڑ پیدا ہوا۔ انھوں نے سمجھا کہ تزکیہ کا مطلب جبلّت کو مار ڈالنا ہے لہٰذا تمام کوششیں غلط رُخ پر چلی گئیں۔ تمام توانائی غلط رخ پر صرف ہوگئی۔ جبلّت کو مار ڈالنا مقصد ہے ہی نہیں یہ تو اللہ نے ہمارے لیے بنائی ہے۔ حُسنِ اخلاق کا تعلق اس بات سے نہیں ہے کہ جبلت کو مار ڈالا جائے، کھایا پیا نہ جائے، یا ہنسا بولا نہ جائے، نہ لوگوں سے تعلق قائم کیا جائے اور نہ شادی بیاہ کیا جائے۔

مندرجہ بالا سطور میں ذکر آچکا کہ فطرت کا تعلق روح سے ہے اور روح تنہائی پسند ہوتی ہے۔ انسان اپنی فطرت کو سب سے اچھی طرح اُس وقت پہچانتا ہے جب وہ تنہا ہوتا ہے۔ فطرت کو پہچاننے کے لیے بعض اوقات تنہائی بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ جہاں تک جبلّت کا تقاضا ہے اس میں انسان

گھلنا ملنا چاہتا ہے، لوگوں کے اندر رہنا چاہتا ہے، معاشرتی روابط (Social Contacts) چاہتا ہے۔ علمِ نفسیات (psychology) میں کہتے ہیں کہ انسان معاشرتی جانور ہیں (Humans are social animals) تو جبلّت کے اندر یہ خاصیت ہے۔ انسان لوگوں کے درمیان بسنا چاہتا ہے، بات چیت کرنا چاہتا ہے، یہ ہماری جبلّی خواہش ہے۔ ملنا جلنا انسان کی ضرورت بھی ہے لیکن غلو کرنے والوں نے یہ کہا کہ جبلت کو مار ڈالو، اس کو دبا دو یعنی کسی سے ملنا جلنا نہیں، پہاڑوں میں، غاروں میں جا کر رہو، آبادی سے دور دراز جا کر بسیرا کرو اور تنہائی اختیار کرو، یہ طرزِ عمل درست نہیں۔ حُسنِ اخلاق حاصل کرنے کے لیے ان دونوں کو اپنے اپنے مقام پر رکھنا ضروری ہے۔ ان دونوں تقاضوں میں اعتدال قائم کرنا ضروری ہے اور دونوں کے تقاضوں کو تسکین فراہم کرنا ضروری ہے جو فطرت کا تقاضا ہے وہ پورا کیا جائے اور جو جبلی تقاضے ہیں ان کو بھی پورا کیا جائے اللہ تعالیٰ کی شریعت میں دونوں کے لیے گنجائش موجود ہے۔ فطرت کے تقاضوں اور جبلّت کی ضروریات دونوں کو پورا کرنے کی شریعت اجازت دیتی ہے، نہ صرف ضروریات بلکہ جائز خواہشات کو بھی پورا کرنے کی شریعت میں گنجائش ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَّ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا وَ لَا تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ} (الاعراف: ۳۱)

''کھاؤ پیو لیکن حد سے مت بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

یعنی کھانے پینے کو مقصدِ حیات نہ بنا لینا۔ ایسا نہ ہو کہ تم جبلّت پر اتنا دھیان دو کہ فطرت کو نظر انداز کرنا شروع کر دو۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِيْ)) [1] ''نکاح میری سنّت ہے''، یہ ثواب کا کام ہے، اللہ خوش ہوتا ہے نکاح کرنے سے۔ جہاں تک معاشرتی روابط کا تعلق ہے تو قرآن میں رحمی رشتوں کو نبھانے کا، غریبوں سے مسکینوں سے تعلق قائم رکھنے کا بہت تذکرہ ہے۔ اسلام کا معاشرتی پہلو بہت مضبوط ہے۔ باجماعت نماز کا نظام، زکوٰۃ کا نظام، حج کا عمل، غرض ان عبادات میں میل جول ہے۔ اسلام کی تعلیم انسانوں سے کٹ کر بیٹھنے کی نہیں ہے بلکہ انسانوں کے ساتھ رابطہ قائم رکھنے کی ہے۔ اسلام نے تو انسانوں سے رابطہ رکھنے کو عبادت قرار دیا ہے، لوگوں سے کٹ جانا اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے، اپنے نفس کو مار ڈالنا یا دبا دینا اسلام کا مقصد نہیں ہے۔ اگر آپ جبلّت یا فطرت، دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کریں گے تو حسن اخلاق نہیں آ سکتا، انسان کی شخصیت کی تکمیل نہیں ہو سکے گی۔

---

(۱) سنن ابن ماجه، کتاب النکاح، باب ماجاء في فضل النکاح

جبلت و فطرت کے توازن سے اندرونی و بیرونی امن:

ایمان امن دیتا ہے یہ چاہتا ہے کہ انسان کے دونوں پہلو فطرت اور جبلت کے درمیان امن ہو، دونوں کے حقوق اور ضروریات پوری ہوتی رہیں۔ اس سے انسان کے کُل وجود میں امن رہتا ہے۔ جب اندر امن آجاتا ہے تو باہر بھی پُرامن فضا قائم ہوجاتی ہے۔ انسان پُرامن بنتا ہے، ایمان والا ہوتا ہے، مومن ہوتا ہے، تو خود بھی امن سے ہوتا ہے اور دوسروں کے لیے بھی باعثِ امن ہوتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث اپنے سامنے رکھیں۔ ((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (۱) ''مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھوں سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں'' یہ ہے اصل اسلام! یہ ہے سلامتی! جب انسان کے اندر سچّا اخلاق ہوتا ہے تو وہ سچّا مسلمان اور سچّا مومن ہوتا ہے۔ خود بھی امن سے زندگی بسر کرتا ہے اور دوسروں کو بھی امن سے رہنے دیتا ہے۔ اس کے اندر کوئی احساسِ محرومی نہیں ہوتی، غیر فطری پابندیوں سے آزاد ہوتا ہے، اس کے سارے فطری تقاضے اچھی طرح سے پورے ہورہے ہوتے ہیں۔ لہٰذا جب ان میں توازن قائم ہوتا ہے تو حسنِ اخلاق اور امن آجاتا ہے۔

شیطان کے ہاتھوں فطرت و جبلّت میں بگاڑ:

شیطان جو کہ انسان کا ازلی دشمن ہے، اس کا چیلنج ہے کہ میں ان میں بگاڑ پیدا کروں گا۔ چنانچہ وہ ہم میں لازماً بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ جب فطرت یا جبلّت بگڑتی ہے تو فساد پیدا ہوجاتا ہے، ایمان اور اسلام رخصت ہوجاتا ہے، کفر و فسق آجاتا ہے۔

سورۃ النساء کی آیت نمبر ۱۱۹ میں شیطان کا یہ دعویٰ نقل ہوا ہے کہ اس نے کہا تھا:

{وَّ لَاُضِلَّنَّهُمْ وَ لَاُمَنِّيَنَّهُمْ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ اٰذَانَ الْاَنْعَامِ وَ لَاٰمُرَنَّهُمْ فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللّٰهِ}

''میں لازماً ان کو بہکاؤں گا، میں ضرور ان کو آرزوؤں میں الجھاؤں گا، اور میں ضرور ان کو حکم دوں گا تو یہ میرے حکم سے چوپایوں کے کان کاٹیں گے، اور میں ضرور ان کو حکم دوں گا تو وہ اللہ کی بنائی ہوئی تخلیق میں تبدیلی کریں گے۔''

فطرت اور جبلّت دونوں اللہ نے بنائی ہیں، شیطان اِن کو بگاڑنا چاہتا ہے، لیکن وہ بگاڑ کا لفظ استعمال نہیں کرتا کیوں کہ بظاہر وہ ہمارا بڑا خیر خواہ بنتا ہے۔ بس یہ کہتا ہے کہ فطرت کے تقاضے

(۱) جامع الترمذی، کتاب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین أصبعی الرحمن

پورے کرو، جبلّت کو دبا دو یا کہے گا صرف جبلت پر نظر رکھو، فطرت کو رہنے دو۔ فطرت میں شبہات کے ذریعے بگاڑ پیدا کرتا ہے جو بنیادی فطری چیزیں ہیں، توحید، اللہ کی فرمانبرداری، خود احتسابی (self accountability) حیا اور یہ احساس کہ دنیا میرا وطن نہیں ہے ان چیزوں میں شبہات پیدا کرتا ہے۔ کہتا ہے حیا کی تمھیں کیا ضرورت ہے؟ اللہ! وہ ہے بھی کہ نہیں؟ اللہ کی تمھیں کیا ضرورت ہے۔ فطری تعلیمات میں وسوسوں کے ذریعے شبہات پیدا کرتا ہے۔ قرآن ہمیں دینِ فطرت سکھاتا ہے۔ قرآن کا آغاز ہی ایسے ہوا: {الٓمّٓ ۝ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ} (البقرۃ: ۱، ۲) ''الف لام میم۔ یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں۔'' پہلے ہی شک کی نفی کر دی کہ تم تو فطرت سنوارنے اُٹھ رہے ہو، شک سے نجات پالو، اگر شک سے نجات نہیں پاؤ گے تو فطرت کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکو گے، ان کی تسکین نہیں ہو سکے گی۔ تم اپنی فطرت کو پہچان نہیں پاؤ گے تو شک سے نجات پانا ضروری ہے۔ شک ڈالنا شیطان کا بہت خطرناک ہتھیار ہے۔ اور جبلّت میں خواہشات اور شہوات کے ذریعے شیطان بگاڑ پیدا کرتا ہے یعنی بُرائیوں پر ابھارتا ہے۔ شریعت میں جبلّت کی جائز خواہشات کو پورا کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ شیطان انہی خواہشات میں پھونکیں مارتا ہے اور ان کو اتنا بڑھا دیتا ہے کہ پھر انسان شریعت کے دائرے سے باہر نکل کر ان کو پورا کرنے کی کوشش کرنے لگتا ہے۔ اور جب یہ خواہشات شریعت کے دائرے سے باہر نکلنے لگتی ہیں تو ان کو قرآن ''ھَوَاء'' کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَ اَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ ۝ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى} (النّٰزعٰت: ۴۰-۴۱)

''اور جو ڈرا اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے سے اور اس نے اپنے نفس کو ھَوَا سے روکا تو بیشک جنّت اس کا ٹھکانہ ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی قرآن میں یہ نہیں فرمایا کہ بندہ اپنی ساری خواہشات ختم کر دے بلکہ ھَوَا سے روکا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

{زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَ الْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَ الْاَنْعَامِ وَ الْحَرْثِ} (آل عمران: ۱۴)

''گُھبا دی گئی ہے انسان کے دل کے اندر محبت شہوات کی یعنی عورتیں، بیٹے، خزانے سونے چاندی کے، نشان لگے ہوئے گھوڑے، جانور اور کھیتی۔''

ان تمام چیزوں کا شوق اور شہوت موجود ہے۔ ان سے منع نہیں کیا گیا کہ تم عورتوں سے محبت

مت کرو یا عورتیں اپنے شوہروں سے محبت نہ کریں، یا اولاد کی خواہش ہی نہیں ہونی چاہیے، یا مال اچھا ہی نہیں لگنا چاہیے۔ یہ سب جبلّت کے تقاضے ہیں۔ انھیں پورا کرو لیکن ھَوا سے بچو۔ اب اگر ہم اعلیٰ اور عمدہ اخلاق حاصل کرنا چاہتے ہیں تو امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جو چار چیزیں بتائی ہیں، ان میں اعتدال پیدا کرنا ہوگا۔

بنیادی انسانی قوتوں میں اعتدال و توازن:

قوّتِ علم، قوّتِ عقل، قوّتِ شہوت اور قوّتِ غضب کو اعتدال پر لانا ہوگا۔ ان میں اگر کمی بیشی اور افراط و تفریط ہو جائے تو مختلف اخلاقی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور عمل میں بگاڑ پیدا ہونے لگتا ہے۔ اب ذرا اس پہلو پر غور و فکر کر لیتے ہیں کہ جب یہ حد سے بڑھ جاتی ہیں تو کیا شکل اختیار کرتی ہیں؟ کس طرح سے ان کا اظہار ہوتا ہے؟ اور دوسری طرف اگر یہ نقطۂ اعتدال سے گر جائیں تو کون سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں؟ اس کا اظہار کس طرح ہوتا ہے؟ اور جب یہ قوتیں معتدل اور متوازن ہوتی ہیں تو انسان کے اندر کن صفات کا ظہور ہوتا ہے؟

1۔ قوّتِ علم:

اس قوت کا تعلق فطرت سے ہے۔ علم حاصل کرنے کی طلب فطرت میں موجود ہے۔ فطرت والی خصوصیات صرف انسانوں میں ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات جانوروں میں نہیں ہوتی ہیں کیونکہ جانوروں میں فطرت نہیں ہوتی، صرف جبلّت ہوتی ہے۔ فطرت کا تعلق چونکہ روح سے ہے تو یہ انسان کے ساتھ مخصوص ہے۔ جانوروں میں صرف جبلّت ہوتی ہے، فطرت نہیں ہوتی۔ چونکہ جانوروں میں فطرت نہیں تو ان میں نہ انَا ہے، نہ سوچ سمجھ ہے، نہ غور و فکر کی صلاحیت ہے، نہ حیا ہوتی ہے، نہ اپنا محاسبہ کر سکتے ہیں، نہ پاکیزگی اور صفائی کا احساس ہوتا ہے، نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ دنیا ہمارا گھر نہیں، اور نہ علم حاصل کر سکتے ہیں اور نہ سکھا سکتے ہیں۔ ہاں جبلّت کی سطح پر جن جن چیزوں کی ان کو ضرورت ہوتی ہے، وہ ان کے اندر موجود ہیں۔ گھر بنانا، گھونسلہ بنانا ان کی جبلّت میں پہلے سے موجود ہے۔ سُدھانا اور چیز ہے، علم سیکھنا اور ترقی کرنا دیگر چیز ہے۔ انسان غاروں میں رہتا تھا، علم حاصل کرتے کرتے فلک بوس عمارتیں بنانی شروع کر دیں۔ سفر کے لیے موٹر، ریل اور جہاز بنا ڈالے لیکن چڑیا کا گھونسلہ دس ہزار سال پہلے بھی ایسا ہی تھا، آج بھی ویسا ہی ہے، اس میں ترقی نہیں ہوئی۔ دنیاوی ترقی علم کے حصول سے ہوتی ہے۔ لہٰذا فطرت والی خصوصیات جانوروں میں نہیں

ہیں۔انسان جب اپنی فطرت کو بھول جاتا ہے یا بگاڑ لیتا ہے تو بالکل جانوروں کی سطح پر آجاتا ہے۔ اس میں حیا ختم ہوجاتی ہے، اللہ کی طرف لوٹ جانے کا احساس ختم ہوجاتا ہے، اپنے محاسبہ کا احساس، جوابدہی کا شعور نہیں ہوتا، اللہ کی فرمانبرداری کی طلب اور تڑپ ختم ہوجاتی ہے۔وہ جانوروں کی سطح پر جیتا ہے، اپنی فطرت کا گلا گھونٹ کر اسے مسخ کردیتا ہے۔صرف اس کا حیوانی وجود بچتا ہے، اس کی روح ختم ہوجاتی ہے۔ایسے انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے جانوروں سے تشبیہ دی ہے۔اندر کا انسان تو مر گیا ہے، اب وہ صرف حیوانی سطح پر زندہ ہے، صرف بھوک اور شہوت کے لیے زندہ ہے۔بس یہی دو فکریں دامن گیر ہیں کہ پیٹ بھر جائے اور فرج کی تسکین کا سامان ہوجائے، تیسرا کوئی مقصد بچا ہی نہیں لہٰذا علم کا تعلق ہماری فطرت سے ہے۔

2۔ قوتِ عقل:

قوتِ عقل بھی انسان کے اندر ہے۔جب یہ حد اعتدال سے بڑھ جائے، حدود سے متجاوز ہوجائے تو انسان کے اندر دھوکہ دہی، چالاکی اور عیاری پیدا ہوتی ہے۔سازشی و مکار ذہانت نمو پاجاتی ہے اور یہ ایک مرض کی صورت اختیار کرلیتی ہے تو پھر انسان اللہ کے علم پر شک کرنے لگتا ہے، اللہ کو اپنے سے بڑا ماننے سے انکار کردیتا ہے۔آخر کار اللہ کے وجود سے ہی انکار کردیتا ہے۔ایسا کب ہوتا ہے؟ جب عقل میں زیادتی ہوجائے۔ہم سمجھتے ہیں کہ کسی چیز کا زیادہ ہونا تو اچھا ہوتا ہے لیکن اگر آپ سرطان کی بیماری ذہن میں لائیں تو یہ بات سمجھ میں آجائے کہ ہمیشہ کسی چیز کا زیادہ ہونا فائدہ مند نہیں ہوتا۔سرطان میں کیا ہوتا ہے؟ جسم کے خلیے (Cells) تیزی سے بڑھنا شروع ہوجاتے ہیں۔انسان کے جسم کے خلیے بڑھتے چلے جاتے ہیں تو یہ بڑھوتری فائدہ تو نہیں دیتی بلکہ سرطان کی شکل اختیار کرلیتی ہے۔اسی طرح بے مقصد عقل وغیر نافع عقل جب حد سے زیادہ بڑھنے لگ جاتی ہے تو پھر وہ ایک مرض کی صورت اختیار کرتی ہے اور کئی اخلاقی بیماریوں کو جنم دینے کا باعث ہوجاتی ہے۔

اس کے برعکس اگر قوتِ عقل میں بہت زیادہ کمی ہوجائے تو اس کا اظہار حماقت اور بیوقوفی کی صورت میں ہوتا ہے اور انسان اللہ کے ساتھ دوسری مخلوقات کو شریک کرنے لگ جاتا ہے۔اسی طرح عقل جب کم ہوتی ہے تو انسان شرک کی طرف چلا جاتا ہے۔اگر قوتِ عقل معتدل اور متوازن رہے تو اس سے انسان میں حکمت و دانش جنم لیتی ہے۔حکمت کا تعلق بھی فطرت سے ہے اور اس سے تقویٰ

پیدا ہوتا ہے۔

3۔ قوتِ غضب:

کسی اور زبان میں اس لفظ کا متبادل ڈھونڈنا ممکن نہیں ہے۔ یوں سمجھیں جیسا کہ مشین کی طاقت (horse power) ہوتی ہے، اسی طرح یہ انسان کا ایک انجن ہے، اس کا سرچشمۂ طاقت (source of energy) ہے۔ اگر قوتِ غضب زیادہ ہوگی تو آدمی بات کرنے میں بہت اونچا اونچا بولے گا، بے ادب ہوگا، بڑے بڑے دعوے کرے گا، بڑھکیں مارے گا۔ ضروری نہیں کہ قوتِ غضب کی زیادتی سے انسان میں یہ ساری کی ساری خرابیاں پیدا ہو جائیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک بُرائی بھی ہے تو وہ اسی قوت غضب کے اعتدال سے ہٹ جانے کی وجہ سے ہے۔ چنانچہ قوتِ غضب کی زیادتی کی وجہ سے بڑے بڑے دعوے کرنے، بلاضرورت خطرات میں کود پڑنے، غصہ کرنے، جلد بازی کرنے، اوروں کی بے عزتی کرنے جیسی بُرائیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

اور اگر اس قوت میں حد سے زیادہ کمی ہو جائے تو کاہلی، ناامیدی، بزدلی اور کم ہمتی پیدا ہوگی، خود کو حقیر جانے گا، بے بسی کا شکار رہے گا، شکوے شکایت کرے گا، اس کے اندر بے غیرتی پائی جائے گی۔ یہ تمام برائیاں یا ان میں سے چند یا کوئی ایک پیدا ہو سکتی ہے اور اگر قوتِ غضب میں اعتدال ہے تو انسان کے اندر غیرت، خودداری اور شجاعت جیسی خوبیاں پیدا ہوں گی۔

4۔ قوتِ شہوت:

خواہشات و شہوات یہ سب ایک ہی قوتِ شہوت کے تحت آتے ہیں۔ اگر یہ قوت حد سے بڑھی ہوئی ہو تو لالچ، ہوس، بے حیائی، خیانت، بدعہدی، امیروں کے ہاتھوں ذلت اٹھانا، جو معاشرے کے کرتا دھرتا ہیں ان کے آگے خوشامد اور چاپلوسی کرنا، غریبوں کو حقیر جاننا، غیر حقیقی توقعات رکھنا، اس طرح کی برائیاں پیدا ہوں گی۔

اور اگر قوتِ شہوت حد سے زیادہ گھٹ جائے تو انسان کے اندر سستی پیدا ہوتی ہے، بے چینی رہتی ہے، جھنجھلاہٹ اور مایوسی طاری رہتی ہے، انسان اعصابی دباؤ (depression) کا شکار ہوتا ہے۔ لیکن اگر قوت شہوت اعتدال پر ہو تو انسان کے اندر عفّت پیدا ہوتی ہے، تحمل آتا ہے، شرم و حیا قائم رہتی ہے، غیر حقیقی توقعات نہیں رکھتا، حقیقت پسند ہوتا ہے، ہوائی قلعے نہیں بناتا، اس کے اندر ظرافت و مزاح ہوتا ہے، کسی کا مذاق نہیں اڑاتا، اس کے اندر توانائی ہوتی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ قوتِ

غضب اور قوتِ شہوت کا گلا نہیں گھونٹنا ہے بلکہ ان کو معتدل بنانے اور قابو کرنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ قوتیں ہماری فطرت کے تابع ہو جائیں۔

5۔ قوتِ عدل:

قوتِ عدل کا بھی تعلق فطرت سے ہے۔ جانوروں کے اندر اس کا کوئی تصور نہیں ہے جب کہ انسانوں کے اندر عدل کا تصور ہے۔ قوتِ عدل جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، دو انتہاؤں کی درمیانی کیفیت ہے۔ عدل کی ضد ہے ظلم، چنانچہ عدل کے بارے میں انسان کا رویہ کبھی کبھی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ اگر انسان عدل کے بارے میں زیادہ ہی حسّاس ہے تو بہت ہی زیادہ بال کی کھال نکالے گا، بہت ہی زیادہ محتاط ہوگا۔ تو ظالموں کے ساتھ بے جا نرمی برتے گا، ان کی طرف سے غلط اور جھوٹے بہانے قبول کر لے گا اس لیے کہ عدل کے بارے میں بڑا حسّاس ہوگا۔ سوچتا رہے گا کیا پتہ ایسا ہو، کیا پتہ ویسا ہو۔ لہٰذا ظالموں کے ساتھ نرمی برتے گا، ان کے غلط بہانے بھی مان لے گا، اور عدل کے بارے میں اگر بہت دیر لگائے گا تو بھی ظالموں کو فائدہ ہوگا۔ عدل کرنے میں تاخیر کرنا ایسا ہے جیسا عدل کو روک لینا اور اگر عدل کی طرف سے بالکل بے حس ہو، بے نیاز ہو، انتہائی غیر محتاط ہو، بہت جلد باز ہو تو بے قصوروں پر بھی شک کرے گا، بغیر ثبوت کے بھی لوگوں کو سزا دے دے گا۔ اور اگر جلد بازی کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ بے قصوروں کو سزا دیدے۔ تو دونوں صورتوں میں وہ ظلم کا ارتکاب کرے گا۔

یہ چند باتیں ہیں کہ جن کا علم انسان کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ خود کو پہچانے۔ یہ تمام چیزیں ان شاء اللہ خود شناسی میں مددگار اور معاون ثابت ہوں گی۔ اور خدا شناسی کی طرف رہنمائی کریں گی۔

ادب

تزکیہ دراصل دل کو بدلنا ہے۔اور عربی میں لفظ ''قلب'' کا مطلب ہوتا ہے پلٹنا۔اگر آپ نے اپنا تزکیہ کرنا ہے تو اس کی ابتداء یقیناً دل سے کرنی ہوگی۔تزکیہ کے لیے اس دل کو سب سے پہلے ادب (etiquette) سکھانا چاہئے کہ مختلف لوگوں، مختلف ہستیوں کے ساتھ ہمارا رویّہ کیسا ہونا چاہیے۔

پہلے زمانے میں جو استاد بچوں کو پڑھایا کرتے تھے، ان کو مؤدِّب کہا جاتا تھا یعنی ادب سکھانے والا۔وہ بچوں کو متعلقہ علوم کے ساتھ ساتھ آداب بھی سکھایا کرتے تھے۔لہٰذا علم کے ساتھ ادب بھی ضروری ہے۔

1-اللہ کا ادب:

سب سے پہلے جو ادب آنا چاہیے، وہ ہے ''اللہ کا ادب۔'' اللہ کے ساتھ تعلق قائم کرنے کے کیا آداب ہیں، اپنے رب کے ساتھ تعلق کی نوعیت کیا ہونی چاہیے، اس پر تھوڑی سی گفتگو کر لیتے ہیں۔

(۱) اللہ تعالیٰ کے ادب کا سب سے پہلا تقاضا یہ ہے کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے {لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ} (لقمٰن: ۱۳) ''اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو'' اور اللہ کا تقویٰ اختیار کیا جائے یعنی متقی رہا جائے، خود کو اللہ کی نظر سے جانچا اور تولا جائے، یہ اللہ کا ادب ہے۔اللہ اکبر! اللہ سب سے بڑا ہے۔جو اللہ کا مقام ہے اسی پر اللہ کو رکھا جائے تبھی اللہ کا ادب آئے گا اور اس کے مقام کا احساس ہوگا، نمازوں کے اندر خشوع وخضوع پیدا ہوگا۔

نماز میں اللہ کے سامنے بہت ادب کے ساتھ کھڑا ہونا چاہیے۔فرمانِ الٰہی ہے:

{الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ} (المؤمنون: ۲)

''وہ لوگ (فلاح پانے والے ہوں گے) جو اپنی نمازوں میں خشیت کا مظاہرہ کرنے والے ہیں۔''

یعنی اپنے رب کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔

(۲) اللہ کے ساتھ تعلق کا ایک ادب یہ بھی ہے کہ اُس کی بہت تعریف کی جائے۔اس کی تسبیح کی جائے یعنی سبحان اللہ، اس کی تحمید کی جائے یعنی الحمد للہ اور اس کا ذکر کیا جائے۔اللہ کے بارے

میں سوچا جائے، اس کی عظمت کا تصور کیا جائے، اس کی خلاّقی پر غور کیا جائے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ کو اپنی زندگی کا محور بنالیا جائے، ہم اُس کے نام سے جئیں اور اسی کے نام سے مریں۔

{قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ} (الانعام: ۱۶۲)

''بیشک میری نماز، میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔''

یہ ہے للّٰہیت۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

{کُوْنُوْا رَبّٰنِیّٖنَ} (آل عمران: ۷۹) ''اللہ والے بنو۔''

ایسے اللہ والے بنو کہ بس اللہ تمھارے دل پر چھا جائے، اُٹھتے بیٹھتے وہ یاد آئے اور اس سے محبت ہو۔

(۳) اللہ کے نام کا ادب کیا جائے، حتّی الامکان کوشش کرنی چاہیے کہ اگر کسی کاغذ پر لکھا ہوا اللہ کا نام زمین پر پڑا ہوا نظر آئے تو اُسے اٹھا کر اونچی اور محفوظ جگہ پر رکھ دیں، کچرے یا ردّی میں نہ جانے پائے۔ انسان اللہ کے نام کی جھوٹی قسمیں نہ کھائے۔ جھوٹی قسم کھانا تو پھر بہت بڑی بات ہے، اللہ کے نام پر بہت زیادہ قسمیں کھانا بھی پسندیدہ نہیں۔ خاص طور پر اللہ کی قسم کھا کر کسی اچھے کام سے باز رہنا یعنی کوئی اچھا کام چھوڑنے پر اللہ کے نام کی قسم کھالینا بے ادبی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ البقرۃ آیت ۲۲۴ میں فرمایا:

{وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰہَ عُرْضَۃً لِّاَیْمَانِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَیْنَ النَّاسِ}

''اور نہ بنالیا کرو اللہ کو آڑ اپنی قسموں کے لیے کہ تم نیکی اور پرہیزگاری اور لوگوں کے درمیان صلح کی کوشش نہ کرو گے۔''

ایسی قسم مت کھاؤ کہ اللہ کی قسم میں زندگی بھر اپنے بھائی سے بات نہیں کروں گا، یا فلاں شخص کو کبھی سلام نہیں کروں گا نعوذ باللہ۔ ایسا کرنا درست نہیں ہے۔

(۴) انسان بات بے بات اللہ کا نام نہ لے۔ شریعت موسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے احکام عشرہ میں بھی یہ بات درج ہے کہ لغو چیزوں کے لیے اللہ کا نام مت لیا کرو۔ گناہوں پہ اللہ کا نام مت لیا کرو۔ اللہ کا نام ادب اور شعور کے ساتھ لینا چاہیے۔

(۵) اللہ کے نام کا ادب یہ بھی ہے کہ اللہ کے ناموں کو اپنی دعاؤں کے لیے وسیلہ بنایا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا} (الاعراف: ۱۸۰)

''تمام خوبصورت نام اللہ کے لیے ہیں، تو اس کو ان ناموں سے پکارو۔''

(۶) انسان اپنی طرف سے اللہ کا نام ایجاد نہ کرے، بلکہ اللہ نے قرآن مجید میں اپنے جن صفاتی اسماء کا ذکر کیا ہے یا احادیث مبارکہ میں جو نام مذکور ہیں بس ان ہی صفاتی ناموں کے ذریعے اللہ کو پکارے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک دعا میں یہ الفاظ آتے ہیں:

(لَا اُحْصِی ثَنَاءً عَلَیْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَیْتَ عَلٰی نَفْسِكَ) (۱)

''اے اللہ میں تو تیری تعریف نہیں کر سکتا، تُو ایسا ہے جیسا کہ تو نے خود اپنی تعریف فرمائی۔''

ایسا نہ ہو کہ ہم اپنی طرف سے کوئی اچھا نام لے کر اللہ تعالیٰ کو پکاریں لیکن وہ اللہ کے شایانِ شان نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تو اکبر ہے، اللہ بہت بلند مرتبہ والا، بہت اعلیٰ وارفع ہے، وہ مبرّا ومنزّہ ہے، ہمارے تصوّرات سے بہت ماوراء ہے۔ ہم اپنے معیارات سے سوچتے ہیں اور ہمارے معیارات بہت چھوٹے ہیں۔ اللہ کی ذات وصفات تک ہمارے وہم وگمان کی رسائی نہیں ہوسکتی، ہمارا تخیل (imagination) بھی اللہ کے مقام تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے کہ انسان اپنی طرف سے کوئی نام یا صفت گھڑ لے یا اللہ کے بارے میں کوئی غلط تصوّر قائم کر لے۔

(۷) اللہ کا ادب یہ ہے کہ جن ناموں سے اللہ نے خود کو یاد کیا ہے انہی کو وسیلہ بنایا جائے۔ جب دل میں اللہ کی عظمت ہوگی تو اس کا اثر عمل میں نظر آئے گا، پوری شخصیت پر اس کا اثر ظاہر ہوگا اور اس کی صفات کی عظمت کا یقیناً احساس تازہ ہوگا۔

2۔ قرآن کا ادب:

قرآن کریم اور وہ مجلس جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو، دونوں کے آداب ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ} (الاعراف: ۲۰۴)

''اور جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو غور سے سنو اور خاموش رہو شاید کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

یہ ہے قرآن سننے کا ادب۔ سننے سے مراد ہے اس خاص مجلس میں سننا جہاں انسان آتا ہی قرآن سننے کے لیے ہے۔ ورنہ اگر بیچ بازار میں تلاوتِ قرآن کی آواز آ رہی ہے تو انسان بازار میں

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات عن رسول اللہ ﷺ

قرآن سننے کے لیے تو نہیں گیا۔ اب اگر وہاں کسی نے تلاوت کی کیسٹ لگا رکھی ہے تو جس نے تلاوت لگائی ہے وہ ادب سے سنے، باقی لوگ اس کے مکلف نہیں۔

اس آیت سے مراد یہ ہے کہ جب تم قرآن کی مجلس میں آؤ۔ تمھارا ارادہ ہی یہ ہو کہ تمہیں قرآن سننا ہے یا پھر تم خود اس ارادے سے کیسٹ لگاؤ کہ مجھے قرآن سننا ہے تو اب خاموش رہو اور غور سے سنو۔ جہاں قرآن پڑھا جا رہا ہو وہاں با ادب بیٹھنا اللہ کی رحمت کو متوجہ کرنے کا ذریعہ ہے۔ ترتیب کے بغیر نہیں بیٹھنا چاہیے، بے دلی سے نہیں سننا چاہیے، دل و دماغ دونوں کو حاضر رکھ کر سننا چاہیے۔ کیوں کہ قرآن تو نازل ہی دل پر ہوا ہے۔ اگر دل غافل رہے، بے ادب رہے تو اصلاح کا آغاز کہاں سے کریں گے۔ لہٰذا مؤدّب بننے کا آغاز دل سے کرنا ہے، سب سے پہلے دل کو ادب سکھانا ہے۔ قرآن سنتے سنتے جمائیاں لینا، اونگھنا یا سو جانا انتہا درجے کی بے ادبی ہے۔ کسی درس وغیرہ میں جانا اور وہاں قرآن کی آیات کا درس ہو رہا ہو تو متوجہ ہو کر سننا بہت ضروری ہے۔ ذرا سوچیں ایک طرف قرآن سنایا جا رہا ہو، پڑھایا جا رہا ہو اور دوسری طرف ہم موبائل پر پیغامات بھیج رہے ہوں، پڑھ رہے ہوں یا فون پر باتیں شروع کر دیں، یہ سب کتنی بڑی بے ادبی ہے۔ مثل مشہور ہے ''باادب بانصیب بے ادب بے نصیب۔'' جو اتنی بے ادبی سے اللہ کا کلام سنے گا تو خدشہ ہے کہ وہ ہدایت سے محروم رہے، قرآن اس کے دل میں جاگزیں نہ ہو۔ اتنی لاپرواہی کے ساتھ قرآن سننے والے کو ہدایت ملنا مشکل ہے۔ تو یہ رویّہ اللہ کو سخت ناپسند ہے۔ اسی طرح قرآن کی مجلس میں بیٹھے ہوئے باتیں تو نہیں کر رہے لیکن کاپی پر لکھ کر ایک دوسرے کو بھیج رہے ہیں، یہ بھی سخت بے ادبی ہے۔

اس لیے جس حد تک ممکن ہو اپنے جسم سے، اپنی سوچ سے، اپنے دل سے اور حرکات وسکنات سے قرآن کا ادب کرنا چاہیے۔ کلام کا ادب ظاہر کرے گا کہ صاحبِ کلام کا کتنا ادب دل میں ہے۔ اور اللہ سب سے زیادہ اس ادب کا مستحق ہے۔

3- جناب رسول اکرم ﷺ کا ادب:

اللہ تبارک وتعالیٰ کے شرف اعلیٰ کے بعد انسانوں کا مرتبہ آتا ہے۔ یقیناً انسانوں میں سب سے اشرف اور ارفع نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ اس لیے سب سے زیادہ آپ ﷺ کا ادب کرنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے (سورۃ الحجرات: 1، 2) میں فرمایا ہے:

{ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ○ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَ لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ○ }

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے آگے نکلنے کی کوشش نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو بے شک اللہ سب کچھ سننے والا اور باخبر ہے۔ اے ایمان والو! اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے اپنی آواز بلند مت کرو اور نہ ان سے ایسے زور سے بولو جیسے تم ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اعمال غارت ہو جائیں اور تمہیں پتہ بھی نہ چلے۔''

جب نبی اکرم ﷺ کا نام آئے تو چاہیے کہ آدمی درود پڑھے۔ جب آپ ﷺ کی حدیث شریف سامنے آجائے تو خاموش ہو جائے۔ کوئی بحث مباحثہ ہو رہا ہو اور کسی نے کہا بھئی حدیثِ مبارکہ میں یہ آتا ہے۔ تو بس بات ختم، طے ہو گیا۔ آپ ﷺ کی بات کے سامنے اپنی آوازوں کو بلند نہیں کرنا، آپ ﷺ کی سنتوں کا احترام کرنا ہے۔ جب آپ ﷺ کا ادب ہو گا تو آپ کے طور طریقوں کا بھی ادب ہو گا اور آپ ﷺ تو افضل البشر اور امام الانبیاء ہیں۔ آپ ﷺ نے معراج کے موقع پر بیت المقدس میں تمام انبیاء علیہم السلام کی امامت کرائی۔ خلاصہ یہ کہ ہر سنت چاہے چھوٹی ہو یا بڑی اُس کا ادب کرنا ہے۔

اور آپ ﷺ سے متعلق جتنے لوگ تھے آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ ﷺ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سب کا احترام نہایت ضروری ہے۔ کسی نے کہا ہے کہ جب تمہارے سامنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ذکر کیا جائے تو ادب کے ساتھ خاموش ہو جاؤ، یعنی اُن پر طعن و تنقید مت کرو۔ آپ ﷺ کی اولاد تھی، آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے، سب آپ ﷺ کو پیارے تھے۔ آپ ﷺ کی ازواج تھیں، جن کو ازواجِ مطہرات کہا گیا یعنی پاک بیویاں۔ لہٰذا آپ ﷺ کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، آپ ﷺ کی ازواج، آپ ﷺ اولاد، آپ ﷺ کے رشتہ دار جو ایمان لائے، اُن سب کا لازمی ادب کیا جائے، اُن کی عزت کی جائے۔ چاہیے کہ وقت نکال کر آپ ﷺ کی حیاتِ مبارکہ کا مطالعہ کیا جائے، کیوں کہ جتنا زیادہ ہم آپ ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں گے، اُتنا ہی زیادہ آپ ﷺ کا ادب بھی کریں گے، ان شاء اللہ تعالیٰ!

4۔انسانوں کا ادب:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ کے بعد عام انسانوں کی باری آتی ہے۔اُن کا ادب بھی ضروری ہے۔ جوعلم میں بڑا ہواُس کا ادب کریں، چاہے کوئی استاد ہو یا کوئی عالم ہو۔ ہوسکتا ہے کوئی عمر میں بڑا نہ ہومگر علم میں بڑا ہوتو اُس کا ادب کرنا چاہیے۔

(الف) عمر میں بڑوں کا ادب:

عمر میں بڑے دوطرح کے ہوتے ہیں ۔ایک خاندان کے بزرگ ، نانی ، دادی ، چچا ، تایا، پھوپھیاں ، ساس ، سُسر ۔ یہ عمر میں بڑے لوگ ہیں، ان کا ادب کرنا نہایت ضروری ہے۔کسی کو اجازت نہیں کہ بڑوں کے سامنے زبان چلائے۔ یہ روش پُراعتمادی کی علامت نہیں ہے بلکہ بدتمیزی کی علامت ہے۔خاندان کے بزرگوں کا ادب لازمی ہے یعنی ان سے جھک کر ملا جائے ،اُنہیں سلام کیا جائے ،کوئی بات اُن کے سامنے ایسی نہ کی جائے جس سے وہ اپنی بےعزتی اور بےادبی محسوس کریں۔

دوسرے وہ عمر رسیدہ لوگ جو خاندان کے بزرگ یا رشتہ دار نہیں ہوتے ۔ ہوسکتا ہے ملازم ہوں، ڈرائیور، آیا، خانساماں، چوکیدار یا جھاڑو پونچھا کرنے والے ہوں۔ اگر یہ ملازمین عمر میں بڑے ہیں تو اُن کا ادب کرنا چاہیے۔حدیثِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں آتا ہے:

(لَيْسَ مِنَّا مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيُوَقِّرْ كَبِيرَنَا) (۱)

''وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کرتا اور وہ ہمارے بڑوں کی تعظیم نہیں کرتا۔''

بچوں کو خادمین کا ادب کرنا سکھایئے:

اپنے بچوں کو سکھایئے کہ نوکروں کا ادب کریں کیوں کہ وہ اُن سے بڑے ہیں۔ اُنہیں ''آپ'' کہہ کر مخاطب کرنا ہے۔ بچے عمر میں چھوٹے ہوتے ہیں اور ملازمین عام طور پر عمر میں اُن سے بڑے ہوتے ہیں۔لہٰذا انہیں سکھائیں کہ ملازمین سے تحکمانہ لہجے میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ بچے نوکروں کو خود سلام کریں، اس لیے کہ چھوٹے بڑوں کو سلام کرتے ہیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیے جہاں خاندان کے بزرگوں کو سلام کرنا ہے وہاں گھر کے نوکروں کو بھی سلام کرنا لازمی ہے۔اس لیے کہ ملازمین کی بھی عزتِ نفس ہوتی ہے، وہ بھی عزت چاہتے ہیں۔

---

(۱) مسند احمد، بَاقِي مُسْنَدِ الْمُكْثِرِينَ، مُسْنَدُ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِي رضی اللہ عنہ

جب ہم چاہتے ہیں کہ بڑے ہماری اطاعت کریں، ہمارا کہنا مانیں تو ہم خواہ مخواہ اپنے آپ کو پریشان کرتے ہیں۔ بلاوجہ کا بوجھ اپنے اوپر لاد لیتے ہیں۔ اللہ نے ہم پر یہ ذمہ داری نہیں ڈالی کہ ہم سب کو اپنا مطیع بنائیں۔ فرمانبرداری کرنا، کسی کی بات ماننا، احکام بجالانا عموماً ہمیں بہت پُرسکون اور ہلکا کر دیتا ہے۔ اگر ہمیں اچھا معیارِ زندگی چاہیے تو ہم ادب کر کے دیکھیں۔

(ب) عہدے میں بڑوں کا ادب:

پھر جو عہدے میں بڑا ہو اس کی بھی عزت کرنی چاہیے کیوں کہ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک باعزت مقام عطا کیا ہے۔ مثلاً ملک کا سربراہ، کسی ادارے کا سربراہ، جج، مسجد کا امام یا کوئی استاد ایسے تمام افراد کی عزت کرنی چاہیے۔

(ج) رتبے میں بڑوں کا ادب:

بعض لوگ رُتبے میں بڑے ہوتے ہیں جیسے والدین۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کو بہت بڑا رتبہ دے رکھا ہے۔ اسی طرح مالک ہوسکتا ہے کہ عمر میں چھوٹا ہو لیکن اللہ نے اسے ایک مقام عطا کیا ہے کہ اسے مالک بنا دیا تو جو ماتحت ہیں وہ مالک کا ادب اور اس کی عزت کریں۔ ادب میں لازماً یہ بات داخل ہے کہ جو بڑے ہیں، چاہے علم میں ہوں یا عمر میں، عہدے میں ہوں یا مرتبے میں، اُن کا ہرگز مذاق نہ اُڑایا جائے۔ ہمارے ہاں جو رواج چل پڑا ہے کہ عہدے میں بڑے لوگوں کے مزاحیہ کردار بنائے جاتے ہیں، اُن کی کردار کشی کے لیے لطیفے گھڑے جاتے ہیں، یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے زمانے میں جو کہ آئیڈیل اسلامی معاشرہ تھا، وہاں ہمیں اس طرح کی باتیں نہیں ملتی ہیں۔ کوئی کسی کا اس طرح مذاق نہیں اُڑایا کرتا تھا، مذاق اڑانے سے تحقیر ہوتی ہے، بے عزتی ہوتی ہے جو کہ ادب کی ضد ہے۔ لیکن ہمارے ہاں میڈیا نے یہ رواج اپنا لیا ہے کہ ملک کے صدر کا مذاق اڑایا جائے، وزیروں کا مذاق اُڑایا جائے، یا ادارے کے سربراہوں کا مذاق اڑایا جائے اور اس سے لطف اندوز ہوا جائے۔

علم ادب کے ساتھ آتا ہے، یا یوں کہہ لیں کہ علم کے ساتھ ادب آنا چاہیے۔ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ اگر علم نہیں ہے تو ادب کرنا نہیں آئے گا۔

ادب کے لیے کھڑا ہونا ضروری نہیں:

ہمارے معاشرے میں بڑوں کے ادب کے ضمن میں معروف ہے کہ جب وہ آئیں تو ان

کے احترام میں کھڑا ہوا جائے، یہ لازمی نہیں ہے۔ یہ بھی ہمارے ہاں ایک غلط رواج چل پڑا ہے کہ بڑے جب آئیں تو کھڑا ہوا جائے۔ جب کہ اسلام کے مطابق اگر کسی بڑے کے لیے کھڑے نہ ہوں تو یہ بے عزتی یا بے ادبی کی علامت نہیں ہے۔ ہاں اگر کوئی انسان آنے والے کے لیے خود کھڑا ہو جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ البتہ کھڑا ہونا واجب نہیں ہے لیکن کوئی گناہ بھی نہیں ہے، کوئی کھڑا ہو جاتا ہے تو ہو جائے، نہیں ہوتا تو بے ادبی میں شمار نہیں ہوتا۔ نبی اکرم ﷺ کو یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ جب آپ ﷺ تشریف لائیں تو لوگ آپ کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ سے زیادہ کوئی اور ہمیں محبوب نہ تھا لیکن ہم آپ ﷺ کو دیکھ کر اس لیے کھڑے نہیں ہوتے تھے کہ آپ ﷺ پسند نہیں فرماتے تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

(مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَمْثُلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)(۱)

''اگر کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ میرے آنے پر لوگ کھڑے ہو جائیں اور میں بیٹھوں تو لوگ میرے سرہانے کھڑے رہیں تو وہ جہنم میں داخل ہونے کی تیاری کر لے۔''

یہ ''انا'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے کہ انسان کو اچھا لگے کہ لوگ میرے لیے کھڑے ہو جائیں، چوکنا ہو جائیں۔ لیکن اگر کوئی خود اپنی خوشی سے کسی کے ادب و احترام کی خاطر کھڑا ہونا چاہتا ہے تو کوئی حرج بھی نہیں۔

(د) کسی قوم کے بڑے کا ادب:

حدیثِ رسول ﷺ میں آتا ہے: ''جب تمہارے پاس کسی قوم کا معزز مہمان آئے تو تم اس کا اکرام کرو۔'' یعنی عزت اور احترام کرو۔ کسی ایسے انسان کی بے عزتی نہیں کرنی چاہیے جو اپنی قوم میں باعزت سمجھا جاتا ہو۔ اگر کوئی کافر اپنے معاشرے میں باعزت سمجھا جاتا ہے اور وہ مسلمانوں کے پاس ان کی محفل میں آتا ہے تو اس کافر کی عزت ہونی چاہیے۔ یہ حدیث ہمیں آداب سکھا رہی ہے۔ ایسے شخص کی بے عزتی نہیں کی جائے گی، نہ اس کا مذاق اُڑایا جائے گا اور نہ اس کی تحقیر کی جائے گی۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی قیام الرجل للرجل

آج بے ادبی کا کلچر عام ہے:

آج آپ دیکھیں کہ بے ادبی کرنا دنیا کا رواج ہی بن گیا ہے۔ ہر ایک کی بے ادبی کی جاتی ہے، ہر ایک پر جملے کسے جاتے ہیں، ہر ایک کا مذاق اُڑایا جاتا ہے، طنز کیا جاتا ہے یہاں تک کہ ان کی برائیوں کو اُچھال کر اُن پر کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ یہ عبث کام ہے اور مغرب کی تقلید ہے، وہاں تو پیغمبروں کو بھی نہیں چھوڑا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسی معزز اور محترم ہستیوں پر مزاحیہ فلمیں بنائی گئی ہیں گویا نعوذ باللہ ان عظیم پیغمبروں کی کوئی وقعت ہی نہیں ہے۔

بڑوں کا ادب کیسے ہو:

اسلام ہمیں ادب سکھاتا ہے کہ جب بڑے بات کریں تو بیچ میں بات نہ کاٹی جائے بلکہ بات مکمل ہو جانے کے بعد اظہارِ خیال کیا جائے۔ بعض دفعہ معمّر افراد ٹھہر ٹھہر کر اور دُہرا دُہرا کر بات کرتے ہیں، ان کی بات صبر سے سنی جائے، بات مکمل ہونے کا انتظار کیا جائے۔ مکہ میں ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف رکھتے تھے کہ ولید بن مغیرہ آیا اور اُس نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بات شروع کی کہ ''بھتیجے تم نے یہ کیا کیا! مکہ کے گھر گھر میں فساد برپا کر دیا! تم نے ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہا'' اور اسی طرح کی باتیں کرتا رہا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے عمر میں چھوٹے تھے مگر رُتبے میں کتنے بڑے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے کتنے پیارے رسول تھے اور وہ اللہ کا دشمن تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بات نہیں کاٹی بلکہ صبر اور خاموشی سے پوری بات سنی۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی بات کہہ چکا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ''ابو ولید آپ کی بات مکمل ہو گئی؟'' اس نے کہا ''جی ہاں ہو گئی'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی بات کا جواب دیا۔

تو اسلام ہمیں آداب سکھاتا ہے۔ یہ ایک طرح کا چھوٹوں کا تکبر ہے کہ وہ بڑوں پر ہنسنا شروع کر دیں کہ پتہ نہیں کیا بولے چلے جا رہے ہیں؟ بار بار ایک ہی بات دہرائے چلے جاتے ہیں۔ یہ بھی بے ادبی ہے۔ بڑوں کی بات مکمل ہونے کا انتظار کریں، توجہ سے سُنیں۔

اسی طرح بڑوں کے ادب میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اُنہیں دُور سے مخاطب نہ کیا جائے بلکہ قریب جا کر بات کی جائے اور شائستگی کے ساتھ نرم لہجے میں گفتگو کی جائے۔ یہ زیادہ مناسب طرزِ عمل ہے اور یہ اسلامی تہذیب جو کہ سنتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیاد پر قائم ہوئی ہے اس میں بھی پسندیدہ ہے۔

بڑوں کے قریب جا کر آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے بات کرنے کی ہدایت عام حالات میں ہے، ہنگامی صورتحال کے دوران نہیں۔ غیر معمولی حالات میں آواز بڑھائی جا سکتی ہے۔ ایک اور

بات جو بڑوں کے ادب میں آتی ہے وہ یہ کہ بڑوں سے بحث نہ کی جائے۔ اگر وہ غلطی پر ہیں اور بات نہیں سمجھ پا رہے تو اُن کے لیے دعا کر کے انسان خاموش ہو جائے، ان سے الجھنا صحیح نہیں ہے، تنقیدی انداز سے گریز کرنا چاہیے۔

شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتے ہوئے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے کہ اُن کی بات مانی جائے، ادب کے ساتھ اطاعت لازم ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ کسی کا ادب کیا جائے اور اس کی بات نہ مانی جائے؟

اسلاف میں علماء اور اساتذہ کی عزت:

ایک واقعہ ہے کہ ایک بار حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے ایک جنازے میں شرکت فرمائی۔ نماز جنازہ کے بعد آپ رضی اللہ عنہ کی سواری کے لیے ایک خچر لایا گیا تو حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فوراً آگے بڑھ کر رکاب تھام لی۔ یہ دیکھ کر حضرت زید رضی اللہ عنہ ذرا ٹھٹکے اور فرمایا اے میرے آقا کے ابن عم! میری سواری کی رکاب تھام کر آپ تکلیف نہ فرمائیں۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کون تھے؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کے بیٹے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا زاد بھائی تھے، اِس لحاظ سے ان کا بڑا مقام تھا تو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اطمینان سے بیٹھیے علمائے دین کی اِسی طرح عزت کرنی چاہیے۔

اسی طرح ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید نے اپنے بیٹے سے کہا کہ تم اپنے استاد کی جوتیاں اُٹھایا کرو۔ چنانچہ اِس سے پہلے کہ اُستاد مجلس سے اُٹھ کر جاتے یہ شہزادہ دوڑ کر استاد کی جوتیاں اُٹھالیتا تھا، اس قدر استاد کی عزت ہوا کرتی تھی۔

ایک دفعہ ہارون رشید آیا اور اس نے دیکھا کہ اُستاد صاحب وضو کر رہے ہیں اور شہزادہ پانی ڈال رہا ہے اور وہ اپنے ہاتھ سے پاؤں مَل رہے ہیں تو خلیفہ ہارون ناراض ہوا اور اپنے بیٹے سے کہنے لگا کہ ایسا کیوں نہ ہوا کہ ایک ہاتھ سے تو پانی ڈالتا اور دوسرے ہاتھ سے اُستاد کا پاؤں دھوتا۔

یہ اسلام کا معیارِ ادب ہے۔ آپ خود تصور کریں وہ معاشرہ کتنا خوش گوار ہوگا کہ جہاں اساتذہ کی ایسی عزت ہوتی ہوگی، کیا بلند اور پاکیزہ اخلاق ہوں گے۔

ادب اور حکم میں تصادم:

حکم کی بجا آوری اور ادب دونوں بہت ضروری ہیں لیکن اگر کبھی صورت حال ایسی بن جائے کہ بڑوں کا ادب اور حکم آپس میں متصادم ہو جائیں اور متضاد ہوں تو آیا ادب کا خیال رکھا جائے گا یا

حکم ملحوظ رکھا جائے گا؟ تو قانون یہ ہے۔ ''اَلْاَمْرُ فَوْقَ الْاَدَبْ'' یعنی حکم کو ادب پر فوقیت دی جائے گی۔ تعظیم کا تقاضا ہے کہ جب کوئی بڑا کسی بات کا حکم دے، چاہے اُس پر عمل کرنا ادب کے خلاف معلوم ہو رہا ہو، ایسی صورت میں حکم کی فوقیت ہوگی، حکم مانا جائے گا۔ مثلاً کچھ لوگ کسی بزرگ کا ہاتھ ادب کی وجہ سے چومنا چاہتے ہیں لیکن بزرگ کو پسند نہیں کہ کوئی میرا ہاتھ چومے۔ انہوں نے اس سے منع کر دیا تو پھر نہیں چومنا۔

یا بعض دفعہ لوگ ادب کی وجہ سے کسی کا سامان اُٹھانا چاہتے ہوں یا اُستاد کی عزت میں ان کی جوتیاں سیدھی کرنا چاہتے ہوں لیکن استاد کو نہیں پسند، وہ نہیں چاہتے کہ کوئی میرا سامان اُٹھائے یا میری جوتیاں سیدھی کرے اور انہوں نے ایسا کرنے سے منع بھی کر دیا تو ادب کا تقاضا ہے کہ حکم مانا جائے اور اس عمل سے باز رہا جائے۔

شاہجہاں کے دو بیٹے عالمگیر اور داراشکوہ بادشاہت کے خواہاں تھے۔ ایک دفعہ یہ دونوں باری باری ایک ہی بزرگ کے پاس گئے کہ وہ اُن کے لیے بادشاہت کی دعا کریں۔ پہلے داراشکوہ گئے۔ بزرگ تخت پر بیٹھے تھے، داراشکوہ جا کر تخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ انہوں نے داراشکوہ سے کہا میرے پاس آجاؤ تو داراشکوہ نے جواب دیا کہ میری مجال نہیں کہ میں آپ کے برابر میں تخت پر بیٹھ جاؤں۔ بزرگ کے اصرار کے باوجود نہیں مانے اور نیچے ہی بیٹھے رہے۔ اس کے بعد عالمگیر آئے۔ وہ بھی نیچے آ کر بیٹھ گئے۔ بزرگ نے ان سے بھی یہی فرمایا کہ میرے پاس تخت پر آجاؤ۔ جب بزرگ کا حکم ہوا تو عالمگیر فوراً اُٹھ کر تخت پر اُن کے پاس جا بیٹھے۔ اُن کے جانے کے بعد بزرگ نے فرمایا کہ دونوں بھائیوں نے اپنا فیصلہ خود ہی کر دیا۔ داراشکوہ کو تخت پیش کیا گیا اُس نے انکار کیا، عالمگیر کو پیش کیا گیا اس نے قبول کر لیا۔

خُلاصہ یہ ہے کہ جو حکم دیا جائے وہ مان لینا چاہیے، چاہے اس سے ادب میں کمی آ رہی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ شاگرد یا ماتحت وغیرہ ادب کی وجہ سے یا تعظیم کی وجہ سے کوئی کام کر رہے ہوں اور اُستاد یا عمر میں بڑا یا رُتبے میں بڑا شخص اُس چیز سے گھٹن محسوس کر رہا ہو، اُس کو پریشانی ہو رہی ہو، بے اطمینانی محسوس کر رہا ہو تو پھر انسان ایسا کرنے سے باز آجائے۔ کسی نے کہا ہے:

عشق تسلیم و رضا کے ما سوا کچھ بھی نہیں
وہ وفا سے خوش نہ ہوں پھر وفا کچھ بھی نہیں

اگر اُن کو وفا نہیں چاہیے، وفا سے خوش نہیں تو پھر ایسی وفا سے کیا فائدہ۔ اسی طرح ایسے ادب کا

کیا فائدہ جو دوسرے کو پریشانی اور اُلجھن میں مبتلا کر رہا ہو۔

جب بڑوں کا صحیح معنی میں ادب ہوگا تو ساتھ ہی ان کے احکامات کا بھی ادب ہوگا۔ جو بڑے حضرات احکامات دیتے ہیں اُنہیں ہم قانون بھی کہہ سکتے ہیں۔ بڑے حضرات قوانین بناتے ہیں اور ان کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ان کے احکامات کو بے چون و چرا مانا جائے۔

(ر) قوانین کا احترام:

اگر ہم حکومت کا ادب کریں گے تو حکومت کے قانون کا بھی ادب کریں گے، مثلاً اشارہ (signal) نہیں توڑیں گے اس لیے کہ یہ بھی ایک طرح کی بے ادبی ہے کہ قوانین کو جب چاہے پامال کر دیں۔ اسلام نے تو قانون کا ادب کرنے کا حکم دیا ہے اور جو قانون کا ادب کرے گا وہ اپنے لیے اصولوں میں تبدیلی نہیں چاہے گا کہ میری وجہ سے فلاں قانون تبدیل کر دیا جائے یا یہ کہ یہ قوانین سب کے لیے ہیں مگر میرے لیے نہیں۔ دراصل یہ بھی اَنَا کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے کہ کوئی خود کو قانون سے بالاتر سمجھ بیٹھے، جب کہ دیگر لوگ ان کا احترام کرنے والے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو اتنا اہم سمجھے کہ سب قوانین میری آسانی کے لیے ہیں اور میری ذات کے اردگرد گھومتے ہیں اور صرف میرے فائدے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ اس کے برعکس وہ لوگ جن کی ''اَنَا'' متوازن ہے وہ قوانین میں تبدیلی نہیں چاہتے بلکہ اپنے آپ کو مقیّد (bound) محسوس کرتے ہیں۔ جب قانون کا ادب اور احترام ہو تو قانون کی خلاف ورزی بھی نہیں ہوگی۔ شریعت کیا ہے؟ اللہ کا دیا ہوا قانون ہے، حدود ہیں۔ اللہ کا ادب ہوگا تو شریعت کا ادب ضرور ہوگا، انسان کے دل میں اس کا لحاظ ہوگا۔

نبی اکرم ﷺ ایک حدیث میں یہ مضمون بیان فرماتے ہیں کہ

(مَثَلُ الْمُؤْمِنِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ عَلَى آخِيَّتِهِ يَجُولُ ثُمَّ يَرْجِعُ إِلَى آخِيَّتِهِ) (۱)

''مومن کی مثال ایک گھوڑے کی سی ہے جو کہ بندھا ہوا ہے جتنی رسی اجازت دیتی ہے اتنا وہ گھوڑا چر چُگ لیتا ہے۔ اس رسّی کی لمبائی کے اندر اندر رہ کر گھوم پھر لیتا ہے۔''

مثال کے طور پر ایک گھوڑا ایک میٹر کی رسی سے بندھا ہوا ہے اب گھوڑے کا دل چاہے گا تو آدھے میٹر پر بیٹھ جائے، پون میٹر پر چلا جائے وہیں بیٹھے، چرے، سو جائے، لیکن رہے گا وہ ایک میٹر کے دائرے کے اندر اندر ہی، یہ حدود پامال نہیں کرے گا۔ مومن کی مثال بھی ایسی ہی ہے۔ شریعت کے دائرے کے اندر اندر رہتا ہے، قانون توڑ کر پھلانگتا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا

(۱) صحیح البخاری، کِتَاب الْأَحْكَامِ، بَاب كَيْفَ يُبَايِعُ الْإِمَامُ النَّاس

ہے:{تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا} (البقرۃ: ۲۲۹) ’’یہ اللہ کی قائم کردہ حدود ہیں انہیں مت پھلانگنا۔‘‘ انسان خود کو پابند محسوس کرے، مادر پدر آزاد نہیں ہے، یہاں تک کہ ایک آیت کے مطابق ان حدود کے قریب بھی نہیں پھٹکنا چاہیے۔ جب اپنے آپ کو پابند کر لے گا تو قوانین کے بارے میں شکایتیں بھی پیدا نہیں ہوں گی۔

قانون کے فوائد:

قانون بنانے کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے اجتماعیت حاصل ہوتی ہے، اجتماعی کام آسان ہوجاتے ہیں اور سب کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جاتا ہے، سب سے برابری کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو قانون کا پابند بناتا ہے تو اس میں اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے یعنی قانون کی پابندی سے بہت سی مثبت خوبیاں ابھرتی ہیں۔ اگر قانون فائدہ مند چیز نہ ہوتا تو ازل سے ہی اس کا وجود نہیں ہوتا۔ یہ قوانین انسانی زندگی کا حصہ ہیں۔ اللہ نے بھی شریعت کی شکل میں قوانین دیئے ہیں اور انسان بھی معاملات کو چلانے کے لیے قوانین بناتے ہیں۔ چھوٹے سے چھوٹے ادارے کے بھی کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ گویا کہ انسانی معاشرے کے لیے ترتیبِ قانون ایک امرِ ناگزیر ہے۔ اور اس سے بہت سی مثبت صلاحیتیں پروان چڑھتی ہیں۔ عزم پیدا ہوتا ہے، اطاعت کا جذبہ ابھرتا ہے، قربانی کا جذبہ پروان چڑھتا ہے، صبر واستقلال پیدا ہوتا ہے۔ انسان کی اَنَا اپنے مقام پر قائم رہتی ہے اور ایسے معاشرے کا ہر فرد ایک منظم فرد بن جاتا ہے۔ مساوات کی فضا پیدا ہوتی ہے اور پھر جو انسان اپنے آپ کو قانون کی اطاعت اور پیروی کا عادی کر لیتا ہے تو مشکلات اور دِقت کے باوجود وقت پر کام کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ مسلمانوں کی عظیم الشان فتوحات، جن کا نقطۂ آغاز غزوۂ بدر تھا، یہ عظیم کامیابیاں تنظیم واطاعت کے بدولت حاصل ہوئیں۔

اسی طرح قانون کا ادب کیا ہے؟ قانون کا ادب یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے۔ ایسے قانون کا کیا فائدہ جسے ہر شخص توڑنے پر کمر بستہ ہو۔ اُس قانون کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی کوئی برکت ہے۔ معاشرے کے کچھ لوگ اگر قانون توڑتے ہیں تو باقیوں میں غم وغصہ پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ انتشار کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس لیے قانون کو برقرار رکھنے کے لیے اور اس کے ثمرات اور برکات حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ سب لوگ اس پر عمل کریں۔ خود کو پرسکون رکھنے کے

لیے بھی قانون کا ادب نہایت ضروری ہے ورنہ انسان جھنجلاہٹ میں مبتلا رہتا ہے۔ ماحول میں امن و سکون کے بجائے تنازع کی فضا رہتی ہے۔ اگر قانون کا ادب اور اطاعت نہ کی جائے تو ہر وقت ٹکراؤ، بدگمانی اور غصے کی کیفیت رہتی ہے۔ جس کے نتیجے میں انفرادی اور اجتماعی امور کی کیفیت شدید متاثر ہوتی ہے۔

اسلام میں پابندی، اطاعت اور نظم و نسق:

اسلام کے جملہ انفرادی و اجتماعی احکام میں ہمیں ایک نظم وضبط کا احساس ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ نماز میں صفوں کی درستگی بھی لوگوں کے اندر نظم پیدا کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ میدانِ جنگ ہو یا باجماعت نماز ہو مسلمانوں کو صفیں درست کرنے کی عادت ڈالی گئی۔ جب نبی اکرم ﷺ کا انتقال ہوا تو لوگ صفیں بنا بنا کر حجرے میں جاتے، نماز جنازہ پڑھتے اور باہر نکل آتے تھے۔ تمام لوگ منظم اور پُرسکون رہے۔ کوئی ہڑبونگ نہیں مچی، نہ دھکم پیل ہی ہوئی کہ لوگ پیروں تلے روندے جا رہے ہوں۔ ایسا کچھ نہیں تھا۔ ان کو ایسی اطاعت کی، قانون کی پابندی (discipline) کی عادت پڑ گئی تھی۔

نبی اکرم ﷺ لوگوں سے جو بیعت لیا کرتے تھے اس کے الفاظ بھی نظم وضبط کی اعلیٰ مثال ہیں۔

((بَايَعْنَا رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ ، وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَأَنْ لَا نُنَازِعَ الْأَمْرَ أَهْلَهُ وَأَنْ نَقُومَ أَوْ نَقُولَ بِالْحَقِّ حَيْثُمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) (۱)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے کہ ''ہم حکم سنیں گے اور مانیں گے (مسلمانوں کو قانون پر تنقید کی عادت نہیں تھی، قانون کو ماننے کی عادت تھی)، خواہ مشکل ہو یا آسانی، خواہ ہماری طبیعت کو خوش گوار لگے خواہ ناگوار لگے، اور جس کو بھی ہم پر امیر بنایا جائے گا ہم اس سے جھگڑیں گے نہیں اور ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور اللہ کے معاملے میں حق کہنے سے ہم ہرگز نہیں ڈریں گے، نہ کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کو خاطر میں لائیں گے۔''

یہاں غور کریں کہ ہر نکتہ پر کتنا زور ہے، چاہے دل چاہے یا نہ چاہے۔ چاہے خوش اور راضی ہوں چاہے ناخوش اور ناراض ہوں، مشکل ہو یا آسانی ہو، ہم اطاعت کریں گے۔

تو اسلام مسلمانوں کا اعتراض کرنے والا مزاج نہیں بناتا، ہر چیز کو رد کرنے کے لیے مت

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب کیف یبایع الامام الناس

کھڑے ہوجاؤ۔ ہر قانون کی اصلاح کی ذمہ داری اپنے سر مت لو۔ جب انسان قانون کی اصلاح کی فکر میں لگ جاتا ہے تو وہ اطاعت نہیں کرتا، وہ کہتا ہے کہ قانون درست ہی نہیں ہے اس کی اطاعت کیا کریں تو قانون پر تنقید کرنا بھی بے ادبی کا ایک مظہر ہے۔ سورۃ النور آیت نمبر ۶۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ اِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰۤى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ یَذْهَبُوْا حَتّٰى یَسْتَاْذِنُوْهُ }

''بے شک مومن تو بس وہی لوگ ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر اور جب وہ ہوتے ہیں اُن کے ساتھ کسی اجتماعی کام پر وہ نہیں جاتے جب تک وہ اجازت نہ لے لیں نبی ﷺ سے۔''

اگر کوئی غیر معمولی صورت حال پیدا ہوگئی ہے تو آپ ﷺ سے اجازت مانگے بغیر نہیں جاتے۔

سورۃ النساء آیت ۵۹ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

{ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ }

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول اللہ ﷺ کی اور اُن لوگوں کی کہ جو تمہارے معاملے کا اختیار رکھتے ہیں۔''

جن کے پاس کوئی عہدہ، کوئی رتبہ، کوئی مرتبہ ہے اور انہوں نے کوئی قانون بنایا ہے تو اس کی اطاعت کرنی ہوگی۔ دراصل اطاعت کرنا اَنا کو بہت ناگوار گزرتا ہے۔ جس کی اَنا حد سے بڑھی ہوئی ہے اس پر اطاعت سے بھاری اور کوئی چیز نہیں ہوتی لیکن جب انسان اپنی اَنا کو قابو کرتا ہے تو وہ با ادب ہوجاتا ہے، اطاعت گزار ہوجاتا ہے، ادب کرنے کی اُس کو عادت ہوجاتی ہے، قوانین کا ادب کرتا ہے اور پھر یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی جذباتی یا غیر معمولی صورتِ حال پیدا ہوجائے تو ادب کی عادت انسان کے کام آتی ہے۔

عادتوں کو فطرت کے قریب کیا جائے:

فطرت اور جبلّت میں سے ادب کا تعلق فطرت سے ہے۔ ہم سمجھ چکے ہیں کہ جانوروں کے اندر فطرت نہیں ہوتی بلکہ صرف جبلّت ہوتی ہے جب کہ انسانوں میں فطرت بھی ہوتی ہے اور اسی فطرت اور جبلت کے امتزاج سے عادتیں وجود میں آتی ہیں تو کیوں نہ ہم اپنی عادتوں کو فطرت کے قریب لے جائیں۔ یہ چیز انسان کو بہت فائدہ دیتی ہے اور کڑے وقت میں انسان کو سنبھال لیتی

ہے۔ سیرت النبی ﷺ میں اس کا مظاہرہ صلح حدیبیہ کے موقع پر ملتا ہے۔ چونکہ مسلمانوں کو اطاعت کرنے کی عادت تھی لہٰذا اس عادت نے مسلمانوں کو اس آزمائش کے موقع پر فساد سے بچا لیا۔ صلح حدیبیہ کی شرائط سے مسلمان بالکل خوش نہیں تھے، لیکن نظم وضبط کی عادت تھی اسی لیے اس کٹھن وقت میں بھی اطاعت کر گئے۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۲۶ میں فرمایا ہے:

{اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ فَاَنْزَلَ اللّٰہُ سَکِیْنَتَہٗ عَلٰی رَسُوْلِہٖ وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَاَلْزَمَھُمْ کَلِمَۃَ التَّقْوٰی}

''جب رکھ لی اُن لوگوں نے جنھوں نے کفر کیا اپنے دلوں میں ضد جو جاہلیت کی ضد تھی تو نازل کی اللہ نے اپنی تسکین اپنے رسول اور مومنوں پر اور قائم رکھا اُنہیں تقویٰ کی بات پر۔''

اس بھلی عادت کی وجہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تقویٰ اور احسان کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوئے، درحقیقت تقویٰ بغیر ادب کے نہیں آ سکتا۔

''ادب'' اور ''احترام'' :

لفظ ''ادب'' دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے، ظاہری اعتبار سے اور معنوی اعتبار سے۔ یعنی ادب کا ایک تعلق جسمانی حرکات سے ہے اور دوسرا تعلق دل کی کیفیت سے ہے۔ ان دونوں کے لیے ہم دو مختلف الفاظ استعمال کرتے ہیں یعنی ادب اور احترام۔ ''ادب'' کا تعلق ظاہری رویّہ سے ہے اور ''احترام'' کا تعلق قلب سے ہے۔

ابھی تک ہم نے ادب کے موضوع پر بات کی ہے، اب احترام پر ذرا روشنی ڈالتے ہیں۔ لفظ ''احترام'' بنا ہے حرمت سے جس کے معنی ہیں کسی چیز کی عظمت کی وجہ سے اس کی تعظیم کرنا۔ اگر دل کے اندر عزت واحترام ہے تو وہ خود بخود چھلکے گا۔ اصل ادب تو یہ ہے کہ دل میں بھی احترام ہو اور جسم کی حرکات وسکنات سے بھی اس کا اظہار ہو، نہ کہ دکھاوا یا بناوٹی عزت واحترام۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ انسان ہر ایک کا دل سے احترام نہیں کر سکتا۔ جن لوگوں کا ادب کرنے کا تقاضا ہوتا ہے بعض دفعہ دل میں ان کا احترام نہیں ہوتا۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ایسے وقت میں انسان کیا کرے؟ ایسے وقت میں انسان کو مناسب رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ اگر دل میں کسی شخص کے لیے احترام نہیں ہے تو کم از کم رویّے سے اس کا اظہار نہ ہو، اس سے کم از کم معاشرے میں امن رہتا ہے۔

مثال کے طور پر کچھ مہمان آتے ہیں۔ مہمانوں کا ادب اور حق یہ ہے کہ خوش دلی سے اُن کا استقبال کیا جائے، خوش آمدید کہا جائے۔ لیکن اگر کچھ ایسے لوگ آجائیں جن کا دل میں احترام نہیں ہے، جنہیں دیکھ کر زیادہ خوشی نہیں ہوئی لیکن ایک عادت ہے کہ ملنے والوں سے مسکرا کر ملنا ہے، یہ فطرت بن گئی ہے تو ہم اُن سے عادتاً مسکرا کر بات کریں گے، اُن سے اچھی طرح سے پیش آئیں گے، اپنی حرکات اور سکنات سے ظاہر نہیں کریں گے کہ ان کا آنا پسند نہیں آیا۔ بچپن سے ہمیں جو آداب سکھائے جاتے ہیں وہ ہمارے بہت کام آتے ہیں۔ پھر ہم دوسروں کو اُن کا مقام تو کم از کم دے ہی دیتے ہیں، بے عزتی نہیں کرتے۔ جو کچھ سکھایا گیا ہے، جس کی تربیت ہو چکی ہے وہی رویّہ غیر شعوری طور پر سرزد ہوتا ہے۔

بچوں کو عادت ڈالنی چاہیے کہ بڑوں کے سامنے زبان درازی نہ کریں اور نہ ان کو پلٹ کر جواب دیں۔ جب یہ عادت گھٹی میں ڈال دی جاتی ہے تو پھر زندگی میں ہر طرح کے لوگوں کے ساتھ رہنا آسان ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھار لڑکیوں کو ایسے سسرالیوں سے واسطہ پڑتا ہے، جہاں کچھ لوگ اچھے نہیں لگتے تو انسان اپنے مناسب رویّہ کی وجہ سے بہت ساری تلخیوں سے بچ جاتا ہے، بے ادبی کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ جو لوگ بڑوں کو منہ در منہ جواب نہیں دیتے انھیں بعد میں پشیمان نہیں ہونا پڑتا۔ اور پچھلے دور میں یہ بہت بڑی خاصیت سمجھی جاتی تھی۔ اب یہ معیار بدل دیا گیا ہے اور بے ادبی کو اعتماد کہہ دیا گیا ہے۔ بدتمیزی کو خود اعتمادی کہہ دیا گیا ہے تو معاملات بھی تلپٹ ہو گئے۔ جب کوئی بدتمیز اور بے ادب ہو اور اس کی اسی وجہ سے عزت ہونے لگ جائے، ان کمزوریوں یا برائیوں کو اچھے اچھے نام دے دیئے جائیں تو پھر لوگ کسی کا بھی ادب نہیں کرنا چاہیں گے لہٰذا ادب کرنا ضروری ہے۔

ادب کرنا بے چارگی، کمزوری یا بزدلی کی علامت نہیں ہے۔ ادب وہی لوگ کرتے ہیں جن کے اندر بھرپور طاقت ہوتی ہے اور جو اندر سے بااعتماد ہوتے ہیں، ورنہ زبان تو سب کے پاس ہے اور اس کو چلانا بھی کوئی بڑی بات نہیں ہے لیکن انسانیت یہ ہے کہ انسان زبان اپنے قابو میں رکھے۔ ورنہ اگر اس کو قابو میں نہ کیا تو ہم جانوروں کی سطح پر گر جائیں گے، کیوں کہ جانور ایک دوسرے پر غرّاتے ہیں، ادب نہیں کرتے۔ یہ بدتمیزی اور بے ادبی تو جانوروں کی عادت ہے کہ گوشت کے ٹکڑے کی خاطر ایک دوسرے پر غرّاتے ہیں، حملہ کرتے ہیں، چھینا جھپٹی کرتے ہیں۔ زبان درازی

کی عادت انسانی معاشرے میں نہیں ہونی چاہیے۔

استاد کے آگے زبان درازی کرنا، شکلیں بنانا، پیٹھ پیچھے ان کا مذاق اڑانا، یا صدرِ مملکت کا مذاق اڑانا، یا ماں باپ کو ترکی بہ ترکی جواب دینا، اچھی عادتیں نہیں، اچھا اخلاق نہیں۔ اس سے اصلاح نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سے بہت دعا کرنی چاہیے کہ اللہ ہم تمام مسلمانوں کو مُؤَدِّب بنادے۔

اَنا

تزکیہ کے تعارف اور ادب کے موضوع کے بعد چند مزید عنوانات زیرِ مطالعہ رہیں گے۔ اس ضمن میں پہلا عنوان ''انا'' ہے۔

تزکیہ کا عمل ایک مالی کے کام سے بہت ملتا جلتا ہے۔ مالی کچھ پودے لگاتا ہے اور وہ چاہتا ہے کہ ان پودوں کو غذا ملے اور یہ صحت مند ہوں، خوبصورت ہوں، پھلیں پھولیں۔ اس کے علاوہ جو بھی جھاڑ جھنکار چاروں طرف اُگتی ہے، ان غیر ضروری اور نقصان دہ جھاڑیوں کو مالی صاف کرتا رہتا ہے، اکھاڑتا رہتا ہے، تاکہ یہ جھاڑ جھنکار مٹی کی قوتِ نمو، سورج کی روشنی اور پانی و ہوا میں حصہ دار نہ بن جائے، لہٰذا وہ مسلسل صفائی اور چھٹائی کرتا رہتا ہے، تاکہ پودے اچھے اور صحت مند رہیں اور پروان چڑھیں، تزکیہ بھی دراصل یہی عمل ہے یعنی کسی چیز کو نشوونما دینا اور غلط چیزوں کو اُس کے پاس سے دُور کرتے رہنا۔ مومن کا کام بھی مالی کے کام جیسا ہی ہوتا ہے۔ مومن چاہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو صلاحیتیں مجھ میں رکھی ہیں اور جو وقت مجھے عطا کیا ہے وہ وقت اور صلاحیتیں نیکیوں کو پروان چڑھانے میں کام آئیں تاکہ یہ گناہوں کے کاموں میں استعمال نہ ہوں۔ کسی بزرگ نے بہت ہی پیاری بات کہی ہے: ہر انسان اللہ کا لگایا ہوا ایک چھوٹا سا باغ ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ اس باغ کے اندر نیکیوں کے رنگ برنگے پھول کھلیں، نیکیوں کی بہار آئے، انسان نیک اعمال کی خوشبو سے معطر ہو اور گناہوں کی خزاں سے، گندے کاموں کی نجاست سے دور رہے اور برے کاموں کی بُو سے پاک صاف رہے۔ اپنے آپ کو برائیوں سے پاک کرنا اور نیکیوں سے آراستہ کرنا دوطرفہ عمل ہے اور اسی کا نام تزکیہ ہے۔ اپنی ذات کا تزکیہ کرنے کے لیے خودشناسی یعنی اپنی پہچان بہت ضروری ہے۔

اَنا عربی زبان کا لفظ ہے، اس کا مطلب ہے، ''مَیں۔'' اس کائنات میں موجود تمام مخلوقات کے اندر ''میں'' کا احساس نہیں سوائے انسانوں اور جنّات کے، لیکن ہم اپنی گفتگو کا دائرہ صرف انسان تک محدود رکھیں گے۔ انسانوں میں خودشعوری (self conscious) کا احساس موجود ہے۔ باقی جتنی مخلوقات ہیں وہ شعور تو رکھتے ہیں، انکے اندر حس بھی ہے مگر خودشعوری نہیں ہے۔ خود

شعوری صرف اور صرف انسانوں یا جنوں میں ہے۔ اللہ نے انسان میں انا رکھی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انسان خود کو پہچانے، اللہ کی مخلوقات میں اپنا مقام پہچانے، وہ یہ مشاہدہ کرے کہ اس پوری کائنات میں میرا کیا مقام و مرتبہ ہے؟ (where do I stand) اس عالم شہادت کی تمام مخلوقات میں ''مَیں'' کہاں کھڑا ہوں؟ تبھی وہ اپنے مقام اور مرتبے کو پہچان سکے گا، تب ہی ان سے درست اور متوازن تعلق قائم کر سکے گا اور اس طرح وہ یہ جان سکے گا کہ کس کا مجھ پر کتنا حق ہے اور میرا دوسروں پر کیا حق ہے اور اسی طرح اپنی ذمہ داری کا بھی احساس ہوگا۔

اللہ کی کتاب میں بہت سی مخلوقات کا ذکر ہے۔ مثلاً پودوں اور پیڑوں کا، پہاڑوں کا، زمین و آسمان کا، سمندری مخلوقات کا، حشرات الارض کا، فرشتوں اور جنّات وغیرہ کا۔ غور کریں تو انسان کسی نہ کسی اعتبار سے ان سب کے ساتھ متعلق ہے۔ اسی طرح عناصرِ فطرت اور عاقل مخلوقات یعنی فرشتوں اور جنوں کے ساتھ بھی اس کا تعلق رہتا ہے۔ لیکن انسان کے سوا کسی مرئی مخلوق میں ''انا'' نہیں ہے، اپنے کچھ ہونے کا احساس نہیں ہے۔ وہ اپنے بارے میں نہیں سوچتے کہ میں کون ہوں اور کیسا لگ رہا ہوں؟ جب کہ انسان یہ سب کچھ سوچتا ہے۔ وہ اپنی ذات کے بارے میں حسّاس ہے، اُسے اپنی ذات کا شعور ہے۔ اسی طرح اپنی ہستی کا، اپنے ''میں'' ہونے کا احساس ہے۔ انسان کو اپنے ایک شخص ہونے کا احساس ہے۔ وہ خود کو جانچ سکتا ہے۔ وہ اپنا محاسبہ کر سکتا ہے کہ میں یہ کام کرتے ہوئے اچھا لگ رہا ہوں یا نہیں۔ میں فلاں سوٹ پہن کے اچھا دِکھ رہا ہوں یا نہیں۔ خود شعوری کی ایک جھلک آئینہ دیکھنے سے نظر آتی ہے، مخلوقات میں صرف انسان ہی شیشہ دیکھنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ اُسے کہیں شیشہ نظر آجائے تو فوراً خود کو سر سے پاؤں تک دیکھ ڈالتا ہے جب کہ کوئی جانور یا کوئی دیگر مخلوق آئینہ دیکھ کر خود کو درست کرنے کی فکر نہیں کرتی۔ یہ تو صرف انسان کا خاصّہ ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ وہ کیسا لگ رہا ہے۔ انسان چاہتا ہے کہ وہ اچھا لگے اور یہ اسی ''اَنا'' کا نتیجہ ہے۔ پس اَنا بہت ضروری چیز ہے۔ اسلام ہماری اَنا کو مٹانے نہیں آیا بلکہ اُسے اس کے صحیح مقام پر رکھنے آیا ہے اور شریعت اس معاملے میں ہماری مددگار ثابت ہوتی ہے۔ انا کو کچل دینا، ختم کر دینا مقصد نہیں ہے۔ نہ اس کو بالکل مٹانا ہے اور نہ حد سے بڑھانا ہے بلکہ مناسب اور معتدل رکھنا ہے۔ اس خود شعوری کی بنا پر انسان اپنی ذات کے بارے میں فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے کیا چیز فائدہ دے گی اور کیا نقصان، کیا کروں اور کیا نہ کروں اور اسی قوتِ فیصلہ کی بنا پر ہی اللہ کے ہاں

اس کا محاسبہ ہوگا۔

{فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ} (الکھف: ۲۹)

''پس جو چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر کرے۔''

ایمان لانے پر جزا ہے جب کہ ایمان نہ لانے پر سزا ہے۔ اس لیے کہ ایمان لانا یا نہ لانا اس کے فیصلے پر منحصر ہے، اس کی اپنی پسند ہے۔ جانوروں کے لیے کوئی جزا و سزا نہیں ہے اس لیے کہ جانور تو صرف جبلّت پر عمل کرتے ہیں۔ وہ شعور کے ساتھ فیصلے نہیں کرتے، وہ تو بس سُدھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

انسانی امتحان کے لیے شعورِ ذات واختیار:

انسان چونکہ شعور سے فیصلے کرتا ہے اور یہی شعور واختیار اس کے امتحان کی وجہ ہے۔ دنیا میں انسان کا امتحان ہو رہا ہے۔ سورۃ الملک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{الَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا} (الملک: ۲)

''اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس نے زندگی اور موت کو پیدا کیا تاکہ وہ تم کو آزمائے کہ کون تم میں سے اچھے عمل کرتا ہے۔''

دنیا میں انسان امتحان کے لیے بھیجا گیا ہے، سو اس میں انا کا ہونا بھی ضروری ہے تاکہ اس میں فیصلے کی قوت، ارادے کی طاقت، اچھے برے کی پہچان اور پسند و ناپسند کے معیارات ہوں، ورنہ امتحان نہیں ہو پاتا اور انسان بھی ہواؤں، پہاڑوں اور دریاؤں یا جانوروں کی طرح ایک بے اختیار مخلوق بن کر رہ جاتا۔ اسی لیے انسانوں میں کوئی ایسا نہیں ہے جس کو اپنے ''مَیں'' ہونے کا احساس نہیں، جس کو اپنے شخص ہونے کا احساس نہیں، جس میں انا نہیں۔ کیوں کہ اگر انا نہیں تو اللہ کے ہاں اس کا محاسبہ بھی نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص پاگل ہو جائے تو اس کی کوئی شخصیت نہیں رہتی۔ پاگلوں میں انا نہیں ہوتی، ان میں اپنی ذات کے بارے میں کوئی شعور نہیں ہوتا۔ لہٰذا اللہ کے ہاں پاگلوں کا کوئی محاسبہ، کوئی حساب کتاب، کوئی پوچھ گچھ نہیں ہے۔

اللہ کی ''انا'' اور انسان کی ''انا'':

جہاں تک اس لفظ ''انا'' کا تعلق ہے تو اللہ تعالیٰ نے یہ لفظ اپنے لیے بھی استعمال فرمایا ہے۔ سورۂ طٰہٰ آیت نمبر ۱۴ میں فرمایا:

{اِنَّنِیۡۤ اَنَا اللّٰہُ لَاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعۡبُدۡنِیۡ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ}

''بیشک میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے تو میری ہی عبادت کرو اور میری یاد کے لیے نماز پڑھا کرو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو دفعہ یہ لفظ اپنے لیے استعمال فرمایا ہے۔ چنانچہ اللہ میں نہ صرف ''انا'' ہے بلکہ ''انائے کبیر'' (infinite Ego) ہے۔ علّامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کو (The big I am) کہا ہے۔ اس کے برعکس انسان کی انا ''انائے صغیر'' (finite ego) ہے۔ نماز میں انسان اپنی انائے صغیر کو اللہ کی انائے کبیر کے آگے جھکاتا ہے تو انسان کی انا درست حالت پر قائم ہو جاتی ہے، پہلے وہ کہتا ہے اللہ اکبر، اللہ سب سے بڑا ہے، پھر سبحان ربی العظیم، ''میرا رب پاک ہے جو سب سے عظیم ہے۔'' سبحان ربی الاعلیٰ، ''میرا رب پاک ہے جو سب سے اعلیٰ ہے۔'' چنانچہ نماز میں اس بات کا اقرار موجود ہے کہ میں اکبر نہیں تُو اکبر ہے، میں عظیم نہیں تُو عظیم ہے، میں اعلیٰ نہیں اے اللہ! تُو اعلیٰ ہے۔ نماز کے ذریعے انا اللہ سے جڑی رہتی ہے اور یہ ایک صحت مند ''انا'' کی نشانی ہے، جو اللہ کے آگے جھکی رہے اور اُسی سے جڑی رہے۔

{قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ تَزَکّٰی ۝ وَ ذَکَرَ اسۡمَ رَبِّہٖ فَصَلّٰی ۝} (الاعلی: 15-14)

''یقیناً کامیاب ہو گیا وہ جو پاک ہو گیا۔ اور ذکر کرتا رہا اپنے رب کے نام کا پھر پڑھتا رہا نماز۔''

انسان کے لیے اپنے مقام و مرتبے کی پہچان:

تزکیہ اسی کا ہو سکتا ہے جو نماز پڑھے اور اپنے رب کو یاد رکھے۔ جب اللہ سے تعلق درست ہوتا ہے تو انسان باقی مخلوقات میں اپنے مقام و مرتبہ کو پہچان لیتا ہے۔ ورنہ انسان کو کون بتائے گا کہ باقی مخلوقات میں تمہارا کیا مقام ہے؟ تم باقی مخلوق کی طرح نرے حیوان ہو یا تم جانوروں سے بھی کوئی نچلے درجے کی ہستی ہو یا تم ان سب سے اعلیٰ اور افضل ہو۔ یہ تو وہی بتائے گا جس نے انسان کو پیدا کیا۔ قرآن میں آتا ہے: {اَلَا یَعۡلَمُ مَنۡ خَلَقَ} (الملک: ۱۴) ''کیا وہ نہیں جانتا جس نے پیدا کیا ہے؟'' تو انسان ہونے کے ناطہ میرا کیا مقام ہے؟ یہ اللہ کے سوا مجھے کوئی اور نہیں بتا سکتا اور اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں انسان کا مقام واضح فرما دیا۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۳۰ میں فرمایا: {اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً} ''بیشک میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' معلوم یہ ہوا کہ دنیا کی ساری مخلوقات پر انسان اللہ کی طرف سے حکمران بنا کر بھیجا گیا ہے۔ انسان کو تمام مخلوقات پر

فوقیت دی گئی ہے، بہت اعلیٰ مقام دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی خلافت کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ مخلوقات کی دیکھ بھال کی جائے، ان کی بہتری کا خیال رکھا جائے جس کے بدلے میں تمام مخلوقات انسان کی خدمت کریں گی اور انسان اُن سے کام لے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ} (الجاثیہ: ۱۳)

''اللہ نے مسخر کر دیا ہے تمہارے لیے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے سب کا سب اپنی طرف سے۔''

یعنی یہ سب انسان کے خادم ہیں، اس کی چاکری میں لگے ہیں۔ چاند، سورج، ستارے، پہاڑ، پیڑ، پودے، جانور، دریا اور سمندر یہ سب انسان کے لیے پیدا کیے گئے ہیں، انسان ان پر حاکم ہے، یہ سب مسخر ہیں۔ وہ اللہ کے حکم سے ان سب پر حاوی ہے۔ اللہ کا نمائندہ بن کر آیا ہے۔ ان سب باتوں سے انسان کے اندر شرف کی اور عزت کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ جب اس کو یہ پتہ چلتا ہے کہ میں ان تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف ہوں تو وہ کبھی بھی ان کے آگے نہیں جھکتا، ان کے آگے ماتھا نہیں رگڑتا اور نہ اپنی انا کو کمتر مخلوق کے آگے ہی جھکاتا ہے۔ یہ تو ہوا عالمِ شہادت کی مخلوق کا حال۔ اب عالمِ غیب میں جو مخلوق ہے یعنی فرشتے، انکے ساتھ انسان کا رشتہ کیسا ہونا چاہیے؟ ان کا کیا رتبہ اور کیا مقام ہے؟ کیا انسان فرشتوں سے اعلیٰ ہے یا فرشتوں جیسا ہے یا ان سے کمتر ہے؟ اس کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ ہی نے ہمیں بتایا ہے۔ سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۳۴ میں فرمایا:

{وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ} (البقرۃ: ۳۴)

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ سجدہ کرو آدم کو، تو سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔''

قرآن میں بعض مقامات پر آتا ہے: {فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ} (الحجر: ۳۰) ''سب کے سب فرشتوں نے اکٹھے سجدہ کیا۔'' انسان کے آگے سب جھک گئے تو پتہ چلا کہ وہ تو مسجودِ ملائک ہے، اُسے تو فرشتوں نے سجدہ کیا ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہے سب مخلوقات میں اشرف، اعلیٰ، افضل، ارفع اور بہترین ہے۔ نوری مخلوق سے بھی بہتر، ناری مخلوق سے بھی بہتر اور تمام خاکی مخلوق سے بھی بہتر ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے، آپ کو، ہم انسانوں کو کتنے پیار سے بنایا ہے۔ ہر انسان اللہ کی خلاّقی کا نمونہ ہے۔

بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں کہ سب انسان ایک جیسے ہو گئے، ایک ہی سانچہ بنا کر سب کو اس میں ڈھال دیا۔ ہر انسان دوسرے انسان سے جدا ہے۔ جُڑواں بچے (twins) بھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ ان کی بھی اپنی ایک الگ شناخت، الگ پہچان، الگ اَنا، الگ شخصیت ہوتی ہے۔ ہر انسان کی انگلیوں کے پور تک مختلف ہیں۔ گویا ہر انسان نایاب ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک اعلیٰ مقام عطا فرمایا ہے۔ انسان اپنے رب کے نزدیک بہت خاص ہے جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے تو اس کے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے، خوشی کا احساس ہوتا ہے، اپنی اہمیت کا احساس اُجاگر ہوتا ہے، شکر کے جذبات اُمڈ آتے ہیں۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت نمبر ۷۰ میں فرمایا:

{وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِي الْبَرِّ وَ الْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلًا}

''ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی اور تری میں سواریاں عطا کیں، اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور بہت سی مخلوقات پر انہیں فوقیت بخشی۔''

انسان جب اس طرح سوچتا ہے کہ میں اتنا اعلیٰ وارفع ہوں تو وہ اپنے رب سے جُڑا رہتا ہے، اپنے صحیح مقام کو پہچان لیتا ہے، اس کی انا صحت مند رہتی ہے اور وہ پُراعتماد رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کی صورتوں کے بارے میں فرماتا ہے:

{وَ صَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ} (التغابن: ۳)

''ہم نے تمہاری صورتیں بنائیں اور کیا ہی اچھی بنائی ہیں تمہاری صورتیں۔''

جس رب نے مجھے بنایا ہے اس کی نظر میں میں بہت خوبصورت ہوں، بہت اچھا ہوں یہ احساس انسان کے اندر خوشی کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھے، بنانے والے کی نظر سے جانچے۔ پیدا بھی اُسی نے کیا ہے، لوٹ کر بھی اُسی کی پاس جانا ہے، وہی مالک ہے، وہی خالق ہے، وہی رازق ہے۔ جس کی میں ملکیت ہوں، جس نے مجھے بنایا ہے، جب اس کی نظر میں میں اتنا اچھا ہوں یا اتنی اچھی ہوں تو مجھے کسی اور کی کیا فکر؟ اردو میں ایک کہاوت ہے کہ ''دلہن وہی جو پیا من بھائے'' سہاگن وہی ہے جو شوہر کو اچھی لگے، وہ عورت کسی اور کو اچھی نہیں لگتی تو نہ لگے۔ اگر میاں کو اچھی لگتی ہے تو بس کافی ہے۔ کچھ خواتین کے اوپر کوئی خاص رنگ

یا ڈیزائن بالکل نہیں جچتا، لوگ کہتے ہیں تم پر یہ رنگ جچ نہیں رہا، تم پر یہ چیز اچھی نہیں لگتی، لیکن وہ پھر بھی پہنتی ہیں کہ میرے میاں کو یہ رنگ مجھ پر اچھا لگتا ہے تو جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے پھر وہ لوگوں کی رائے سے اور اُن کی پسند و ناپسند سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔ وہ اس بات پر مطمئن رہتا ہے کہ میں اللہ کو تو اچھا لگتا ہوں۔ مجھے تو وہی کام کرنے ہیں جو میرے رب کو پسند ہیں۔ چنانچہ جب تک انسان اللہ سے جڑا رہتا ہے اپنی نظروں میں خود بہت اعلیٰ وارفع رہتا ہے اور جب انسان اللہ سے اپنا تعلق کاٹ لیتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ کو کمتر مخلوقات کا غلام بنا لیتا ہے۔ اُن کی آراء، ان کی پسند و ناپسند سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ پھر اَنا اپنے مقام سے گر جاتی ہے، احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتا ہے، اس لیے کہ وہ اب خود کو اللہ کی نظر سے نہیں دیکھ رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کے بجائے لوگوں کی پروا کرنے لگا ہے اور لوگوں کی بہت پروا کرنا، اپنے آپ کو لوگوں کی نظر سے دیکھنا کہ لوگ کیا کہیں گے، کیا سوچ رہے ہوں گے انسان کو پریشان (nervous) کر دیتا ہے۔ اعتماد ختم ہونے لگتا ہے، احساسِ کمتری پیدا ہونے لگتا ہے اور یہ تمام چیزیں اَنا کو اس کے مقام سے گرا دیتی ہیں اور جب تک انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے متقی رہتا ہے، اَنا معتدل رہتی ہے، یہ احساس رہتا ہے کہ میں مخلوقات میں سب سے برتر اور اعلیٰ ہوں۔ ان کی دیکھ بھال میری ذمّہ داری ہے، تو ان احساسات سے خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے، انسان اپنی نظروں میں باعزت رہتا ہے اور یہی خود اعتمادی اور اپنی نظروں میں باعزت ہونا مومن میں مطلوب اور پسندیدہ صفت ہے۔

عزت و بقائے نفس:

بندۂ مومن کو چاہیے کہ اپنے آپ کو پسند کرے، خود کو برا بھلا نہ کہے۔ بعض مذاہب میں 'انا' سے نمٹنے کا یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ انا کو کچل کر رکھ دو اور جب انھوں نے اس طرح اپنی انا کو کچلنے کی کوشش کی تو اس کا نتیجہ برعکس نکلا۔ جب انا کو دبایا تو پھر ساری کی ساری توجہ انا پر مرکوز ہو کر رہ گئی، انا کے گرد ہی پوری زندگی ضائع ہو گئی۔ اس انا کو ذلیل کیا، اپنے آپ کو جھکایا، اپنے آپ کو تنگ کیا۔ اس انا کو کچلنے کے لیے ظلم کیا تو ساری کوششیں اکارت گئیں کیوں کہ یہ غیر فطری رویہ ہے۔ اللہ نے فطرت میں انا رکھ دی ہے یہ کچلی نہیں جا سکتی۔ اگر اس کو دبائیں گے تو دس مزید خرابیاں جنم لیں

گی۔خود شکستگی مقصد بن جائے گی اور اَنا پر توجہ مزید بڑھ جائے گی۔کچھ لوگوں کی ساری زندگی اسی مہم میں گزر جاتی ہے، اپنے نفس کے ساتھ ہی گتھم گتھا رہتے ہیں مگر کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا، بلکہ بعض دفعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ نفس ہی اُن کو پچھاڑ دیتا ہے۔

اگر اللہ کا منشا یہ ہوتا کہ انسان اپنی ذات سے نفرت کرے یا انسان اپنے آپ کو گھٹیا، بے کار، بے عزت اور کمتر سمجھے تو اللہ تعالیٰ استغفار کا دروازہ کھلا نہ رکھتا بلکہ یہ حکم ہوتا کہ گناہ ہو گیا ہے تو ساری زندگی احساسِ جرم میں مبتلا رہو۔جبکہ اللہتعالیٰ ایسا نہیں چاہتا کہ ہم احساسِ جرم میں مبتلا رہیں۔اگر ہم ہر وقت احساسِ شرمندگی، احساسِ ندامت میں رہیں گے اور یہ بوجھ ساری زندگی اُٹھا کر رکھیں گے تو ہم نیکیوں کی دوڑ میں کبھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔اللہ چاہتا ہے کہ ہم اس احساسِ جُرم کو چھوڑ دیں، معافی مانگ کر گناہوں کو بھول جائیں۔اللہ معاف کر دیتا ہے، گناہ مٹا دیتا ہے، اُس نے معافی کا دروازہ کھلا رکھا ہے تا کہ یہ نجاست پیچھے چھوڑ کر ہم اپنی راہ لیں۔چنانچہ دوسروں کے سامنے اپنے گناہوں کا تذکرہ کرنے سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔اسلام میں بلاوجہ اعترافِ گناہ نام کی کوئی چیز نہیں ہے کیوں کہ اس سے انسان کی عزتِ نفس پر زد پڑتی ہے۔کوئی شخص جان بوجھ کر اپنے آپ کو بدنام کرنے کی کوشش نہ کرے، اپنے گناہوں کی تشہیر نہ کرے، خود کو دوسروں کی نظروں میں گرانے کی کوشش نہ کرے، بلاوجہ اپنی بے عزتی نہ کروائے۔خود کو ناپسند کرنا، اپنی ذات سے کراہیت و گھن محسوس کرنا، اپنے آپ سے نفرت میں مبتلا رہنا انسان میں بے اعتمادی پیدا کر دیتا ہے، انسان کی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔

جب انسان خود کو اپنے رب کی نظر سے دیکھتا ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے، اور حدیثِ مبارکہ کے مطابق اللہ بندے سے ستّر ماؤں سے بڑھ کر محبت کرتا ہے تو انسان کو اپنے اوپر بڑا ہی ناز ہوتا ہے، وہ خود کو اہم سمجھتا ہے۔فطری طور پر انسان چاہتا ہے کہ اللہ مجھ کو پسند کرے۔یہ چیز اس کے اندر ودیعت شدہ ہے کہ اللہ مجھ سے راضی ہو، مجھے پسند کرے اور انسان کی یہ خواہش بھی ہوتی ہے کہ لوگ مجھے پسند کریں۔یہ کوئی نہیں چاہتا کہ میں معاشرے میں بُرا سمجھا جاؤں، بے عزت ہوں، رسوا اور ذلیل ہوں، لوگ مجھ پر ہنسیں اور مذاق اڑائیں لیکن جب انسان وحی سے کٹ جاتا ہے تو اس طرح کی عجیب عجیب بیماریوں کا شکار ہو سکتا ہے۔

یہ جو فطرت میں خواہش ہے کہ اللہ مجھے پسند کرے اور لوگ بھی مجھے پسند کریں، اس کے لیے

ضروری ہے کہ انسان گناہوں سے بچے اور لوگوں کے سامنے اچھے حلیہ میں رہے۔ اپنی خَلق کو بھی اچھا رکھے اور اپنی خُلق کو بھی اچھا رکھے۔ رسول اکرم ﷺ نے ہمیں اپنا ظاہری حال حلیہ بگاڑنے سے منع فرمایا ہے۔ مثال کے طور پر کسی نے ایک جوتا پہنا ہے اور دوسرا نہیں پہنا، آدھے سر پر بال ہیں اور آدھے سر پر نہیں، پھٹے حالوں گھومنا یا بیماروں کی طرح چلنا اِن تمام امور سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ نبی اکرم ﷺ صاف ستھرے کپڑے پہنا کرتے تھے اور بالوں میں کنگھی کر کے رکھتے تھے۔ اسی لیے اسلام میں پاکیزگی اور صفائی پر اتنا زور ہے حدیثِ مبارکہ ہے

(اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ) (۱) ''پاکیزگی ایمان کا حصہ ہے۔''

جن مذاہب میں انا کو کچلنے پر زور دیا گیا ہے، ان کے اندر گندا رہنے کی بھی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے ہاں معیار یہ ہے کہ جو جتنا گندا رہے، بال لمبے، الجھے ہوئے، ناخن بڑے اور غلیظ، دانت کالے اور سانس بدبودار اور لباس بھی میلا اور بدبودار ہو اتنا ہی وہ متّقی سمجھا جاتا ہے۔ جو لوگوں کی نظروں میں جتنا حقیر اور ذلیل ہو، اللہ کی نظر میں اتنا ہی بلند اور اعلیٰ ہے یہ بالکل غلط سوچ ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا اس کے بال بکھرے ہوئے اور پراگندہ تھے تو نبی اکرم ﷺ نے اسے دیکھ کر فرمایا: ''کیا اس کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں جس سے وہ اپنے بالوں کو ٹھیک کرے۔'' اسلام چاہتا ہے کہ ہم لوگوں کے سامنے اچھے لگیں، صاف ستھرے رہیں۔ خود کو عیب دار نہ بنائیں اور نہ اپنے عیب اور گناہ لوگوں پر کھولیں۔ اسی طرح ایک مومن یہ تمنا نہ کرے کہ لوگ میری بے عزتی کریں، اس کی یہ خواہش نہ ہو کہ کوئی میرا مذاق اُڑائے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا ہے:

{وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ} (الشعراء: ۸۴)

''اے اللہ بعد میں آنے والوں میں میرا ذکرِ خیر باقی رکھ۔''

انسان کی یہ فطری خواہش ہے کہ لوگ اُسے اچھے نام سے یاد کریں۔ نبی اکرم ﷺ کی دعا کا بھی حصہ ہے:

(وَاجْعَلْنِيْ فِيْ عَيْنِيْ صَغِيْرًا وَّفِيْ اَعْيُنِ النَّاسِ كَبِيْرًا) (۲)

''اے اللہ! مجھے اپنی نظر میں چھوٹا دکھا اور لوگوں کی نظروں میں بڑا کر کے دکھا دے۔''

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

جب انا صحت مند ہوگی تو انسان کا رویّہ اپنے خالق اور مخلوق کے ساتھ بالکل درست رہے گا۔ انا اللہ کے آگے جھکی رہے اور اس سے جڑی رہے تو انسان اللہ کی نظر میں بلند رہتا ہے۔ اسے پورا شعور ہوتا ہے کہ میں اس وقت تک باعزّت ہوں جب تک اللہ کی نظر میں باعزّت ہوں، میرے لیے اللہ کا بندہ ہونا باعثِ عزّت ہے۔ عبداللہ سے بڑھ کر کوئی مرتبہ قابلِ عزت نہیں ہوسکتا۔ ایسے شخص کو بس ایک ڈر یا خوف ہوتا ہے کہ کہیں میں اللہ کی نظر سے نہ گر جاؤں۔ یہ احساس تقویٰ کو جنم دیتا ہے، اسی لیے قرآن مجید نے تقویٰ پر بہت زور دیا ہے۔

تقویٰ اور اس کا اثر:

انا کا درست مقام پر ہونا اور اللہ کے ساتھ جڑا ہوا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اگر کوئی ایسا موقع آجائے کہ اللہ اور انسان دونوں کی نظر میں بیک وقت باعزّت رہنا ممکن نہ رہے تو متقّی شخص لوگوں کی نظر میں گرنا قبول کر لیتا ہے لیکن اللہ کی نظر میں گرنا اور بے عزت ہونا قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اگر وہ اللہ کی نظر میں گر جائے گا تو وہ اپنی انسانی فضیلت (human dignity) کھو بیٹھے گا۔ اپنے تشخص، عزتِ نفس سے ہاتھ دھو بیٹھے گا، وہ اپنی ہی نظروں میں گر جائے گا۔ اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ انسانیت نے جب اللہ کی نظر میں بلند مقام حاصل کرنے کی فکر چھوڑ دی تو وہ اللہ کی نظر سے گر گئی، نتیجتاً وہ اپنی عزّت بھی گنوا بیٹھی۔ لہٰذا آج کے انسان کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر عیب، ہر برائی کو آگے بڑھ کر اپنا لیتا ہے بلکہ دلیل بھی دیتا ہے کہ انسان تو ہے ہی گندہ، گناہوں کی پوٹ اور انسان کے جینیات (genes) کے اندر ہی گندگی ہے، انسان خود اپنے ہی آپ کو برا سمجھنے لگتا ہے۔

لیکن متّقی اللہ کی نظروں سے نہیں گرنا چاہتا اور یہ واقعی بڑا بھاری اور مشکل قدم ہوتا ہے کہ انسان اللہ کی خاطر لوگوں کی نظروں میں گرنا قبول کر لے۔ یہ بہت بڑا فیصلہ ہے اور اس کے لیے اپنی شخصیت میں ایک چیز درکار ہے اور وہ ہے اپنے اوپر حد درجے کا اعتماد۔ اپنے شرف کا، اپنے مقام کا احساس، پُر اعتماد لوگ ہی یہ فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جن میں ذرا بھی اعتماد کی کمی ہو وہ یہ راہ کبھی بھی اختیار نہیں کر سکتے کہ خواہ لوگوں کی نظر میں گر جائیں لیکن اللہ کی نظروں میں اپنا مقام برقرار رکھیں۔ یہ اعتماد تقویٰ سے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ عبودیّت میں حریّت ہے، جب ''انا'' اللہ کی غلام بن جائے تو انسان لوگوں کے معیار اور انکی آراء اور تنقید سے آزاد ہو جاتا ہے اور اگر انائے صغیر انائے کبیر کے آگے نہ جھکے تو مختلف اخلاقی اور روحانی بیماریاں جنم لیتی ہیں اور جب اپنا مقام یاد نہیں رہتا تو پھر اپنا

مقصد بھی یاد نہیں رہتا کہ ہم دنیا میں کیوں آئے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ} (الذٰریات:۵۶)

''میں نے نہیں پیدا کیا جنّوں اور انسانوں کو مگر اس لیے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

پس جب انسان کو اپنا مقام اور مقصدِ حیات یاد نہیں رہتا تو وہ جانوروں کی غلامی شروع کر دیتا ہے یا پھر مظاہر قدرت کو سجدے کرنے لگتا ہے اور اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے، اللہ کی رضا حاصل کرنے کے بجائے ان سے دنیا کا خریدار بن جاتا ہے۔ اس کا رویّہ غیر متوازن ہو جاتا ہے اور پھر اس کے خالق سے بھی اور مخلوق سے بھی تعلقات بگڑ جاتے ہیں۔

انا میں اعتدال:

جس طرح انا کو حد سے گرانا پسندیدہ نہیں، اسی طرح انا کو حد سے بڑھانا بھی انتہائی خطرناک ہے۔ مومن کی انا چونکہ اپنے صحیح مقام پر اور حد کے اندر ہی رہنی چاہیے چنانچہ وہ اپنی اَنا (ego) کو درست مقام پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا مومن باادب ہوتا ہے، اس کا رویہ درست ہوتا ہے، اس کے اخلاق صحیح ہوتے ہیں لیکن اگر انا حد سے بڑھ جائے تو بے ادبی لازماً پیدا ہوتی ہے۔ شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے انتہائی بے ادبی کا مظاہرہ کیا اور اس بے ادبی کی وجہ اس کی انا تھی، اسی اَنا نے ابلیس کو رجیم بنایا، اسی انا نے ''عزازیل'' کو ''ابلیس مردود'' بنا دیا۔ جب رب تعالیٰ نے حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو پہلا لفظ اس کی زبان پر ''اَنَا'' آیا {اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ} (الاعراف:۱۲) ''میں اس سے بہتر ہوں۔'' انسان جس کو بڑا سمجھتا ہے، مشکل اور پریشانی میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام پر جب مشکل پڑی تو ان کی زبان پر اللہ کا نام آیا لیکن شیطان کی زبان پر لفظ ''اَنَا'' آیا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی نظر میں اللہ سب سے بڑا تھا۔ ان کی اَنا اللہ کے آگے جھک چکی تھی لیکن شیطان کی اَنا نہیں جھکی۔ اس نے حکم عدولی کی، نافرمانی کی، بدتمیزی اور بے ادبی کا مظاہرہ کیا اور کہا

{اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ} (الاعراف:۱۲) ''میں اس سے بہتر ہوں۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب بادشاہِ وقت (نمرود) کے سامنے جب اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا تو اس نے بھی کہا {قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَاُمِيْتُ} (البقرۃ:۲۵۸) ''میں (بھی) زندگی دیتا ہوں، اور میں (بھی) موت دیتا ہوں''، میں ہی سب کچھ ہوں۔ جب انسان میں اَنا زیادہ ہو جاتی ہے تو وہ تکبر والا رویہ اختیار کرتا ہے۔ فرعون نے تو سارے ریکارڈ توڑ دیے، تکبر کی تمام حدود پار کر گیا۔ اس

نے دعویٰ کیا{فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى} (النزعٰت:۲۴)''میں ہوں تمہارا سب سے اعلیٰ رب''۔اس تکبر نے اس کو برباد کیا،اسی نے اس کو ڈبویا،نشانِ عبرت بنادیا تو اَنا کو قابو کرنا نہایت ضروری ہے،حد سے زیادہ نہ بڑھنے پائے،حد سے بڑھے گی تو تکبر پیدا ہوگا اور انسان کبھی جنّت حاصل نہیں کرسکے گا۔دوسری طرف حد سے زیادہ گھٹ جائے گی تو دنیا میں ناکارہ اور بیکار ہوجائے گی، خالق ومخلوق کے ساتھ انسان کا کیا رویہ ہونا چاہیے،وہ انا ہی متعین کرے گی۔اگر اَنا اپنے مقام پر ہے تو مومن باادب ہوگا۔خالق کو خالق کا حق اور مقام دے گا۔اور مخلوق کو مخلوق کا حق اور مقام دے گا اور اگر اَنا اپنے مقام سے بڑھ گئی ہے تو پھر وہ بے ادب ہوجائے گا،نہ اللہ کی تعظیم کرے گا،نہ مخلوق کی عزّت کرے گا اور اگر یہی انا اپنے مقام سے گھٹ گئی تو پھر اس کی اپنی نظروں میں بھی عزّت نہ رہے گی۔

اسراف

لفظ اسراف کا مفہوم:

اسراف کا لفظ قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے، اسی مفہوم کا ایک اور لفظ بھی قرآن حکیم میں آیا ہے یعنی ''غُلُو'' اسی طرح ایک اور لفظ بھی قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے ''تبذیر'' یعنی بہت زیادہ فضول خرچی کرنا۔ اسی طرح اسراف کے لیے مزید الفاظ استعمال ہو سکتے ہیں۔ ہم اس گفتگو میں اسراف کا کوئی محدود مطلب نہیں لیں گے بلکہ جامع انداز میں بات کریں گے۔ یہ لفظ جب ہم سنتے ہیں تو خیال محض پیسے کی طرف جاتا ہے کہ صرف مالی معاملات ہی میں اسراف کیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ زیادہ تر اسراف پیسے ہی میں ہوتا ہے لیکن دیگر نعمتیں جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو دی ہیں، مثلاً بول چال، کھانے پینے اور پہننے اوڑھنے، اس میں بھی اسراف کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اپنے طرزِ زندگی کو جانچیے کہ اس کے سوا ہم کہاں کہاں اسراف کا شکار ہو رہے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا ہے:

{ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ } (الاعراف: ۳۱)

''کھاؤ پیو مگر اسراف مت کرو بے شک وہ (اللہ تعالیٰ) اسراف کرنے والوں سے محبت نہیں فرماتا۔''

دراصل ہماری زندگی میں کئی جگہ اسراف ہو رہا ہوتا ہے لیکن ہمیں اس کا شعور نہیں ہوتا، اس کا سرسری سا اندازہ کسی کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں سے فرمایا تھا:

{ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ } (الاعراف: ۸۱)

''بلکہ تم حد سے بڑھنے والے لوگ ہو۔''

قرآن حکیم میں نیک لوگوں کی صفت آئی ہے:

{ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا } (الفرقان: ۶۷)

''(نیک لوگ وہ ہوتے ہیں) کہ جب وہ خرچ کرتے ہیں تو وہ اسراف نہیں کرتے۔''

اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا:

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ کَذَّابٌ} (المؤمن:۲۸)

''بے شک اللہ نہیں ہدایت دیتا اسراف کرنیوالے کو، جھوٹے کو۔''

اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں مُسرف اور کذّاب یعنی اسراف کرنے والا اور بہت جھوٹ بولنے والا، یعنی باتوں میں بھی اسراف کیا جاسکتا ہے۔ جب انسان بہت زیادہ بولتا ہے تو اس کے لیے جھوٹ بولنا آسان ہوتا جاتا ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا کہ:

{کَذٰلِکَ یُضِلُّ اللّٰہُ مَنْ ھُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابُ} (المومن:۳۴)

''اور اسی طرح اللہ گمراہ کرتا ہے ہر اس شخص کو جو اسراف کرنے والا، شک میں پڑنے والا ہو۔''

قرآن حکیم میں فرعون کا ذکر کرتے ہوئے بھی فرمایا گیا:

{اِنَّہٗ کَانَ عَالِیًا مِّنَ الْمُسْرِفِیْنَ} (الدخان: ۳۱)

''یقیناً وہ بڑا سرکش اسراف کرنے والوں میں سے تھا۔''

ان تمام آیات پر غور کریں تو محسوس ہوتا ہے کہ اسراف کے معنی فضول خرچی کرنے سے کہیں زیادہ وسیع ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے اُمید ہے کہ دو چار پیسے زیادہ خرچ کرنے والوں کو اتنا سخت عذاب نہیں دے گا۔ سو ان صفحات میں ہم جاننے کی کوشش کریں گے کہ مالی معاملات کے علاوہ اسراف کہاں کہاں کیا جاتا ہے۔

اسراف اور غلو کے لغوی معنی:

پہلے ''اسراف'' اور ''غلو'' کا مطلب سمجھتے ہیں۔ ان دونوں الفاظ کا مطلب ہے کسی کام کا ضرورت اور فائدہ کی حد سے آگے بڑھ جانا۔ جس کی وجہ سے وہ کام بے کار یا الٹا نقصان کا سبب بن جائے اس کو اسراف کہتے ہیں۔ اس کی ضد بخل ہے اور درمیانی نقطہ اعتدال ہے تو معلوم ہوا کہ ضرورت کی حد تک کسی چیز کو استعمال کرنا اسراف نہیں ہے، بلکہ ضرورت سے زیادہ استعمال کرنا یعنی چیز کو ضائع کرنا یا ایسے استعمال کرنا کہ اس سے دنیا یا آخرت میں نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، یہ اسراف ہے۔

آواز کا اسراف:

آواز کا اسراف یہ ہے کہ جہاں کم اور دھیمی آواز سے ضرورت پوری ہوسکتی ہے وہاں اُونچی آواز استعمال کی جائے۔ مثلاً استاد کلاس میں طلبہ سے مناسب آواز میں بات کر رہا ہو جو کہ تمام طلبہ کو پہنچ رہی ہو، سب کی ضرورت کو پورا کر رہی ہو، تو اتنی آواز فائدہ مند ہے، کافی ہے، سب کو بات سمجھ میں آرہی

ہے۔لیکن وہی استاد اگر اپنی کلاس میں چیخنا شروع کر دے، بلا وجہ اونچی آواز میں بولنا شروع کر دے تو اس سے کلاس میں بے چینی شروع ہو جائے گی، سماعت پر ناگوار گزرے گا، سر میں درد شروع ہو جائے گا۔ جب ہم پر تیز آواز اتنی گراں گزرتی ہے تو بچوں پر جب ہم گلا پھاڑ کر چیختے ہیں تو ان پر کیا اثر ہوتا ہوگا۔ اس رویے سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوتا ہے۔ گفتگو اپنا اثر کھو دیتی ہے جو آپ کہنا چاہتے ہیں اس سے لوگوں کی توجہ ہٹ جاتی ہے۔ آواز کی کرختگی اور بلندی سے دھیان بٹ جاتا ہے، اس مضر آواز سے آپ کا گلا بھی دکھا اور مقصد بھی حاصل نہ ہوا بلکہ اُلٹا نقصان ہوا!

ہم آواز کا بے جا اور بے انتہا اسراف کرتے ہیں، بچوں پر، نوکروں پر، فون پر بات کرتے ہوئے اور بچوں پر تو خاص طور پر اس کے بہت بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غصہ میں ہماری آواز خود بخود بلند ہو جاتی ہے، بجائے اس کے کہ گھر میں کسی سے اگر کوئی غلطی یا قصور ہو جائے تو اس کے پاس جا کر آہستگی اور تحمل سے بات کر کے اُسے سمجھائیں تو اس کا نتیجہ یقیناً بہت اچھا نکلے گا، پُر اثر بات ہوگی، اُس کو اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ جب انسان بلا وجہ چیخ و پکار کرتا ہے تو اپنا مقام کھو بیٹھتا ہے۔ لوگ اس کی بات کو اہمیت نہیں دیتے اور لوگوں کے اندر منفی جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ زور سے بولنے سے بات پُر اثر نہیں ہوتی بلکہ بے اثر ہو جاتی ہے، اسراف کا یہی نقصان ہے۔

قرآن حکیم میں ہمیں آواز کے اسراف پر یہ ہدایت ملتی ہے:

{وَاغْضُضْ مِنْ صَوْتِكَ إِنَّ أَنْكَرَ الْأَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيرِ} (لقمان: ۱۹)

"اور اپنی آواز ذرا پست رکھو بے شک آوازوں میں سب سے بُری آواز گدھے کی آواز ہوتی ہے۔"

گدھا اپنی آواز پر قابو نہیں رکھ سکتا، وہ جب بھی آواز نکالتا ہے چیخ و پکار کی صورت میں نکلتی ہے۔ گدھے کی تو مجبوری ہے کہ وہ تو بولتا ہی اس طرح ہے اور اُس کا اس طرح بولنا قابلِ اعتراض نہیں ہے لیکن انسان جب اس طرح گلا پھاڑ کر چیخنے لگ جائے اور گدھے کی مشابہت اختیار کر لے تو یہ انتہائی خطرناک طرزِ عمل ہے۔

باتوں میں اسراف:

بولنا اور بے تحاشا بولتے چلے جانا باتوں میں اسراف ہے۔ اتنی باتیں کرنا کہ دوسرے کو اپنی بات کہنے کا موقع ہی نہ ملے، چھوٹی چھوٹی تفصیلات بتاتے چلے جانا، بات کو کھینچ تان کر طول دینا کہ انسان خود ہی بھول جائے کہ بات کہاں سے شروع کی تھی۔ یہ اندازِ گفتگو سراسر اسراف پر مشتمل ہے۔ انسان کو مناسب حد تک بات کرنی چاہئے، دوسروں کی بھی بات سنے، غیر ضروری تفصیلات سے

گریز کرے، نہ دوسرا آپ کی باتوں سے بور ہو اور نہ آپ پر بوجھ پڑے۔ بہت لمبی بات کرنے والوں سے لوگ گھبراتے اور کتراتے ہیں۔ لہٰذا بات میں بخل نہ کریں اور نہ ہی اسراف کریں، نپی تلی بات سوچے سمجھے الفاظ میں کریں۔ بعض دفعہ لوگ گھسے پٹے جملے دہراتے رہتے ہیں، اتنا ہنستے ہیں کہ حد ہو جاتی ہے، یا کچھ الفاظ اُن کا تکیہ کلام بن جاتے ہیں، یا تاکیداً دہرائے چلے جاتے ہیں، یہ بھی اسراف ہے جس سے آپ کی طاقت ضائع ہوتی ہے۔ غیر ضروری تفصیلات بات کو بوجھل کر دیتی ہیں، لوگوں پر اس کا سننا ناگوار گزرتا ہے۔

جسمانی حرکات میں اسراف :

جسمانی حرکات میں اسراف یہ ہے کہ مثلاً آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا کچھ لوگ بیٹھے ہوئے مسلسل حرکت کرتے رہتے ہیں، ٹانگیں ہلاتے رہتے ہیں، ہاتھ چلاتے رہتے ہیں، بعض لوگ چل چل کر پڑھاتے ہیں، لیکچر دیتے وقت اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چلتے پھرتے بات کرتے ہیں۔ یہ افعال بھی سننے والوں کو یکسو نہیں ہونے دیتے۔ انسان کی جسمانی حرکات (body language) پُراعتماد ہونی چاہئیں۔ اسی طرح بات کرتے ہوئے بار بار ناک کو چھونا انتہائی بُرا تاثر ڈالتی ہے۔ بعض لوگوں کی جسمانی حرکات یہ پیغام دے رہی ہوتی ہے کہ یہ صاحب اوپر سے تو بڑے پُرسکون نظر آنے کی کوشش کر رہے ہیں مگر اندر سے خوف زدہ ہیں، پریشانی کا شکار ہیں، اس پر قابو پانا ضروری ہے۔ خاص طور پر انٹرویو وغیرہ میں تو آرام وسکون کے ساتھ بیٹھنا چاہیے اور غیر ضروری حرکات سے بالکل پرہیز کرنا چاہیے۔ بعض لوگ ہر وقت چیونگ گم چباتے رہتے ہیں یا پھر منہ میں الائچی یا سپاری رکھ کر منہ چلاتے رہتے ہیں، یہ بھی نامناسب حرکت ہے۔

ایک اور انداز یہ ہوتا ہے کہ فون پر کسی کو راستہ بتاتے ہوئے زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کا بھی استعمال کر رہے ہوتے ہیں۔ تھوڑے بہت تو ہاتھ فطری طور پر چلتے ہی ہیں، کبھی کبھار بات کرتے ہوئے کوئی بات سمجھاتے ہوئے ہاتھوں سے مدد لینا ضروری ہوتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ بھی اس طرح کیا کرتے تھے لیکن مسلسل دائیں بائیں گھومنا اس سے توجّہ بٹتی (divert) ہوتی ہے۔ یہ طریقہ درست نہیں، یہ بھی اسراف کے اندر آتا ہے جس سے معاشرہ میں بدنظمی پیدا ہوتی ہے۔

ابھی تک ہم نے اسراف کے ضمن میں جو گفتگو کی یعنی آواز، بول چال، حرکات وسکنات کا اسراف یہ چیزیں خدانخواستہ گناہ میں شامل نہیں ہوتیں فقط ناپسندیدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ ان چیزوں کی وجہ سے کسی کی پکڑ نہیں کرے گا۔ روحانی سکون اور اخلاق میں شائستگی کی خاطر یہ

چیزیں ناگزیر ہیں تاکہ ہماری شخصیت بدنما نہ ہو۔ یہ سب اس لیے ہے کہ ہم اپنے آپ کو سنوار رہے ہیں، اپنا تزکیہ کر رہے ہیں۔ اپنے ظاہر کو اور باطن کو ساتھ ساتھ سنوارنا ہے، خود کو شائستہ بنانا ہے تاکہ ہم دوسروں کی نظر میں بھی بدنما نہ لگیں۔ یہ آواز کا اسراف اور جسم کا اسراف خود آپ کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا ہے کیوں کہ ایسے لوگ دیکھنے میں اچھے نہیں لگتے، متاثر نہیں کرتے، یہ ایک خامی ہے اس کو سدھارنا چاہیے۔

اعتراض میں اسراف:

ایک اور چیز قابلِ غور ہے اعتراض میں اسراف کیسے ہوتا ہے؟ اعتراض کرتے ہوئے مبالغہ آرائی کرنا، مثلاً ہزار دفعہ کہا ایسا مت کرو، سو دفعہ بات سمجھائی ہے پھر بھی سمجھ میں نہیں آرہا، اس کو مبالغہ کہتے ہیں، البتہ یہ جھوٹ میں شمار نہیں ہوگا کیوں کہ یہ ایک محاورہ ہے، ایسے الفاظ محاورتاً استعمال ہوتے ہیں۔ مگر یہ گفتگو کی خامی ہے جس سے جھنجلاہٹ شروع ہو جاتی ہے، اس قسم کا رویّہ سامنے والے پر منفی اثر ڈالتا ہے، ڈھٹائی آنے لگتی ہے۔ جب ہم مبالغہ کرتے ہیں تو ہماری بات کا اثر آہستہ آہستہ زائل ہونے لگتا ہے۔ پھر ہماری ڈانٹ بچوں کے لیے ایک عام سی بات ہو جاتی ہے، وہ اس لہجے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ آزما کر دیکھ لیں جو مائیں، بزرگ اور بڑے اس طرح چھوٹے بچوں پر غصہ کرتے ہیں تو وہ بڑوں کی باتوں پر توجہ دینا چھوڑ دیتے ہیں، سنی ان سنی کرنے لگتے ہیں، ایک طرح کا دفاعی نظام بنا لیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ ان کی تو عادت ہے، یہ تو اسی طرح بات کرتے ہیں، ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر بتاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں میں کہنا کیا مصیبت ہے! کیا آفت آرہی ہے! میں تو تنگ آ گئی ہوں اس گھر سے۔ یہ بھی اعتراض میں اسراف ہے۔ ایسی بات کو تکیہ کلام بنا لینا کوئی اچھی خوبی یا خاصیت نہیں۔ سو ان الفاظ سے گریز کرنا چاہیے بلکہ ایسے الفاظ کے استعمال سے مکمل طور پر بچنا چاہیے۔

تنقید کرنے میں اسراف:

تنقید کرنے میں بھی اسراف کیا جاتا ہے۔ کسی نے کوئی کام غلط کیا، کوئی نادانستہ غلطی سرزد ہوگئی، اب جتنی غلطی ہے اُسی حد تک تنقید کرنی چاہئے۔ اِس میں مبالغہ آرائی کرنا، آسمان و زمین کے قلابے ملانا درست نہیں۔ مخصوص کر کے بتائیں کہ تم نے فلاں وقت جھوٹ بولا تھا۔ لیکن یہ کہنا کہ تم ہمیشہ ایسے ہی جھوٹ بولتے ہو، یہ تو تمہاری عادت ہی ہے، تم نے کبھی کوئی کام ٹھیک سے کیا بھی ہے، کبھی کوئی ڈھنگ کی بات بھی کر لیا کرو، ہمیشہ جھوٹ بولتے ہو، تم سے کبھی کھانا ٹھیک پکتا ہی

نہیں، یہ انداز اختیار کرنا اسراف ہے۔ ان الفاظ کا اثر صرف سننے والے پر ہی نہیں ہوتا بلکہ کہنے والے میں بھی ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ یہ کہہ دینا کہ تم نے ظہر کی نماز قضا کر دی اور یہ کہنا کہ تم تو روزانہ نماز قضا کر دیتے ہو، ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے۔ دوسری بات سے سامنے والے میں منفی ردعمل پیدا ہوگا، اس طرح وہ ٹھان لے گا کہ اچھا اب نہیں پڑھوں گا۔ ایک بار نہ پڑھنے پر سارے کیے کرائے پر پانی پھیر دیا۔ اسی طرح خواتین کی جب اُن کے شوہروں سے لڑائی ہو جائے تو فوراً کہہ دیتی ہیں۔ ''آپ نے تو کبھی خیال ہی نہیں کیا، آپ کی تو ہمیشہ سے یہی عادت ہے۔'' یا پھر ساس نندوں سے لڑائی ہوگئی ان کی بھی ساری اچھائیوں اور خوبیوں کو بُھلا دیا اور کہا کہ ''آپ ہمیشہ ایسا ہی کرتی ہیں اور یہی کچھ کہتی ہیں۔'' اچھے بُرے حالات آتے جاتے رہتے ہیں کوئی ہمیشہ کے لیے بُرا یا ہمیشہ کے لیے اچھا نہیں ہوتا، اتنی تنگ نظری مناسب نہیں، ذرا وسعت پیدا کرنی چاہیے۔ تعلقات اور معاملات میں جو بات موثر ہوسکتی ہے، کاٹ دار لہجے اس کو غیر موثر بنا دیتے ہیں۔ غیر ضروری تاکید بات کو غیر مؤثر بنا دیتی ہے اور وہ بات تعمیر کے بجائے تخریب کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ انداز ہمارے معاشرے کا مزاج بنتا ہی چلا جا رہا ہے۔

تعریف میں اسراف:

تنقید کے برعکس تعریف کو بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہماری نفسیات میں یہ شامل ہے کہ جو چیز اچھی لگتی ہے اس کی تعریف میں بھی زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ ہمیں اس کی اتنی عادت ہوگئی ہے کہ ایک نارمل تعریف، جائز تعریف تو ہمیں تعریف لگتی ہی نہیں۔ مثال کے طور پر کسی نے دعوت دی، کھانا پکایا، مہمانوں نے ایک بار کہہ دیا کہ کھانا اچھا تھا تو میزبان کو لگتا ہے شاید کھانا پسند نہیں آیا جب تک ایک ایک نوالہ کھا کر تعریف نہ کریں، گُن نہ گائیں، قصیدے نہ پڑھیں، ہمیں لگتا ہی نہیں کہ تعریف کی گئی ہے۔ مبالغے میں یقیناً جھوٹ کا عنصر شامل ہوتا ہے، اس لیے مناسب حد تک تعریف ٹھیک ہے تعریف کے اندر مبالغہ ناپسندیدہ ہے۔

ذاتی طور پر کسی کی تعریف میں مبالغہ مت کریں، اُس کے نفس کو شر اور آزمائش میں مت ڈالیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا وہ کسی کی تعریف کر رہا ہے اور تعریف میں مبالغہ کر رہا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(وَيْلَكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ قَطَعْتَ عُنُقَ صَاحِبِكَ مِرَارًا ثُمَّ قَالَ مَنْ كَانَ

مِنْكُمْ مَادِحًا أَخَاهُ لَا مَحَالَةَ فَلْيَقُلْ أَحْسِبُ فُلَانًا وَاللهُ حَسِيبُهُ وَلَا أُزَكِّي عَلَى اللهِ أَحَدًا)(۱)

"افسوس ہے تجھ پر! تُو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ ڈالی، تو نے اپنے ساتھی کی گردن کاٹ ڈالی۔ پھر فرمایا کہ اگر کسی کے لیے اپنے کسی بھائی کی تعریف کرنی ضروری ہو جائے تو یوں کہے کہ میں فلاں شخص کو ایسا سمجھتا ہوں، آگے اللہ خوب جانتا ہے، میں اللہ کے سامنے کسی کو بے عیب نہیں کہہ سکتا۔"

اس حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ حوصلہ افزائی کے طور پر تھوڑی بہت تعریف ہو جائے تو اس کی اجازت ہے لیکن بے حد تعریف اسراف اور مبالغہ ہے جو کہ بہت ناپسندیدہ ہے۔ مزید یہ کہ تعریفی کلمات میں اپنی کم علمی کا اعتراف اور اللہ کے کامل علم کا ذکر بھی کرنا چاہیے تاکہ تعریف میں اُس کے غلط ہونے کی گنجائش رہے۔

تعریف سُن کر انسان کا نفس موٹا ہوتا ہے، کان منتظر ہوتے ہیں کہ لوگ آ کر میرے کام کی تعریف کریں۔ اس میں دکھاوا شامل ہوتا ہے، نیت کے اندر بگاڑ آتا ہے۔ جب لوگوں سے تعریف سننے کا شوق پیدا ہوتا ہے تو اللہ سے اجر پانے کا شوق مدھم پڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک انسان اگر فرض سمجھ کر کام کرے، اس کو نیکی سمجھ کر کرے، اللہ کے لیے کرے اور لوگوں سے ہرگز صلہ نہ چاہے تو اُس کو لوگوں کی تعریف پر کان نہیں دھرنے چاہئیں۔ تعریف میں مبالغہ اور اسراف بہت ناپسندیدہ ہے اور اس کے اندر پھر جھوٹ بھی شامل ہو جاتا ہے۔

مثال کے طور پر آپ نے کسی کو بہت عرصہ بعد دیکھا تو معلوم ہوا کہ اس نے وزن کم کیا ہے۔ اب آپ اُس کی اس طرح تعریف کر رہی ہوں کہ آپ بہت جوان (young) لگ رہی ہیں، حالانکہ بعض اوقات وزن گھٹا کر انسان زیادہ بوڑھا لگنے لگتا ہے، تازگی ختم ہو جاتی ہے۔ تو تعریفوں کے پُل باندھنے کے بجائے بس اتنا کہہ دیں کہ آپ کا وزن کم لگ رہا ہے۔ ساتھ جھوٹی تعریفیں کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کہ آپ تو جوان ہو گئی ہیں، بیس سال کی لگ رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ کائنات میں صرف ایک ہی ہستی ہے جس کی تعریف میں اسراف نہیں ہو سکتا اور وہ اللہ کی ذات ہے۔ اُس کی جتنی تعریف کی جائے، جتنی حمد و ثنا کی جائے کم ہے، اللہ کے بہت سارے نام مبالغے کے صیغوں میں آتے ہیں مثلاً غفور بہت بخشنے والا، رحمن بے پناہ رحم کرنے والا وغیرہ۔ لیکن انسانوں کی تعریف میں مبالغہ اور غُلو کرنا شرک تک لے جاتا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الشهادات، باب اذا زکی رجل رجلاً کفاه

تعریف اور تعظیم میں اسراف سے بہت بچنے کی ضرورت ہے۔ حوصلہ افزائی کی حد تک تعریف کریں، معاشرتی روابط کو خوشگوار بنانے کی حد تک کریں، اس سے زیادہ نہیں۔ جیسے اگر کسی نے بہت محنت سے کھانا پکایا ہے، اچھا پکایا ہے تو کہہ دیجئے کہ اچھا پکایا ہے۔ کوئی لباس اچھا لگ رہا ہے تو تعریف کر دیں کہ یہ لباس آپ پر اچھا لگ رہا ہے کوئی حرج نہیں لیکن اسراف اچھا نہیں۔

جذبات کا اسراف:

اسی طرح جذبات کا اسراف بھی ہم اپنے معاشرے میں کثرت سے دیکھتے ہیں، لوگوں کا ایک ڈرامائی سا انداز بن گیا ہے۔ کسی کا انتقال ہو جائے تو قریبی رشتہ دار غمگین ہوتے ہیں، روتے بھی ہیں لیکن اگر بے ہوش نہیں ہو رہے، دورے نہیں پڑ رہے، محض خاموشی سے آنسو بہا رہے ہیں، زبان سے کچھ نہیں بول رہے جو کہ عین سنت طریقہ ہے تو لوگ سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کو غم ہی نہیں ہے اور اگر کوئی بین کرتا ہے، دہاڑیں مار مار کر روتا ہے، غش کھاتا ہے، منہ پیٹتا ہے، سر کے بال نوچتا ہے تو ہی سمجھتے ہیں کہ ان لوگوں کو غم ہے۔ دراصل لوگوں کو تماشا متاثر کرتا ہے پھر جگہ جگہ ایسے واویلے کا چرچا ہوتا ہے، درحقیقت یہ اسراف ہے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ نے غم کے اظہار کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ لہٰذا سوگ منانے میں آپ ﷺ کی تعلیمات کو مدّنظر رکھنا چاہیے۔

دوسری چیز یہ کہ ایسے موقعوں پر ہم وقت کا بھی بہت اسراف کرتے ہیں۔ مثلاً کسی کے گھر میں اگر انتقال ہو جائے تو اولاد یا قریبی رشتہ دار سب سے پہلے تین دن کی چھٹی لے کر گھر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ ہمارے ہاں طے شدہ ہے کہ غم کے ساتھ چھٹی تو ضروری ہے۔ جب کہ سوگ منانا اور چیز ہے اور کام کو معطل کر دینا مختلف چیز ہے۔ ہمارے ہاں تعطیل کا مغربی تصور ہے۔ اگر آپ نبی اکرم ﷺ کی سیرت پڑھیں تو حیران رہ جائیں گے۔ ایک طرف آپ ﷺ کی صاحبزادی کا انتقال ہوا اور دوسری طرف آپ نے بدر کی جنگ لڑی۔ یہ سرگرمی اپنی جگہ، بیٹی کا غم اپنی جگہ۔ آپ یہ کہیں نہیں پڑھیں گے کہ کسی کے انتقال کی وجہ سے نبی اکرم ﷺ تین دن کے لیے سب سے کٹ کر بیٹھ گئے ہوں یا پھر میت کے اقرباء کو تلقین کی ہو کہ الگ تھلگ بیٹھ جاؤ، کوئی کام نہ کرو۔ خوشی نہ منانا اور چیز ہے اور کوئی کام نہ کرنا دیگر چیز ہے۔ اس کے بعد عید بھی آئی اس لیے کہ غزوۂ بدر رمضان میں ہوا تھا تو سب نے عید کی خوشیاں بھی منائیں۔ اس لیے کہ اسلام میں سوگ تین دن کا ہے۔ یہ حیرت انگیز توازن آپ کو سیرت میں نظر آئے گا۔ ہم نے تو اس کو لازم و ملزوم کر لیا کہ اگر میت کے گھر والے کام کر رہے ہیں تو یہ مرنے والے کی بے حرمتی ہے اور اس کو مرنے والے کا غم نہیں، جس نے غم نہ منایا

اس نے مرنے والے کی تعظیم نہ کی۔ دراصل کام کرنے سے غم دور ہوتا ہے اسی لیے انسان جلد از جلد مصروف ہوجائے تا کہ زندگی معمول پر آجائے۔ یہ جذبات کا اسراف ہے اور غور طلب بات یہ ہے کہ اگر گھر میں بیٹھ کر قرآن پڑھا جائے اور ایصالِ ثواب کیا جائے تو کسی کو اعتراض نہیں ہوگا لیکن اگر کسی کی موت پر کوئی قرآن پڑھانے کہیں اور چلا گیا یا قرآن پڑھنے کے لیے گھر سے باہر کہیں چلا گیا تو تنقید کرینگے، بُرا بھلا کہیں گے، بڑے دیندار بنتے ہیں آج بھی کلاس لینے چلے گئے۔ گویا صرف قرآن پڑھنے کو نیکی نہیں سمجھتے بلکہ وہاں بیٹھ کر پڑھنے کو نیکی سمجھتے ہیں۔ جو اس دنیا سے چلا گیا ہم اس کو استغفار کا تحفہ بھیج سکتے ہیں، اگر ہمارا کوئی قریبی رشتہ دار تھا، تو ہم ان کے لیے صدقہ جاریہ بننے کی کوشش کریں۔ لیکن ایک رسم بن گئی ہے کہ سب مسلسل بیٹھے رہیں، روتے رہیں اور اس طرح سے جذبات میں اسراف کرتے رہیں۔

خوشی کے موقعوں پر بھی آپ کو یہی اسراف محسوس ہوگا۔ خوش ہوں گے تو بے پناہ خوشیاں منائیں گے، بلند آواز، قہقہے، ٹھٹھے اور شادی بیاہ کے موقع پر تو اسراف ہی اسراف نظر آتا ہے، اس میں بالکل توازن برقرار نہیں رہتا۔ یہ جذبات میں اسراف ہے کہ خوش ہوئے تو بے تحاشا خوش، افسردہ ہوئے تو بے انتہا افسردہ۔ یہ پنڈولم کی سوئی جو یا تو اِس انتہا پر ہوتی ہے یا اُس انتہا پر، یہ انسان کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔ یہ روش کہ بے حد خوش ہوں یا انتہائی افسردہ بہت نقصان دہ ہے۔ جب جذبات میں اسراف ہوگا تو وقت کا اسراف بھی ضرور ہوگا۔

خوشی غمی کے موقع پر وقت کا اسراف:

ہمارے معاشرہ کی شادیاں عمومی طور پر ہمارے دین، ایمان اور وقت کی آزمائش بنی ہوئی ہیں۔ اگر گھر میں شادی ہے تو کوئی تصور نہیں کرتا کہ چھٹی نہ لی جائے۔ اب سب چھٹی لے کر گھر میں بیٹھے رہیں گے، سارے دفتری کام معطل کر دیے جائیں گے۔ خواہ دفتر میں کتنا اہم کام ہو، آپ کی کتنی ضرورت ہو، لیکن نہیں! ہمارے گھر میں تو شادی ہے، ہم تو دفتر آ ہی نہیں سکتے۔ یہ اسراف کا مظاہرہ ہے۔ گھر میں بیٹھ کر ایسا کیا کر رہے ہیں جو کہ آپ دفتری معمولات کے ساتھ نہیں کر سکتے۔ اگر ہم شادی کو سنت طریقہ تک محدود کریں تو معاملات میں توازن قائم رہ سکتا ہے لیکن اگر ہم اس کو سنت سے ہٹا دیں گے تو ہم ضرور اسراف کریں گے۔

اسراف کے مقابلے میں ہم سادگی اختیار کرنے کی بات کرتے ہیں لیکن ہم سادگی کی مکمل تعریف نہیں کر سکتے۔ کیوں کہ امیر کی سادگی کا معیار الگ ہے اور غریب کا الگ تو اگر ہم سنت کی بات

کریں اور اس پر قائم رہیں تو سنت ہمیں اسراف سے بچا لیتی ہے اور زندگی معتدل راہ پر چلتی رہتی ہے، انسان اسراف کا شکار نہیں ہوتا۔

گھر میں شادی ہے تو خوشی ضرور منائیں مگر ساتھ ساتھ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ دونوں کام اکٹھے کیے جا سکتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ چھٹی لینا کوئی حرام کام ہے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خوشی اور غم کے موقعوں پر ذمّہ داریوں کو ٹالنا نہیں چاہیے۔ معمول کے مطابق زندگی کو چلانے کی ضرورت ہے۔ اپنا وقت اس طرح سے ترتیب دیں کہ زندگی کے معاملات کا بھی حرج نہ ہو اور دفتری و دیگر ذمہ داریاں بھی ادا ہوتی رہیں۔ ہمارے اسی طرزِ عمل کی وجہ سے دفاتر میں کثرت سے چھٹیاں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے کام کا حرج ہوتا ہے۔ جب کہ خود ہم گھر میں کام کرنے والیوں کی چھٹیوں سے پریشان ہوتے ہیں کہ ان کے گھر کوئی خوشی یا غم کا موقع آتا ہے تو گھر بیٹھ جاتی ہیں اور کام کا حرج ہو جاتا ہے۔ لیکن ہم بھی تو یہی کرتے ہیں! ہماری محافل رات رات بھر جمی رہتی ہیں، دو دو ہفتے مختلف پروگرام چل رہے ہوتے ہیں، مایوں ہے، مہندی ہے، دلہن اور دولہا کے گھر آنا جانا لگا رہتا ہے جس کی وجہ سے دفتر کی چھٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ وقت کا اسراف ہے، قوت کا اسراف ہے، مال و دولت کا اسراف ہے۔

عام زندگی میں وقت کا اسراف:

عام زندگی میں بھی ہم وقت کا بہت اسراف کرتے ہیں۔ جو کام دس منٹ میں ہو سکتا ہے اس پر آدھا گھنٹہ صرف ہوتا ہے۔ بننے سنورنے، نہانے دھونے، بازاروں میں گھومنے پھرنے میں بہت سا وقت بلاضرورت ضائع ہوتا رہتا ہے۔ فون پر غیر ضروری باتیں کرنا، اِدھر اُدھر کی لغو باتیں کرنا، یہ تمام باتیں اسراف میں آتی ہیں۔ دراصل ہمیں اپنا کام مناسب وقت میں سمیٹنا نہیں آتا۔ وقت کی قدر کریں، دنیا میں ہم آخرت کمانے کے لیے آئے ہیں تو ہمارے لیے وقت ہی سب سے بڑی متاع ہے۔ اگر آخرت کمانے کا تصور دماغ میں تازہ رہے گا تو وقت کی قدر ضرور ہوگی۔

ایک صورت ایسی ہے جس میں فون پر بات کرنا اسراف میں شامل نہیں ہوگا، خواہ ایک گھنٹہ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ماں باپ دور رہتے ہوں یا دوسرے ملک میں مقیم ہوں تو پھر فون پر بات کرنی چاہیے۔ یہ دراصل کسی درجہ میں والدین کا حق ادا کرنے کی کوشش ہے جو کہ عبادت بھی ہے یعنی ماں باپ کا دل بہلانا، اپنی مصروفیات میں سے اُن کے لیے وقت نکالا جائے لیکن یاد رکھیں اس میں غیبت، جھوٹ، دل دکھانے والی طنزیہ گفتگو نہیں ہونی چاہیے۔

اسراف کا تعیّن :

فقہاء کرام نے مقاصدِ شریعت کے تحت انسانی اعمال کی تین اقسام کی ہیں۔ سب سے پہلی ''الضروریات'' یعنی وہ امور جن پر دینی و دنیاوی بقا موقوف ہے۔ مثلاً دین کا تحفظ، جان کا تحفظ اور عقل کا تحفظ۔ اسی طرح ''الحاجات'' میں ایسے امور شامل ہیں جو زندگی اور موت کا مسئلہ تو نہیں ہوتے لیکن ان کا تعلق تنگی و راحت، مشکل و آسانی سے ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر نماز کو قصر کرنا، کھانے پینے، رہن سہن میں اچھی چیزیں استعمال کرنا۔ یوں سمجھ لیجیے کہ ستر پوش لباس پہننا ضروریات میں سے ہے اور ایسا لباس جو کہ پورے بدن کو ڈھانپ لے، اچھا لباس ہو، یہ پہننا حاجات میں سے ہے۔ تیسری قسم ''التحسینیات'' ہے، اس کو مروت کا تقاضا بھی کہہ سکتے ہیں۔ اعمال میں ''التحسینیات'' کے نہ ہونے کی وجہ سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا، البتہ حُسن کا تقاضا ہے کہ ان کو اختیار کیا جائے۔ مثلاً نماز میں زینت اختیار کرنا، نفیس لباس پہننا وغیرہ۔

اسراف کا تعیّن کرتے ہوئے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے محض ''الضروریات'' پر زندگی گزارنے کا نہیں کہا بلکہ ''الحاجات'' اور ''التحسینیات'' کی رعایت بھی دی ہے۔ ہوسکتا ہے ہم کسی شے کو اسراف سمجھ رہے ہوں جب کہ اللہ کی نظر میں وہ شے نہ صرف جائز ہو بلکہ قابلِ تحسین بھی ہو۔

پیسے میں اسراف :

اسراف کا ذکر سن کر سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ مال و دولت اور پیسہ خرچ کرنے کے بارے میں آتا ہے۔ سب سے پہلے اس تصور کو ذہن سے نکال دیں کہ پیسہ خرچ کرنا ہی اسراف ہے۔ پیسہ خرچ کرنا اپنی ذات میں اسراف نہیں ہے۔ اسی طرح ضرورت کے سوا خرچ کرنا بھی عموماً اسراف نہیں ہے، خواہشات پر خرچ کرنا بھی اپنی ذات میں حرام نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ہدایت دے کہ ہم اسراف کے بارے میں صحیح تصور قائم کرسکیں۔

پیسے میں اسراف یہ ہوگا کہ بلاوجہ، بلاضرورت یا زائد از ضرورت خرچ کرنا، جس کی کوئی ضرورت نہیں، چیزیں خریدتے چلے جانا، جمع کرتے جانا، نہ خود استعمال کرنا اور نہ دوسروں کو دینا۔ مثال کے طور پر ایک گھرانہ ہے جس میں کُل چھ افراد ہیں، چار بچے ہیں ایک امّی اور ایک ابّا۔ ان کی ضرورت ہے کہ ان کے گھر میں چھ کمبل یا چھ رضائیاں ہوں لیکن یہ لوگ بیس کمبل اور رضائیاں لاکر

رکھ لیں تو یہ اسراف ہے۔ ایک اور مثال دیکھیں فرض کریں ایک اور گھرانہ بھی چھ افراد پر مشتمل ہے لیکن ان کے ہاں مہمان داری بہت ہوتی ہے، عزیزوں کا تانتا بندھا رہتا ہے، تو مانگ تانگ کر بستر پورے کرنا اچھی بات نہیں۔ ایسی صورت میں چاہیے کہ کچھ رضائیاں یا کمبل زائد از ضرورت بھی رکھ لیں جو بوقت ضرورت کام آجائیں۔ یہ اسراف نہیں ہے کیوں کہ اللہ نے ان کو استطاعت بھی دی ہے اور ضرورت بھی ہے۔

اسراف دراصل یہ ہے کہ ایک دفعہ کپڑا پہنا یا ایک دفعہ جوتا پہنا اور پھر صندوق میں رکھ دیا اور پھر مزید خریدنے چلے گئے۔ یہ درست نہیں، جائز نہیں، پسندیدہ نہیں۔ کسی چیز کی ضرورت ہے اور خرید بھی سکتے ہیں تو ضرور خریدیں۔ گاڑی ہو، گھر ہو، زیور ہو، کپڑا ہو کوئی بھی استعمال کی چیز ہو، یہ سب خریدنا درست ہے۔

خواہشات اور اسراف:

اب ہم آتے ہیں خواہشات کی طرف یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا خواہشات کو پورا کرنا اسراف ہے؟ اگر کسی چیز کو خریدنے کی خواہش دل میں جنم لیتی ہے اور اس کو خریدنے کی استطاعت ہے تو خرید لیں، اپنی خواہش پوری کر لیں لیکن ضائع نہ کریں۔

آپ کے پاس پچھلے سال کے گرم سردیوں کے کپڑے پڑے ہیں لیکن بازار میں نئے پرنٹ دیکھ کر خریدنے کو دل چاہا تو حسبِ استطاعت خرید لیں۔ پہلے والے کسی ضرورت مند کو دے دیں، یہ اسراف نہیں۔ اسراف یہ ہے کہ ہر موسم کے کپڑے خریدنا لازم سمجھیں اور خرید خرید کر کپڑوں کا ڈھیر لگا دیں، لیکن نہ خود پہننے کی نوبت آئے اور نہ کسی کو خیرات کریں۔ اور یہ بھی اسراف میں شمار ہوگا کہ کسی ایسی چیز کی خواہش کریں جو خرید نہ سکیں، قرض لے کر یا حرام ذرائع سے کما کر خواہشات پوری کریں یہ اسراف ہے۔

یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ خواہشات کے معاملے میں احوال وظروف سے پتہ چلے گا کہ اس میں اسراف ہو رہا ہے یا نہیں، ہو سکتا ہے کسی صاحبِ استطاعت کے لیے ایک چیز اسراف نہ ہو جب کہ تھوڑی کم حیثیت کے لیے وہی چیز اسراف میں داخل ہو۔ مثال کے طور پر ایک عورت کے خاوند کی آمدنی دس پندرہ ہزار ہے اور وہ پانچ ہزار کا جوڑا خریدنا چاہتی ہے یا کوئی سونے کی چیز خرید لیتی ہے تو یہ اسراف ہے لیکن کوئی ایسی عورت جس کے شوہر کی تنخواہ پانچ لاکھ ہے اور وہ پانچ ہزار کا جوڑا یا زیور خریدنا چاہے تو یہ اسراف نہیں۔ لہٰذا کچھ معاملات میں اسراف کی تعریف امیر اور غریب کے لیے

الگ الگ ہے۔

ابھی صرف اسراف کی بات ہورہی ہے، ہوسکتا ہے کسی شخص کے لیے ایک چیز خریدنا جائز ہو لیکن وہ استعمال کرتے ہوئے دکھاوا اور نمائش کرنے لگے تو وہی جائز چیز اب باعثِ گناہ ہوجائے گی۔ راہبانہ طرزِ زندگی میں یہ تصور تھا کہ اچھی چیز اگر خرید سکتے ہو تب بھی مت خریدو۔ ایسی سادگی اسلام میں یقیناً پسندیدہ ہے لیکن ہم ابھی حلال اور حرام کی بات کررہے ہیں، گناہ وثواب کی بات کررہے ہیں، حدود وقیود کی بات کررہے ہیں، تو انسان کے خرچ کرنے میں کوئی حرج نہیں، اس پر کوئی گناہ نہیں ملے گا۔

نمود ونمائش اور اسراف:

جہاں تک دکھاوے اور نمائش کا تعلق ہے تو وہ سراسر گناہ ہے۔ ایسا خرچ کرنا جس میں فضول خرچی کے ساتھ دکھاوا بھی ہے یا کفار اور مشرکین کے تہوار منانے پر خرچ کیا جارہا ہے، بے ثمر، بلاضرورت، بے محل، یہ دراصل اللہ کی نافرمانی میں خرچ ہورہا ہے، ان کو عزت دی جارہی ہے جن کو اللہ نے عزت نہیں دی جو اللہ کے نافرمان ہیں۔ ہم ان کے نقش قدم پر چل رہے ہیں جن کے طور طریقہ پر عمل کرنے سے، جن کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ گناہ ہی کے زمرے میں چلا جائے گا اور اس طرح بلاضرورت، دکھاوے اور نمائش کے لیے روپیہ پیسہ خرچ کرنا تو پھر تبذیر بن جاتا ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا ہے:

{اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ} (بنی اسرائیل: ۲۷)

''بے شک بے جا خرچ کرنے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔''

اسراف کی حدود اور اس سے بچنے کی تدبیر:

یہ جاننا ضروری ہے کہ کہاں اسراف کیا جارہا ہے اور کہاں نہیں۔ چند ایک تو بالکل واضح نکات ہیں جو ہم خود جان سکتے ہیں اور محسوس کرسکتے ہیں۔ دوسری چیز جو انسان کو اسراف سے روکتی ہے وہ اس کا تقویٰ ہے۔ اس کے اندر جو خوفِ خدا ہے، اس کا جو ضمیر ہے وہ اسے راہ دکھائے گا، بتائے گا کہ حد کہاں پر ہے، کس حد تک ضرورت ہے اور کتنی دنیا کی محبت ہے، کتنی دنیا سے بے رغبتی ہے۔ اسی لیے ہر شخص کا انفرادی محاسبہ ہوگا۔ خود انسان سادگی سے رہے بہت اچھی بات ہے۔ اپنی خواہشات کو روکے رکھے اور ضروریات پر کم سے کم خرچ کرے، خواہشات ختم کرنے کی کوشش کرے۔ مگر اس طرزِ عمل کو نہ اپنے اعلیٰ ہونے کی دلیل سمجھے اور نہ ہی دوسروں کو تحقیر وتنقید کی نظر سے دیکھے۔ دوسروں کی غیبت کرنا یا باتیں بنانے

لگ جانا بھی نہایت ناپسندیدہ رویّہ ہے اور نیکیوں کو غارت کرنے کا باعث ہے۔

بعض لوگوں کو مہنگی چیزیں پسند ہوتی ہیں، طبیعت شاہانہ ہوتی ہے اور بعض سستی چیزیں خریدتے ہیں۔ اب ہمیں فیصلہ نہیں کرنا کہ کون اسراف کر رہا ہے اور کون میانہ روی پر ہے۔ یہ دراصل نیت پر شک کرنا ہے کہ فلاں دکھاوے اور نمائش کے لیے ایسا کرتے ہیں، کچھ لوگ مہنگی چیزیں اس لیے لیتے ہیں کہ یہ پائیدار ہوتی ہیں، جلدی خراب نہیں ہوتیں، اس وجہ سے مہنگی اشیاء لینا ٹھیک ہے۔ کچھ لوگ مہنگی چیزیں صرف منفرد ہونے کے لیے لیتے ہیں یہ غلط ہے۔ اپنے لیے سادگی اختیار کرنا یقیناً عزیمت کا راستہ ہے، انبیاء اور اولیاء کا راستہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں۔ اگر اپنے لیے یہ معیار قائم کرلیا کہ کم سے کم پر گزارہ کرنا ہے تو بہت اچھی بات ہے لیکن اوروں کو اس طرز پر گھسیٹ گھسیٹ کر لانا اور اپنے آپ کو معیار بنا کر پیش کرنا کہ میں کتنی اچھی یا کتنا اچھا ہوں اس کی بالکل ضرورت نہیں۔ خود کو اعلیٰ نہیں سمجھنا اور دوسروں کو ان کے طرزِ زندگی کی وجہ سے حقیر اور کمتر نہیں سمجھنا۔ بس انسان یہ سوچ لے کہ جتنا جمع کیا یا جتنا خرچ کیا ان سب کا حساب دینا ہوگا۔

اسراف کے متعلق اصل تصور:

ایک چیز جو ہمارے ذہنوں میں بیٹھ چکی ہے وہ یہ ہے کہ کوئی بھی مہنگی چیز خریدنا اسراف ہے یہ تصور ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے مگر یہ تصور درست نہیں۔

آپ کے پاس قیمتی کپڑے ہیں آپ اُن کو سستے صابن سے دھوئیں گے تو وہ خراب ہوجائیں گے، زیادہ عرصہ نہیں چل سکیں گے۔ اس لیے آپ تھوڑے زیادہ پیسے خرچ کر کے اچھا والا سرف استعمال کریں۔ اب اس کو اسراف کہہ دینا شدت پسندی ہے۔

فضول خرچی میں اور مہنگی چیز خریدنے میں فرق کرنے کی ضرورت ہے۔ ہر مہنگی چیز خریدنا فضول خرچی نہیں ہوتی۔ بعض لوگ اسراف کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ ضرورت کی چیز پر ضرورت سے زائد خرچ کرنا اسراف ہے اگر ضرورت کی چیز پر ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا اسراف ہوتا تو پھر اسلام میں جائز خواہشات پوری کرنے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی، ہم سے کہہ دیا جاتا کہ خالی ضروریات کی سطح پر زندگی گزارو۔ ضروریاتِ زندگی کی حد تک چیزیں خریدو، خواہشات پر پیسہ خرچ کرنا گناہ قرار دیدیا جاتا۔ اگر اسلام یہ مزاج اختیار کرتا تو ہم رہبانیت کی طرف چل پڑتے۔ رہبانیت کا مزاج یہی ہے کہ اپنے نفس کی کسی خواہش کو پورا مت ہونے دو۔ خواہشات تو گناہوں کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔ حالانکہ ایسی بات نہیں، انسان کے اندر اللہ نے کچھ فطری خواہشات رکھی ہیں

انسان کی فطرت ہے کہ خوبصورت اچھی چیز حاصل کرنا چاہتا ہے، حاصل یہ کہ اللہ تعالی نے جائز خواہشات پوری کرنے کی گنجائش رکھی ہے۔

البتہ وہ خواہشات جو کہ شریعت کی حدود کو توڑ کر پوری کی جائیں اُن سے روکا گیا ہے کہ یہ چیز اسراف اور تبذیر میں شمار ہوتی ہے۔

سونا پہننے میں اسراف یہ ہوگا کہ بہت سارا سونا خرید لیا مگر زکوٰۃ ادا نہ کی۔ آپ زکوٰۃ نہیں دے سکتے تو سونا کیوں خریدا؟ چاہے آپ کے پاس ہزار تولہ سونا ہے مگر آپ اُس کی زکوٰۃ باقاعدگی سے دیتے ہیں تو کوئی حرج نہیں۔ بس زکوٰۃ کا برابر حساب رکھیں، ہر سال زکوٰۃ ادا کرتے رہیں، تاکہ کل اللہ کے سامنے حاضر ہوں تو حساب دینا آسان ہو جائے۔ تو فتویٰ اور ہے تقویٰ اور ہے۔ فی الحال ہم فتوے کی بات کر رہے ہیں۔ تقویٰ کی بات نہیں کر رہے ہر انسان کے تقویٰ کا الگ معیار ہوتا ہے۔ جہاں تک فتوے کا تعلق ہے تو سونا خریدنے کی بھی اجازت ہے اور پہننے کی بھی اجازت ہے اور اللہ نے کوئی حد بھی نہیں بتائی کہ بس دو تولہ سونا خرید سکتے ہو اس سے زیادہ مت خریدنا۔ اسی طرح لباس ہماری ضرورت ہے، کسی طرح کا بھی لباس پہن کر یہ ضروت پوری کی جاسکتی ہے تو اللہ نے ریشم کیوں بنایا؟ کیا ریشم پہننا گناہ ہے۔ ریشم وغیرہ ہمیشہ سے مہنگے کپڑے رہے ہیں، تو کیا اِن کو پہننا گناہ ہے؟ اگر ریشم پہننا اسراف ہوتا تو پھر تو یہ گناہ ہوتا۔ یہ سوچ دراصل اسلام کے مزاج کے خلاف ہے، راہبانہ طرزِ زندگی کی ایک شکل ہے جو کہ انسان کی خوشیوں کا گلا گھوٹنے کا غیر فطری طریقہ ہے۔ جب زندگی میں اتنی شدت پسندی اختیار کی جاتی ہے تو زندگی میں خشکی آنے لگتی ہے، روکھا پن آنے لگتا ہے اور مزاجوں میں تلخی اور سختی آنے لگتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں جو اللہ نے انسانوں کے لیے بنائی ہیں اِن سے انسان وقتی طور پر ذرا خوش ہو جاتا ہے، طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے، پھر عبادت میں مزید دل لگتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معیارات مختلف ہیں۔ سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ }(۱۳)

''بے شک اللہ کے نزدیک سب سے باعزت وہ ہے تم میں سے جو سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔''

اللہ نے یہ تو نہیں کہا کہ اللہ کی نظر میں سب سے بہتر اور اعلیٰ وہ ہے جو ہیرے جواہرات نہیں خریدتا یا ریشم نہیں پہنتا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام بہترین لباس پہنتے تھے، تخت و تاج کے مالک تھے لیکن صاحبِ تقویٰ بھی تھے۔ اللہ کی نظر میں بھی بہت اعلیٰ تھے۔ اس کے برعکس کوئی دین دشمن ہو سکتا ہے اچھا لباس نہ پہنتا ہو، درویش صفت ہو لیکن اللہ کی نظر میں باعزت نہ ہو، تو معیار تو تقویٰ ہے۔ اب اگر سونا نہ خریدنے والی خاتون اپنے بارے میں عجب کا شکار ہو جائے، احساس برتری کا شکار ہو

جائے کہ میں کتنی متقی ہوں کہ میں سونا خرید سکتی ہوں تب بھی نہیں خریدتی، اور یہ کیسی دنیادار عورت ہے قرآن پڑھتی ہے اور پھر بھی مہنگی مہنگی چیزیں خریدتی ہے تو یہ عورت غلطی پر ہے۔ لوگوں کے اپنے اپنے مزاج ہوتے ہیں، کسی کو شوق ہوتا ہے کسی کو شوق نہیں ہوتا۔ حاصل کلام یہ کہ اللہ تعالی نے سونا اور ریشم مسلمان امت کے مردوں پر حرام کیا ہے خواتین پر حرام نہیں کیا وہ پہن سکتی ہیں۔

حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے۔ جب وہ چھوٹے تھے تو ایک دفعہ گر گئے اور رونے لگے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو اٹھایا، پیار کیا، کپڑے جھاڑے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے کپڑے جھاڑتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے کہ اسامہ اگر تو بیٹی ہوتا تو ہم تجھے اچھے اچھے کپڑے پہناتے، زیور پہناتے۔ دیکھیں اس حدیث سے کتنی ہدایات نکلتی ہیں، مثلاً ایک یہ کہ بننا سنورنا عورتوں کی فطری خواہش ہے۔ اگر زیور گناہ کا کام ہوتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ نہ کہتے کہ اسامہ اگر بیٹی ہوتا تو ہم اس کو زیور پہناتے۔

ہم متقی ہونے کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ متقی وہ ہے جو اپنی کسی بھی خواہش کو پورا نہیں کرتا اور جو زیادہ متقی ہے وہ نہ صرف اپنی خواہش پوری نہیں کرتا بلکہ کسی اور کی بھی خواہش پوری ہوتے نہیں دیکھ سکتا، اس پر فوراً اسراف کا فتویٰ لگا دیتا ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بھی کبھی کبھار خوب صورت لباس پہنا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قیمتی لباس پہننے کا بہت شوق تھا بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس لیے پہنا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ ایسا لباس پہننا اسراف نہیں ہے۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ اکثر نیا جوڑا پہنتے تھے۔ تو کیا وہ معاذ اللہ مسرف (اسراف کرنے والے) تھے۔ کہا جاتا ہے کہ پہن کر اپنے کسی شاگرد کو دے دیا کرتے تھے۔ تو یہ اسراف نہیں ہے۔

یاد رکھیے اسراف یہ ہے کہ چیزوں کو لے لے کر جمع کرتے جانا، نہ خود استعمال کرنا اور نہ دوسروں کو استعمال کرنے دینا۔ ایک دفعہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آیا اور عرض کی کہ میں چاہتا ہوں میرا لباس بہت خوبصورت ہو، میرا جوتا بھی خوبصورت ہو، یہاں تک کہا کہ میرا کوڑا بھی خوبصورت ہو تو کیا یہ تکبر ہے؟ تو آپ نے فرمایا:

(اَللّٰهُ جَمِيْلٌ وَيُحِبُّ الجَمَالَ) (۱)

''اللہ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند فرماتا ہے۔''

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر و بیانہ

ہم کیسے کسی کو فتوی دے سکتے ہیں کہ سستی گاڑیوں میں بیٹھنے والے تو جنت میں جا سکتے ہیں لیکن مہنگی گاڑی چلانے والے جنت میں نہیں جائیں گے۔ یہ باتیں اچھی طرح سمجھ لیں، کہیں ایسا نہ ہو کہ کل ہم قرآن پڑھ کر نکلیں تو ہم انگلی اٹھا اٹھا کر ہر ایک پر تنقید کریں کہ فلاں اسراف کرتا ہے، فلاں بھی اسراف کرتا ہے، جو یہ کرتا ہے وہ فضول خرچ ہے، جو فلاں گاڑی خریدتا ہے وہ تقویٰ سے عاری ہے وغیرہ وغیرہ۔ مثلاً ایک شخص مرسیڈیز استعمال کرتا ہے یا ذاتی جہاز کا مالک ہے تو کیا وہ جہنم میں جائے گا؟ ہاں مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے جب دکھاوا کیا جائے، اِترایا جائے، اس سے بچنا چاہئے۔

دنیا میں ایسے متقی پرہیز گار، پابندِ صوم وصلوٰۃ ہیں جنھیں اچھا کھانا پینا اور اچھا اوڑھنا پہننا اچھا لگتا ہے، ان کو اس بات سے مطلب نہیں ہوتا کہ انھیں کوئی دیکھ رہا ہے یا کوئی نہیں دیکھ رہا۔ اللہ نے ان کو اپنی نعمتوں سے نوازا ہے تو ان نعمتوں کا اظہار نقصان دہ نہیں ہے۔ اس سے ان کی پرہیز گاری متاثر نہیں ہوتی۔

اب ایک ایک چیز کو ہم ناپنے تولنے بیٹھ جائیں گے تو زندگی اسی جہاد میں گزر جائے گی، اپنے آپ سے کُشتیاں لڑتے رہیں گے۔ خواہشات کو پورا کرنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ خواہشات دل و دماغ سے اُتر جاتی ہیں، مثلاً بازار گئے، ایک کپڑا دیکھا، اتنا پیارا لگا کہ حواسوں پر چھا گیا، نماز پڑھ رہے ہیں تو یاد آ رہا ہے، قرآن پڑھنے بیٹھے ہیں تو وہی ذہن میں چل رہا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ اُس کو خرید لیں تاکہ آپ کے حواسوں سے اتر جائے۔ جب ایک چیز انسان کے پاس آجاتی ہے اس کی وقعت ختم ہو جاتی ہے جب اللہ نے اجازت دی ہے تو کیوں اپنے آپ کو مشقت میں ڈالیں۔ اصل میدان لڑائی کا یہ ہے کہ اپنے نفس کو صغیرہ کبیرہ گناہوں سے روکا جائے۔

کھانے میں اسراف:

اگلی چیز ہے کھانے میں اسراف۔ غور کریں اللہ تعالی نے کیا کچھ نعمتیں ہمارے کھانے کے لیے بنائی ہیں، ان میں ساگ ترکاری بھی ہے، جانوروں کا گوشت بھی ہے۔ اللہ کے دسترخوان میں خشک میوے (dry fruits) بھی ہیں، سستے سے لے کر مہنگے تک سب شامل ہیں، بادام، پستے، چلغوزے یا کاجو، جو بہت مہنگے ہیں اور مونگ پھلی وغیرہ، جو کہ سستی ہیں، یہ تمام چیزیں اللہ کی نعمتیں ہیں۔ اسراف یہ ہے کہ آپ کوئی چیز خرید کر گھر لائے۔ سب نے کھائی، مہمانوں کو بھی دی مگر گھر کے خادمین کو کھانا نصیب نہ ہو، اُن کو ہاتھ لگانے کی قطعاً اجازت نہ ہو۔ یہ زیادتی ہے وہ بھی انسان ہیں، اُن کا بھی دل چاہتا ہے، ان کو بھی اپنے ساتھ کھلایا کریں۔

اگر اللہ نے استطاعت دی ہے تو مہنگے سے مہنگا میوہ کھائیں مگر گھر میں سب کے ساتھ مل کر

کھائیں۔نوکروں اور ملازموں کا بھی حصہ نکالیں۔کھانے میں اسراف کا تعلق مہنگے یا سستا ہونے سے نہیں ہے۔اصل اسراف یہ ہے کہ کھانے کو زندگی کا مقصد ہی بنا لیا جائے۔یہ کھانے کے اندر اسراف ہے کہ ہر وقت کھانے کے متعلق ہی منصوبہ بندی ہو،کیا کھائیں اور کہاں کھائیں یہی زندگی کی فکر بن جائے۔

کھانا اتنا کھائیں کہ جس سے صحت اچھی رہے۔اللہ کے نام سے شروع کریں اور اللہ کی خاطر ہی کھائیں تاکہ تندرست وتوانا رہیں۔اور کھانا کھانے کے بعد اللہ کا شکر ادا کریں۔اس کے برخلاف اتنا کھانا کہ بیماریاں جنم لیں،سستی اور کاہلی پیدا ہو جائے تو یہ اسراف ہوگا۔صد افسوس کہ آج دنیا کھانے کے اسراف کا شکار ہوگئی ہے۔امیر ممالک میں اتنا زیادہ کھاتے ہیں کہ کھانا بجائے نعمت کے زحمت بن گیا ہے۔بسوں اور جہازوں کی نشستوں میں سما نہیں پاتے،ہسپتالوں میں خصوصی بستر بنانے پڑتے ہیں،یہ سب اسراف کی وجہ سے ہے۔اس کو بسیار خوری کہا جاتا ہے۔عیسائیت میں بسیار خوری کو سات مہلک گناہوں میں شمار کیا جاتا تھا۔تو کم کھانے کی عادت ڈالیں،بے تحاشا کھانے سے پرہیز کریں،اس سے وضو برقرار نہیں رہتا،نمازیں قضا ہوتی ہیں،سستی آتی ہے،بیماریاں جنم لیتی ہیں۔یہ ہے کھانے میں اسراف اور یہ چیز گناہ میں شامل ہوتی ہے۔پھر کھانے میں اسراف یہ بھی ہے کہ حلال اور حرام کی تمیز نہ کی جائے۔باہر ملکوں میں جانے والے بغیر تحقیق کے وہاں کی تیار شدہ غذائیں برگر،کیک اور دیگر اشیاء کھاتے ہیں جو حرام بھی ہوسکتی ہیں۔ذبح ٹھیک نہیں ہوتا،سور کی چربی اور گوشت شامل ہوتے ہیں۔کیک اور پیسٹری میں شراب وغیرہ کا استعمال عام ہے اور مسلمان وہاں جا کر بڑے آرام سے یہ سب کھا لیتے ہیں یہ اسراف ہے اور گناہ میں شامل ہے۔

{كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا} (الاعراف: ۳۱)

''کھاؤ پیو مگر اسراف مت کرو۔''

حلال حرام کا بہت خیال رکھیں،پھر گھر میں آٹھ دس قسم کے پکوان تیار کروانا کہ لوگ متاثر ہوں گے،میری واہ واہ ہو جائے گی،یہ سراسر اسراف ہے،یہ حد سے گزرنے والی بات ہے۔کھانے کو ضائع کرنا،چیزیں سڑ رہی ہیں لیکن کسی کو نہ دینا،پکا ہوا کھانا کچرے میں پھینک دینا۔یہ بھی اسراف ہے۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو یہاں تک فرمایا کہ تم میں سے اگر کسی کا نوالہ زمین پر گر جائے تو اسے اٹھا کر،جھاڑ کر کھالو۔

بسکٹ یا کوئی اور خشک چیز فرش پر گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھالینی چاہیے۔ہمارے

یہاں اس کو تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے، زمین پر گری ہوئی چیز تو ہم کھا ہی نہیں سکتے، یہ تو بدتمیزی ہے، لوگ کیا سوچیں گے کتنے گنوار لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ عین سنت ہے۔ ایک اور چیز جو ہمارے ہاں تہذیب کی نشانی سمجھی جاتی ہے وہ یہ کہ گلاس میں تھوڑا سا شربت چھوڑ دیا جائے، پلیٹ میں تھوڑا سا سالن چھوڑ دیا جائے، اس کو بعض لوگ قابل تعریف سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ اسراف ہے۔ پلیٹ میں اتنا سالن لیں جو ختم کرسکیں۔ شادی بیاہ میں، دعوتوں میں بہت سارا کھانا پلیٹوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے جو پھر کچرے خانے میں پھینک دیا جاتا ہے، یہ اسراف ہے۔ بچوں کو بچپن ہی سے یہ تربیت دیں اور عادت ڈالیں کہ پلیٹ صاف کرنی ہے، کھانا ضائع کرنا گناہ ہے۔

قدرتی وسائل میں اسراف:

قدرتی وسائل میں اسراف یا ناقدری کوئی نئی بات نہیں۔ لوگوں کو شعور دلایا جائے کہ قدرتی وسائل کا ضیاع غلط چیز ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے تقریباً چودہ سو سال پہلے ہمیں اس کے بارے میں احتیاط کی تلقین فرمادی تھی۔ آپ ﷺ نے ایک آدمی کو دیکھا جو پانی کے (کسی کنویں چشمے یا ندی کے) کنارے بیٹھا وضو کر رہا تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس میں اسراف نہ کرو، تو اس نے عرض کیا اس میں بھی اسراف ہوسکتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا ہاں! دریا کے کنارے بھی وضو میں اتنا ہی پانی استعمال کرنا چاہیے جتنی کہ ضرورت ہو۔

لیکن آج ہم وضو کرتے ہوئے پورا نل کھول دیتے ہیں۔ جب تک ہاتھ پر صابن لگایا، ملا، رگڑا تب تک پانی بہتا چلا جارہا ہے۔ تین دفعہ کلی کی تو پانی بہہ رہا ہے۔ ناک صاف کرنے میں، مسح کرنے میں کتنا پانی ضائع کیا؟ پہلے تو وضو برتن میں پانی لے کر کیا جاتا تھا ایک ہاتھ سے پانی لیتے اس سے کلی کرتے، ناک صاف کرتے تو پانی ضائع نہیں ہوتا تھا۔ تھوڑے پانی میں پورا وضو مکمل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ حتیٰ الامکان کوشش کریں کہ نل بند کردیا کریں۔ تھوڑا پانی استعمال کریں خواہ وضو کرنے میں ایک دو منٹ زیادہ لگ جائیں، کوئی بات نہیں! مگر اسراف نہیں ہونا چاہیے۔ نہانے میں بھی بے تحاشا پانی بہانا، شاور (shower) کے نیچے کھڑے رہنا بھی اسراف ہے۔ پانی اللہ تعالیٰ کی بہت قیمتی نعمت ہے، اس کو بہت احتیاط اور بقدرِ ضرورت استعمال کرنا چاہیے۔ پانی کے بے جا استعمال کی وجہ سے آج کل پوری دنیا میں صاف پانی کی کمی ہے۔ اس کا بھی اللہ کے ہاں حساب ہوگا تو مسلمان کو ماحول کے بارے میں بہت محتاط ہونا چاہیے۔

اسی طرح بجلی بھی ایک کام کی چیز ہے، اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے۔ اس کے استعمال میں احتیاط کرنی چاہیے۔ جس کمرے میں ہوں اُس کی بتی اور پنکھا وغیرہ کھول لیں اور کمرے سے نکلتے وقت پنکھا اور بتی بند کر دیں۔

اِسی طرح گیس کتنی قیمتی نعمت ہے، یہ بھی ہمارے گھروں میں بے تحاشا ضائع ہوتی ہے۔ گیس احتیاط سے استعمال کریں، کھانا پکانے کے بعد چولہا بند کر دیں۔ اس کے علاوہ مین سوئچ بھی بند کر دینا چاہیے کیوں کہ بعض دفعہ گیس نکل رہی ہوتی ہے۔

عبادت سمجھ کر پانی، گیس اور بجلی بچایئے۔ کہیں اللہ کی نعمتیں ضائع نہ ہوں، ناشکری اور نا قدری نہ ہونے پائے۔ یہ کنجوسی نہیں ہے یہ میانہ روی ہے۔ جہاں ضروت نہ ہو وہاں بجلی کا بٹن بند کرنا یا سردیوں میں کمرے سے نکل کر گیس ہیٹر بند کرنا بھی نیکی ہے۔

یہ سب کچھ پڑھنے کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم نے اپنی زندگیوں میں بہت اسراف کیا ہے۔ تو اب کیا کریں؟ سورۃ الزمر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ} (الزمر: ۵۳)

”اے نبی ﷺ فرما دیجئے اے میرے وہ بندو! جو اپنی جانوں پر اسراف کر بیٹھے ہو تم اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہونا۔ اللہ سارے گناہ بخش دے گا وہ تو ہے ہی غفور اور رحیم، رحم فرمانے والا۔“

شروع میں ہم نے بات کی تھی کہ ہم نے عادتوں پر ہی کام کرنا ہے۔ اچھا اخلاق کیا ہے؟ عادتوں کا درست ہو جانا۔ اگر ہمیں اسراف کی عادت ہو گئی ہے تو اس عادت کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ قرآن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح لازم و ملزوم کی طرح آتا ہے۔ یہ الفاظ ہمیشہ اکھٹے آتے ہیں۔ تو ہم ایک لحاظ سے ان کا ترجمہ یوں بھی کر سکتے ہیں کہ وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی عادتیں اچھی ہیں۔ نماز بھی عادت ہے، روزہ بھی عادت ہے، جو بھی ہم کام کرتے ہیں وہ عادت ہی تو بن جاتی ہے۔ تو اگر ہم نے اپنی عادتیں اچھی کر لیں تو ہم نے عمل صالح کر لیا۔ آخر میں اللہ سے دعا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ ہماری عادت بن جائے کہ ہم اسراف نہ کریں۔ ہمیں اچھے کاموں میں پیسے خرچ کرنے چاہئیں، دین کے کاموں میں اگر بہت زیادہ بھی خرچ کر دیا تو یہ نیکی ہو گی، اس کا بہت اجر ملے گا اور اگر گناہ کے کاموں میں ایک پیسہ بھی لگایا تو وہ اسراف ہے اور اسراف گناہ ہے۔

بخل

بخل کے معنی ہیں ہاتھ بند کر کے رکھنا اور کنجوسی دکھانا۔ بخل کی مذمّت کا ذکر ہمیں قرآن و احادیث میں ملتا ہے:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{ وَ لَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَیْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَ لِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ} (آل عمران: ۱۸۰)

''اور جو لوگ اُس مال میں جو اللہ نے اپنے فضل سے ان کو عطا فرمایا ہے بخل کرتے ہیں وہ اِس بخل کو اپنے حق میں اچھا نہ سمجھیں۔ بلکہ یہ ان کے لیے بُرا ہے وہ جس مال میں بخل کرتے ہیں، قیامت کے دن اس کا طوق بنا کر ان کی گردنوں میں ڈالا جائے گا۔ اور آسمانوں اور زمین کا وارث اللہ ہی ہے اور جو تم عمل کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

{الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ وَ یَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَ یَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا} (النساء: ۳۷)

''جو لوگ خود بخل کرتے ہیں اور دیگر انسانوں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو کچھ اللہ نے ان کو اپنے فضل سے عطا کیا ہے، اس کو چھپاتے ہیں۔ تو تیار کیا ہے ہم نے ایسے ناشکروں اور کافروں کے لیے رسوا کن عذاب۔''

اسی طرح سورۂ محمد ﷺ میں فرمایا:

هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ یَّبْخَلُ وَ مَنْ یَّبْخَلْ فَاِنَّمَا یَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ (محمد: ۳۸)

''دیکھو تم وہ لوگ ہو جب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو بلائے جاتے ہو تو تم میں ایسے شخص بھی ہیں جو بخل کرنے لگتے ہیں اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔''

اسی بخیلی اور کنجوسی کی تصویر سورۂ ھمزہ میں کھینچی گئی ہے کہ جو شخص مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر

رکھتا ہے، اس کا کیا حال ہوگا۔

{ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ } (الھمزۃ: ۱ تا ۲)

''بڑی خرابی ہے ہر ایسے شخص کی جو عیب ٹٹولنے والا غیبت کرنے والا ہو۔ جو مال جوڑتا اور اس کو گن گن کر رکھتا ہے۔''

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(السَّخِيُّ قَرِيبٌ مِنَ اللهِ قَرِيبٌ مِنَ الْجَنَّةِ قَرِيبٌ مِنَ النَّاسِ بَعِيدٌ مِنَ النَّارِ وَالْبَخِيلُ بَعِيدٌ مِنَ اللهِ بَعِيدٌ مِنَ الْجَنَّةِ بَعِيدٌ مِنَ النَّاسِ قَرِيبٌ مِنَ النَّارِ) (۱)

''سخی شخص اللہ کے قریب ہوتا ہے، جنت کے قریب ہوتا ہے اور لوگوں سے بھی قریب ہوتا ہے جب کہ آگ سے دور ہوتا ہے اور بخیل اللہ سے، جنت سے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے اور آگ سے قریب ہوتا ہے۔''

حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے ایک اور حدیث مروی ہے کہ:

(لَا يَجْتَمِعُ الشُّحُّ وَالْإِيمَانُ فِي جَوْفِ رَجُلٍ مُسْلِمٍ) (۲)

''بخل اور ایمان کسی مسلمان آدمی کے دل میں اکٹھے نہیں ہو سکتے۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک دفعہ لوگوں سے پوچھا بتاؤ تمہارا سردار کون ہے؟ انہوں نے کہا کہ فلاں ہمارا سردار ہے، وہ بہت اچھا آدمی ہے لیکن بخیل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بخیل شخص سیّد یعنی سردار نہیں ہو سکتا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ خِبٌّ وَلَا مَنَّانٌ وَلَا بَخِيلٌ) (۳)

''نہیں داخل ہوگا جنت میں دھوکا دینے والا، احسان جتانے والا اور کنجوس۔''

ان نصوصِ قرآن اور احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ اللہ کے نزدیک بخل یا کنجوسی انتہائی مذموم شے ہے یہاں تک کہ بتا دیا گیا کہ کنجوس انسان جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ یقیناً یہ ایک ایسی برائی ہے جس سے مکمل طور پر نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر و الصلۃ، باب ماجاء فی السخاء

(۲) مسند احمد، مسند المکثرین، مسند ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ

(۳) جامع الترمذی، کتاب البر و الصلۃ، باب ماجاء فی البخیل...

جو انسان شریعت کے مطابق بخیل قرار پا جائے اس کے بارے میں تو یہ احادیث اور آیات ہم نے پڑھ لیں کہ وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا لیکن یہ بخل کا انتہائی درجہ ہے جب کہ اس سے کمتر درجے میں بھی بخل کیا جا سکتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایسے بخل کے نتیجے میں ہم جہنم میں تو نہ جائیں لیکن کچھ نہ کچھ ضَرر بہرحال پہنچے گا، مثلاً بخیل شخص کے باہمی تعلقات خوش گوار نہیں رہ پائیں گے۔ اُس کی شخصیت مسخ ہو جائے گی، احسان کا درجہ حاصل نہیں ہو پائے گا اور اگر بخل سے نجات پالی جائے تو دنیا کے فائدے بھی ملیں گے اور آخرت میں بھی ان شاء اللہ تعالیٰ بچا لیے جائیں گے۔

بخل کا دائرہ:

اب ہم یہ دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ بخیلی کس کس طرح کی ہوسکتی ہے۔ بخل کی کچھ صورتیں تو واضح گناہ میں شامل ہیں یعنی ایسا بخل جسے شریعت بخل کہہ دے تو وہ باعثِ وبال ہے۔ چنانچہ یہ سمجھنا چاہیے کہ وہ بخل کیا ہوتا ہے جس پر جہنم کی وعید آئی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ نے کسی کو مال سے نوازا اور وہ اس کی زکوٰۃ ادا نہ کرے یا کم ادا کرے یہ شریعت کی نظر میں بخل ہے۔ بخل کی یہ صورت پیسے والوں ہی سے متعلق ہے۔ مال دینے سے ہاتھ روکنا دراصل مالداروں کا مرض ہے۔

مال میں بخل:

جن کے پاس مال کی کثرت ہوتی ہے اُن کو بخل لاحق ہوسکتا ہے یعنی اللہ نے بہت کچھ دے رکھا ہے مگر اُس کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، مٹھی بند رکھتے ہیں۔ زمینیں ہیں، فیکٹریاں ہیں، تجارت و کاروبار ہے، دولت برس رہی ہے مگر زکوٰۃ نہیں نکالتے، اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ضرورت مندوں کو نہیں دیتے، صدقہ و خیرات نہیں کرتے۔ اسی کے بارے میں سورۂ آل عمران میں ارشاد ہوا کہ یہ تمام مال و اسباب آخرت میں طوق بنا کر گلے میں ڈالا جائے گا اور حدیث شریف میں بیان ہوا:

(مَنْ آتَاهُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ مَالًا فَلَمْ يُؤَدِّ زَكَاتَهُ مُثِّلَ لَهُ مَالُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ شُجَاعًا أَقْرَعَ لَهُ زَبِيبَتَانِ يَأْخُذُ بِلِهْزِمَتَيْهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَقُولُ أَنَا مَالُكَ أَنَا كَنْزُكَ)(۱)

''جو شخص اپنی زکوٰۃ ادا نہیں کرتا اس کا سارا مال قیامت کے روز اس کے گلے میں سانپ بنا کر ڈالا جائے گا۔ جو اُس کی باچھوں کو ڈسے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، میں تیرا خزانہ ہوں۔''

اگر نصاب کے مطابق زکوٰۃ ادا کر دی گئی ہے اور شریعت کے عائد کردہ حقوق بھی پورے ادا

(۱) سنن النسائی، کتاب الزکاۃ، باب مانع الزکاۃ مالہ

کیے ہیں یعنی صدقات اور خیرات وغیرہ تو سارا مال حلال ہے اور اس کے تصرف کی اجازت ہے۔

کفالت میں بخل:

دوسری چیز یہ کہ اگر آدمی اپنے زیرِ کفالت افراد پر خرچ نہ کرے تو یہ بخل ہے۔ بیوی بچوں پر، ماں باپ پر، بہن بھائیوں پر، قرابت داروں پر۔ خرچ کرنے کی استطاعت کے باوجود ان پر خرچ نہیں کرتا یا اگر کرتا بھی ہے تو اپنی حیثیت سے بہت کم خرچ کرتا ہے، یہ دونوں صورتیں بخل میں شمار ہوتی ہیں۔ خاص طور پر بیٹے پر لازم ہے کہ والدین کی ضروریات کا خاص خیال رکھے، اُن پر کھلے دل سے خرچ کرے، کیوں کہ اگر کوئی بیٹا اپنے والدین پر خرچ نہیں کرتا لیکن ساری دنیا کے رفاہِ عامہ کے اداروں کو پیسہ دیتا ہے تو پھر بھی وہ بخیل ہے۔ اسی طرح کوئی شخص بیوی کو نان نفقہ نہیں دیتا، کنجوسی سے ہاتھ کھینچ کر رکھتا ہے یا علاج معالجے اور اولاد کی تعلیم پر خرچ نہیں کرتا لیکن دنیا کو دکھانے کے لیے غریبوں میں آٹے کی بوریاں بانٹتا ہے تو پھر بھی وہ بخیل ہے۔ یہ سب باتیں بخل کی نشانیاں ہیں اور گناہ میں شمار ہوتی ہیں۔

عبادات میں بخل:

عبادات میں بخل کا مطلب یہ ہے کہ ہم عبادات نہ کریں اور اگر کریں بھی تو پوری طرح سے نہ کریں۔ مثلاً نماز نہ پڑھیں یا کم پڑھیں، استطاعت ہونے کے باوجود حج نہ کریں۔ پیسہ ہے، صحت ہے، جا بھی سکتے ہیں لیکن پھر بھی حج سے غافل ہیں تو یہ بھی بخل ہے۔ صاحبِ ثروت ہونے کے باوجود اللہ کی نعمتوں کو اُس کی راہ میں نہ لگانا، سب بچا بچا کر اپنے لیے رکھ لینا بھی بخل ہے، جس کا ذکر سورۂ محمد ﷺ میں آیا ہے:

{هَاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ} (محمد:۳۸)

”تم وہی ہو کہ جب پکارا جاتا ہے کہ آؤ اللہ کی راہ میں خرچ کرو تو تم میں سے ایسا بھی ہے کہ بخل کرتا ہے۔“

تو اِس طرح جو شریعت کی بتائی ہوئی مدّات کے مطابق بخل کرے گا اس کے لیے سخت وعید آئی ہے۔

اب آگے ہم بخل کی دیگر صورتیں دیکھیں گے جن کے ارتکاب سے ضروری نہیں کہ انسان جہنم میں ڈالا جائے لیکن اگر وہ ان چیزوں میں بخل کرے گا تو پھر درجۂ احسان نہیں پا سکے گا، اس کی شخصیت نکھر نہیں سکے گی۔ دراصل بخل کا کسی بھی صورت میں ہونا شخصیت پر منفی اثر چھوڑتا ہے،

شخصیت جامع اور خوبصورت نہیں بن پاتی۔ لہٰذا ہمیں بخل کی ہر صورت سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی ہے۔

مروت میں بخل:

مروت کے معنی رواداری کے ہوتے ہیں یا کسی کا لحاظ رکھنا۔ مروت کے مادے سے ہی لفظ ''اِمْرَئٌ'' (مرد) اور ''اِمْرَأَۃٌ'' (عورت) ہیں جو کہ قرآن حکیم میں بھی استعمال ہوئے ہیں۔ مروّت انسان کی فطرت میں شامل ہے۔ لاطینی (Latin) زبان میں (vir) کا مطلب ہوتا ہے مرد، (virility) مردانگی۔ انگریزی میں انسان کا نیک سیرت ہونا بھی اسی مادے (root) سے ہے یعنی یہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ آدمی مروّت سے کام لے، دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

مروّت میں بخل کیا ہوتا ہے؟ وہ یہ کہ گنجائش ہوتے ہوئے بھی لوگوں کے ساتھ تنگی کرے۔ مثال کے طور پر کسی کو قرض دیا لیکن مقروض مقررہ وقت پر پیسے واپس نہیں کر پا رہا اور قرض دینے والا مہلت دے سکتا ہے اور اس کو کوئی فوری ضرورت بھی نہیں ہے یا کچھ دن مزید صبر کر سکتا ہے مگر پھر بھی سختی کرتا ہے تو یہ مروت میں بخل ہے۔ ایسے موقع پر بندۂ مومن کو رواداری کا مظاہرہ کرنا چاہیے، یہ مروت کا تقاضا ہے اور ایسا نہ کرنا مروت میں بخل شمار ہوگا۔ حدیث میں ایک واقعہ نقل ہوا ہے۔ ایک مال دار آدمی تھا جو لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا اور اُس نے اپنے کارندے سے کہہ رکھا تھا کہ اگر مقروض کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ ہو تو اس کو مہلت دے دینا۔ جب اس شخص کا انتقال ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے صرف اِس بات پر معاف فرما دیا اور جہنم سے آزاد کر دیا۔ اس واقعہ سے یہ سبق ملتا ہے کہ انسان اپنا حق وصول کرنے میں سختی نہ کرے، دوسروں کا حق دینے میں محتاط رہے، وقت پر ادا کرے بلکہ حق واجب ہونے پر حق سے زیادہ ہی دے اور اپنا حق لینے میں ذرا مروّت سے کام لے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ شریعت کے لحاظ سے بھی بخل ہے کہ دوسروں کا حق مار لیا جائے اور اپنے حق کی وصولی میں سختی کی جائے۔

اپنے ملازمین کے ساتھ بھی مروت کا برتاؤ کرنا چاہیے۔ اُن کی معمولی کوتاہیوں کی وجہ سے تنخواہ کاٹنا، بروقت پیسے نہ دینا یا کم تنخواہ طے کرنا صحیح طرزِ عمل نہیں ہے۔ غریب آدمی جس کے زیرِ کفالت کئی افراد ہوں اس کے لیے ایک دن بھی تنخواہ دیر سے ملنا پریشانی کا سبب بن سکتا ہے لیکن ہمارے معاشرے میں نوکروں سے زیادتی قابلِ تحسین سمجھی جاتی ہے، بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے، با

قاعدہ فخر سے بتایا جاتا ہے کہ ہمارا نوکر تو صفائی بھی کرتا ہے، کھانا بھی پکاتا ہے، رات کو چوکیداری بھی کرتا ہے، وقت پڑنے پر گاڑی بھی چلا لیتا ہے، سودا سلف بھی لا کر دے دیتا ہے اور میں صرف تین ہزار روپے تنخواہ دیتی ہوں اور لوگ جواباً کہتے ہیں آپ کتنے خوش قسمت ہیں! ہمارا ملازم تو صرف کچن سنبھالتا ہے اور پانچ ہزار روپے لیتا ہے۔ پھر کوئی کہتا ہے لو بیوقوف ہو، ریٹ خراب کرتے ہو اور بہت داد دی جاتی ہے، عقلمند سمجھا جاتا ہے اُن کو جو اِس طرح نوکروں سے بہت سارا کام لے سکیں اور حقیر سی تنخواہ دیں۔ اس کو کہتے ہیں کتنا کفایت شعار ہے اور اُس کے بخل کو سراہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص دس بارہ گھنٹے کام کرتا ہے تو اُس کو اس کی محنت اور وقت کے مطابق اُجرت دینی چاہیے۔ یہ امر باعثِ شرمندگی ہے کہ ہم اپنے ماتحت سے زیادہ کام لیں اور معاوضہ تھوڑا دیں۔ اِس پر فخر کرنا، ایسی حرکت کو تمغۂ عزت سمجھنا اور عقلمندی کی دلیل سمجھنا یقیناً غلط روش ہے اور یہ بخل بھی ہے۔ جتنا کام لیں اتنا معاوضہ ضرور ادا کریں، ریٹ خراب ہونے کی فکر نہ کریں، اللہ نے دیا ہے تو اللہ ہی کا سمجھ کر خرچ بھی کریں۔

بعض لوگ اتوار بازار جا کر سینکڑوں بلکہ ہزاروں روپے کی خریداری کرتے ہیں اور وہاں مزدوروں سے ٹوکریاں اور سامان اُٹھواتے ہیں جو وزن اٹھا کر اُن کے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا ہے، گھنٹوں آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ آخر میں اُسے پانچ یا دس روپے پکڑا دیتے ہیں۔ یہ سراسر بخل ہے جہاں آپ نے دو تین ہزار کی شاپنگ کی اور بیچارے مزدور کا ایک گھنٹہ بھی لے لیا تو پچاس سو روپے دینے میں کیا حرج ہے، نیکی بھی ملے گی، وہ دعا بھی دے گا اور اللہ بھی راضی ہوگا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس بخل پر ہم کفایت شعاری کا لیبل لگا دیتے ہیں اور ساری بچت ہم ایک غریب کو پورا معاوضہ نہ دے کر کرتے ہیں۔

آپ یہاں کے ریٹ خراب ہونے کی فکر مت کریں۔ اپنے اس نامۂ اعمال کی فکر کریں جو مسلسل سیاہ ہو رہا ہے اور قیامت میں جس کا سامنا ہوگا۔ اگر اُس میں نیکیاں ہلکی ہوگئیں تو سوچیں کتنا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ دنیا میں تھوڑا سا زیادہ دے کر آپ کو اتنا نقصان نہیں ہوگا۔ یہ بھی سوچیں کہ آپ کپڑوں، جوتوں، فاسٹ فوڈ اور بچوں کے کھلونوں پر بے تحاشا خرچ کر ڈالتے ہیں لیکن کسی غریب کو دینے میں ساری کفایت شعاری یاد آجاتی ہے۔ یقین رکھیں آپ کے مال میں سو دو سو روپے خرچ کرنے سے کوئی کمی نہیں ہوگی۔ کسی مزدور کو دس، بیس روپے زیادہ دے کر آج تک کوئی غریب نہیں ہوا۔

بعض لوگوں کی ذہنیت یہ ہوتی ہے کہ زکوٰۃ نکالنے اور صدقہ وخیرات کرنے تو سے نہیں گھبراتے لیکن تنخواہیں دیتے ہوئے جان جاتی ہے۔ اگر ملازموں کی معاشی ذمہ داریاں زیادہ ہیں مثلاً بوڑھے والدین ہیں، بیوی بچے ہیں، ایک ہی کمانے والا ہے تو اس کو فراخ دلی سے تنخواہ دیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تنخواہ تو ہم اتنی ہی دیں گے اس کے علاوہ مدد وغیرہ کرتے رہیں گے۔ مسئلہ یہ ہے کہ اس طرح ملازمین کی عزت نفس بار بار مجروح ہوتی ہے، جب وہ آپ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، سوال کرتے ہیں اور آپ اُن کو خیرات دیتے ہیں۔ اس کے بجائے تنخواہ اتنی دیں کہ ان کی ضروریات پوری ہوجائیں اور اُن کی عزتِ نفس بھی سلامت رہے، اُس پر زد نہ پڑے کیوں کہ ہم تنخواہ اپنا حق سمجھ کر لیتے ہیں، ہماری محنت کی کمائی ہوتی ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ چار ہزار تنخواہ مقرر کریں اور پھر دو ہزار خیرات دیں، اس کی تنخواہ چھ ہزار روپے مقرر کردیں۔ پھر اگر اس کو ضرورت پڑے تو آپ اپنی حیثیت کے مطابق نیک سلوک کرتے رہیں لیکن تنخواہ دینے میں بخل مت کریں۔

بخل عموماً پیسے والوں کا مرض ہے۔ اگر اللہ نے ہمیں حیثیت دی ہے، اچھا کھاتے پیتے ہیں، فائیو اسٹار ہوٹل جاکر دس بارہ ہزار کا کھانا کھالیتے ہیں، ہزار دو ہزار کا پیزا (Pizza) آرڈر کرکے گھر پر منگوالیتے ہیں تو پھر نوکروں کے ساتھ بھی بخل مت کیجیے ورنہ اُن کے اندر غصہ اور نفرت پیدا ہونے کا شدید اندیشہ ہے۔

بخل نفرت کا سبب:

اسلام کا اولین دور دیکھیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مال دار صحابی بھی تھے لیکن جو غریب تھے ان کو کبھی مال داروں سے نفرت نہ ہوئی۔ کبھی آپ یہ نہیں پڑھیں گے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے کبھی نفرت کا اظہار کیا یا حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ جو کہ لکھ پتی صحابی تھے، اُن کے خلاف حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے کبھی نفرت کا اظہار کیا۔ اُس معاشرے میں بہت امیر بھی تھے اور بہت غریب بھی لیکن غریب امیروں سے نفرت نہیں کرتے تھے اور نہ حرص کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امیر بخیل نہیں تھے اور غریب حریص نہیں تھے۔ امیر سخی تھے وہ دوسروں پر خرچ کیا کرتے تھے، غریبوں کو مانگنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی مانگنے سے پہلے ہی اُن کو مل جاتا تھا۔ امیر ضرورت مندوں کا خیال رکھتے، باخبر رہتے اور ضروریات پوری کرتے رہتے تھے۔ ہمارا بھی یہی رویہ ہونا چاہیے، ہمیں دوسروں کی ضروریات اور حاجات کا اندازہ ہونا چاہیے۔ ہمیں بھی سخی

ہونے کی ضرورت ہے۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں میں ڈنڈی مار کر اس کو کفایت شعاری کا لیبل (label) نہ دیا کریں، یہ کفایت شعاری نہیں بلکہ بخل ہے۔ کفایت شعاری کو ہم ان شاء اللہ تعالیٰ آگے زیرِ بحث لائیں گے۔

مروت میں بخل کی ایک اور مثال:

مروت میں بخل کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کوئی بہن بازار جائے اور چھوٹی چھوٹی چیزوں میں دام کم کروانے کے لیے حجت بازی کرنا شروع کردے۔ اب ایک کیلے والا ٹھیلہ لگا کر کھڑا ہے اور آپ کو پتہ ہے کہ اگر شام تک اس کا مال نہ بکا تو خراب ہوجائے گا۔ لہٰذا شام کو نقصان سے بچنے کے لیے مجبوراً وہ قیمت کم لگاتا ہے لیکن آپ اُس کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مزید قیمت کم کرنے کے لیے تکرار کرتی رہتی ہیں، تو یہ غلط ہے۔ وہ بیچارا دے تو دیتا ہے لیکن آپ یہ سوچیں کہ دس روپے کم کروا کر ہم نے کتنا بچا لیا؟ اگر ہم اُسی قیمت میں لے لیتے تو غریب کا بھلا ہوجاتا۔ اپنے بچوں کو تو آئس کریم (ice cream) کھانے کے لیے سو روپے بغیر سوچے سمجھے دے دیتے ہیں تو ٹھیلے والے سے دس بیس روپے بچا کر ہم نے کون سا کمال کردیا۔ بازار میں آلو پیاز پر کچھ پیسے کم کرانا مروت کا بخل ہے، وقت بھی ضائع ہوتا ہے اور غریب کو تھوڑے منافع سے محروم کرکے خود بھی کچھ نہیں حاصل ہوتا۔

بازار میں اس بھاؤ تاؤ کے چکر میں بہت وقت ضائع ہوجاتا ہے اور کتنا کچھ بچا پاتے ہیں؟ کچھ بھی نہیں! ہاں اگر ہزاروں کی چیز خریدتے وقت پانچ سو یا ہزار کم کروالیے تو بات بھی ہے، یہ بخل نہ ہوگا، البتہ معمولی چیزوں میں، معمولی رقم پر بھاؤ تاؤ کرنا بخل ہے۔

اس کے برخلاف ایک رویّہ یہ ہوسکتا ہے کہ ایک بازار میں کیلے کے کئی ٹھیلے لگے ہیں۔ کوئی بیس روپے درجن دے رہا ہے، کوئی پچیس روپے اور کوئی تیس روپے درجن، لیکن کوالٹی سب کی ایک جیسی ہے۔ اب آپ نے بخل سے بچنے کے لیے تیس روپے درجن والے خرید لیے کیوں کہ سستا خریدنے میں بخل کا احتمال ہے۔ یہ دراصل حماقت کا ارتکاب ہے۔ ایسا بھی نہ کریں کہ سخاوت اور فیاضی کے نام پر پوری تنخواہ بانٹ کر اڑا دیں، سستی چیزیں چھوڑ کر وہی چیزیں مہنگے داموں میں خرید لیں۔ حماقت کرنے کو نہیں کہا جارہا سخاوت کرنے کو کہا جارہا ہے۔ سخاوت اور حماقت میں فرق

ہے۔ پودینے اور ہرے دھنیے اور مرچوں کی گڈیوں پر دو تین روپے بچا کر کون سی جائیداد بنالیں گے۔

تحفہ دینے میں بھی خیال رکھیں کہ وہ چیز نہ زیادہ گھٹیا ہو اور نہ بہت قیمتی۔ اس میں فضول خرچ ہونے کی ضرورت نہیں کہ قرضے لے کر یا حیثیت سے بڑھ چڑھ کر، یا دکھاوے اور واہ واہ کے لیے قیمتی تحفے دیں۔ بس مناسب چیز ہو، حیثیت کے مطابق لیکن حیثیت کے باوجود گھٹیا چیز تحفے میں دینا مروت کا بخل شمار ہوگا۔

صدقہ میں بخل:

صدقہ وخیرات کرتے وقت گھٹیا ترین چیز دینا کھلا بخل ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ} (البقرۃ:۲۶۷)

''اور بُری اور ناپاک چیزیں دینے کا قصد نہ کرنا جس کو تم خود لینے والے نہ ہو مگر اس طرح کہ تم کو آنکھیں بند کرنی پڑیں، جان لو کہ اللہ غنی ہے اور حمید ہے۔''

صدقہ وخیرات میں بخل کیسے کیا جاتا ہے؟ پہلی بات یہ ہے کہ جو چیزیں ہم خیرات کے لیے نکالتے ہیں وہ عموماً پرانی ہوتی ہیں، رنگ اتر چکا ہوتا ہے، گھس چکی ہوتی ہیں، مزید یہ کہ دیتے ہوئے خیال آتا ہے کہ دوپٹہ تو اتنا استعمال نہیں ہوا، یہ رکھ لیتے ہیں۔ یہ بیل (lace) جو گلے، دامن اور آستینوں میں لگی ہوئی ہے یہ اتار لیتے ہیں، کام آجائے گی۔ باقی سوٹ صدقہ کر دیتے ہیں۔ اور ایسا جوڑا صدقہ دے کر اپنے آپ کو نیک سمجھتے ہیں اور سخاوت کا ڈھونگ رچاتے ہیں۔ یہ دراصل خیرات میں بخل ہے۔ ذرا یہ سوچیے کہ اللہ جب آپ کو ان نعمتوں سے نوازتا ہے تو کس طرح دیتا ہے؟ کیا پھٹا پرانا، گھسا پٹا، اُدھڑا ہوا؟ صدقہ کرتے وقت یہ بہت سخت آزمائش ہوتی ہے۔ اچھی چیز تو دینے کو بالکل دل نہیں چاہتا لیکن نفس کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے ایسی خواہش کو ضبط کریں۔ یہی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ایسی چیز مت دو جو اگر تم کو دی جائے تو تم قبول نہ کرو۔ نوکروں پر کھانے پینے کے معاملے میں بہت زیادہ سختی نہ رکھیں۔ اگر کبھی بغیر پوچھے کچھ اُٹھا کر کھا لیا یا پی لیا تو نظر انداز کر دیں۔ کھانے پینے کی چیزوں کو تالوں میں نہ رکھیں اور نہ فرج میں تالا لگائیں بلکہ فروٹ وغیرہ میں اُن کا حصہ ضرور نکالیں، گِن گِن کر نہ دیں۔ اللہ تبارک تعالیٰ تو آپ کو بے شمار اور اَن گنت دیتا ہے، مزید یہ کہ پھل

دینے میں یہ نہ کریں کہ گلے سڑے پھل نوکروں کو دے دیئے یا گوشت میں گردن اور ہڈی پر تھوڑے سے گوشت والی بوٹی ان کی پلیٹ میں ڈال دی۔ خدا کا خوف کریں، چاہے تھوڑی چیز دیں مگر اچھی دیں۔ اس کے علاوہ نوکروں کے برتن الگ نہ رکھیں بلکہ اپنے ہی گلاس اور پلیٹ میں اُن کو کھلائیں۔ یہ بھی بخل ہے کہ اپنے سے نیچے والوں کو کمتر سمجھا جائے یا فرق کیا جائے۔ صرف باسی کھانے پر ہی اُن کو نہ ٹرخا دیا کریں۔ تازہ اور باسی دونوں کھانے آپ بھی کھائیں اور اُن کو بھی دیں۔ اِس طرح اُن کی عزتِ نفس مجروح نہیں ہوگی۔ بخیل شخص چاہتا ہے کہ صرف باسی کھانا انہیں دے اور خود تازہ کھانا کھائے۔

مروت میں بخل یہ بھی ہے کہ نوکر صوفے پر ہمارے برابر نہیں بیٹھ سکتے بلکہ ان کے بیٹھنے کی جگہ زمین ہی ہے۔ اگر وہ کہیں ہمت کر کے صوفے پر بیٹھ جائیں تو ہم سوچتے ہیں کہ ان کا دماغ خراب ہو گیا ہے اپنے آپ کو صاحب کے برابر سمجھتا ہے، ادب ولحاظ چھو کر نہیں گزرا۔ جب تک چارپائیوں کا رواج تھا، برابری تھی۔ لوگ ساتھ آ کر بیٹھ جایا کرتے یا دوسری چارپائی پر سامنے آ کر بیٹھ جاتے۔ گاؤں اور دیہاتوں میں اب بھی چارپائی کے رواج کی وجہ سے برابری ہے مگر جب شہروں میں ڈرائینگ روم سجا لیے گئے، صوفے اور کرسیاں استعمال میں آ گئیں تو طبقاتی فرق بہت بڑھ گیا۔

دوسرے ملکوں میں صفائی کرنے والیوں کے ساتھ بڑی تمیز سے بات کرتے ہیں۔ پلیز کہہ کر کام کرواتے ہیں۔ اُن کو الگ پلیٹوں میں کھانا ڈال کر نہیں دیا جاتا بلکہ آزادی سے فِرج کھول کر کھانے پینے کی چیزیں استعمال کرنے کی اجازت ہوتی ہے۔ گھر کے عام برتن استعمال کرتے ہیں، کسی کو اعتراض نہیں ہوتا۔ ایسے اخلاق وآداب اور یہ رویّہ تو مسلمانوں کے معاشرے میں ہونا چاہیے تھا۔ اِن چیزوں کا خیال رکھنا چاہیے کیونکہ یہ طبقاتی فرق ٹھیٹھ مشرکانہ مزاج ہے۔ انسانوں کے کسی گروہ کو اچھوت سمجھنا مشرکانہ ذہنیت کا نتیجہ ہے۔ اسلام میں سب برابر ہیں۔ مسجد میں نماز کے دوران سب برابر ہی ہوتے ہیں، کیا حج پر پتہ چلتا ہے کہ کون امیر ہے یا کون غریب؟ سب ایک ہی لباس پہنے ہوئے ہوتے ہیں اور جس کو جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھ جاتا ہے۔ آپ خود سوچیں کہ گھر کی ساری صفائیاں وہ کریں، ہماری گندگی وہ صاف کریں اور ہم ان کو گندا تصور کریں؟ یہ تفریق اور نفرت مشرکوں میں ہوتی ہے، اُن کے اندر مروت نہیں ہوتی۔ اسلام ہمیں بہت زیادہ مروت سکھاتا ہے اور دوسروں کی عزتِ نفس کی قدر سکھاتا ہے۔ لہٰذا اُن کو عزت دیں، اپنے بچوں سے بھی ان کی

عزت کروائیں اور اس معاملہ میں بخل نہ کریں۔

سخی ہونا، کریم ہونا، بڑی خوبیوں میں سے ہے۔ نبی اکرم ﷺ سب سے زیادہ کریم تھے، آپ ﷺ کسی چیز میں بخل نہیں کیا کرتے تھے۔غریبوں کے ساتھ اس طرح عزت اور مروّت سے پیش آنے سے غریبوں کے دل جیتے جاسکتے ہیں۔ پھر وہ ہماری بڑی محبت اور عزت کرنے لگتے ہیں اور دیگر امیروں سے نفرت نہیں کرتے، اُنہیں پیسے والوں کو دیکھ کر غصہ نہیں آتا۔

برتنوں کے معاملے میں بھی ان کے ساتھ بخل ہوتا ہے۔گھر والوں کے لیے کانچ کے گلاس اور پلیٹیں اور نوکروں کے لیے اسٹیل یا پلاسٹک کے گلاس اور پلیٹ مختص ہوتے ہیں البتہ اگر خود آپ بھی اسٹیل کے برتن استعمال کریں تو ٹھیک ہے۔افسوس تو یہ ہے کہ یہ احتیاطیں ہم صفائی کے نام پر کرتے ہیں۔کہا جاتا ہے کہ اُن کو دانتوں اور مسوڑھوں کی بیماری ہوتی ہے، ہاتھ گندے رہتے ہیں، کوئی لگنے والی بیماری ہوگی، جراثیم پھیلتے ہیں وغیرہ وغیرہ، اسی لیے ہم ان کے برتن علیحدہ رکھتے ہیں۔ یہ بتائیں کہ جب ہمارے ہاں کوئی مہمان آتے ہیں تو کیا ہم اُن سے پہلے صحت اور صفائی کا پوچھتے ہیں یا انہیں فوراً مشروب وغیرہ پیش کرتے ہیں۔مروت صرف پیسے والوں کے ساتھ نہیں برتنی چاہیے بلکہ تمام انسانوں کے ساتھ برتنی چاہیے۔ یہ اسلام کے بنیادی اخلاقیات ہیں۔کام کرنے والوں کی عزت کریں۔وہ اپنے ہاتھ سے حلال کما کر کھاتے ہیں جو انسانیت کی معراج ہے۔محنت کی کمائی کھانا ہی بہت قابلِ عزت بات ہے۔ہم جتنے دوسروں کو عزت دینے میں سخی ہوں گے ان شاءاللہ تعالیٰ اتنی ہی اللہ کی رحمت برسے گی۔

بخیل کی بد نصیبی:

بخیل انسان کا مرض یہ ہوتا ہے کہ خرچ کرتے وقت اس کا دل گُھٹتا اور دُکھتا ہے، اُسے تکلیف ہوتی ہے۔خرچ کرنے کے بعد پچھتاتا ہے اور غمگین رہتا ہے۔اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہوسکتا۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''بخیل بہت بدنصیب ہوتا ہے دنیا میں محروم اور آخرت میں معذّب (عذاب دیا جانے والا)۔'' بخل کی زد خود بخیل پر پڑتی ہے وہ خود سب سے زیادہ تکلیف محسوس کرتا ہے۔

لباس میں بخل:

لباس میں بخل یہ ہے کہ اچھا خاصا پیسہ ہونے کے باوجود اس قدر بُرا اور گھٹیا لباس پہنا جائے

کہ لوگ خیرات دینے آجائیں۔ایک بزرگ کا طریقہ یہ تھا کہ جائے نماز کے نیچے کچھ پیسے رکھا کرتے تھے، جوکوئی محتاج یا ضرورت مند نظر آتا، اُس کو پیسے نکال کر دے دیتے۔ایک صاحب ملنے کے لیے آئے تھوڑے بے حال سے تھے، پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے تھے تو بزرگ نے جائے نماز کے نیچے سے کچھ پیسے نکالے اور اُس شخص کو دینے چاہے، تو اُس نے بتایا حضرت میں باحیثیت انسان ہوں تو بزرگ ناراض ہوئے کہ تم باحیثیت آدمی ہو تو فقیروں جیسا حلیہ کیوں بنایا ہوا ہے۔اللہ کی نعمتوں کی ناشکری اور ناقدری کیوں کر رہے ہو، اپنی حیثیت کے مطابق لباس پہنا کرو۔ لہٰذا یہ بھی بخل میں آتا ہے کہ انسان فقیرانہ بود و باش اختیار کر لے۔

سلام میں بخل:

سلام میں مروت کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی آپ کو سلام کرے تو جواب میں خوش مزاجی کے ساتھ، مسکرا کر، خندہ پیشانی سے، اس سے بہتر الفاظ میں جواب دیں۔ وہ کہے السلام علیکم! تو آپ جواباً ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کا اضافہ کریں۔ یہ سخاوت ہے۔سلام میں بخل کیا ہوگا کہ بددلی سے جواب دیا یا پھر وعلیکم کہہ کر چپ ہو گئے یا صرف گردن یا ہاتھ ہلا کر جواب دینے پر اکتفا کر لیا، بڑی شان بے نیازی کے ساتھ جواب دیا۔ یا پھر سلام کرنے والے کی حیثیت کے مطابق سلام کا جواب دیا۔اپنے سے اونچے یا برابر کے طبقے والوں کو پُر جوش سلام کا جواب دیا لیکن غریب لوگوں کو، ملازمین کو، نوکروں کے سلام کو ٹال دیا یا سلام کرنے میں پہل نہ کی۔غرباء اپنی غربت کے باوجود سخی ہوتے ہیں، سخاوت کرتے ہیں، سلام کرنے میں پہل کرتے ہیں اور آپ امیر ہوتے ہوئے بھی سلام میں بخل کرتے ہیں، یہ توقع رکھتے ہیں کہ پہل وہ کریں اور آپ صرف سر ہلا کر جواب دے دیں۔ یہ غلط بات ہے، کوشش کریں کہ گھر میں کام کرنے والوں کو خود آگے بڑھ کر سلام کریں اور بچوں کی تربیت کریں کہ وہ اُن کو آپ کہہ کر مخاطب کریں اور سلام کریں۔

بچوں کو بخیلی سے بچائیں:

جو لوگ خود بخیل ہوتے ہیں وہ اپنے بچوں کو بھی یہی اقدار سکھاتے ہیں اور بچے اُن کے کردار کو دیکھ دیکھ کر بھی سیکھتے ہیں۔ بچوں کو کھلونے، اسکول میں دوستوں کے ساتھ اپنا کھانا (lunch) بانٹنا سکھائیں۔ بچوں کو اسکول میں اپنا کھانا یا دوسری چیزیں دوسروں کو دینے سے مت روکیں۔ بچوں کو

ایک دوسرے کی بوقت ضرورت مدد کرنا سکھائیں اور چیزیں بانٹنے کی ترغیب دیں کیوں کہ اس میں برکت اور اجر ہے۔ ساتھ ساتھ اپنی چیزوں کی حفاظت اور ان کو دھیان سے رکھنا بھی سکھائیں، ادھر اُدھر ضائع کرتے نہ پھریں۔ ان دونوں انتہاؤں میں تمیز کرنا سکھائیں۔ چیزوں کو سنبھال کر رکھنا اور بخل کرنا دو الگ الگ رویّے ہیں۔

مہمانوں کے ساتھ بخل:

مہمانوں کے ساتھ بھی بخل کیا جاسکتا ہے مثلاً گھر میں اچھی چیز موجود ہو لیکن آپ کسی عام سی چیز سے مہمان کی تواضع کریں، یہ بھی دراصل مروت کا بخل ہے، مہمان کا احترام کرنا ضروری ہے۔ گھر میں موجود اچھی چیز مہمان کے آگے رکھیں۔ حدیثِ مبارکہ کا مفہوم ہے کہ مہمان برکت لے کر آتے ہیں۔ ایک کا کھانا دو کو اور دو کا کھانا چار کو پورا ہوتا ہے۔ یہ آزمائی ہوئی چیز ہے کہ اگر لوگ مہمانوں کو اُن کا حق دیں تو اللہ اُن کے مال میں برکت عطا فرما دیتا ہے۔

خیرات میں بھی اچھی چیز دیا کریں۔ بہت گئی گزری چیزوں کا صدقہ خیرات نہ کریں۔ کیوں کہ یہ ہم اللہ کے نام پر دیتے ہیں، اُسی کا دیا ہوا ہے تو اُس کو اچھی چیز واپس کریں۔ بہت پرانے، گئے گزرے کپڑے، صفائی ستھرائی کے لیے رکھ لیا کریں۔ ہمیں خیرات کرتے وقت اللہ کے اعلیٰ و ارفع و اولیٰ ہونے کا احساس ہونا چاہیے، وہ رزّاق ہے، آسمانوں اور زمین کا مالک و رب ہے لہٰذا دیتے وقت رویّہ اچھا رکھیں، مسکرا کر خندہ پیشانی سے دیں، جھک کر خیرات کریں، دوسروں کو یہ احساس نہ دلائیں کہ آپ کا اُن پر کوئی احسان ہے بلکہ اُن کا حق سمجھ کر ادا کریں۔ تکبر اور بددلی کے ساتھ، ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر شان بے نیازی سے دینا قطعاً اچھا نہیں ہے۔ ایسی خیرات کا اجر کم ہو جاتا ہے۔

بعض گھروں میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ماں باپ اپنے بچوں کو اچھے اچھے کھلونے دلواتے ہیں۔ کھلونوں کا ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے مگر جب دوسرے گھروں کے بچے مہمان بن کر آجائیں تو فوراً تمام کھلونے چھپا دیئے جاتے ہیں، یہ بھی بخل ہے۔ اس دنیا کے خالق کے ارشاد کے مطابق دنیا بذاتِ خود ایک برتنے کی چیز ہے سو اس دنیا میں بچوں کے کھلونوں کو اتنی اہمیت دینا کنجوسی کی انتہا ہے۔ ایسے لوگ دوسرے بچوں کو کھلونوں سے کھیلنے نہیں دیتے کہ خراب کر دیں گے۔ اپنے

بچوں کو سکھاتے ہیں کہ اپنا کھلونا کسی کو مت دینا اور بچوں کو اِس عمر سے بخیلی کی عادت ڈال دی جاتی ہے۔ بعض بچے بڑے ہو جاتے ہیں اور اُن کے بچپن کے کھلونے الماریوں میں سجے ہوتے ہیں۔ اُن کو اُن کھلونوں سے جدا ہونا مشکل لگتا ہے۔ ایسے لوگ زندگی میں ہر چھوٹے بڑے نقصان پر سخت مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ نعمت کے چھن جانے سے اُن کی جان پر بن آتی ہے۔

فالتو چیزوں میں بخل:

بعض گھروں میں خالی ڈبوں، خالی بوتلوں اور خالی شیشیوں کا انبار لگا ہوتا ہے، لیکن کسی کو دیتے نہیں ہیں کہ کام آئیں گی۔ آئس کریم کے خالی ڈبے اگر ماسی مانگ لے تو مشکل پڑ جاتی ہے اور اس کو کفایت شعاری سمجھا جاتا ہے حالانکہ یہ بخل اور کنجوسی ہے۔ کباڑ جمع کرنا، سمیٹ سمیٹ کر رکھنا کہ نہ جانے کب ضرورت پڑ جائے، بخل کا رویہ ہے۔

جذبات میں بخل:

جذبات میں بھی بخل ہو سکتا ہے، مثلاً خوشی کے موقع پر خوشی کا اظہار نہ کرنا۔ اب کسی کے گھر میں شادی ہے یا نیا گھر بنا ہے یا بچہ امتحان میں کامیاب ہوا ہے یا کوئی اور مبارک موقع ہے لیکن دین کی رُو سے خوشی کا اظہار حرام سمجھ لیا کہ دنیاوی باتوں پر کیا خوش ہونا! یہ غلط روش ہے اور جذبات کا بخل ہے۔ اگر اس طرح کی خوشی میسّر آئے تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کا اظہار کریں اور اگر کسی دوسرے کے ہاں خوشی کا موقع ہو تو اُس کی خوشی میں ضرور شامل ہوں اور یوں دعا دیں کہ اللہ مبارک کرے، اللہ مزید خوشیاں دکھائے۔ اسی طرح غم کا موقع ہو تو اس کا اظہار سنتِ مبارکہ کے مطابق کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اپنے بیٹے کے انتقال پر آبدیدہ ہوئے تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے حیرت سے پوچھا: آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رو رہے ہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

(اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ يَحْزَنُ وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضَى رَبُّنَا وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ) (۱)

”بے شک دِل میں نرمی تو ہے آنکھ تو غم کا اظہار کرے گی۔ مگر زبان سے کوئی شکایت کا لفظ نہیں نکلے گا۔“

چنانچہ اس میں بخل کا اظہار نہ کیا جائے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم انا بک لمحزونون

تعریف میں بخل:

کسی قابلِ تعریف چیز کی تعریف نہ کی جائے تو یہ بخل ہے۔ کسی نے کوئی اچھا کام کیا تو مدح کریں، اُس کی محنت کو سراہیں۔ لیکن تعریف کرنے میں جھوٹ نہ بولیں یا مبالغہ آرائی سے کام نہ لیں۔ ہاں اگر تعریف کے قابل کوئی چیز ہے تو مناسب تعریف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

مفتی تقی عثمانی صاحب اپنی کتاب ''اصلاحی خطبات'' میں اپنے استاد ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ سے ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ ایک صاحب اُن کے دروس میں آیا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک بار ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ کو کھانے پر بلایا۔ حضرت وہاں گئے، کھانا کھایا اور کھا کر بہت تعریف کی کہ بہت لذیذ پکا ہے۔ خاتون خانہ بھی پردے کے پیچھے موجود تھیں وہ کھانے کی تعریف سن کر رونے لگیں تو یہ بڑے حیران ہوئے، پوچھا بہن میری کس بات سے آپ کو تکلیف پہنچی، میں نے تو کھانے کی تعریف کی ہے۔ کہنے لگیں کہ مجھے اپنے شوہر کے ساتھ رہتے ہوئے چالیس برس گزر گئے۔ آج تک اُن کے منہ سے میں نے یہ جملہ نہیں سنا کہ آج کھانا اچھا پکا ہے۔ آج آپ کے منہ سے سنا تو مجھ کو رونا آ گیا۔ لہٰذا کوئی تعریف کے قابل چیز ہو تو تعریف کریں۔ کوئی خوبصورت لگ رہا ہے یا کسی نے اچھا لباس پہنا ہے تو کہہ دیجیے کہ آپ اچھے لگ رہے ہیں یا لباس اچھا لگ رہا ہے۔ دین پر کاربند ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ بندہ بالکل خشک مزاج ہو جائے، تلخ اور بے حس ہو کر رہ جائے، ایسی کوئی ضرورت نہیں۔ مبالغہ سے یقیناً بچنا چاہیے لیکن بخل کرنا بھی ٹھیک نہیں، یہ دوسری انتہا ہے۔

تعریف کے معاملے میں نوکروں سے بھی بے اعتنائی نہ برتیں۔ اگر آپ کے ہاں کوئی ملازمہ کھانا پکاتی ہے اور کسی دن اُس کا پکایا ہوا کھانا اچھا لگا تو کہہ دیجیے کہ آج کھانا اچھا تھا یا جھاڑو پوچا کرنے والی ملازمہ نے کسی دن گھر خوب صاف کر کے چمکا دیا، بیت الخلاء (washrooms) اچھی طرح سے دھو دیے تو شکریہ ادا کریں اور کہہ دیں کہ بہت اچھی صفائی کی، دل خوش کر دیا وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح اس کا دل بڑھے گا لیکن ہم سوچتے ہیں کہ اگر ہم تعریف کریں گے تو یہ سر پر چڑھ جائیں گے۔ جیسے ہم تعریف سن کر خوش ہوتے ہیں ایسے ہی دوسروں کو بھی خوشیاں دیں۔

معذرت کرنے میں بخل:

اگر کبھی کوئی قصور یا بھول چُوک ہو جائے تو معذرت کرنے میں بخل نہ کریں۔ اس معاملے میں

ہم بہت زیادہ بخل کرتے ہیں کیوں کہ معذرت کرنے سے ہماری انا پر زد پڑتی ہے۔ اور ہم سمجھ چکے ہیں کہ تزکیہ کا آغاز ہی اَنا کی درستگی سے ہوتا ہے۔ اگر کبھی بلاوجہ کسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے ڈرائیور یا ملازمہ کو ڈانٹ دیا تو اپنی غلطی کا احساس ہوجانے پر نوکر سے معذرت کرلیں۔ کہہ دیں کہ مجھ سے غلطی ہوئی یا میں غلط سمجھا، آپ کا قصور نہیں تھا میں نے خواہ مخواہ آپ کو ڈانٹ دیا۔ معذرت کرنے سے بخیل کی عزت گھٹتی ہے مگر سخی انسان کی نہیں۔ انسان جتنا سخی ہوتا ہے اتنا ہی باعزت ہوتا ہے۔ اگر آپ کسی سے معافی مانگیں گے تو وہ آپ کی زیادہ عزت کرنے لگے گا۔ وہ آپ سے سیکھے گا کہ بڑوں سے بھی غلطی ہوجاتی ہے اور غلطی مان لینا اچھی بات ہے، جب ہم غلطی ماننے میں بخل کرتے ہیں تو بچے ہم سے یہی بات سیکھتے ہیں کہ غلطی کا اقرار نہ کیا جائے بلکہ چھپائی جائے۔ لہٰذا آپ کے بچے بھی آپ کی طرح اپنی غلطی نہیں مانیں گے اور نہ معافی مانگیں گے۔

غفلت کا بخل:

غفلت کا شمار بھی بخل میں ہوتا ہے یعنی جس کام کو جتنا وقت دینا چاہیے اتنا نہ دینا۔ کسی کام کو جتنا وقت دینا چاہیے تھا اُس کو اتنا وقت نہ دے کر آپ نے اُسے نظر انداز کیا یا اپنی ذمہ داری ایمانداری سے نہ نبھائی، یہ بھی غفلت کی مثال ہے۔ جس چیز کا جتنا حق ہے اُس کو اتنا حق دے دینا چاہیے۔

روزمرہ استعمال ہونے والی اشیاء میں بخل:

بعض دفعہ پڑوسی کوئی چیز مانگتے ہیں، کبھی کوئی مشین مانگ لی، برتن مانگ لیے، آلو پیاز جیسی چھوٹی موٹی چیزیں مانگ لیں، ان میں ہاتھ روکنا بخل ہے۔ سورۂ ماعون میں اِسی کا تذکرہ ہے۔ پڑوسیوں میں چیزوں کا تبادلہ ہونا چاہیے، ضرورت پڑنے پر یہ چیزیں ایک دوسرے کو دینی چاہئیں۔

بعض دفعہ نوکروں کو تنخواہ دیتے وقت یا کوئی کھلا مانگ لے تو ہم ڈھونڈ کر پُرانا نوٹ دیتے ہیں، نیا نوٹ نہیں دیتے، یہ بھی ایک طرح سے بخل ہے۔ یہ کوئی گناہ ثواب کا معاملہ نہیں مگر یہ عمل ہماری سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ بازار میں بھی کھلے پیسے ہونے کے باوجود دکاندار کو بڑا نوٹ دیتے ہیں۔ وہ کھلے پیسے مانگ لے تو جھوٹ بول دیتے ہیں کہ ہمارے پاس تو بندھے ہوئے ہی ہیں، ہمارے پاس کھلا نہیں۔ دوسو کی خریداری کرکے پانچ ہزار روپے کا نوٹ دیتے ہیں۔ اب آپ دیکھیں کہ بخل کی وجہ سے جھوٹ بھی بولنا پڑا جو کہ یقیناً گناہ ہے لہٰذا ان چیزوں میں محتاط رہیں۔

دنیا میں آج کتنے امیر لوگ ہیں جو ٹیکس چوری کرتے ہیں۔ایک خاتون کے بارے میں اخبار میں آیا تھا کہ لکھ پتی ہے لیکن اُس کا اپنا بچہ خیراتی ہسپتال میں مر گیا۔ایسے لوگ پیسے سینت سینت کر رکھتے ہیں،لوگوں کی مدد نہیں کرتے،قرض نہیں دیتے،سمجھتے ہیں کہ یہ دولت اُن کے بُرے وقت میں کام آئیگی۔پیسہ خرچ کرنے سے بہت گھبراتے ہیں،یہ ہیں وہ عبدالدینار جنھوں نے پیسے کو اپنا معبود بنایا ہوا ہے۔ایسا شخص پیسہ جمع کرتا ہے،گِن گِن کر رکھتا ہے خواہشات تو دور کی بات ضروریات پر بھی خرچ نہیں کرتا اور بس پیسہ کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے لیکن اُس کی یہ خوشی بھی عارضی ہوتی ہے۔

بخل کا علاج:

کنجوس ہر وقت بے چین رہتا ہے۔اُسے ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ کہیں کوئی مجھ سے پیسے نہ مانگ لے۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے۔ایک شخص کسی بزرگ کے پاس آیا اور بہت رویا،اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔بزرگ نے پوچھا کیا تکلیف ہے؟ بولا میں اچھا خاصا دولتمند ہوں لیکن جب کسی سوالی یا فقیر کو اپنی طرف آتا دیکھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے جیسے موت آرہی ہے۔میرا علاج کر دیجیے! مجھے ہر وقت خوف رہتا ہے کہ ابھی کوئی آکر مجھ سے کچھ مانگ لے گا،مجھے پیسے سے جدا ہونے کا خوف ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔اُنہوں نے کہا اس کا علاج صبر اور مشقت ہے کہ بندہ زبردستی پیسے کو خود سے جدا کرتا رہے۔امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اِس بیماری کا علاج بتاتے ہوئے فرمایا کہ کسی بڑی بیماری کا علاج کرنا ہو تو پہلے اُس کو کسی چھوٹی بیماری میں بدل دو،کیونکہ چھوٹی بیماری کا علاج آسان ہوتا ہے۔حُبِّ مال ایک بڑی بیماری ہے،اِس کو حُبِّ جاہ میں تبدیل کر دو جو کہ نسبتاً چھوٹی بیماری ہے،اس کا علاج آسان ہے۔چنانچہ جب تم مال خرچ کرو گے تو لوگ تمہاری عزت کریں گے،تمہارا نام ہوگا۔یہ ریاکاری ہے لیکن اس کا علاج آسان ہے۔آہستہ آہستہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا شروع کر دے گا۔پہلے مال کی محبت سے چھٹکارا حاصل ہو جائے اور جب مال کی محبت دِل سے کٹ جائے تو پھر اللہ کی راہ میں خرچ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔یہ ہے اس کے علاج کا طریقہ!

دراصل بخیل کسی حال میں خوش نہیں ہوتا۔کسی کے گھر مہمان بن کر جاتا ہے تو اس کا دل گُھٹتا ہے کہ اب ان کو تحفے تحائف دینے پڑیں گے۔اس کو کوئی چیز خوشی نہیں دیتی،نہ کسی کے آنے سے خوش ہوتا ہے اور نہ کسی کو دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ہر وقت غم میں مبتلا رہتا ہے کیوں کہ پیسہ تو بذاتِ خود خوشی نہیں دے سکتا۔بخیل ساری زندگی پیسہ بچاتا اور سنبھالتا رہتا ہے اور یہ غم اس کو کھائے جاتا ہے کہ

کہیں کوئی ادھار نہ مانگ لے یا خرچ نہ کرنا پڑ جائے، وہ اپنی اس نعمت کا حظ نہیں اٹھا پاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ پیسہ خرچ کرنے سے انسان کو سچی خوشی ملتی ہے، اپنی یا کسی اور کی ضرورت پوری کر کے اطمینان حاصل ہوتا ہے، روحانی خوشی اور سکون ملتا ہے۔ اس کے برعکس بخیل کوئی چیز خرید بھی لے تو اس کو اتنا سنبھال کر رکھتا ہے کہ استعمال کی نوبت ہی نہیں آتی، کوئی نعمت اس کو خوشی نہیں دیتی بلکہ مزید پریشانی کا سبب بن جاتی ہے۔

بخل اور اسراف کے درمیان اعتدال کا راستہ پسندیدہ ہے۔ انسان معتدل روش اپنائے، مناسب رویہ رکھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا} (الفرقان: ٦٧)

''وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو نہ بے جا اُڑاتے ہیں اور نہ تنگی کو کام میں لاتے ہیں بلکہ اعتدال کے ساتھ نہ ضرورت سے زیادہ نہ کم۔''

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُوْمًا مَّحْسُوْرًا} (بنی اسرائیل: ٢٩)

''کہ اپنا ہاتھ نہ گلے سے (گردن سے) بندھا ہوا کرلو اور نہ بالکل کھول ہی دو۔ (کہ سبھی کچھ دے ڈالو اور انجام یہ ہو) کہ ملامت زدہ اور درماندہ ہو کر بیٹھ جاؤ۔''

مطلب یہ کہ بالکل مٹھی بند نہ کرلو یا نہ ہی اتنا ہاتھ کھول لو کہ سب لٹا دو۔ ایسا کرو گے تو خود ہی نقصان اٹھاؤ گے۔

رسول اکرم ﷺ کی ایک دعا ہے:

(اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْجُبْنِ وَاَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبُخْلِ) (١)

''اے اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں بزدلی سے اور کنجوسی سے۔''

ایک اور طویل دعا سنن نسائی میں ہے کہ ''اے اللہ مجھ کو تو میانہ روی کی توفیق عطا فرما! میں جب غنی ہوں تب بھی اور فقیر ہوں تب بھی۔''

اور اگر بخل کرنا ہی ہے تو انسان گناہوں میں کرے، گناہ میں بخیل ہو جائے، گناہ کے کام میں اپنا ایک پیسہ بھی نہ لگائے، اپنے وقت کا ایک سیکنڈ بھی نہ لگائے۔

---

(١) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب الاستعاذہ من أرذل العمر۔۔۔

بخل اور اسراف یکجا:

کیا کوئی شخص ایسا ہوسکتا ہے جو بیک وقت مسرف بھی ہو اور بخیل بھی ہو۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ دوسروں کے ساتھ بخیل اور اپنے ساتھ مسرف ہو۔ ایسے لوگ ہمارے معاشرے میں پائے جاتے ہیں جو اپنی خواہشات پر بڑی خوشی سے ہزاروں ہی نہیں بلکہ لاکھوں بھی خرچ کر دیں گے لیکن اگر کسی دوسرے کو تحفہ دینا ہو یا صدقہ، خیرات، زکوٰۃ وغیرہ دینی ہو یا کسی کی کوئی ضرورت پوری کرنی ہو تو ہاتھ گردن سے باندھ لیں گے۔ اعتدال اور احسن طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے سادگی اور دوسروں کے لیے سخاوت کا رویّہ رکھے۔ اس لیے کہ اپنے لیے مسرف اور دوسروں کے لیے بخیل اپنے آپ کو ہلاک کر دینے والی چیز ہے۔ دوسروں کو ان کی توقع سے زیادہ دیں۔

آپ ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ آپ ﷺ انتہائی سخی تھے، ''جوّاد'' تھے۔ آپ ﷺ ہوا کی مانند سخی تھے۔ آپ ﷺ لوگوں کو ایسے دیا کرتے تھے کہ جیسے آپ ﷺ کو فقر کا کوئی اندیشہ ہی نہیں۔ لہٰذا ذخیرہ نہ کریں بلکہ سخی بننے کی کوشش کریں۔ الماریاں مت بھریں، سخاوت کریں۔ ذخیرہ انسان کو پریشان کر دیتا ہے۔ جتنی الماریاں اور تجوریاں ہلکی ہوں گی اتنے ہی آپ خوش رہیں گے۔

کیا کوئی غریب اسراف کرنے والا بھی ہوسکتا ہے؟ ایسے لوگ جو اپنی خواہشات پوری کرنے کے لیے حرام ذرائع اختیار کرتے ہیں، چور ہوتے ہیں کیونکہ اپنے پاس تو ہے نہیں لہٰذا شاہ خرچیوں کے لیے قرض لے لیا، دوسرے کا حق مار لیا، رشوت لے لی۔ یا پھر کثرت سے سوال کرنے والے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ فرمائشوں میں اسراف کرتے ہیں، اتنا اسراف کرتے ہیں کہ ان کی فرمائشیں لامتناہی ہوجاتی ہیں۔ مثلاً اگر پتہ چل جائے کہ کوئی جاننے والا دبئی جارہا ہے یا وہاں سے آرہا ہے تو فوراً لسٹ پکڑا دیں گے۔ بعض دفعہ لوگ رسماً بھی پوچھ لیتے ہیں کہ یہاں سے کچھ چاہیے تو نہیں؟ جواب میں ہم شیمپو، جوتے، پرفیوم سے لے کر ہینڈ بیگ تک آرڈر کر دیتے ہیں، یہ بہت زیادتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ان چیزوں سے غنی ہوجائے، کہہ دے کہ کچھ نہیں چاہیے، اپنے ملک میں ہر چیز دستیاب ہے۔ غنی وہ ہے جس کو کسی چیز کی تمنا اور خواہش نہ ہو۔ کثرت کے ساتھ فرمائش کرنے والا ہی کثرت کے ساتھ سوال کرنے والا ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کو یہ عادت ہوتی ہے کہ کوئی امریکہ سے آرہا ہے تو اُس کو کہہ دیا یہ لا دو وہاں سستا ہے، کوئی دبئی سے آرہا ہے تو اُس سے فرمائش کر دی کہ

یہ لادو وہاں سستی ہے۔ حالانکہ کہیں کچھ سستا نہیں ہوتا اور پھر دوسروں کو تکلیف میں ڈالنا کہ اپنا سامان بھی اٹھائے اور آپ کا بوجھ بھی لادے، زیادہ وزن کی قیمت بھی ادا کرے، کسٹم میں الگ پریشان ہو۔ یہ دوسروں کو مشکل میں ڈالنے والی بات ہے یہاں بھی ہمیں ذرا معتدل اور محتاط رہنے کی ضرورت ہے، اس میں اسراف نہ کریں۔ یہ چیز انسان کو پریشان کردیتی ہے۔ بندہ غنی ہوجائے۔ غِنٰی بہت اچھی چیز ہے، حدیث میں آتا ہے: (اَلْغِنَی غِنَی النَّفْسِ)[1] ''غنیٰ دراصل نفس کا غنیٰ ہے۔'' یعنی خواہشات اٹھیں ہی نہیں، اور نہ ہی چیزوں کو دیکھ کر دل للچائے۔ اگر پیسہ ہے تو سخی ہونا بڑی اچھی صفت ہے جس کو عربی میں ''جواد'' ہونا، ''کریم'' ہونا کہتے ہیں۔

بخل اور کفایت شعاری کا فرق:

بخل اور کفایت شعاری کا فرق سمجھنا بھی بہت ضروری ہے۔ بخل یہ ہے کہ باحیثیت ہوتے ہوئے بھی اپنی ضروریات اور دوسروں پر خرچ نہ کیا جائے، اگر خرچ کر بھی لیں تو بہت گھٹیا چیزیں دیں جب کہ کفایت شعاری یہ ہے کہ پیسہ کی کمی کے باوجود احسن طریقے سے خرچ کرنا کہ اس سے ساری ضروریات اچھی طرح پوری ہوجائیں۔ پیسے کو پھیلا کر ایسے پورا کرنا یا استعمال کرنا کہ تمام ضروریات اس میں سمٹ جائیں، دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلانے اور قرض لینے کی نوبت نہ آئے اور یہ کفایت شعاری انتہائی پسندیدہ صفت ہے۔

مثلاً ایک عورت ہے اس کے پاس کم پیسہ ہے وہ بچوں کے یونیفارم گھر میں سیتی ہے، اپنے شوہر کے کپڑے سیتی ہے، بچوں کو خود پڑھالیتی ہے۔ یہ کفایت شعاری ہے کہ میاں کی کم تنخواہ میں سب اخراجات سمیٹ لیے، یہ بہت سلیقے والی عورت ہے۔ انسان نہ اسراف کا شکار ہو اور نہ بخل کا۔ دوستی میں، دشمنی میں، جذبات میں، روپے پیسے میں، وقت صرف کرنے میں نہ بخل کرے اور نہ اسراف کرے۔ جہاں تک دوستی اور دشمنی کا تعلق ہے اس کے بارے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے ''اپنے دوست کو کم کم چاہو، اپنے محبوب سے تھوڑی تھوڑی محبت کرو ہوسکتا ہے وہ ایک دن تمہارا دشمن ہوجائے'' تو محبت میں اسراف مت کرو آپے سے باہر نہ ہوجاؤ بلکہ اعتدال رکھو اور دشمن کے بارے میں فرمایا کہ ''اپنے دشمن سے تھوڑی دشمنی رکھو ہوسکتا ہے وہ ایک دن تمہارا دوست بن جائے'' تو دشمنی میں بھی حد سے مت گزرو کہ ایک دن وہ تمہارا دوست بن جائے اور تمہیں دشمنی میں کیے

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس۔۔۔

گئے کاموں پر افسوس اور شرمندگی ہو۔

خلاصہ :

اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کا اعتراف کرنے میں مت ہچکچائیں، اُن کو مانیں تب ہی علاج ہو سکے گا۔ اپنی غلطی اور کمزوری مان لینا، اعتراف کر لینا ہی اصلاح کا پہلا قدم ہے یہ عین انسانیت ہے۔ صدقات وخیرات سے غریبوں اور ملازموں کی دل کھول کر مدد کریں۔ اس میں برکت اور بھلائی ہے۔ اچھی اور کام کی چیزیں دیں۔ عورتیں سوٹ دیتے وقت دوپٹہ غائب نہ کریں۔ بیٹیوں والی ماں سے تھوڑی بہت کنجوسی ہو ہی جاتی ہیں، دوپٹہ اگر ٹھیک ٹھاک ہے تو یہ سوچ کر رکھ لیا کہ بیٹی کے کام آجائے گا۔ اپنے قیمتی اور اچھے کپڑے مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے رکھ دیتی ہیں مگر جب ان کے پہننے کا وقت آتا ہے تو فیشن بدل چکا ہوتا ہے اور بیٹیاں پہننے سے انکار کر دیتی ہیں۔ آپ یہ سوچیں کہ اگر آج آپ نے کسی کی ضرورت پوری کی تو کل ان شاء اللہ جب آپ کے بچوں کی شادی کا وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ آپ کی ضرورت پوری کرے گا، وہ آپ کو محروم نہیں کرے گا۔ بچوں کا حوصلہ بڑھائیں کہ وہ اسکول میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ کھانا، پنسل، کاپی وغیرہ مل جل کر استعمال کریں۔ یہ ایک اچھی عادت ہے کہ اپنے بچوں میں سخاوت کا بیج بوئیں۔

پیسہ اور صلاحیت ہوتے ہوئے بھی دین کے راستے میں نہ لگانا، اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے خرچ نہ کرنا غلط طرزِ عمل ہے۔ اس بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ} (محمد ﷺ: ۳۸)

''جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ سے بخل کرتا ہے۔''

اللہ کو تو ضرورت نہیں ہے وہ تو بے نیاز ہے اسی آیت میں آگے آتا ہے کہ اللہ تو غنی ہے تم ہی محتاج ہو، تمہیں ضرورت ہے۔ اللہ کی راہ میں ضرور وقت دو، صلاحیت لگاؤ اور پیسہ لگاؤ۔

اپنے بچوں سے خوب پیار کریں انہیں احساس دلائیں کہ آپ کو وہ بہت محبوب ہیں، کہا جاتا ہے کہ بچوں کو بہت زیادہ پیار نہ کیا کرو کہ وہ خراب ہو جائیں گے۔ یہ بات غلط ہے، بچوں کو ضرور بتائیں کہ آپ اُن سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ زیادہ پیار سے کوئی نہیں بگڑتا بلکہ بچے بے جا پیار سے بگڑتے ہیں، ڈانٹ کے موقع پر بھی آپ درگزر کر دیں اور غلطی پر نہ ٹوکیں تو بگڑنے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح ماں سے محبت کا اظہار کریں، شوہر سے محبت کا اظہار کریں اس میں کوئی خرابی نہیں بلکہ یہ تو

خیر ہی خیر ہے۔اُن کو بتائیں جب آپ نہیں ہوتے تو ہم آپ کو یاد کرتے ہیں بچوں سے بھی کہیے کہ آپ مجھے یاد آتے ہیں، اس سے تعلقات میں مضبوطی آتی ہے، محبت بڑھتی ہے، اس میں اسراف نہ ہولیکن جذبات کا اظہار ضرور ہو۔ کیونکہ یہ زندگی کو خوش گوار بنا دیتا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے کسی سے پوچھا، ''کیا تجھے فلاں سے محبت ہے؟'' اس نے کہا ''ہاں'' تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جا کر اس کو بتاؤ کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔'' اس سے آپس کے تعلقات سنورتے ہیں، دعوتوں کے بعد یا پورے گھر کی صفائی کے بعد نوکروں کو خوش کر دیا کریں، شاباشی دے کر یا کام کی تعریف کر کے اس میں بخل نہ کریں۔ مرد ملازمین کے ساتھ گھر کے حضرات ایسا رویّہ اختیار کر سکتے ہیں۔

نافع علم کو پھیلانے میں بھی بخل کیا جاتا ہے۔لوگ کھانے کی ترکیبیں (recipes) نہیں بتاتے، درزی کی دکان کا نام نہیں بتاتے یا کسی جگہ سستی چیزیں مل رہی ہوں تو وہاں کا پتہ نہیں بتاتے وغیرہ وغیرہ۔اس سب کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو یہ باور کرائیں کہ اللہ نے جس کی قسمت میں جو لکھ دیا ہے وہ اُس کو مل کر رہے گا۔ ہاں اگر آپ اُس کا ذریعہ بنیں گے تو آپ کو اجر مل جائے گا ورنہ اللہ کسی اور سے یہ کام لے لے گا۔

کسی نے ایک بزرگ سے پوچھا کہ میں اللہ کی راہ میں دینا چاہتا ہوں مگر مستحق اور غیر مستحق کا فرق نہیں کر پاتا۔انہوں نے کہا دونوں کو دو کیوں کہ اللہ تجھ کو وہ بھی دیتا ہے جس کا تو مستحق ہے اور وہ بھی جس کا تو مستحق نہیں۔حدیثِ مبارکہ کا مفہوم ہے کہ ایک فرشتہ اترتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ ''اے اللہ جو تیری راہ میں خرچ کرتا ہے اس کو اور دے۔'' ایک اور فرشتہ اُترتا ہے اور کہتا ہے ''اے اللہ جو روک روک کر رکھتا ہے اس کا مال برباد کر دے، اس کا مال فنا کر دے۔'' قرآن حکیم میں ہم پڑھتے ہے کہ جو تم خرچ کرتے ہو اس کے پیچھے اللہ اور لے آتا ہے، کسی کو کمی نہیں ہوتی۔کیا کسی کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے کمی ہوئی؟ ہم غریبوں کو کھانا کھلائیں گے تو کیا اللہ ہمیں بھوکے پیٹ سُلائے گا؟ دراصل برکت بڑی چیز ہے لیکن بخل کرنے سے برکت اُٹھ جاتی ہے۔فیاضی اور سخاوت سے برکت آتی ہے۔دیتے وقت یہ سوچیں کہ شاید ہم زندگی میں آخری بار دے رہے ہیں یا پھر شاید موقع ہی نہ ملے۔محروم، سائل اور غریب کو دیتے وقت اُس کے ممنون رہیں کہ اُس نے ہمارا مال قبول کیا اور شکر ادا کرنا چاہیے کہ اللہ نے ہمیں دینے والا بنایا ہے اور دعا کریں کہ اللہ ہمیشہ دینے والوں میں رکھے، مانگنے والا نہ بنائے۔حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ:

(اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلَی)(۱)

''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

ایک طویل حدیثِ مبارکہ میں مضمون آتا ہے کہ:

((اِنَّ اللّٰہَ عَزَّوَجَلَّ یَقُوْلُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ یَا ابْنَ آدَمَ اسْتَطْعَمْتُکَ فَلَمْ تُطْعِمْنِی قَالَ یَا رَبِّ وَکَیْفَ أُطْعِمُکَ وَأَنْتَ رَبُّ الْعَالَمِینَ قَالَ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّہُ اسْتَطْعَمَکَ عَبْدِی فُلَانٌ فَلَمْ تُطْعِمْہُ أَمَا عَلِمْتَ أَنَّکَ لَوْ أَطْعَمْتَہُ لَوَجَدْتَ ذٰلِکَ عِنْدِی))(۲)

''بے شک اللہ قیامت کے دن بندہ سے کہے گا کہ اے میرے بندے میں بھوکا تھا تو نے مجھے کھانا نہیں کھلایا۔ تو بندہ کہے گا کہ اے اللہ میں تجھے کیسے کھلا سکتا ہوں تُو تو تمام جہانوں کا رب ہے۔ تو اللہ کہے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ تجھ سے میرے فلاں بندے نے کھانا مانگا تھا، تو نے اسے نہ کھلایا، کیا تو جانتا نہیں کہ اگر تو اسے کھلاتا تو مجھے اُس کے پاس پاتا۔''

حدیثِ مبارکہ میں یہ مضمون بھی آتا ہے کہ مانگنے والے سوالی کے ہاتھ کے اوپر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے تو انسان اللہ کے ہاتھ پر اچھی اور بہتر چیز رکھے۔ اللہ تعالی سے دعا ہے کہ وہ ہمیں شریعت کے تقاضوں کی ادائیگی، اپنے جذبات کے اظہار اور لوگوں کے ساتھ تعلقات نبھانے میں بخل کرنے سے محفوظ فرمائے۔ آمین

(۱) صحیح البخاری، کتاب الزکاۃ، باب لا صدقۃ عن ظہر الغنی

(۲) ریاض الصالحین، کتاب عیادۃ المریض وتشییع المیت، باب عیادۃ المریض

دِکھاوا

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے دکھاوے کے لیے ''ریا'' اور اِترانے کے لیے ''بطر'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔

{وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ وَيَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ} (الانفال:۴۷)

''تم اُن لوگوں کی مانند مت ہو جانا جو اپنے گھروں سے نکلے اِتراتے ہوئے اور وہ لوگوں کو روکتے ہیں اللہ کے راستے سے اور جو کچھ وہ عمل کرتے ہیں اللہ اُس پر محیط ہے۔''

اس آیت میں دو الفاظ آئے ہیں۔ ''بطر'' اور ''ریا''۔ ان دونوں کے معنی دکھاوا یا اِترانا ہی ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ریا کاری ہر چیز میں کی جاسکتی ہے یعنی عبادت میں، کسی صلاحیت میں یا کسی اور چیز میں جب کہ بطر صرف مال و دولت میں دکھاوے کے ساتھ مخصوص ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{وَكَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا فَتِلْكَ مَسٰكِنُهُمْ لَمْ تُسْكَنْ مِّنْۢ بَعْدِهِمْ اِلَّا قَلِيْلًا وَكُنَّا نَحْنُ الْوٰرِثِيْنَ} (القصص:۵۸)

''اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا، اُنہیں اپنی معیشت پر بطر تھا۔ یہ اُن کے گھر ہیں، کوئی ان کے بعد ان میں نہ بسا، مگر بہت تھوڑے لوگ بسے اور ہم ہی اُن کے وارث تھے۔''

''بطر'' زیادہ سے زیادہ ساز و سامان جمع کرنے کی بے لگام خواہش کا نام ہے۔ یعنی دولت کا شوق اس قدر بڑھ جائے کہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی محض دولت کمانا اور خرچ کرنا رہ جائے اور دولت سے جو چیزیں حاصل ہوں ان کے بارے میں انتہائی مسرّت ہو۔ یوں سمجھئے ''بطر'' ایک خاص رویّے کا، ایک اخلاقی بیماری کا نام ہے۔ خود ستائش ہو جانا، معیارِ زندگی کے لیے تگ و دو کرنا بلکہ معیارِ زندگی کو ہی پوجنا شروع کر دینا اور زندگی کا مقصد معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنا ہو جائے، پیسہ کمانے اور خرچ کرنے کا چسکا لگ جائے۔ اس کا مشاہدہ ہم اشتہارات میں کر سکتے ہیں جس طرح اشتہارات میں انسانی جذبات کو اُبھار کر دِکھایا جاتا ہے کہ منہ کھلے ہوئے ہیں، چہروں پر مسرت ہے، مصنوعی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے، کوئی آئس کریم کھا کر، کوئی چہرے پر کریم لگا کر، کوئی کار خرید کر دیوانہ

ہوا جا رہا ہے، بانچھیں کھلی ہوئی ہیں، نرم گدوں کے خواب دیکھ رہے ہیں، قالینوں، پردوں اور صوفوں کے، عالیشان بنگلوں اور کوٹھیوں کے سپنوں میں گُم ہیں، کُل آرزو اور کُل ارمان یہی ہیں۔ جس کے پاس یہ سب ہے وہ انہی کی باتیں کر رہا ہے اور جس کے پاس نہیں ہے وہ ان ہی کے خواب دیکھ رہا ہے اور اگر کسی کو یہ حقیر سی متاع مل جائے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سما رہا۔

دکھاوے اور بطر کے معاشی اثرات:

دکھاوے اور بطر میں مال و دولت کا اظہار آگے بڑھ کر بیماری کی شکل اختیار کر لیتا ہے، اس طرح سے کہ وہ لوگ جو اپنے ذرائع آمدنی میں ان چیزوں کو حاصل نہیں کر سکتے وہ اپنی استطاعت سے بڑھ کر خرچ کرتے ہیں، قرض لے کر سامانِ آسائش خریدتے ہیں، مصنوعی طور پر معیارِ زندگی بڑھا لیتے ہیں۔ اسی وجہ سے کریڈٹ کارڈ کا کلچر وجود میں آیا ہے۔ دوسروں کے حُسن سے، دولت وشہرت سے، معیارِ زندگی اور نسلی برتری سے مرعوب ہوتے رہتے ہیں۔ دوسری طرف جس کے پاس یہ نعمتیں ہیں وہ خوب اِتراتے ہیں اور اسی کے اندر مگن رہتے ہیں۔ اعلیٰ ترین چیز خرید کر گھر میں رکھنا اور اس سے لوگوں کو مرعوب کرنا زندگی کا مقصد ہو جاتا ہے۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے قرض بھی لینا پڑے تو لیتے ہیں۔

بڑی اہم ہدایتِ ربّانی ہے:

{وَ كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍۭ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا} (القصص:۵۸)

''اور کتنی ہی بستیاں ہم تباہ کر چکے ہیں جن کے لوگ اپنی معیشت پر اِترا گئے تھے۔''

جب لوگوں میں دکھاوا اور بطر آجاتا ہے تو ان کی معیشت بھی ایک خاص رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ معیشت ایک خاص رُخ پر چل پڑتی ہے۔ اپنی حد سے بڑھ کر خرچ کرنا ایک مرض بن جاتا ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر زندگی گزارنے کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور پھر یہ نفسیات کریڈٹ کارڈ تہذیب (credit card culture) کو جنم دیتی ہے۔ جیسے آجکل ہمارے ہاں رواج ہے، تنخواہ کم ہے، حیثیت نہیں ہے لیکن کریڈٹ کارڈ پر گاڑی یا فرنیچر خرید لیں گے۔ یہ مرض جس معاشرے میں آجائے تو پھر وہاں کسی کا گھر، رہن سہن دیکھ کر آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ کتنا کما رہا ہے کیوں کہ جو بیس ہزار کما رہا ہے وہ بھی دو لاکھ کی چیز خرید لیتا ہے اور جو دو لاکھ کما رہا ہے وہ تو کروڑوں کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ معیارِ زندگی کو مصنوعی طور پر بڑھا لینا چاہے باقی زندگی میں کتنی ہی

مشکل اُٹھانی پڑے، قرض کے پہاڑ کھڑے ہو جائیں، ''دِکھاوے'' کی علامت ہے۔ ایسے لوگ بازاروں سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں۔ برانڈ کے نام (brand names) انہی کے دم سے چلتے ہیں، اس سے کم پر ان کا گزارہ نہیں ہوتا۔

دِکھاوا کرنے والوں کا ایک اور رویّہ دیکھنے میں آتا ہے کہ اگر کہیں چُھٹی گزارنے گئے تو ان کو اس بات سے کم ہی مطلب ہوگا کہ ہمیں کہاں زیادہ مزہ آئے گا، کس جگہ تفریح کا موقع ہوگا، بس ان کو اس بات سے مطلب ہوتا ہے کہ کس ہوٹل میں رہیں گے اور اگر سفر کیا تو فرسٹ کلاس میں سفر کریں گے یا نہیں۔ نچلے درجے (economy class) میں سفر کرنا ان کے لیے انتہائی بے عزتی کا باعث ہوتا ہے، کسی کو کیا بتائیں گے کہ ہم نے عوامی کلاس میں سفر کیا۔ یہ سب ''دِکھاوے'' کی علامات ہیں۔

آپ نوٹ کر رہے ہوں گے کہ اِترانا اور دکھاوا ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اسی لیے شروع میں وضاحت کی تھی کہ ''بطر'' ایک دل کی بیماری ہے اور اس کا اظہار دکھاوے اور اِترانے میں ہوتا ہے۔ جن کے اندر بطر ہوتا ہے وہ اپنی ذات کو بہت نُمایاں کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا اظہار آپ کو اپنے معاشرے میں نظر آئے گا بدقسمتی سے ہمارا معاشرہ بھی اُن میں شامل ہے جہاں ''دکھاوا اور بطر'' پائے جاتے ہیں۔

جشنِ تہنیت:

''دکھاوے اور اِتراہٹ'' کا لازمی نتیجہ خوشی منانے میں اسراف ہے۔ کسی معاشرے میں اگر یہ مرض دیکھنا ہے تو وہاں کی شادی ملاحظہ کر لیں۔ بلاشبہ شادی کا موقع بہت مبارک ہوتا ہے لیکن اگر معاشرے میں دکھاوے کا داعیّہ ہے تو اس کا اندازہ آپ کو شادی کی تقریبات کو سرسری نگاہ میں دیکھنے سے ہی ہو جائے گا، صرف شادی کا کارڈ دیکھ کر بھی اندازہ ہو جائے گا کیونکہ اب تو پوری پوری کتابیں چھپنے لگی ہیں، مخمل لگے ہوتے ہیں، گوٹے کناریاں اور ربن لگے ہوتے ہیں اور نہ جانے کیا کیا لگایا جاتا ہے۔ مہندی کا الگ، مایوں کا الگ، بارات کا الگ اور ولیمہ کا الگ کارڈ چھپتا ہے۔ اُس شادی کے کارڈ کا مصرف کیا ہے، بس یہ اطلاع دینی مقصود ہے کہ تقریب کب اور کہاں منعقد کی جا رہی ہے، تاریخ اور وقت کیا ہے، جگہ کون سی ہے۔ کارڈ میں صرف تاریخ دیکھ کر کچرے کی ٹوکری کی نظر کر دیا جاتا ہے۔ یہ اطلاع اگر ایک دس پندرہ روپے کے کارڈ پر یا کسی کاغذ پر لکھ کر لفافے میں

ڈال کر بھیج دی جائے تو بھی مسئلہ حل ہو جاتا، اطلاع پہنچ جاتی لیکن یہاں مقصد صرف اطلاع دینا نہیں ہے، ساتھ ساتھ دکھاوا بھی ہے۔ دیکھیں مقصد ٹھیک ہونے کے باوجود دکھاوے کی وجہ سے گُناہ سرزد ہو گیا۔

جس کے اندر ''دِکھاوا'' ہوتا ہے وہ اپنے لیے بہت ساری محافل سجانا چاہتا ہے، وہ بتانا چاہتا ہے کہ دیکھو میرے پاس کتنا کچھ ہے۔ کسی چیز کو صرف حاصل کرنے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس کی نمائش بھی کرتا ہے۔ اِس وجہ سے اخباروں میں بڑے بڑے اشتہارات ہمیں ملتے ہیں۔ موت کے موقع پر بھی دکھاوے سے باز نہیں آتے، آدھے آدھے صفحے کے اعلان چھپواتے ہیں تاکہ لوگ جان جائیں کہ پیسے والے کا انتقال ہوا ہے اور اب تو یہ مرض قبرستانوں تک پہنچ گیا ہے، مردے کو دفنانے کے لیے بھی نام والا قبرستان ہو۔ اعلیٰ درجے کے علاقے میں ہو، عام سے قبرستان میں کیسے دفنائیں؟ اللہ تبارک تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝}(التکاثر)

''غافل کر رکھا تم کو اس تکاثر کی دوڑ نے۔ یہاں تک کہ تم نے قبریں دیکھ لیں۔''

کسی مشہور قبرستان میں اگر جگہ ختم ہو جائے تو دوسری منزل بنا کر کسی مردے کے اوپر دفنا دیتے ہیں مگر کسی چھوٹے موٹے قبرستان لے کر نہیں جاتے۔

بچوں میں بطر:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَ لَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَ لَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ}(لقمٰن:۱۸)

''اور اپنے گالوں کو لوگوں کے لیے پھیلا کر مت رکھنا اور زمین میں اکڑ اکڑ کر مت چلنا، بلاشبہ اللہ تعالیٰ شیخی خورے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔''

یہ دراصل حکیم لقمان اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہے ہیں۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اپنے بچوں کو اترانے سے بچائیں۔ مہنگی سے مہنگی اور قیمتی سے قیمتی اشیاء استعمال کرنے کی عادت سے بچائیں۔ دراصل ماں باپ بچپن ہی سے بچوں کے اندر یہ جذبہ ڈال دیتے ہیں۔ مثلاً ایک سے ایک قیمتی پنسل بکس دینا، ایسی گھڑی دلوانا جس میں بچے کی ضرورت سے زائد معلومات ہوتی ہیں وقت تو بتاتی ہی ہے ساتھ

ساتھ مہینہ، دن اور تاریخ بھی بتاتی ہے۔ کیلکولیٹر (calculator) بھی ہے، الارم بھی ہے، میوزک بھی بجاتی ہے، سبھی کچھ کرتی ہے۔ یا پھر اُن کو مہنگے بستے دلاتے ہیں تاکہ اسکول میں دوسرے بچے دیکھ کر اُن کے بچوں سے مرعوب ہوں۔ کہیں چھٹیاں گزار کر آئیں گے تو لوگوں کو بلا بلا کر اس کی ویڈیو دکھائیں گے، تصویریں دکھائیں گے کوئی دیکھنا چاہے یا نہ چاہے۔

دوسروں سے بھی دِکھاوے اور بطر کا تقاضا:

ہمارے معاشرے میں لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو دکھاوا کرتے ہیں، اتراتے ہیں ساتھ یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہمارے دوست احباب بھی دکھاوا کریں، جو مہمان ہماری دعوت میں شرکت کریں تو وہ بھی ہمارے رنگ میں رنگ جائیں، سوٹ بوٹ پہن کر تیار ہوں تاکہ پتہ چلے کہ ہمارے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے بھی ہماری طرح امیر کبیر ہیں۔ دعوت نامے پر لکھ دیا جاتا ہے کہ مہندی ہے تو ہرا جوڑا پہن کر آئیں، مایوں ہے تو زرد رنگ کا لباس ہو، اور شادی پر لال رنگ کے کپڑے پہن کر آئیں اور شادیوں میں جو لوگ بارات کے ساتھ جانے والے ہوں یا ولیمہ میں ساتھ ہوں تو ان سے بھی بھاری زیور اور جوڑوں کی فرمائش کی جاتی ہے، یہ دکھانے کے لیے کہ ہمارے رشتے دار اتنے امیر کبیر ہیں تو انسانوں کی تو کوئی حیثیت نہ رہی۔ ہاں مہمان نے کیا پہنا ہے اس کی اہمیت ہے۔ ایسے چھوٹے چھوٹے معیارات بن جاتے ہیں اور پھر جس کے پاس ایسا لباس نہیں تو ایسے مہمانوں کو اپنے ساتھ نہیں لے کر جاتے، اس حد تک دکھاوا رچ بس گیا ہے۔ یاد رکھیں یہ بطر اور ریاکاری برباد کرنے والی چیزیں ہیں جو قوموں کو ہلاک اور برباد کر دیتی ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچوں کی خوشی کا جشن نہایت اہتمام سے منایا جاتا ہے، دھوم دھڑکے سے اُن کی سالگرہ (birthday) منائی جاتی ہے۔ اب وہ زمانہ گیا کہ صرف ایک کیک کاٹ کر سالگرہ ختم ہوجائے اب تو سالگرہ کا باقاعدہ موضوع (theme) ہوتا ہے۔ کسی کا موضوع سنڈریلا (cinderella) ہے۔ اس میں ایک سجی سجائی بگھی ہے جس میں سب مہمان بچوں کو باری باری سیر کرائی جاتی ہے، غبارے ہیں، ربن ہیں، رنگا رنگ سجاوٹ ہے اور سارے تحفے ایک طرف سجے ہوئے ہیں۔ اور جس کی سالگرہ ہے وہ سب کی نگاہوں اور توجہ کا مرکز ہوتا ہے۔ لاکھوں روپے ان تقاریب پر خرچ ہوتے ہیں۔ نتیجتاً جو بچے ایسی تقریب میں آتے ہیں وہ بھی اپنے والدین سے اسی قسم کی سالگرہ منانے کا مطالبہ کرتے ہیں لہٰذا پورا معاشرہ ''دکھاوے'' کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ بعض دفعہ لوگ تحفہ دیتے ہوئے قیمت کا لیبل (price tag) نہیں ہٹاتے تاکہ پتہ چلے کہ کتنا قیمتی

تحفہ دیا ہے؟ بطر کا اظہار یوں بھی ہوتا ہے کہ کوئی چیز معمولی سی دکان سے خریدی اور پھر اس کو قیمتی تھیلے یا لفافے میں بند کر کے دے دیا۔ بعض لوگ قیمتی تھیلے سنبھال کر رکھتے ہیں تا کہ ہم اپنا تحفہ ان تھیلوں میں رکھ کر کے اپنی بڑائی ظاہر کر سکیں ۔ دبئی یا انگلینڈ سے لائے ہوئے تھیلے (shopping bags) سنبھال کر رکھ لیتے ہیں۔

آج پوری دنیا دکھاوے اور بطر کی لپیٹ میں ہے، اور بطر ہے ہی پیسے والوں کا مرض۔ امیر ملکوں سے یہ مرض شروع ہوتا ہے، ترقی یافتہ اور دولت مند ممالک اپنی دولت کا اظہار کرتے ہیں اور پھر اُن کی دیکھا دیکھی غریب ممالک بھی وہی سب شروع کر دیتے ہیں۔ ''دکھاوا اور بطر'' کے مرض کا آغاز یورپ اور امریکہ ہی سے ہوا ہے، وہاں سے پھیلتے ہوئے یہ مرض ہمارے ملک جیسے ملکوں میں بھی آجاتا ہے۔ اُن ملکوں میں تمام کاروبار کریڈٹ کارڈ پر چلتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہر امریکی بچہ پیدا ہوتے ہی 40,000 ڈالر کا مقروض ہوتا ہے۔ ہسپتالوں کے بل سے لے کر فرنیچر، گاڑیاں سب کچھ کریڈٹ کارڈ پر لیا جاتا ہے۔

اس نُمائش کی حوصلہ افزائی اشتہارات کے ذریعے بھی بہت زیادہ کی جاتی ہے کہ دنیا کی چیزوں کو دیکھ کر خوشی سے پھٹ پڑنا۔ دنیاوی اشیاء، عیش وعشرت اور سامانِ آسائش کے اشتہارات کو غور سے دیکھا کریں۔ کسی کے ہاتھ میں آئس کریم ہے تو اُس کی آنکھیں پھٹی ہوئی ہیں اور باچھیں کھلی ہوئی ہیں، کوئی چاکلیٹ کھا رہا ہے تو دوسروں کا منہ کھلا ہوا ہے، برگر کھا رہے ہیں تو جھوم رہے ہیں۔ گاڑی دیکھی تو آپے سے باہر ہو گئے۔ کوئی سوتے میں گھر کا خواب دیکھ رہا ہے یا کہیں بیٹھا ہے تو اوپر سے پیسے برستے ہوئے محسوس کر رہا ہے، انسانوں کو اس قسم کی لالچی خوشی کا تصور دیا جاتا ہے۔ ان اشتہارات کے ذریعہ انسانوں کے ذہنوں میں یہ خیال بٹھا دیا گیا ہے کہ ہمارے سکون اطمینان اور خوشی کا دارومدار صرف اچھا کھانے، اچھا پہننے اور اچھا رہن سہن اختیار کرنے میں ہے۔ ایسے لوگ نشہ آور مسرت کا شکار لگتے ہیں۔ تمام آسائشوں اور زبان کے چٹخاروں کی وجہ سے حواس باختہ ہو جاتے ہیں۔ اشتہارات میں یہاں تک دکھایا جاتا ہے کہ جس کے پاس اچھا ٹی وی (TV) ہوگا یا اچھی گاڑی ہوگی تو سب سے اچھی لڑکی اُسی کے ساتھ شادی کرے گی۔ بچے بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ اگر ماں باپ نے ہمیں فلاں موبائل نہیں دلوایا تو وہ ہم سے محبت نہیں کرتے۔ اب تو لوگ بھی صرف ایسے تحفوں پر خوش ہوتے ہیں کہ جو مہنگے ہوں، یہ ہے بطر کا مرض!

کن جذبات کے ساتھ، کتنی مشکلات اُٹھا کر یہ تحفہ دیا گیا، کس نیت، کس محبت وخلوص سے دیا گیا، اس کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔

قارون سے بنی اسرائیل کے نیک لوگوں نے کہا تھا:

{لَا تَفْرَحْ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْفَرِحِیْنَ} (القصص:۷۶)

''زیادہ خوشی سے مت پھُول! بے شک اللہ حد سے زیادہ خوش ہونے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔''

بازاروں کے مسلسل چکر لگانا اور صرف اس لیے خریداری کرنا کہ اشتہار دیکھ لیا تھا اور جب حواسوں پر یہی چیزیں چھائی رہتی ہیں، اٹھتے بیٹھتے کپڑا، زیور، مشینی اشیاء (gadgets) انہی چیزوں کے بارے میں تذکرے اور باتیں ہوتی ہیں تو ایسا معاشرہ بطر اور دکھاوے کا شکار ہوجاتا ہے۔ اپنی حیثیت سے بڑھ کر زندگی گزارنے کا شوق عام ہوجاتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لوگوں میں قناعت تھی، آدمی جتنا کماتا تھا اُسی معیار پر زندگی گزارتا تھا، جو امیر تھے اُن کے طور طریقے مختلف تھے اور جو کم آمدنی والے تھے اُن کے طور طریقے اور تھے لیکن اب کوئی قناعت کی زندگی گزارنے پر راضی نہیں ہے، سب کو وہی چاہیے جو دوسروں کے پاس ہے تو اس طرح معاشرے میں ایک دوڑ (race) لگ جاتی ہے، چھوٹے چھوٹے بچوں کے ہاتھوں میں موبائل نظر آتے ہیں۔ ذرا سوچیں پانچویں جماعت کے بچے کو فون کی کیا ضرورت ہے، وہ بھی سب سے نیا ماڈل چاہیے، معمولی چیز کے لیے تیار نہیں ہوتے کیوں کہ ضرورت کے تحت نہیں لیتے بلکہ شوق کے لیے اور دوسروں کی دیکھا دیکھی خریدتے ہیں۔ اس کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کتنا ہی کمائے، اس کو پورا نہیں پڑتا۔ چین اور سکون رخصت ہوجاتا ہے۔ ایک نہ ختم ہونے والی دوڑ شروع ہوجاتی ہے جس کہ نتیجہ میں قناعت اُٹھ جاتی ہے۔

دِکھاوا اور اِترانا دراصل تباہ شدہ اقوام کا مرض تھا۔ وہ لوگ خودنمائی میں اتنے مصروف رہتے تھے کہ دوسروں کی تکلیف کا احساس تک نہیں ہوتا تھا، بالکل بے حس ہو گئے تھے۔ لوگوں کی قدر واہمیت صرف اس چیز سے منسلک ہوکر رہ گئی تھی کہ انہوں نے کتنے کی چیز پہنی ہے یا کس طرح کے گھر میں رہتے ہیں، انسانی قدروں کو ناپنے کا آلہ مال ودولت رہ گیا تھا۔ دراصل یہ خالص مادہ پر

ستانہ ذہنیت ہے اور بطر کا تعلق اِسی ذہنیت سے ہے یعنی مادّہ کی پوجا، دولت کی پرستش، زندگی کا مقصد ہی دولت کمانا، سجنا سنورنا، دکھانا، اترانا ہی رہ جائے۔

بطر کے ساتھ عموماً اسراف کا مرض پایا جاتا ہے۔ نعمتیں مل جانے پر آپے سے باہر ہو جانا، خوشی سے پھولے نہ سمانا، محض مادّے سے خوشی حاصل کرنے والے لوگ بطر کا شکار ہوتے ہیں۔

دکھاوے اور بطر کے فوری نقصانات:

دکھاوے میں کمیاتِ زندگی (living standard) تو بلند ہو جاتا ہے، لیکن معیارِ زندگی کچھ نہیں رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ طٰہٰ میں بتایا ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کو اس طرح بھول جائیں گے اور مادہ پرستی میں لگ جائیں گے تو کیا ہوگا؟

{وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِیْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِیْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اَعْمٰى}
(طٰہٰ: ۱۲۴)

''اور جس کسی نے میرے ذکر سے منہ پھیرا تو اُن کی معیشت تنگ ہو جائے گی اور آخرت میں اندھے اٹھائے جائیں گے۔''

اس کا نقد نقصان یہ ہوتا ہے کہ مثلاً گھر تو بہت خوبصورت ہوتا ہے مگر خاندانی نظام مضبوط نہیں رہتا، گھر ٹوٹنے لگتے ہیں، طلاقیں بڑھ جاتی ہیں، خاندان ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتے ہیں، اولاد گمراہ، نافرمان اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتی ہے۔ معاشرے سے سکون و اطمینان رخصت ہو جاتا ہے، ہر طرف بے چینی پھیل جاتی ہے۔ سامانِ تسکین کی بہتات ہوتی ہے مگر انسان تنہا رہ جاتا ہے، رشتے ناطے ختم ہو جاتے ہیں۔ مکان تو شاندار ہوتے ہیں لیکن وہ گھر نہیں رہتے۔ پیسہ کمانے کی دوڑ میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ رشتوں کا تقدس قائم نہیں رہتا، نہ رشتوں کا حق ہی ادا ہو پاتا ہے، یہ دکھاوے اور بطر کے معاشرتی نقصانات ہیں۔

دکھاوے اور اتراہٹ کے تحت طرح طرح سے اپنی نمائش کی جاتی ہے، کس کس طرح سے لوگوں کی توجہ اپنی چیزوں کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے، کیسے اپنی اہمیت پیسے کے ذریعے سے جتائی جاتی ہے۔ کوئی پوچھے نہ پوچھے اپنی چیزوں کی ایک ایک تفصیل، قیمت اور خریدنے کی جگہ بتاتے ہیں۔

انسان جتنا زیادہ دِکھاوا کرتا ہے اور اپنے مال و اسباب پر اِتراتا ہے اُتنی ہی سراسیمگی

(insecurity) بڑھتی جاتی ہے۔ جن چیزوں پر خرچ کرنا چاہیے وہاں لوگ نہیں کرتے اور صرف دکھاوے میں خرچ کرتے ہیں تو ایک طرح کی نقلی معیشت پروان چڑھتی ہے اور پھر سب کچھ ایک دم سے ختم ہو جاتا ہے۔

دکھاوے اور بطر کا علاج:

اس کا علاج کیا ہے؟ پہلے تو بندہ اللہ سے دعا کرے جو نبی اکرم ﷺ بھی مانگا کرتے تھے:

(اَللّٰھُمَّ قَنِّعْنِیْ بِمَا رَزَقْتَنِیْ وَبَارِكْ لِیْ فِیْهِ) (۱)

''اے اللہ تو مجھ کو مطمئن کر دے اس پر جو تو نے مجھ کو دیا اور اِسی میں برکت عطا فرما دے۔''

اس ضمن میں سورۂ کہف کے مضامین پر غور کرنا بھی فائدہ دے گا کہ دنیا کی حقیقت کیا ہے؟ یہ کتنی بے وقعت شے ہے، آخرت کے مقابلے میں کتنی گھٹیا ہے۔ اس کا ایک اور علاج مہینے میں تین روزے رکھنا ہے۔ بھوک کے ذریعے اس کا علاج کیا جا سکتا ہے، جب انسان کے پیٹ میں کچھ نہیں ہوتا، بھوک کا احساس ہوتا ہے تو انسان میں نرمی اور عاجزی آتی ہے۔ مادّی اشیاء کی طلب کم ہوتی ہے اسی لیے رمضان کا مہینہ دکھاوے اور بطر کو ختم کرنے کے لیے بہترین مہینہ ہے۔ اس کا ایک اور علاج یہ بھی ہے کہ انسان یہ احساس پیدا کرے کہ دنیا عارضی اور قلیل ہے اور آخرت کے مقابلے میں اس کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ یہ آخرت کمانے کا ذریعہ ہے۔ قرآن حکیم میں یہ بات صراحتاً موجود ہے:

{وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّ لَعِبٌ} (العنکبوت: ۶۴)

''نہیں ہے دنیا کی زندگی مگر دھوکے کا سامان۔''

کسی کے ہیرے جواہرات دیکھ کر متاثر مت ہوں، تعریفیں نہ کریں۔ دل میں تمنّا پیدا مت ہونے دیں، فوراً جنت کا تصور کر لیں جو کہ اصل مقام اور اصل ٹھکانہ ہے۔

دنیا میں مقابلہ بازی کرنا، لوگوں کی چیزوں پر تبصرہ کرنا بھی اس مرض کو بڑھانے کا سبب ہے۔ اگر کسی کا اچھا لباس یا اچھا گھر سجا سجایا دیکھیں تو حسد نہ کریں، اِس دوڑ میں نہ پڑیں کہ ہر اچھی شے میرے پاس بھی ہو۔ گھر آ کر تقاضے نہ کریں کہ ہمیں بھی وہی چیز چاہیے جو دوسروں کے پاس ہے۔ اگر ضرورت ہے تو ٹھیک ہے لیکن صرف نفس کو تسکین دینے کے لیے اور صرف جمع کرنے کی خاطر

(۱) مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الدعاء، باب مایدعو به الرجل بین الرکن والمقام

خریداری کرنا مناسب نہیں۔ انسان کو قناعت کی زندگی گزارنی چاہیے۔ بخاری شریف میں حدیث ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

(لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ) (۱)

"غِنیٰ یہ نہیں کہ انسان کے پاس بے شمار چیزیں جمع ہو جائیں بلکہ اصل غِنیٰ نفس کا غنی ہو جانا ہے۔"

انسان بے نیاز ہو جائے، دنیا کی محبت دل سے نکل جائے، دنیاوی چیزوں کا ڈھیر جمع کرنے کا شوق ہی ختم ہو جائے، کوئی حرص نہ رہے، مادّی چیزیں بے حیثیت لگنے لگیں۔ اسی طرح موت کو یاد رکھنا کہ اچانک آکر دبوچ لیتی ہے، سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے، دوسروں میں بٹ جاتا ہے، اگلی دنیا میں یہ مال ومتاع کچھ کام نہ آئے گا۔ ان حقائق کی یاددہانی بھی دنیا کی محبت کو کم کرتی ہے۔

دکھاوے اور بطر کی علامات:

اپنے آپ سے یہ سوال کریں کہ آپ عام طور پر بازار کیوں جاتے ہیں؟ کسی ضرورت کے تحت جاتے ہیں تو ٹھیک ہے لیکن اگر شوق یا خواہشات کو پورا کرنے کے لیے جاتے ہیں یا محض بازاروں میں گھومنے پھرنے (window shopping) کے لیے، یعنی خریدنے کی سکت نہیں ہے تو دیکھ دیکھ کر ہی دل بہلا لیں۔ اگر ان وجوہات سے بازار جاتے ہیں تو یہ بطر کی علامت ہے۔

دعوتوں اور شادیوں میں جاتے ہوئے اپنا جائزہ لیجیے۔ کیا آپ کو ہر دفعہ نیا جوڑا چاہیے ہوتا ہے کیوں کہ پہلا جوڑا سب دیکھ چکے ہیں۔ یہ خیال ہمارے ہاں کا عام مرض ہے۔ ایک جوڑا اگر دو یا دو سے زائد شادیوں میں پہن لیا تو پھر اس کو دوبارہ پہننا بہت ناگوار لگتا ہے، اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے۔ خاص طور پر دولہا کی والدہ، بہن اور قریبی رشتہ دار تو ضرور نئے کپڑے بنواتے ہیں، پرانے کپڑے چاہے بہت ہی قیمتی کیوں نہ ہوں انہیں دوبارہ نہیں پہنیں گے۔ خوشی کے موقع پر جب تک بہت زیادہ خرچ نہ کر لیں انہیں لگتا ہے کہ خوشی کا حق ادا نہیں کیا، خوشی کو پیسے کے ساتھ جوڑنا اور غم کو بھی پیسے کے ساتھ نتھی کرنا مرض ہے۔ اب تو بعض لوگ سوئم وغیرہ بھی فائیو اسٹار ہوٹل میں کرنے لگے ہیں۔

اکثر لوگوں کو نئے کپڑے پہننے کا شوق ہوتا ہے اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن نئے کپڑے دکھاوے کے لیے نہیں سلوانے چاہئیں کہ ہر تقریب پر اچھے بھلے کپڑے موجود ہونے کے باوجود نیا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس

سوٹ سلوانا ہے اور وہ بھی صرف اس لیے کہ پہلا سوٹ لوگوں نے دیکھا ہوا ہے۔ جدید موبائل فون اس لیے خریدنا کہ اشتہاری بورڈ (bill board) دیکھ لیا ہے یا پھر اس لیے کہ سب دوستوں کے پاس ہے، میرے پاس کیوں نہ ہو! یہ بھی دکھاوا ہے کہ سب نے نیا ماڈل لے لیا ہے میں پرانا ماڈل کیسے استعمال کروں! لیکن اگر یہی نیا ماڈل اس لیے خریدنا ہے کہ میری ضروریات کو پورا کرتا ہے تو پھر ٹھیک ہے۔

دعوتیں کیوں ہوتی ہیں؟ لوگوں کو خوش کرنا ہے، بڑی اچھی چیز ہے، اچھا جذبہ ہے لیکن اپنی خوشیاں لوگوں کو دِکھانا، اپنی نعمتوں پر اِترانا، اپنی شہرت و دکھاوے کے لیے یا کسی سے کوئی کام نکلوانے کے لیے اگر دعوت کی جائے تو یہ باطل وجوہات ہیں۔ اس دعوت کا مقصد اپنی غرض حاصل کرنا تو یہ پسندیدہ نہیں یا اگر دعوت اس غرض سے ہے کہ تحفے وصول کریں، شادی کی سالگرہ ہے یا بچے کی سالگرہ ہے، ایسے موقع پر لوگوں کو بلا بلا کر تحفے تحائف وصول کرنا، یہ بھی بے غرض دعوت نہیں۔ دوست احباب کو یا پھر رشتہ داروں کو کھلانا اجر کا کام ہے لیکن یہ کام محض اللہ کی رضا کے لیے کرنا چاہیے۔

ہمارے ہاں شادیوں میں لڑکے یا لڑکی کی ماں ایک بیگ (bag) میں لفافے لے لے کر جمع کرتی ہے یا پھر دلہن کے پاس ایک خاتون قلم اور نوٹ بک لے کر بیٹھی ہوتی ہے اور باقاعدہ حساب رکھا جاتا ہے کہ کس نے کتنا دیا، اسی لیے بعض لوگ اگر کسی مجبوری سے نہیں آپاتے تو تحفہ بھیج کر قرض چکاتے ہیں، یہ لین دین کا کاروبار بن گیا ہے۔ ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نزدیک صرف تحفے کی قدر ہے انسان کی کوئی قدر نہیں۔ عموماً ہر دعوت میں کوئی نہ کوئی غرض ضرور ہوتی ہے، یہ سب بطر کا مرض ہے۔

اب اگر آپ کو کوئی تحفہ دے اور وہ کم قیمت کا ہو یا آپ کے معیار کے مطابق نہ ہو تو تحفے کی قیمت مت دیکھیں، اس کے پیچھے دینے والے کے جذبات اور نیت کو دیکھیں اور اس کی قدر کریں، یہ اچھے مزاج کی علامت ہے۔ تحفے کی قدر قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتی، اصل چیز تحفہ دینے والے کی محبت کا اظہار ہے، اس کی قدر کریں۔

ہمیں اپنا تجزیہ کرنا چاہیے کہ ہم نعمت ملنے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں یا آپے سے باہر ہو جاتے ہیں؟ اُچھلنا کودنا، چیخنا چلانا، جھومنا شروع کر دیتے ہیں؟ یا ان نعمتوں کی وجہ سے اللہ کے آگے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں۔ کیا میں اس طرح سوچتی ہوں کہ میرے بچے زینب مارکیٹ کے کپڑے نہیں پہن

سکتے یا سکول کالج بس میں نہیں جاسکتے وغیرہ وغیرہ۔ اگر گفتگو کا پسندیدہ موضوع خریداری ہو تو یہ بطر ہے۔ محبت، شہرت، عزت کا معیار صرف چیزیں جمع کرنے اور خریدنے کی استطاعت کو بنالیا گیا ہے، اسی سے خوشی ملتی ہے۔ رشتہ لیتے دیتے وقت لڑکا یا لڑکی کا معیار پیسے والا اور تجدد پسند (modern) ہونا بنتا جارہا ہے تو یہ سب چیزیں بطر کا اظہار ہیں۔

ہم نے بہت ساری چیزوں کو رسم کے طور پر اپنالیا اور اُن کو اب ایک ضرورت سمجھنے لگے ہیں۔ ہر عید، بقرعید پر شادی شدہ لڑکی کا جوڑا مٹھائی سمیت جائے اور لڑکے کا جوڑا آئے۔ اسی طرح مختلف رسمیں مہندی، مایوں یا موت کی رسمیں سب غیر ضروری اخراجات ہیں اور ختم ہونے چاہئیں۔ بطر کرنے والے توقعات بھی بہت زیادہ لگاتے ہیں۔ دوسروں سے امیدیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ ایسے لوگوں سے دُور رہیں۔ شادی کے موقع پر جہیز اور بَری کی نمائش کرنا بہت بُری رسم ہے، دکھاوا ہی دکھاوا ہے اور اس کا کوئی مقصد نہیں۔ بطر کرنے والے ایسے تمام دکھاووں اور نمائشوں کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ یہ سب تو خوشی کا اظہار ہے۔

راہِ عمل:

ہر قسم کی فضول رسموں اور تقریبوں سے بچنا چاہیے۔ لایعنی اور بے مقصد اخراجات بے جا نمائش دکھاوے میں شامل ہوتے ہیں۔ اپنا جائزہ لیتے رہنا چاہیے۔ دوسروں پر ہنسنا اور تنقید کرنا آسان ہے مگر اپنی خرابیوں کا اعتراف کرنا مشکل ہے۔ ان سب چیزوں کو اپنی زندگی سے نکال دیجیے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے کہ وہ شادی بیاہ کے موقعوں پر قرضوں سے بچائے۔ جو آپ کی حیثیت ہے اس کے مطابق ذمہ داریاں ادا کریں۔ لوگوں کی رضا کی خاطر اپنی جان مارنے کی ضرورت نہیں۔ آپ وہ کریں جو آپ کی استطاعت کے مطابق ہے۔ ان بے جا اخراجات کے خلاف، رسموں اور رواجوں کے خلاف جہاد کرنے کی ضرورت ہے۔

ہمارے معاشرے میں دکھاوا اور بطر ایک محاذ ہے، اس پر ڈٹ جائیں۔ دنیاوی چیزوں میں مقابلہ بازی چھوڑ کر نیکیوں کے میدان میں دوڑ لگائیے، نیکیوں میں بڑھ چڑھ کر مقابلہ کیجیے، دین و دنیا دونوں سنور جائیں گے۔

اگر اللہ نے آپ کو بہت نوازا ہے، بڑا گھر دیا ہے، روپے پیسے کی ریل پیل ہے، بڑی گاڑیاں اور نوکر چاکر ہیں، تو مزید عاجزی اور انکساری اختیار کیجیے، اپنے آپ کو حقیر سمجھئے۔ ہم اس کے بالکل

قابل نہیں۔ یہ سب اللہ کا رحم و کرم ہے جو ہمیں اتنا نوازا ہے۔ کسر نفسی کے ساتھ ان نعمتوں کو استعمال کریں اور دعا کرتے رہیں کہ اے اللہ! تو میرا آسان حساب لے اور اے اللہ! ان چیزوں کی محبت میرے دل میں پیدا نہ ہو، میں اپنی وقعت، اپنا معیار اِن مادی چیز کے ساتھ نہ بناؤں۔ اگر میں اللہ کی نظر میں اچھا ہوں، اللہ کا اچھا بندہ ہوں تو ہر جگہ اچھا ہوں، چاہے یہ تمام نعمتیں ہوں یا نہ ہوں۔ اللہ کا شعور کے ساتھ شکر ادا کیجیے، قرآن کا علم سب سے بڑی نعمت ہے، اگر یہ نعمت اللہ نے عطا کر دی تو ساری دنیا سے بہتر ہے۔ اس پر اللہ کا شکر ادا کریں۔ حدیثِ مبارکہ میں آتا ہے کہ ''جس شخص کو اللہ نے قرآن کی نعمت دی اور وہ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر رشک کرے تو اس نے قرآن کی قدر نہ کی۔''

سورۂ یونس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَ بِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ} (آیت:۵۸)

''اے نبی ﷺ! کہہ دیجیے جو اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہے تو چاہیے کہ وہ اس پر خوشیاں منائیں یہ ہر چیز سے بہتر ہے جو وہ جمع کرتے ہیں۔''

اگر خوشی کا اظہار کرنا ہی ہے تو قرآن کی نعمت پر خوشی کا اظہار کرو۔ دنیاوی نعمتوں پر خوشیاں منانا اللہ کو پسند نہیں۔ قرآن پر خوشیاں مناؤ یہ چیز اللہ کو پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس دکھاوے اور بطر کے مرض سے نجات عطا فرمائے اور ہم سب کو قانع بنا دے۔ آمین یارب العالمین!

تکبر وتذلل

تکبر کے حوالہ سے بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔کوئی شخص اپنے آپ کو تکبر سے بَری نہ سمجھے، کبھی کوئی اپنے بارے میں یہ گمان نہ رکھے کہ میں نے اپنے نفس کو ایسا پاک کر دیا ہے کہ تکبر نام کی کوئی چیز میرے اندر موجود ہو ہی نہیں سکتی۔اسی لیے اپنے آپ کو تکبر سے پاک کرنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کیا جائے کہ ہاں مجھ میں تکبر کا پورا امکان موجود ہے۔جب ذہن کھلا ہوا ہوگا تو ان شاءاللہ تکبر کو پہچاننے میں آسانی رہے گی۔عام طور پر ہم دوسروں کی طرف انگلی اٹھا کر کہتے ہیں کہ وہ بہت متکبر (proud) ہے، بہت گھمنڈ والا (arrogant) ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جب ہم دوسروں پر اپنی توجہ مرتکز کرتے ہیں تو ہمیں اپنا تکبر نظر نہیں آتا۔جیسا کہ کہاوت ہے کہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا بھی نظر آجاتا ہے لیکن اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔لہٰذا تکبر کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم صرف اپنے اوپر توجہ (focus) رکھیں اور تکبر کی علامات کو اپنے اندر تلاش کرنے کی کوشش کریں۔

تکبر کیا چیز ہے؟

کِبر دراصل دل میں ہوتا ہے، یوں سمجھیے کہ کبر کا تعلق دل کے امراض سے ہے اور اس بیماری کی علامات (symptoms) انسانی رویے میں ظاہر ہوتی ہیں۔مثلاً تکبر میں انسان دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔یہ بیماری نہایت مہلک اور خوفناک ہے،اس کے بارے میں حدیث میں آیا ہے:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ)) (۱)

''جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔''

اتنی خوفناک وعید کسی اور چیز کے بارے میں نہیں آئی۔جہاں تک غِل یا کینہ آجانے کی بات ہے، اس کے بارے میں قرآن میں فرمایا گیا کہ ''اللہ دلوں کو پاک کر کے جنت میں داخل کر دے گا۔''لیکن تکبر کے بارے میں فرمایا کہ اگر کسی کے دل میں رائی کے برابر بھی تکبر ہوگا تو وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔

زمین وآسمان میں جو سب سے پہلے اللہ کی نافرمانی ہوئی اس کا سبب تکبر ہی تھا،قرآن میں اللہ تبارک تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

{وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ} (البقرۃ:۳۴)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب تحریم الکبر وبیانہ

''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ تو وہ سب سجدے میں گر پڑے مگر شیطان، اس نے انکار کر دیا اور تکبر کیا اور ہو گیا کافروں میں سے۔''

شیطان کی اس نافرمانی پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرمایا گیا:

{قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ ۝ وَّ إِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝} (الحجر)

''تو (شیطان) نکل یہاں سے تو مردود ہے (اللہ کی رحمت سے دور ہے)۔ اور بے شک تم پر لعنت ہے قیامت کے دن تک۔''

یعنی تُو تکبر کرتا ہے، اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے۔ اللہ کا بھی فیصلہ ہے کہ اللہ تکبر کرنے والوں کو بالکل چھوٹا بنا دے گا۔ تکبر کی وجہ سے جب اللہ نے شیطان پر لعنت کی تو کیا وجہ ہے کہ جب انسان شیطانی رویّہ اختیار کرتے ہوئے تکبر کریں تو ان پر اللہ کی لعنت نہ ہو؟

سورۃ المومن آیت ۶۰ میں فرمایا:

{وَ قَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝}

''اور تمہارا رب کہتا ہے مجھے پکارو میں جواب دوں گا! بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں، وہ عنقریب جہنم میں داخل ہوں گے ذلیل و خوار ہو کر۔''

سورۃ احقاف میں فرمایا:

{فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَ بِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ} (الاحقاف: ۲۰)

''سو آج تم کو ذلت کا عذاب ہے، یہ اس کی سزا ہے جو تم زمین میں ناحق غرور کیا کرتے تھے اور بدکرداری کرتے تھے۔''

{قِيْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ} (الزمر: ۷۲)

''کہا جائے گا کہ دوزخ کے دروازوں میں داخل ہو جاؤ ہمیشہ اس میں رہو گے پس تکبر کرنے والوں کا کتنا بُرا ٹھکانہ ہے۔''

تکبر کی شناخت اور درجات:

کوئی مہلک بیماری یکدم پیدا نہیں ہوتی بلکہ خطرناک بیماریاں چھوٹی چھوٹی چیزوں سے ظاہر ہونا شروع ہوتی ہیں پھر کہیں جا کر وہ ایک بڑی بیماری بن جاتی ہیں۔ چونکہ تکبر بہت بڑی اور

خوفناک بیماری ہے اس لیے ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ بیماری کس طرح رفتہ رفتہ اتنی بڑی خرابی بن جاتی ہے، اس کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے، اس کا منبع (source) کیا ہے اور اس سے پہلے کہ یہ چھوٹی بیماری ایک بڑی بیماری میں تبدیل ہو، کیوں نہ ہم اس چھوٹی بیماری ہی کا علاج کرلیں کیوں کہ کوئی بھی مرض آغاز میں قابلِ علاج ہوتا ہے لیکن جب یہ حد سے گزر جائے تو نا قابل علاج ہو جاتا ہے، جس طرح سرطان (cancer) پہلے مرحلے (first stage) سے دوسرے مرحلے (second stage) اور پھر تیسرے اور آخری مرحلے (third stage) میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح تکبر کا مرض بھی مرحلہ وار بڑھتا چلا جاتا ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ تکبر میں بھی ہمیں تین مرحلے (stages) ہی نظر آتے ہیں یعنی عُجب، فخر اور پھر تکبر۔ ایک بات یاد رکھیں پہلے اور دوسرے مرحلے میں یہ مرض قابل علاج ہوتا ہے لیکن جب بات آخری مرحلے تک پہنچ جائے تو پھر یہ قابلِ علاج نہیں رہتا۔ واللہ اعلم۔

تکبر کا پہلا مرحلہ ''عجب'':

تکبر کی پہلی سیڑھی کا نام ''عُجب یا خود پسندی'' ہے۔ یہاں سے تکبر کی ابتدا ہوتی ہے، ''خود شعوری'' بگڑ کر ''خود پسندی'' بن جاتی ہے۔ خود شعوری بجائے خدا شعوری کی راہ ہموار کرنے کے کہیں راستہ بھٹک جاتی ہے۔ اس کے نتیجے میں انسان اپنی ہی ذات کو خدا بنا بیٹھتا ہے۔ جب خود پسندی آتی ہے تو وہ ''اَنَا'' جسے اللہ کے آگے سربسجود ہونا تھا، وہ نفس کے آگے سجدہ ریز ہو جاتی ہے۔ یہ خود پسندی یا عُجب تکبر کی پہلی سطح ہے۔ ایک بات یاد رکھیں خود پسندی اُسی میں آتی ہے جس میں کوئی نہ کوئی خوبی ہو۔ جب کسی انسان کے اوصاف کی تعریف کی جائے، اس کے کسی کام کو سراہا جائے تو بعض دفعہ یہ تعریف اور عزت انسان کے اندر عُجب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک حدیث میں ذکر ہے کہ تین چیزیں ہلاک کرنے والی ہیں، جن میں سے ایک عُجب ہے۔ یہ اتنی خطرناک بیماری ہے کہ جو شخص اس میں مبتلا ہو جاتا ہے وہ اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہے، اُسے اپنی ذات بہت ہی پیاری لگنے لگتی ہے۔ یہ ہے پہلا مرحلہ اور یہ قابلِ علاج ہے۔

عُجب کی پہچان:

عجب کی معرفت اپنے خیالات کا جائزہ لینے سے ہوگی۔ اگر ہمارے تمام خیالات کا مرکز ہماری ذات ہے اور ہم اپنے ہی بارے میں ہر وقت سوچتے رہتے ہیں تو یہ عجب کا آغاز ہے۔ اپنے نقطۂ نظر کو بہترین سمجھنا بھی عجب ہے۔ اگر ہماری گفتگو میں زیادہ تر اس طرح کے الفاظ آتے ہیں مثلاً

میرا ذوق، میرے معیارات، میں کیا پہنوں، میں کیسا لگ رہا ہوں، میرا کیا خیال ہے، کسی کے بارے میں میرا تجزیہ کیا ہے، میں کسی کو دیکھ کر کیا سوچتا ہوں، تو یہ عُجب کی علامات ہیں۔ اس کے علاوہ دوسروں کے بارے میں بھی یہی خیال کرنا کہ وہ میرے بارے میں سوچ رہے ہوں گے، ایسا سمجھنا کہ ہم ہی سب کے حواسوں پر چھائے رہتے ہیں، یہ رویّہ بھی اسی بیماری کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایسے افراد خود کو بہت اہم سمجھنے لگتے ہیں، اپنی ذات، اپنا خیال اور اپنی بات بہت قیمتی لگتی ہے، اپنے اوپر ناز ہونے لگتا ہے اور رفتہ رفتہ یہ احساس گفتگو میں بھی چھلکنے لگتا ہے۔ جس طرح اگر کسی برتن میں گنجائش سے زیادہ پانی بھر دیا جائے تو پھر وہ چھلکنے (over flow) لگتا ہے، اسی طرح اگر ذہن میں ہر وقت اپنی ہی ذات سمائی رہے تو پھر اس کا اظہار ہونا فطری بات ہے۔ جب خود پسندی کا احساس اتنا زیادہ ہو جائے تو کہاں تک سنبھالا جا سکتا ہے، کب تک اندر سمٹ کر رہ سکتا ہے، کب تک صرف سوچنے پر ہی اکتفا کرتے رہیں۔ لازماً یہ خیالات اب الفاظ میں ظاہر ہوں گے، جب بھی گفتگو کریں گے تو اس میں عجب اور خود پسندی کا احساس چھلکنے لگے گا۔

دوسرا مرحلہ ''فخر'':

جب عُجب گفتگو میں ظاہر ہو جائے تو یہ دوسرے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے یعنی ''فخر''۔ عجب میں تو فقط سوچ ہی رہے تھے، مرض مخفی (dormant) تھا، اب اپنے بارے میں شیخیاں بھگاریں گے، لاف وگزاف (brag) کریں گے، اپنی تعریفوں کے پل باندھیں گے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ} (لقمٰن: ۱۸)

''بے شک اللہ پسند نہیں کرتا اترانے والے خود پسند کو''

بہر حال فخر قابلِ علاج مرض ہے اگر اس مرحلے پر اس کا علاج ہو جائے تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ شفا مل جائے گی۔ اگر علاج نہیں کیا تو یہ مرض تیسرے مرحلے (third stage) میں داخل ہو جائے گا جو کہ لاعلاج ہے۔

تیسرا مرحلہ ''اصل تکبر'':

ابھی تک تو صرف اپنی ذات اچھی لگ رہی تھی، اُس کی تعریفیں ہو رہی تھیں، اب تکبر کا مرحلہ شروع ہوگا۔ جس میں انسان کسی کو اپنے سامنے کچھ نہیں سمجھتا۔ دوسروں کی برائیاں کرنا، بے عزتی کرنا، مذاق اڑانا، اگر کوئی ان کی بات سے اتفاق نہ کرے یا اختلاف کرے تو دشمنی پر اتر آنا، انتقامی

کاروائیاں شروع کر دینا، نقصان پہنچانا۔ اس کردار کی مثالیں قرآن حکیم میں ملتی ہیں۔ مثال کے طور پر شیطان سب سے زیادہ تکبر کرنے والا تھا اور انسانوں میں سب سے متکبر فرعون تھا، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو رب نہ مانا، اس کی بات کا رد کیا تو فرعون ہٹ دھرمی پر اتر آیا، مذاق اڑانے لگا، کہنے لگا (نعوذ باللہ) کہ مجھے تو یہ شخص پاگل اور جادوگر لگتا ہے۔ پھر کتنی تحقیر کے ساتھ پوچھا تھا کہ ''رب العالمین'' کیا ہوتا ہے؟ دراصل یہ تکبر ہے۔ اپنی تعریف تو کرتا ہی تھا، کہتا تھا ''میں ہوں تمہارا سب سے اعلیٰ رب۔'' جو نہ مانے اور انکار کرے اس سے انتقام لیتا اور قتل کروا دیتا تھا۔

فخر اور تکبر کی پہچان:

اب ہم فخر اور تکبر کی علامات ڈھونڈنے کی کوشش کریں گے۔ ہم یہ دیکھنے کی کوشش کریں گے کہ یہ مرض کہاں فخر کی حد تک ہے اور کہاں تکبر میں داخل ہو گیا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے تکبر کے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔ اس کے اسباب اور اقسام بھی لکھی ہیں اور اس کا علاج بھی بتایا ہے۔ انہی کی کتاب ''کیمیائے سعادت'' کی روشنی میں فخر اور تکبر کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

پہلے ہم دیکھتے ہیں فخر کیا ہے۔ یعنی اپنی ذات اور اس سے منسلک چیزوں پر مسرت کا اظہار کرنا۔ سب سے پہلے علم کی بات کرتے ہیں، جس کو اپنے علم پر فخر ہو گا وہ اپنے علم کا اظہار کثرت سے کرے گا کہ کہاں سے پڑھا، کتنی محنت کی، کتنا ذہین تھا اور عام لوگوں سے کتنا بلند (above average) تھا۔ اس قسم کی باتیں کر کے فخر کا اظہار کرتا ہے، اپنی ڈگریوں کو آویزاں (display) کرتا ہے۔ ہاں اگر کوئی ڈاکٹر اپنی ڈگری آویزاں کرتا ہے تو یہ پیشے کی ضرورت ہے۔ ہم تو اُس شخص کی بات کر رہے ہیں جو اپنی ذات سے بہت متاثر ہے اور اس کے پاس کوئی ڈگری ہے تو وہ اس ڈگری کو بریف کیس میں یا فائلوں میں رکھ دینا کافی نہیں سمجھتا بلکہ چاہتا ہے کہ ساری دنیا دیکھ لے۔

فخر کا مطلب ہے پھٹ پڑنا۔ فَجَر کا لفظ بھی ان ہی معنوں میں استعمال ہوتا ہے یعنی اندھیرے کو چیر کر آنے والی صبح۔ پھٹ پڑنے والے لوگوں میں تحمل نہیں ہوتا اپنی خوبی دوسروں کو بتانا فرض سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہم کتنے اعلیٰ ہیں، اس طرح وہ نمائش کرتے ہیں۔ اگر بُرائی یہاں تک ہے تو قابلِ علاج ہے۔ اگر ان کو کوئی یہ احساس دلا دے کہ اپنی تعریف کرنا اچھی بات نہیں، یہ تو اپنا مذاق اڑوانے کے مترادف ہے، جگ ہنسائی کا باعث ہے، تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی اصلاح کر لے لیکن اگر وقت پر اس کا احساس نہ ہوا تو ہو سکتا ہے کہ وقت کے ساتھ یہ چیز بڑھ کر تکبر میں بدل (convert)

جائے۔فخر کی حد تک تو اپنی یونیورسٹی کی تعریف تھی، اپنی ڈگری کی تعریف تھی، اپنے اساتذہ کی تعریف تھی، اب تکبر یہ ہوگا کہ باقی سب کے استاد گھٹیا، سب کی یونیورسٹیز گھٹیا، باقی تمام سکول کالج بے کار، کسی کی کوئی ڈگری کام کی نہیں، بس انہی کے پاس جو ہے وہی بہترین ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: اس مرض کا پہلا سبب ''علم'' ہے یعنی جب کوئی صاحبِ علم اپنے آپ کو علم سے آراستہ پاتا ہے تو اُسے اپنے مقابلے میں دوسروں کی حیثیت وحشیوں اور جانوروں کی سی لگتی ہے۔ کبر اور نخوت اس پر غالب سے غالب تر ہوتی جاتی ہے۔اس کی نشانی کیا ہے؟ کیسے پتہ چلے گا کہ میرے اندر تکبر ہے۔اس کی نشانی یہ ہے کہ وہ لوگوں سے اس بات کی توقع کرنے لگتا ہے کہ وہ اس کی غیر معمولی تعظیم وتکریم کریں۔اگر وہ نہ کریں تو اس کو بڑا تعجب ہوتا ہے، اُن کی عقل پر حیرت چھائی ہوتی ہے، منہ تکنے لگتا ہے کہ مجھ جیسا عالم فاضل ان کے درمیان موجود ہے اور یہ مجھے کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں دے رہے۔اس بات پر اس کو حیرت ہوتی ہے، بہت ہی پریشان ہوتا ہے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔وہ سوچتا ہے کہ ان لوگوں کو میری عظمت اور میرا مقام شاید معلوم نہیں ہے اگر یہ مجھ سے واقف ہوتے تو یقیناً مجھ سے امتیازی سلوک کرتے جس کا میں مستحق ہوں۔اس طرح خود کو تسلی دے لیتا ہے کہ ان کو معلوم ہی نہیں کہ میں کون ہوں، میری قدر نہیں جانتے۔مثال کے طور پر ایسا شخص کسی ڈاکٹر کے ہاں گیا اور وہاں کے سیکریٹری نے اُسے پچاسواں نمبر دے دیا اور کہا کہ آپ انتظار کریں۔ایسا شخص یہ نمبر لے کر بہت حیران ہوگا، اس کی توقع یہ تھی کہ جیسے ہی میں کلینک میں داخل ہوں گا تو سب کھڑے ہوجائیں گے اور کہیں گے کہ آپ تو فلاں ہیں نا! آیئے آیئے بیٹھیے، میں آپ کو سب سے پہلے ڈاکٹر صاحب سے ملواؤں گا۔وہ اس قسم کے سلوک کی توقع کرتا ہے کہ ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔ہر جگہ لوگ اس کو پہچان جائیں گے، احترام کریں گے۔لوگ میرے آگے بچھ جائیں گے، مجھے سر آنکھوں پر بٹھائیں گے اور جب ایسا نہیں ہوتا تو یہ صاحب ششدر رہ جاتے ہیں۔

آگے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کوئی ان کو اپنے ہاں مدعو کرے تو اس کو قبول کرلینا گویا کہ دعوت دینے والے کے سر پر اُن کا احسان ہوتا ہے، دعوت دینے والے کی عزت افزائی ہوتی ہے۔

وہ آئے گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم ان کو، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

وہ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ یہ جان لیں کہ ان کا وجود دوسروں کے لیے باعثِ برکت ہے۔

بعض دفعہ لوگ بھی تعریفیں کر کر کے دوسروں کے دماغ کو آسمان پر پہنچا دیتے ہیں۔ پتہ نہیں کس کے دل میں عجب چھپا ہوا ہے، وہ عجب، عجب ہی رہ جاتا تکبر نہ بنتا اگر لوگ اتنا زیادہ مسکہ نہ لگاتے۔ اسی لیے اسلام میں بے جا تعریف کرنا سخت ناپسندیدہ ہے، تعریف ہضم کرنا آسان نہیں، اس کا شخصیت پر منفی (negative) اثر پڑتا ہے۔ یہ اتنا بڑا فتنہ ہے کہ اس کی کوئی حد نہیں۔ ایک عربی شاعر جس کا نام ''متنبی'' تھا اس کا ایک قول آتا ہے کہ ''اگر تم کریم انسان کی عزت کرو گے وہ تمہارا احسان مند ہوگا اور اگر کم ظرف انسان کی عزت کرو گے تو وہ باغی ہو جائے گا۔'' یعنی اس کے اندر سرکشی پیدا ہوگی اور ہوسکتا ہے کہ تکبر بھی پیدا ہو جائے۔ ہمارے ہاں ایک محاورہ استعمال ہوتا ہے ''ہلکے کو حوالداری مل گئی۔'' ہلکے تو تھے ہی حوالداری جو ملی تو وہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھ بیٹھے۔ لہٰذا ایسا شخص بلانے والے کا احسان نہیں مانتا کہ اس نے مجھے اس قابل سمجھا کہ اپنے گھر بلایا، میری عزت افزائی ہوئی، بلکہ یہ سوچتا ہے کہ میں نے اس کے گھر جا کر اس پر احسان کیا ہے بلکہ اس کا عالمِ شہود میں ہونا ہی دنیا پر احسان ہے ورنہ اگر وہ نہ ہوتا تو دنیا تباہ ہو چکی ہوتی۔

متکبر انسان اکثر اس بات کا بھی اظہار کرتا رہتا ہے کہ آخرت کے معاملات میں وہ حق تعالیٰ کے فضل و کرم سے یقیناً کامیاب ہے جبکہ دوسرے اس فضل سے بہت دُور ہیں۔ اس کی نجات تو یقینی ہے البتہ دوسروں کے لیے خطرہ اور تشویش زیادہ ہے۔ متکبر شخص کا یہ اندازِ گفتگو ہوتا ہے کہ میں تو جنتی ہوں مگر آپ کا کیا ہوگا مجھے تو آپ کی فکر کھائے جاتی ہے اور یہ جتاتا بھی رہتا ہے کہ ہر کوئی اس کی دعاؤں، ہدایت اور برکت کا سخت محتاج ہے، ورنہ دوزخ سے نجات حاصل کرنا ان کے لیے ممکن نہیں ہوسکتا۔

بعض دفعہ اللہ سے تعلق پر بھی لوگوں کو تکبر ہو جاتا ہے، ان کا کہنا یہ ہوتا ہے کہ اگر کسی نے ہمیں ستایا، دکھ دیا تو اللہ بدلہ لے گا اور اگر کسی پر کوئی مشکل یا آزمائش آپڑتی ہے تو فوراً فتویٰ دے دیتے ہیں کہ اللہ نے ہمارے ساتھ زیادتی کا بدلہ لیا ہے۔ ان کے تکبر کا حال یہ ہوتا ہے کہ ہم ہی اللہ کے لاڈلے ہیں، اگر کوئی ٹیڑھی نظر سے ہمیں دیکھ لے تو اللہ معاف نہیں کرے گا۔ اپنے آپ کو بزرگ اور ولی اللہ سمجھتے ہیں اور ہر ایک کو اپنا محتاج جانتے ہیں۔ ہماری صحبت میں رہ کر ہی ان کی نجات ہے۔

خاندان پر فخر و تکبر:

خاندان پر فخر اور تکبر میں بھی پہلے عُجب پیدا ہوتا ہے۔ عُجب کا تعلق سوچ سے ہے اور فخر کا معاملہ عمل سے ہے۔ ابتداءً اپنے بارے میں بہت سوچا اور اپنے آباء و اجداد کے کارنامے سنے، اپنی نسل بہت ہی اعلیٰ وارفع لگی اور پھر اس کا اظہار بھی شروع کر دیا، اپنے خاندان کے گُن گانے لگے، جب

بھی گفتگو کا موقع ملا تو خاندانی تفاخر کی بات چھیڑ دی، اپنے باپ دادا کے کارنامے بیان کرنا شروع کیے کہ کیسے نوابوں کی اولاد تھے، کیسے مغلوں کی نسل سے تھے، کیا حسب نسب تھا، کیسے کھاتے پیتے تھے۔ ان کے آداب، رسم ورواج پر گفتگو اور شان وشوکت کا تذکرہ کیا جاتا رہا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ یہ مرض صرف امراء تک محدود نہیں بلکہ غرباء بھی اس مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ایک خاتون کہہ رہی تھیں کہ میرے شوہر عام لوگوں کے خانساماں نہیں تھے بلکہ انگریزوں کے خانساماں تھے، اب بتایئے خانساماں ہونے پر بھی فخر جتایا جاتا ہے۔

ہر درجے میں فخر ہوسکتا ہے۔ انسان اپنی کسی بھی خصوصیت پر فخر کرسکتا ہے خواہ وہ کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔ اپنے آباء واجداد کی بڑائی کا اظہار بے محل، بے موقع، وقت بے وقت مناسب نہیں ہے۔ یہ سب فخر کا نتیجہ ہے، پہلے صرف ایک سوچ تھی، رفتہ رفتہ وہ زبان پر آگئی اور پھر عمل میں ظاہر ہونے لگی یعنی دوسروں کو حقیر سمجھنے لگے۔ ایسے لوگ خاندان سے باہر شادیاں نہیں کرتے، کوئی شادی خاندان سے باہر ہوجائے تو ناک کٹ جاتی ہے یعنی کسی کو اپنا ہم پلہ نہیں سمجھتے تو اپنے سے نچلوں میں شادی کیوں کریں۔

خاندان کا تکبر اس حد تک جا پہنچتا ہے کہ نعوذ باللہ، اللہ کے ساتھ بھی تکبر کرنے لگتے ہیں۔ اللہ کے حکم کے آگے بھی کہتے ہیں کہ ہمارے لیے تو وہی کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا، ہم اپنے باپ دادا کے رسم ورواج نہیں چھوڑ سکتے۔ اگر اللہ کے رسول یہ کہتے ہیں تو کیا ہوا، ہم تو اپنے باپ دادا ہی کی پیروی کریں گے یعنی خاندان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی بات کو رد کردیا جاتا ہے۔ اس تکبر کا مظاہرہ ہم اپنے معاشرے میں، اپنے اردگرد دیکھتے ہیں اور اس کو وفاداری کہتے ہیں۔ شیطان اس طرح وفاداری اور اعتماد (confidence) کے نام پر بہکاتا ہے جبکہ ان باتوں کے پیچھے کہیں تکبر چھپا ہوا ہوتا ہے۔ انسان شناخت نہیں کرپاتا کہ یہ تکبر ہے۔ خاندان پر تکبر کرنے والے اللہ کے سامنے بھی متکبر ہوجاتے ہیں۔ اور علم کا تکبر تو جانا پہچانا ہے کہ اگر اپنے علم کے بل بوتے پر کوئی فیصلہ کرلیا اور پھر اللہ کی کوئی بات سامنے آجائے یا اللہ کے رسول ﷺ کی حدیث آگے آجائے تو کہہ دیتے ہیں کہ میرا خیال یہ ہے، میرا فیصلہ یہ ہے، میرا علم اور تجربہ یہ کہتا ہے۔ قارون نے اپنے علم پر کتنا فخر اور تکبر کیا تھا۔ جب لوگوں نے اس سے کہا تھا کہ رب کا شکر ادا کرو تو اس نے کہا: مجھے تو اپنے علم کی وجہ سے یہ مال ودولت اور نعمتیں ملی ہیں، مقام ملا ہے تو میں کیوں کسی کا شکر ادا کروں۔

نبی اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ میں یہ بات آتی ہے کہ ''جس کو اس کے اعمال پیچھے ڈال دیں

گے، اس کا حسب نسب اس کو آگے نہ بڑھا سکے گا۔'' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی نظر میں کسی خاندان کا کوئی بھی مقام یا مرتبہ نہ ہوگا۔ تو چاہیے کہ اس مرض کا علاج کریں۔ کوشش کریں کہ فخر کے مرحلے پر ہی اس مرض کا علاج کرلیں، اس سے نجات حاصل کریں تاکہ ہلاکت سے بچ سکیں لیکن اگر مرض اس حد تک پہنچ گیا کہ کسی دوسرے خاندان کے فرد کو اپنے خاندان میں شامل کرنا یا اپنے خاندان کے کسی فرد کو دوسرے خاندان میں بیاہنا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں تو یہ تکبر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ } (الحجرات:۱۳)

''تم میں سے سب سے عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔''

کوئی نبی کے خاندان سے بھی ہو، نبی کا بیٹا بھی ہو، لیکن اگر اس کا عمل اچھا نہیں ہے تو نبی کے خاندان کا ہونا اس کو نہ بچا سکے گا۔ قریش کے بڑے بڑے سردار تھے مثلاً ابوجہل اور ابولہب وغیرہ کیا بخش دیے جائیں گے کہ وہ بہت اعلیٰ خاندان کے تھے؟

خاندانی تکبر سے بچنے کا طریقہ:

اگر خاندان پر تکبر ہے تو پہلی کوشش یہ کریں کہ اپنے خاندان کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیں، کسی کا خاندان عظیم نہیں۔ سب ایک خاندان کے ہیں، ہم سب کے جدِّ امجد حضرت آدم علیہ السلام ہیں جو مٹی سے بنے تھے اور ہم سب ایک حقیر پانی کی بوند سے بنے ہیں تو ہم اپنے آپ یا اپنے خاندان پر کیوں فخر کریں۔ کیا ہم میں کوئی ایسی خوبی ہے؟ کوئی خوبی نہیں ہے۔ پس انسان اپنے آپ کو جھکائے، اپنی حیثیت کے بارے میں سوچے اور اپنے خاندان کا تذکرہ کرنا چھوڑ دے۔ کبھی کبھار برسبیل تذکرہ کوئی بات کہہ دی تو کہہ دی۔ سب ہی ذکر کر رہے ہیں تو آپ نے بھی کوئی ایک آدھ جملہ کہہ دیا تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، لیکن دوسروں کو مرعوب کرنے کے لیے، دبانے کے لیے، اپنا سکہ جمانے کے لیے اپنے آپ کو اعلیٰ ترین خاندان کا فرد بنا کر پیش کرنا نامناسب ہے، ناپسندیدہ ہے۔ خاندان پر تکبر مردوں اور عورتوں، دونوں اصناف میں ہوتا ہے۔ عورتیں عام طور پر سسرال سے موازنہ کرتی ہیں کہ میرا میکا ایسا ہے اور میرا میکا ویسا ہے۔ یہ بھی تفاخر کی ایک صورت ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ میرا میکا سب سے اعلیٰ ہے اور تمام سسرال والے گھٹیا، کمتر اور بے کار ہیں۔

مسلمان امت پر شیطان کا ایک حملہ:

شیخ حمزہ یوسف اپنے لیکچر ''Purification of the Heart'' میں فرماتے ہیں:

''امتِ مسلمہ پر شیطان نے دو طرح سے حملہ کیا۔ اہلِ علم حضرات خصوصاً مشرقی علماء پر یہ حملہ اس طرح ہوا کہ انہوں نے اپنے نام کے ساتھ لمبے چوڑے القابات لگانے شروع کر دیئے۔ جیسے شیخ،

الحاج، مفتی اعظم وغیرہ۔ بعض دفعہ تو ان القابات کا سلسلہ اتنا طویل ہوتا ہے کہ اصل نام ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ مغرب کے مسلمانوں پر اس طرح سے حملہ کیا کہ عربی کے سیدھے سادے الفاظ کو صحیح تلفظ سے نہیں پڑھ سکتے، انگریزی کے مشکل سے مشکل الفاظ تو پڑھ لیں گے لیکن عبداللہ یا عبدالرحمن نہیں کہہ سکیں گے۔'' یہ بھی ایک طرح سے تکبر کا اظہار ہے کہ کچھ حروف جو آپ صحیح طور پر بول سکتے ہیں لیکن جان بوجھ کے نہیں بولتے تاکہ آپ عام لوگوں سے نمایاں ہوجائیں، لوگوں کو یہ محسوس ہو کہ آپ یورپ کے ہیں یا یہ ظاہر ہو کہ آپ زیادہ تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ دونوں صورتیں علم پر تکبر میں آتی ہیں جو کہ انتہائی ناپسندیدہ ہے۔ اگر کسی کی واقعی مجبوری ہے، مخارج درست نہیں ہیں، لاکھ کوشش کے باوجود ''ح'' یا ''ق'' ادا نہیں کر پاتے تو یہ تکبر نہیں ہے لیکن ٹھیک بولنے کی طاقت ہونے کے باوجود صحیح تلفظ کے ساتھ نہ پڑھیں کہ کہیں لوگ ہمیں سرکاری اسکول یا مدرسے سے پڑھا ہوا نہ سمجھ لیں۔ قرآن کے بجائے کُرآن بولیں، یہ بھی تکبر ہے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگ یہ باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں کیوں کہ ابھی ہماری تہذیب پوری طرح مغرب کے زیرِ اثر نہیں آئی لیکن شیخ حمزہ یوسف مغربی تہذیب کی بیماریوں سے بخوبی واقف ہیں کیوں کہ انہوں نے مغربی تہذیب کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اس پر مزید یہ کہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ آپ ایمان لائے، موریطانیہ سے دینی تعلیم حاصل کی۔ لہٰذا انہیں مغربی تہذیب کو ایک صاحبِ ایمان کی نظر سے دیکھنے کا موقع ملا۔

ہم نے حسب نسب پر بات کرتے ہوئے سمجھا تھا کہ پہلے عجب پیدا ہوتا ہے اور پھر فخر کیا جاتا ہے اور بالآخر تکبر آجاتا ہے۔ علم پر تکبر ہو تو پھر اپنے علم کے آگے اللہ کا علم بھی کچھ نہیں لگتا معاذ اللہ۔ لوگوں کے علم کو تو پہلے ہی کچھ نہیں سمجھتے تھے اب نعوذ باللہ اللہ کے علم میں بھی نکتہ چینی کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کاٹنے کی سزا وحشیانہ ہے، اسلام کے کچھ احکام آج کے دور میں ناقابلِ عمل ہیں اور بعض غیر ضروری ہیں۔ شیطان نے بھی اللہ تعالیٰ کے حکم پر عقلی اعتراض کیا تھا جب اُسے حکم دیا گیا آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو اس نے کہا، ''میں اس سے بہتر ہوں کیوں کہ میں آگ سے بنا ہوں اور وہ مٹی سے (میں کسی کمتر شے کو کیوں سجدہ کروں)۔''

ہوسکتا ہے کوئی شخص لوگوں کے ساتھ تکبر کا رویّہ نہ رکھے مگر اللہ کے ساتھ اس کا رویّہ متکبّرانہ ہو۔ مثلاً جو شخص جان بوجھ کر نمازیں نہ پڑھے، اللہ کے سامنے جھکنے پر تیار نہ ہو، اس سے بڑھ کر متکبر اور کون ہوگا! جو اللہ کی بات نہیں مانتا، اللہ کے آگے سجدہ نہیں کرتا تو اس سے بڑھ کر متکبر اور کون ہوگا! جو شخص اللہ کے دیئے ہوئے احکامات کی پابندی کو لازمی اور ضروری نہیں سمجھتا اور اللہ کی دی ہوئی شریعت پر عمل کرنا اپنی انا کے خلاف سمجھتا ہے یا اسے اپنے علم پر، اپنی حیثیت پر، اپنے حسب نسب

پر اتنا فخر ہے کہ وہ سوچتا ہے کہ نماز پڑھنے سے اس کی شان میں کمی آئے گی یا کوئی عورت سوچے کہ میں نے حجاب اوڑھ لیا تو میں گھٹیا یا کمتر ہوجاؤں گی یا کسی تقریب میں سنگھار (make up) کر کے بیٹھی ہے اور نماز کا وقت ہوگیا تو اس لیے نماز نہیں پڑھتی کہ وضو کرنا پڑے گا اور میک اَپ دھل کر اتر جائے گا۔

حسن پر فخر:

تیسری چیز جس کے بارے میں ہم بات کریں گے وہ ''حسن پر فخر'' ہے۔ یہ مرض عام طور پر خواتین میں زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس مرض کی ابتدا بھی عُجب سے ہوتی ہے۔ کسی نے رنگ کی تعریف کی، آنکھوں کی یا کسی اور جسمانی خوبصورتی کی تعریف کی تو یہ بات دل میں بس گئی اور عُجب پیدا ہونا شروع ہوگیا۔ اپنے بارے میں بے حد سوچنے لگے، سب سے اہم چیز یہ بن گئی کہ میں کیسی دِکھ رہی ہوں، ایسا کیا پہنوں کہ اچھی لگوں، بال کیسے بنانے چاہئیں، یوں بیٹھوں تو کیسی لگتی ہوں۔ عُجب میں انسان کو اپنے بارے میں ہی سوچتے رہنے کی عادت پڑ جاتی ہے، عورت اپنے حسن کے بارے میں ہی غور کرتی رہتی ہے اور پھر آئینہ میں خود کو دیکھ دیکھ فریفتہ ہوئے چلی جاتی ہے۔ سینکڑوں سال سے یہ چیز لوگوں کے مشاہدے میں ہے کہ مردوں کی نسبت عورتوں میں فخر زیادہ پایا جاتا ہے۔ تبھی تو ہار سنگھار کا سامان ساتھ لے کر رکھتی ہیں۔

عُجب کا ایک اظہار:

عُجب کا ایک اظہار آئینہ سے محبت ہے۔ آتے جاتے، رخ بدل بدل کر آئینہ دیکھنا، نئے کپڑے سِل کر آئیں تو آئینے کے سامنے پورا سیشن (session) کرنا، وضو کرنے کھڑے ہوں تو وضو میں دھیان کم اور شیشے پر زیادہ ہونا عُجب کی علامتیں ہیں۔ ایسے شخص کا وضو مشین کی طرح غیر شعوری طور پر ہو رہا ہوتا ہے، ساری توجہ آئینے میں نظر آنے والے سراپے پر ہوتی ہے۔ کہیں آنا جانا ہو تو بیشتر وقت اپنا جائزہ لینے میں گزر جاتا ہے۔

یہ چیز مناسب نہیں اور یہی وجہ تھی کہ پرانے وقتوں میں مائیں بیٹیوں کو آئینہ کے سامنے زیادہ دیر کھڑے رہنے سے سختی سے منع کرتی تھیں، خواہ مخواہ آئینہ کے سامنے کھڑے رہنے کو بُرا سمجھا جاتا تھا، کوئی بزرگ دیکھ لے تو ڈانٹ پڑتی تھی کہ کیوں آئینہ کے سامنے کھڑی ہو۔ خاندان کی بزرگ خواتین ہمیں بتاتی ہیں کہ ماؤں نے آئینے اتنے اونچے طاقوں میں رکھے ہوتے تھے کہ ہم وہاں تک پہنچ ہی نہ پاتے اور اُچھل اُچھل کر دیکھتے تھے کہ مانگ سیدھی ہے یا نہیں۔ اگر لڑکیاں زیادہ وقت

آئینے کے سامنے رہیں تو مائیں ناراض ہوا کرتی تھیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس بات کی حوصلہ افزائی (encourage) نہیں کرنا چاہیے۔ آج بھی بیٹوں اور بیٹیوں کو منع کرنا چاہیے کہ آئینے کے سامنے دیر تک کھڑے ہو کر زیب وزینت نہ کرتے رہیں۔

جن کے اندر اپنے حسن کے بارے میں عُجب ہوتا ہے وہ تصویریں کھنچوانے کے بھی بہت شوقین ہوتے ہیں، اپنی تصویریں ان کو بہت اچھی لگتی ہیں۔ بڑے اہتمام سے، بن سنور کر خاص انداز (pose) بنا بنا کر مختلف زاویوں سے اپنی تصویریں کھنچواتے ہیں۔ شادی کی تقریبات میں خواتین کیمرہ والے کو دیکھ کر مسکرانے لگتی ہیں تاکہ تصویر میں اچھی لگیں۔

بعض اوقات یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کچھ لوگ آئینے کے سامنے تصوراتی گفتگو بھی کرتے ہیں تاکہ ان کو پتہ ہو کہ کون سا انداز ان پر زیادہ جچتا ہے تو اس کو اپنا لیا جائے، ایسے لوگوں کو اپنی ذات پر نگاہ (monitor) رکھنے کی اتنی عادت ہو جاتی ہے کہ جب مجلس میں محوِ گفتگو ہوتے ہیں تب بھی لاشعور میں اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوتے ہیں کہ ہم ابھی بات کرتے ہوئے کیسے لگ رہے ہیں۔

حسن میں اللہ کے ساتھ تکبر کیسے ہوتا ہے۔ اگر اللہ کے کسی حکم سے اُن کا حسن چھپتا ہے یا حسن میں کمی واقع ہوتی ہے تو وہ اُس حکم پر عمل نہیں کریں گی مثلاً شرعی پردہ نہیں کریں گی، اور اگر کوئی مرد بڑا حسین ہے، اللہ نے وجاہت اور خوبصورتی سے نوازا ہے تو وہ داڑھی کی سنت پر عمل نہیں کرنا چاہے گا، اس کے خیال میں داڑھی رکھی تو خوبصورتی نہیں رہے گی، شکل بگڑ جائے گی، ملّا نظر آئے گا وغیرہ وغیرہ۔

صورت مورت (looks) کے بارے میں بہت محتاط رہنا انسان کو غیر محفوظ (insecure) کر دیتا ہے، اعتماد کی کمی ہو جاتی ہے۔ ہر وقت اس فکر اور سوچ میں رہنا کہ میں دیکھنے والوں کو کیسی لگ رہی ہوں یا لگ رہا ہوں۔، ایک بے چینی (tension) پیدا کر دیتا ہے۔ پھر یہ عُجب جو حسن پر ہوتا ہے یہ عدم تحفظ کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے۔ ہر وقت پیارا لگنا، اچھا لگنا، یہ فکر کہ بال تو خراب نہیں ہو گئے، کہیں لپ اسٹک (lipstick) تو نہیں پھیل گئی۔ دستی بیگ (hand bag) میں بھی چھوٹا آئینہ رکھا رہتا ہے، آنکھ بچا کر اپنے آپ کو وقتاً فوقتاً موقع ملتے ہی دیکھ لینا کہ سب ٹھیک ہے۔ یہ خواتین مجلس، محفل میں اردگرد سے بے نیاز اپنے آپ میں مصروف رہتی ہیں، کبھی دوپٹہ ٹھیک کرتی ہیں تو کبھی بالوں کی لَٹ کو سنوار رہی ہیں، کبھی گلو بند کو ہلا جلا رہی ہیں وغیرہ وغیرہ۔ دورانِ گفتگو انگوٹھیوں کا جائزہ لینا تاکہ قیمتی موتی لوگوں کی نظر سے اوجھل نہ ہو جائے۔

اپنی ذات میں اس قدر مصروف رہنا بڑی ناپسندیدہ چیز ہے، یہ کوئی خوبی نہیں۔ اس عُجب پر

قابو پانے کی ضرورت ہے، اس کو ختم کرنے کی ضرورت ہے، بچیوں کو اس چیز سے باہر نکالنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ ایک خاص عمر میں یہ چیز پیدا ہوتی ہے۔ زیادہ سختی کی بھی ضرورت نہیں، ان کی خواہشات کا خیال کیجیے۔ لیکن جب وہ اس چیز کی طرف بہت زیادہ مائل نظر آئیں تو دانش مندی اور حکمت کے ساتھ ان کی حوصلہ شکنی (discourage) کریں۔

ایک زمانہ تھا کہ سرخی پاؤڈر، (make up) صرف شادی شدہ عورتیں کیا کرتی تھیں بلکہ یہ بناؤ سنگھار شادی شدہ عورت کی پہچان تھی، کنواری لڑکیاں ان چیزوں کا استعمال نہیں کرتی تھیں بلکہ سادہ رہتی تھیں۔ لڑکیاں گوٹے کنارے والے ریشمی لباس بھی نہیں پہنتی تھیں اور نہ انھیں زیور پہننے دیا جاتا تھا۔ یہ بھی تربیت کا حصہ تھا کہ لڑکیوں کو اپنی ذات پر اتنی توجہ نہیں دینی چاہیے۔ انسان اپنی ہی ذات اور حسن کا دیوانہ بن کر نہ رہ جائے۔ اسی وجہ سے جب شادی کے وقت لڑکی دلہن بنتی تھی تو لوگ یہی کہتے تھے کہ دلہن بن کر روپ آیا ہے۔ کیوں کہ وہ عام طور پر سادہ رہتی تھی اسی لیے دلہن بن کر نہایت خوبصورت لگتی تھی اور اس اچانک تبدیلی سے لڑکی میں حیا بھی آجاتی تھی۔

ان چیزوں کو دوبارہ زندہ کرنے کی ضرورت ہے۔ آجکل تو کالج، یونیورسٹی کی مختلف تقریبات (functions) میں شادی شدہ عورتوں اور کنواری لڑکیوں میں فرق کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیوں کے بہت زیادہ بننے سنورنے پر ماؤں کی طرف سے حوصلہ افزائی کا رجحان اچھا نہیں، سادگی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ سب ایک خاص عمر میں اچھا لگتا ہے۔ اگر اس بگاڑ کا سدّ باب نہ کیا جائے تو یہ تکبر میں بدل جائے گا۔ اس معاملے میں تکبر کا اظہار کیسے ہوگا؟ دوسروں کی صورت پر نکتہ چینی کرنا، اُن پر اعتراض کرنا، اُن کا مذاق اُڑانا، کسی کو کالا کہہ دیا، کسی کو ٹھگنا کہہ دیا، کسی کی ناک پر جملہ کس دیا، کسی کے ہونٹوں پر طنز کر دیا۔ غرضیکہ اپنے سوا ہر ایک میں کوئی نہ کوئی عیب نظر آتا ہے۔

تکبّر کی ضد: تذلُّل

انکساری یا تذلُّل تکبّر کی ضد ہے۔ ہم نے دیکھا کہ تکبر میں انسان خود کو بہت اعلیٰ وارفع سمجھتا ہے جب کہ تذلُّل میں خود کو بہت گھٹیا اور ذلیل سمجھنے لگتا ہے، سارے عیب اپنے اندر نظر آنے لگتے ہیں، اپنے آپ کو بُرا بھلا کہتا رہتا ہے، سب کے سامنے اپنی برائیاں بیان کرتا ہے۔ وہ برائیاں اور وہ عیب جو چھپے ہوئے تھے، لوگوں کی نظروں سے اوجھل تھے، اُنہیں بھی کھول کھول کر بیان کرتا پھرتا ہے۔ تذلُّل میں مبتلا لوگ اس بات کے لیے ذہنی طور پر تیار رہتے ہیں کہ لوگ ان کو بُرا بھلا کہیں گے، گھٹیا سمجھیں گے بلکہ خود متوقع (expect) ہوتے ہیں کہ کب ہماری بے عزتی ہو۔ یاد رکھیں

اپنی بے عزتی کرنا بھی ایک مرض ہے، بیماری ہے۔

اسلام میں عاجزی تو بہت پسندیدہ ہے لیکن اپنی بے عزتی کرنا بالکل پسندیدہ نہیں۔ کسی نے کہا ہے کہ ''عاجزی اختیار کرو لیکن اپنی بے عزتی مت کرو۔'' اللہ کو یہ بات پسند نہیں کہ بندہ اپنا عیب یا اپنا گناہ کسی کے سامنے ظاہر کرے جب کہ اللہ نے اس کا پردہ رکھ لیا ہو۔ لیکن کچھ لوگ دوسروں سے اپنا موازنہ کرتے رہتے ہیں اور پھر خود کو گھٹیا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، سوچتے ہیں سب مجھ سے اچھے ہیں، میں تو کسی قابل نہیں، میں تو اتنا گنہگار ہوں اور جب اُن کو یقین ہو جاتا ہے کہ میں اب کبھی اچھا نہیں ہو سکتا، مجھ میں اتنی خامیاں اور خرابیاں ہیں تو اپنے آپ سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ گفتگو میں بار بار ایسے الفاظ دہراتے ہیں کہ میں یہ نہیں کر سکتا، مجھ میں اتنی قابلیت نہیں ہے، یہ کام میرے بس سے باہر ہے۔ دراصل ایسے شخص کی ذہنیت شکست خوردہ ہوتی ہے، پہلے ہی اپنی بے بسی کا اعلان کر دیتا ہے، میں کوئی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا، گھر کا کام پورا نہیں ہو پاتا، نمازیں قضا ہو جاتی ہیں، وقت پر کوئی کام مکمل نہیں کر پاتا۔ اتنا گنہگار ہوں اللہ کبھی نہیں بخشے گا، اللہ میری دعائیں بھی نہیں سنے گا۔ میری شکل اتنی بُری ہے، اتنی معمولی ہے۔ غرضیکہ ایک ایک برائی اور ایک ایک عیب کا اظہار کرتے ہیں۔ لوگوں سے ایک طرح سے رحم کی بھیک مانگتے رہتے ہیں کہ میں قابلِ رحم ہوں، میرے اوپر ترس کھاؤ اُن کو لوگوں کا ترس اور رحم حاصل کرنا اچھا لگتا ہے۔ اپنے غم اور دکھڑوں کی ایسی ایسی داستانیں سناتے ہیں کہ کسی طرح لوگوں کی ہمدردیاں حاصل ہو جائیں اور اس طرح دوسروں کی توجہ (attention) حاصل کرتے ہیں۔ اپنے ڈھکے چھپے جھگڑے اور مسائل سب لوگوں سے بیان کرتے پھرتے ہیں۔

اگر کوئی ایسا برتاؤ (behave) کرتا ہے اور پھر اس کو اپنی عاجزی سمجھتا ہے تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔ یہ عاجزی نہیں ہے، یہ ''تذلُّل'' ہے، احساس کمتری کا اظہار ہے۔ تواضع کو اتنا نہیں بڑھانا چاہیے کہ وہ ''تذلُّل'' بن جائے۔ اس لیے کہ جس کے اندر اس حد تک ''تذلُّل'' ہوگا اُسے اپنی نعمتوں کا دھیان نہیں رہے گا کہ اللہ نے مجھے کتنی نعمتیں عطا کی ہیں۔ اگر نعمتوں کا احساس ہوتا تو اس کے اندر اعتماد آتا اپنی ذات کو پسند کرتا۔ لہٰذا تذلُّل کرنے والا بھی کفرانِ نعمت کا مجرم ہوتا ہے۔ بعض لوگ جان بوجھ کر تواضع کے نام پر ایسی باتیں کرتے ہیں، خود اس چیز کو پروان (cultivate) چڑھاتے ہیں۔

فرقہ ملامتیہ کا طرزِ عمل:

اسلام میں ایک ایسا دور گزرا ہے جب کچھ نیک لوگوں کو اس بات کی فکر ہوئی کہ لوگ ہماری نیکیوں

کی تعریف کرنے لگے ہیں۔ انھوں نے سوچا کہ ہم تو صرف اللہ کی رضا کے لیے نیک کام کر رہے ہیں لیکن دنیا والے ہماری تعریف کر کے ہماری نیکیاں خراب کر رہے ہیں تو ایسا نہ ہو کہ ہماری ساری نیکیاں اور یہ کوششیں ریا کاری میں شامل ہو جائیں اور اللہ کے ہاں مقبولیت سے محروم ہو جائیں، تو انہوں نے ایسے کام شروع کر دیئے کہ جن سے لوگ غلط فہمی کا شکار ہو جائیں۔ مثلاً شربت ایسے پینے لگے جیسے وہ شراب ہو، ایسی حرکتیں کرنے لگے جیسے نشے میں ہیں۔ لوگوں کو ایسی غلط فہمی میں مبتلا کیا کہ اُن کا کردار خراب ہے یا وہ بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہیں۔ لوگوں کے سامنے ایسے ظاہر کرنے لگے کہ وہ بہت گنہگار ہیں۔ اُس گروہ کا نام ''فرقہ ملامتیہ'' پڑ گیا تھا۔ وہ لوگوں کی ملامت چاہتے تھے کہ لوگ ملامت کریں بُرا بھلا کہیں۔ یہ رویّہ اسلام کے ساتھ، اسلام کی تعلیمات کے ساتھ میل نہیں کھاتا، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مومن اپنے آپ کو رسوا اور بے عزت نہ کرے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَنْبَغِي لِمُؤْمِنٍ اَنْ يُذِلَّ نَفْسَهٗ)) (۱)

''مومن اپنے آپ کو رسوا (ذلیل نہیں کرتا)۔''

تذلُّل کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان میں اعتماد کی کمی پیدا ہو جاتی ہے۔ نہ اس کو اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے اور نہ دوسرے ہی اس پر اعتماد کرتے ہیں، ظاہر سی بات ہے جب آپ خود ہی اپنی اتنی بُرائیاں کریں گے تو بھلا کون آپ پر اعتماد کرے گا۔ اسی وجہ سے دوسرے بھی ان کو کوئی کام، کوئی ذمہ داری دینے سے کتراتے ہیں کیونکہ ایسے لوگ انتہائی احساسِ کمتری (inferiority complex) کا شکار ہوتے ہیں، اپنی خداداد صلاحیتوں کو نہیں پہچانتے، جو بھی کام شروع کرتے ہیں، نامکمل چھوڑ دیتے ہیں، اچانک بوکھلا (Panic) جاتے ہیں، ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔ بعض اوقات لوگوں کے سامنے آنے سے ہچکچاتے ہیں، لوگوں کا سامنا نہیں کر پاتے، مجلسوں میں جانے سے گھبراتے ہیں، لوگوں کے سامنے کچھ بولنے کی ہمت ہی نہیں ہو پاتی کیوں کہ اُن کو یقین ہوتا ہے کہ میں بہت بُرا بولتا/ بولتی ہوں، اگر لوگ میری بات سنیں گے تو مذاق اُڑائیں گے۔ میری آواز خراب ہے، میرا لہجہ بھی خراب ہے لہٰذا میں کسی سے بات نہیں کروں گا۔ اس کے علاوہ دوسروں کی بہت زیادہ، بے جا تعریف کرتے ہیں۔ یہ بھی تذلُّل کی علامت ہے۔ حسرت کے ساتھ دوسروں کی تعریف کرنا؛ متکبر شخص صرف اپنی تعریف سننا پسند کرتا ہے مگر یہاں معاملہ برعکس ہے کہ تذلُّل میں مبتلا دوسروں کی بے تحاشا تعریف کرتے ہیں۔

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب الفتن۔۔۔

متکبر انسان کسی کی تعریف برداشت نہیں کرسکتا اور تذلُّل والے اپنی تعریف نہیں سن سکتے۔ اگر کوئی تعریف کر بھی دے تو فوراً کسرِ نفسی سے کام لیں گے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، طرح طرح کی تاویلیں پیش کریں گے کہ میں اس قابل نہیں ہوں، مجھ میں کوئی خوبی یا اچھائی نہیں ہے۔

تذلُّل کے نقصانات:

تذلُّل کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ انسان کی شخصیت تباہ ہوجاتی ہے، بڑی خطرناک شکل اختیار کر لیتی ہے۔ بعض دفعہ ایسے لوگوں میں تلخی آجاتی ہے، سب کے ساتھ ترش رو ہوجاتے ہیں۔ تذلُّل میں مبتلا لوگ اپنے سے بڑوں میں تو ٹھیک رہتے ہیں لیکن اپنے ماتحتوں کو یا اپنے بچوں کو بہت زیادہ پریس (crush) کر رکھ دیتے ہیں۔ وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ جس کا تعلق میری ذات سے ہے وہ بھی خراب ہی ہوگا، جن لوگوں میں یہ مرض ہوتا ہے وہ اپنے بچوں کی اٹھتے بیٹھتے برائیاں کرتے ہیں۔ میرے بچے بہت نالائق ہیں، ناک موٹی ہے، رنگ کالا ہے، چھوٹا قد ہے، بدتمیز ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے لوگوں سے آپ کبھی بھی اپنے گھر والوں کی تعریف نہیں سنیں گے۔ جس خرابی کا کسی کو پتہ نہیں یا کوئی عیب ہے جو کسی کو معلوم نہیں وہ بھی بھری محفل میں بیان کر دیں گے۔ یہ اپنا احساسِ کمتری اور تذلُّل اپنے ماتحتوں میں بھی منتقل کر دیتے ہیں اور اگر کبھی ان کو کوئی عہدہ مل جائے تو اپنی ٹیم کی تحریک (motivation) بالکل ختم کر دیتے ہیں۔ کبھی کسی کی تعریف نہیں کرتے بلکہ ہر بات پر تنقید کرتے ہیں۔ اُن کو یہ خیال ہوتا ہے کہ جس ٹیم کا لیڈر مجھ جیسا ناکارہ انسان ہے اس کے ماتحت بھی ایسے ہی ہوں گے۔ بجائے اس کے کہ اپنی ذمہ داری کو احسن طریقے سے ادا کرتے ہوئے خود اعتمادی کے ساتھ کام کریں، وہ تو اسی پر حیران رہتے ہیں کہ مجھے یہ اعزاز کیسے دیا گیا۔ اپنا یہ اعزاز اُن کو بڑا عجیب اور انہونی چیز لگتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ اعزاز قبول نہیں کر پاتے۔ چنانچہ ان کی صحبت میں لوگ نکھر نہیں پاتے، کسی کی خوبی یا صلاحیت پروان نہیں چڑھ پاتی۔

تذلُّل پیدا ہونے کے اسباب:

تذلُّل کے بہت سے اسباب ہوسکتے ہیں۔ ہوسکتا ہے زندگی کے کسی حصہ میں ان پر شدید تنقید کی گئی ہو تو جذباتی خلش (emotional scar) رہ گئی ہو، نفسیات پر گہرا اثر ہوا ہو یا کسی کے مقابلے میں ان کو حقیر سمجھا گیا ہو۔ اسی لیے والدین سے ماقبل گزارش کی گئی تھی کہ وہ اپنے بچوں میں مقابلہ نہ کریں، کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دیں۔ کسی ایک بچے کو تو بہت توجہ لاڈ پیار دینا اور دوسرے کو بالکل نظرانداز (neglect) کر دینا بھی تذلُّل کا باعث ہوسکتا ہے۔ مزید یہ کہ بچوں میں سے کسی کو بدشکل

اور بیوقوف ہونے کا طعنہ دیا جائے اور ان کے ساتھ مسلسل یہی رویّہ اختیار کیا جائے تو قدرتی طور پر ایسے بچوں میں احساس کمتری پیدا ہو جاتی ہے۔ کبھی بھی سب کے سامنے بچوں کے کسی عیب یا خرابی کا مسلسل ذکر نہیں کرنا چاہیے، کبھی اُن کو پاگل یا بیوقوف (stupid) نہیں کہنا چاہیے۔

عام طور پر مائیں غصہ میں اکثر ایسے الفاظ استعمال کر جاتی ہیں۔ اگر ایسا کبھی ہو جائے تو بچوں سے معافی مانگ لیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی استغفار کریں۔ اس کو معمول (routine) نہ بنائیں کیونکہ بچوں کو ہر وقت بُرا بھلا کہنے سے ان کے اندر ذلت کا احساس پیدا ہوگا۔ اپنے بچوں کے سامنے ہمیشہ دوسرے بچوں کو اچھا کہیں گے کہ وہ ایسے تمیز دار ہیں، صاف ستھرے رہتے ہیں، والدین کا کہنا مانتے ہیں وغیرہ وغیرہ تو یہ تذلُّل کا باعث بن جائے گا۔ اس لیے انتہائی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ایک اور بات نہایت ضروری ہے کہ انسان اپنی نعمتوں پر نظر رکھے، ان کا شعور رکھے اور اپنی خوبیوں پر اپنے رب کا شکر ادا کرے، نعمتوں اور صلاحیتوں پر نظر رکھے۔ اگر اپنی نعمتوں کا احساس نہیں ہوگا تو لامحالہ تلخی پیدا ہوگی، مایوسی جنم لے گی۔

تذلُّل کا علاج:

احساسِ ذلت کا سب سے بہترین علاج تقویٰ ہے۔ اپنے آپ کو کسی کی نظر سے دیکھنے کے بجائے صرف اللہ تعالیٰ کی نظر سے دیکھیں۔ اللہ نے فرمایا:

{اَلَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ} (السجدہ:۷)

''اللہ نے جو چیز بنائی بہت اچھی بنائی۔''

مجھے اللہ نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے۔ میں اللہ کی تخلیق کا شاہکار ہوں۔ میں کیوں اپنے آپ کو کسی اور کی نظر سے دیکھوں۔ اپنے آپ کو کسی اور کے معیار پر کیوں جانچوں۔ لوگوں نے عقل، خوبصورتی، اعلیٰ، کمتر، اچھے اور بُرے کے اپنے اپنے معیارات بنائے ہوئے ہیں۔ چھوڑیں ان سب کو مت دیکھیں اپنے آپ کو لوگوں کی نظروں سے! صرف اللہ کی نظر سے اپنے آپ کو دیکھیں! کیوں کہ اللہ ہی نے ہمیں بنایا ہے اور اللہ نے خود کہا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو بہت اچھی ساخت پر بنایا ہے۔ بے شک اللہ بہترین خالق ہے۔

{فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ} (التغابن: ۳)

''بہت اچھی بنائی ہیں صورتیں۔''

جب اللہ اپنی بنائی ہوئی صورتوں کو اچھا کہہ رہے ہیں تو مان لیں کہ ہم بہت اچھے ہیں اور اللہ سے دعا کر کے اس احساسِ کمتری کو قابو کریں، اِس سے چھٹکارا حاصل کریں۔ اگر کہیں گفتگو کرنی ہے

تو اچھی طرح مشق (practice) کریں اور بھرپور تیاری کے ساتھ جائیں۔ کوئی نئی چیز پکانی ہے تو بغیر کسی خوف کے پکائیں۔

تذلُّل کا علاج ممکن ہے۔ عموماً لوگ احساسِ کمتری کی گھاٹی سے نکل آتے ہیں، پھر اُن کی شخصیت نکھر جاتی ہے۔ بعض دفعہ اللہ کے فضل سے رفیقِ حیات ایسا مل جاتا ہے جو ان کو احساسِ کمتری سے نکال لیتا ہے لیکن یہ ایک بہت طویل مرحلہ (process) ہے۔ قدم بقدم، ایک ایک دن کر کے محنت کرنی پڑتی ہے۔

تذلُّل کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ بچپن میں اُن کو محبت نہیں ملی ہوتی، محرومیت کا ایک احساس ہوتا ہے۔ توجہ اور پیار نہیں ملا ہوتا، تو یہ محرومیاں انسانی شخصیت (personality) پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ اگر کسی انسان کو کسی رشتے سے کوئی پیار نہ ملا ہو تو وہ سوچے کہ جس ہستی نے مجھے دنیا میں بھیجا ہے وہ تو مجھ سے پیار کرتا ہے، وہ میرا ساتھی اور مددگار ہے اور ایسے جملے کہنا چھوڑ دے جن میں اپنی برائی ہو، اس کو بالکل فخر کی بات نہ سمجھے کہ ہم تو خود ہی اپنی برائیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

اگر بچوں میں کوئی عیب ہے تو اس بات کو اپنے اور بچے کے درمیان رہنے دیں، ڈھنڈورا نہ پیٹیں۔ اسی طرح آپ کے ماتحت میں کوئی عیب ہے تو اس کے اور آپ تک محدود رہنا چاہیے۔ پوری دنیا کے سامنے تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر آپ میں کوئی عیب ہے تو اللہ سے رجوع کریں، اللہ سے مدد اور رہنمائی طلب کریں اور جتنا بھی ممکن ہو لوگوں کے سامنے بہتر انداز سے آئیں تاکہ لوگوں کو ہنسنے، مذاق اڑانے اور برائی کرنے کا موقع نہ ملے۔ اس طرح ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔

تذلُّل والوں کی مدد اور علاج:

ایک خیال یہ آتا ہے کہ اگر اپنے اردگرد ہمیں ایسا انسان نظر آئے جو احساسِ ذلت کا شکار ہے تو اس کی مدد کیسے کی جائے۔ اس کو بھی احساس دلایا جائے کہ اللہ نے اسے بھی اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا ہے اور اللہ اُس سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مذکورہ ساری تجاویز بھی اُس پر آزمائی جاسکتی ہیں۔ ایک علاج یہ بھی ہے کہ ایسے لوگ کسی ٹیم کا حصہ بن جائیں۔ اس لیے کہ تذلُّل میں بندے کو اپنے بے کار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ کسی ٹیم سے جڑ کر کام کرتے ہیں تو ان کے تذلُّل کا علاج ہو جاتا ہے۔ اجتماعیت میں اللہ تعالیٰ نے بڑی برکت رکھی ہے۔ اگر ایسے لوگ آپ کے ماتحت ہیں تو اُن سے ایسا کام لیں، جو نسبتاً آسان ہو اور ہلکا پھلکا ہو۔ جب وہ کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیں گے تو اُن کے اندر اعتماد آئے گا۔ اس طرح احساسِ تحصیلِ مقصد (sense of achievement) پیدا ہوگا۔ مل کر کام کرنے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی کسی کام کو ادھورا چھوڑنے کے چکر میں ہو تو باقی افراد پکڑ لیتے ہیں اور اُس کے قدم جماتے ہیں

کہ تم یہ کام چھوڑ کر نہیں جا سکتے تو مجبوراً ہی اُس کو وہ کام پورا کرنا پڑتا ہے۔ اِس سے بھی اُس کے اندر اعتماد پیدا ہوتا ہے۔

اگر کسی کے اندر تذلُّل ہو تو اس کی تعریف کرنی چاہیے، کیوں کہ اس مرض کے علاج کے لیے تھوڑی انتہا (extreme) پر جانا ہوگا، جیسا کہ آپ کے پاس پانی ہے جو کہ بالکل یخ ٹھنڈا ہے اور آپ اس کا درجہ حرارت معتدل کرنا چاہتے ہیں تو آپ کیا کرتے ہیں، گرم پانی ڈال کر اُس کی ٹھنڈک کو متوازن یا کم کرتے ہیں اور گرم پانی کا اضافہ کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ پانی کا درجۂ حرارت حسبِ ضرورت ہو جائے۔ لیکن اگر مسلسل کھولتا ہوا پانی ملاتے رہیں گے تو پانی دوسری انتہا تک پہنچ جائے گا یعنی بہت گرم ہو جائے گا۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے یہ مثال دی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ شدید بیماری کا ازالہ کرنے کے لیے بعض دفعہ دوسری انتہا پر جانا پڑتا ہے یعنی تکبر ایک شدید مرض ہے، یہ عُجب کا تیسرا مرحلہ (third stage) ہے چنانچہ اس کا علاج بھی دوسری انتہا پر ہوگا۔ جیسا کہ سرطان (cancer) میں کاٹ چھانٹ کرنی پڑتی ہے، صرف دوائیوں سے علاج ممکن نہیں۔ اس کے برخلاف جس کے اندر تکبر ہے وہ اپنی تعریف ہرگز نہ کرے اور نہ دوسروں سے سنے اور کوئی دوسرے متکبر انسان کی جائز تعریف بھی نہ کرے۔ جب تک کہ تکبر اندر سے مٹ نہ جائے، دور نہ ہو جائے۔ اس کے بعد پھر معتدل رویّہ اختیار کرنا چاہیے۔ عام انداز میں بات چیت اور دوستانہ تعلقات قائم رکھنے چاہئیں۔ اسی طرح جس کے اندر تذلُّل ہے اس کے ساتھ بھی شفایاب ہونے تک دوسری انتہا پر جانا ہوگا۔ اپنے بارے میں بہت مثبت اور اچھا اچھا سوچے، اپنے متعلق ہمیشہ اچھا گمان رکھے اور تعمیری (constructive) سوچ رکھے۔

اور تذلُّل میں مبتلا شخص کی خوب تعریف اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ اس کے اندر خود مختاری پیدا ہو۔ اس کو توجہ دینی چاہیے، نظر انداز (ignore) بالکل بھی نہ کریں۔ اُس کی معمولی محنت اور کامیابی پر بھی دل بڑھائیں۔ اتنے عرصے تک یہ علاج جاری رکھیں جب تک وہ اعتدال پر نہ آجائے اور اپنے متعلق اچھا نہ سوچنے لگے۔ جس طرح ڈاکٹر دوائی کی مقدار مسلسل کم کرتا جاتا ہے اور صحت یاب ہونے کے بعد بالکل بند کر دیتا ہے اسی طرح تذلُّل میں بھی ایک اعتدال پر آکر علاج بند کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے آپ کو خود سنبھال لے۔ اس طرح ان شاء اللہ شفا ملے گی اور شخصیت متوازن ہو جائے گی۔

تواضع

تکبر اور تذلل دو انتہائی طرزِ عمل ہیں اور ان کے بیچ میں تواضع (humbleness) ہے۔ اعتدال پسند (modest) ہونا۔ متواضع شخصیت کو اسلام پسند کرتا ہے کیوں کہ اسلام خود بھی معتدل دین ہے۔

تواضع کی فضیلت:

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں متوازن طرزِ عمل کی مدح سرائی فرمائی ہے:

{وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا} (فرقان: ۶۳)

''رحمٰن کے بندے تو وہ ہیں جو زمین میں دھیمی چال چلتے ہیں۔''

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں آتا ہے:

((وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ)) (۱)

''کوئی شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار نہیں کرتا مگر یہ کہ اللہ اس کا درجہ بلند کرتا ہے۔''

مراد یہ کہ اللہ کی خاطر جو تواضع اختیار کرے گا اللہ اُسے عزت دیگا۔

صحیح مسلم ہی کی ایک اور حدیث میں آپ ﷺ نے فرمایا:

((إِنَّ اللّٰهَ أَوْحَى إِلَيَّ أَنْ تَوَاضَعُوا حَتَّى لَا يَفْخَرَ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ وَلَا يَبْغِ أَحَدٌ عَلَى أَحَدٍ)) (۲)

''اللہ تعالیٰ نے میری طرف وحی بھیجی ہے کہ آپس میں تواضع اختیار کرو حتّٰی کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی کسی پر زیادتی کرے۔''

یہ متوازن رویّہ (balanced attitude) اسلام میں مطلوب (required) ہے۔

تواضع کی حقیقت:

تواضع دل اور روح کا فعل ہے، روح کی کیفیت کا نام ہے اور اس کا مظہر یہ ہے کہ انسان جو

---

(۱) صحیح مسلم، كِتَاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَاب اسْتِحْبَابِ الْعَفْوِ۔۔۔

(۲) صحیح مسلم، كِتَاب الْجَنَّةِ وَصِفَةِ نَعِيمِهَا وَأَهْلِهَا، بَاب الصِّفَاتِ الَّتِي يُعْرَفُ بِهَا فِي الدُّنْيَا۔۔۔

کچھ حاصل کرے اُس کا سہرا (credit) اپنے سر نہ لے بلکہ اللہ کو دے، اپنی کامیابیوں کو اللہ کی دَین سمجھے۔ تواضع یہ ہے کہ انسان اپنے بارے میں زیادہ نہ سوچے ورنہ وہ عُجب اور خود پسندی کا شکار ہوجائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ اپنے آپ کو گھٹیا سمجھے، یہ بھی نہیں کرنا۔ کسی نے انکساری (modesty) کے بارے میں بہت ہی پیاری بات کہی ہے کہ:

''متواضع لوگ اپنے آپ کو کم نہیں سمجھتے، گھٹیا اور حقیر نہیں سمجھتے بلکہ اپنے بارے میں کم سوچتے ہیں۔'' یعنی اُن پر ہر وقت اپنی شخصیت کا خمار نہیں چھایا رہتا۔ یہ ہے دراصل تواضع کہ انسان اپنے بارے میں میانہ روی اختیار کرے۔

اگر کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ لوگ اس کی عزت اور تعظیم میں غلو کر رہے ہیں، مثلاً لوگ منہ بھر بھر کر تعریفیں کر رہے ہیں یا لوگ اُس کا درجہ حد سے زیادہ بڑھا رہے ہیں، ایسی ایسی خوبیاں جوڑ رہے ہیں جو اُس میں نہیں پائی جاتیں تو اصلاح کی غرض سے اپنی کسی کمزوری کا ذکر کردے۔ اگر ایسا کوئی واقعہ آپ کے ساتھ پیش آجائے، مثال کے طور پر کوئی آپ کے کھانا پکانے کی بہت تعریف کر رہا ہے، تو فوراً خطرے کی گھنٹی بجنی چاہیے، کہ اب میرے اندر عُجب آنے والا ہے یا آچکا۔ جب کسی محفل میں اس طرح تعریف کی جاتی ہے تو دو طرح کے خطرے ہوتے ہیں؛ اپنے اندر عجب آنے کا اور دوسروں کے دل میں حسد پیدا ہونے کا۔ اگر کوئی اس طرح آپ کی تعریف کرے تو آپ کا ردّعمل کیا ہونا چاہیے؟ اگر آپ کہیں گے کہ اللہ نے میرے ہاتھ میں ذائقہ دیا ہے تو اس پر اعتراض وارِد ہوگا کہ یہ بڑی اللہ کی لاڈلی ہیں، بڑی نیک پارسا ہیں۔ بہرکیف سننے والے آپ کے بارے میں کچھ نہ کچھ منفی (negative) ہی سوچیں گے۔ لہٰذا کوئی بھی آپ کی تعریف کرے، آپ کی شکل وصورت کی، کپڑوں کی، آپ کے ذوق (taste) کی، کھانے پکانے کی تو ایسی صورتحال میں آپ اپنی کسی غلطی یا کمزوری کا ذکر کرسکتی ہیں۔ مثلاً خاموشی سے کہہ دیں کہ پہلے ایک دو دفعہ کوشش (try) کی تھی تو بہت بُرا پکا تھا، جَل گیا تھا یا نمک تیز ہوگیا تھا وغیرہ وغیرہ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ غلطیاں سب ہی سے ہوتی ہیں تو اپنی کسی ایسی ہی غلطی کا ذکر کردیں۔ ان شاءاللہ اس طرح لوگوں میں حسد پیدا نہیں ہوگا۔

تکبر اور تذلل کا تزکیہ:

تکبر اور تذلل دونوں عیوب ہیں۔ ان عیبوں کو تزکیہ سے ختم کرنا ہے۔ تزکیہ کی مثال میک اَپ

(make up) کی سی ہے۔ جیسے کہ چہرے کا میک اپ کر کے داغ دھبّے وغیرہ چھپائے جاتے ہیں اور اس کا استعمال ایسی مہارت سے کیا جاتا ہے کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ میک اپ کیا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ تواضع میں ہم اپنے عیوب کو چھپانے کے بجائے ختم کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ زیادہ میک اپ (over make up) بدنما لگتا ہے اور کم میک اپ (under make up) سے عیب نہیں چھپتے اسی لیے میک اپ درمیانہ اچھا لگتا ہے۔ تواضع بھی دو انتہاؤں کی درمیانی کیفیت ہے کہ اپنی تعریف سن کر نہ بہت اِترایا جائے اور نہ ہی بہت حقیر بنا جائے کہ یہ تو سب میک اپ کا کمال ہے، میں اتنی خوب صورت کہاں ہوں، میری شکل وصورت تو بہت معمولی ہے وغیرہ وغیرہ۔

ایسی تواضع اختیار نہ کریں کہ شخصیت مزید بدنما ہو جائے اور تواضع شخصیت کا عیب (false modesty) بن جائے۔ آپ کو پتہ ہے کہ کھانا اچھا پکا ہے یا آپ کو پتہ ہے کہ آپ اچھی لگ رہی ہیں، تو نہ نہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مان لیں کہ اچھا ہے اور اللہ کا شکر بجالائیں۔ ساتھ ہی اس تاثر کو زائل (tone down) کرنے کی کوشش کریں، مثلاً کوئی کھانے کی تعریف کرے تو آپ کہہ دیں کہ کبھی کبھی اچھا بن جاتا ہے اور کبھی نہیں بھی بنتا ہے۔ اس طرح آپ کی تعریف کسی کے حسد کی وجہ نہیں بنے گی۔ اور آپ بھی عجب سے محفوظ رہیں گی۔

دوسرے کی حوصلہ افزائی کے لیے اپنا ذکر کر سکتے ہیں:

اسی طرح کسی کو اپنی اصلاح کے حوالے سے مایوسی ہو رہی ہو اور وہ آپ کے سامنے اس کا ذکر کرے کہ میں تو ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا، میں نماز کی پابندی کر ہی نہیں سکتا، فجر میں مجھ سے اٹھا ہی نہیں جاتا تو اُس کی حوصلہ افزائی (encourage) کرنے کے لیے اس طرح کی باتیں کریں کہ مجھ میں بھی یہ کمزوری تھی، اللہ کے فضل سے دور ہو گئی، آپ کوشش کرتے رہیں اور اللہ سے دعا کریں آپ کی بھی یہ خامی دُور ہو جائے گی۔ اللہ نے مجھ پر فضل کیا ہے یقینا آپ پر بھی کرے گا۔

اگر بغیر کسی وجہ کے آپ کو اپنے اندر عُجب محسوس ہو رہا ہے تو اپنی کمیوں کوتاہیوں کا ذکر کیا جا سکتا ہے۔ اس کا جواز یہ ہے کہ ایک دفعہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں منبر پر آئے، لوگوں سے خطاب کیا اور اپنا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''اے عمر رضی اللہ عنہ! تو وہی ہے نا جو مکے میں بکریاں چرایا کرتا تھا۔'' لوگ بڑے حیران ہوئے بعض نے کہا امیر المومنین! یہ آپ نے کیا بات

کی۔آپ تو اتنی بڑی ریاست کے امیر ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ ایک دن میں بیٹھا ہوا تھا تو میرے دل میں خیال آیا، واہ عمر! آج تیرے پاس کتنی بڑی ریاست ہے۔بس یہ خیال آیا تو میں نے اس کا علاج یہ سوچا کہ میں لوگوں کو بتادوں کہ میری اصل حقیقت کیا ہے۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں تقویٰ تھا تو وہ شیطانی خیال کو فوراً پہچان گئے۔اس سے پہلے کہ وہ عُجب کا سانپ نقصان پہنچاتا، اژدہا بن کر ساری نیکیاں نگل جاتا، ایمان کا دشمن بنتا، اُس کا سر کچل دیا۔اِس طرح بھی تواضع آتی ہے۔

عجب اور تکبر سے بچنے کے اور طریقے:

اسی طرح اگر آپ کسی بڑے گھر میں رہتے ہیں اور کوئی اُس گھر کی تعریف کرے تو آپ کہہ دیں کہ ہم مدتوں فلیٹ (flat) میں رہے تھے۔اس طرح تعریف کرنے والا بھی سمجھ جائے گا کہ یہ لوگ جدّی پُشتی امیر نہیں ہیں۔لہٰذا عُجب اور حسد دونوں کا سدّ باب ہوجائے گا۔مزید یہ کہ چھوٹوں کو سلام کرنا، خواہ عمر میں چھوٹے ہوں یا رتبے میں، نوکر چاکر، کام کرنے والیاں، ان سب کو سلام میں پہل کرنے کی کوشش کریں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک متفق علیہ روایت ہے:

((أَنَّهُ مَرَّ عَلَى صِبْيَانٍ فَسَلَّمَ عَلَيْهِمْ وَقَالَ كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَفْعَلُهُ))(۱)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ بچوں کے پاس سے گذرے تو بچوں کو سلام کیا اور کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا کرتے تھے۔''

اگر لباس کے حوالے سے کبر آرہا ہے یعنی لوگ آپ کے اوڑھنے پہننے کی بہت تعریف کرنے لگے ہیں کہ آپ کی پسند (choice) بہت اچھی ہے، بہت اچھے کپڑے پہنتی ہیں، ڈیزائن (design) بہت اچھے ہوتے ہیں، تو اس وجہ سے بھی عُجب آسکتا ہے اور دوسروں میں حسد کے جذبات ابھر سکتے ہیں، تو ایسے میں تواضع اختیار کریں اور لباس میں سادگی اپنائیں۔لیکن یاد رکھیں بات سادہ لباس کی کی گئی ہے، گندے، بدنما، بے ڈھنگے لباس کی نہیں۔لباس خوب صورت ہو، اچھا ہو مگر بہت مہنگا نہ ہو، سادہ لباس بھی خوب صورت ہوسکتا ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کِتَاب الِاسْتِئْذَانِ، بَاب التَّسْلِيمِ عَلَى الصِّبْيَانِ

تواضع کی ایک صورت :

تواضع یہ بھی ہے کہ جب لوگوں کے درمیان موجود ہوں تو کوئی نمایاں مقام حاصل کرنے کی کوشش نہ کی جائے۔یعنی یہ تمنا دل میں نہ آئے کہ مجلس، محفل یا دعوت میں اپنے کپڑے دکھاؤں یا خود کو بہت اہم شخصیت بتلاؤں۔ اورنہ توجہ سے بہت زیادہ گھبراؤں اور شرمندہ (embarrassed) ہوں۔ نبی اکرم ﷺ لوگوں کے درمیان چلا کرتے تھے، آگے آگے نہیں چلتے تھے۔نفس بہکائے گا کہ آپ تو بڑے عزت والے ہیں۔آگے ہونے میں عزت مت محسوس کریں۔اگر کوئی کسی کو بڑا سمجھتا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے آپ کو بڑا سمجھنے لگے۔ دوسروں کی رائے (opinion) کا اتنا یقین نہیں کرنا۔

سب سے مختلف (different) لگنے کی خواہش اور کوشش مت کریں۔سب (crowd) کے ساتھ رہیں، منفرد دکھنے کی کوشش مت کریں۔آپ کے دل میں اگر یہ خواہش ہو کہ مجھ جیسا زیور مجلس میں کوئی اور نہ پہنے۔تو اتار دیں تا کہ عُجب نہ آئے یا کوئی جوڑا پہن کر یہ احساس ہو کہ ایسا تو کسی کے پاس ہوگا ہی نہیں۔جونہی یہ احساس آئے اُس لباس کو تبدیل کرلیں، اتار دیں کچھ اور پہن لیں تا کہ عُجب سے نجات ملے۔یہ بظاہر توسخت (extreme) اقدام ہیں لیکن یہ ناگزیر ہیں، ان پر جانا ہوگا تا کہ دل سے عُجب نکل جائے، شخصیت اوسط درجے (average) پر آجائے۔آج کل لوگ اس اوسط (average) کے لفظ سے بہت بیزار (allergic) ہیں، اس سے بڑی کوئی گالی نہیں سمجھی جاتی۔اوسط (average) کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ جیسے باقی سب لوگ ہیں ویسا ہی میں بھی ہوں۔لیکن ہمیں تو منفرد رہنے کا مرض ہے۔ ہمارے نفس پر یہ بات بہت گراں گزرتی ہے کہ ہمیں عام انسانوں کی صف میں لاکھڑا کردیا جائے۔ہمارے بچے کی کارکردگی کی رپورٹ (report card) پر اگر استاد نے اوسط (average) کا فقرہ (comment) لکھ دیا تو بچے کی شامت آجاتی ہے۔یعنی ہم یہ نہیں چاہتے کہ ہمارا بچہ اور بہت سے بچوں کی طرح ہو۔ہم تو بے تحاشا تعریف سننا چاہتے ہیں، بہترین (best) سے کم پر راضی نہیں ہوتے۔بے مثال (unique) ہوں اور بہترین (best) ہوں تب راضی ہوتے ہیں۔اپنے آپ کو یہ یقین دلائیں کہ ہم متوسّط (average) انسان ہیں اور متوسّط ہونا کوئی خرابی یا کمی نہیں، کوئی بے عزتی کی بات نہیں۔اپنے آپ کو اس بات پر قائل (convince) کیجیے کہ جیسے اور لوگ ہیں ویسے ہی ہم ہیں۔

اللہ کی عطا کردہ کسی نعمت کی وجہ سے یا کسی کامیابی کی وجہ سے خود کو لوگوں سے بہتر نہ سمجھیں اور نہ انسان خود کو حقیر اور گھٹیا سمجھے۔ قرآن میں اللہ فرماتا ہے۔

{وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ} (الضحیٰ: ۱۱)

''اور جو نعمت آپ ﷺ کے رب نے آپ کو دی ہے اس کو بیان کیجیے۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے تلقین فرمائی ہے۔ حاصل گفتگو یہ ہے کہ شکر اور تواضع کو اپنی شخصیت کا حصہ بنائیں۔ اللہ نے جو نعمتیں دی ہیں ان کا اظہار ہونا چاہیے ان کو چھپا چھپا کر نہ رکھا جائے، جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کو یہ بات اچھی لگتی ہے کہ اللہ کسی شخص کو نعمت دے تو وہ اس پر ظاہر بھی ہو، یعنی اگر کسی شخص کو اللہ نے کھاتا پیتا بنایا ہے تو اس کے بود و باش سے ظاہر ہو۔ اللہ نے صاحبِ ثروت بنایا ہے تو اچھا رہنا سہنا رکھے تاکہ ظاہر ہو کہ اللہ نے اس کو دے رکھا ہے، محتاج یا فقیر نہیں ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس بات کی بھی رعایت کرنا کہ دکھاوا اور عجب نہ ہو، مشکل معاملہ ہے مگر قرآن و احادیث اس بارے میں ہماری رہنمائی کرتی ہیں۔ شکر کے طور پر نعمت کا ذکر کرنا کہ لوگ آپ کو محتاج، ضرورت مند نہ سمجھیں، بے چارہ سمجھ کر ترس نہ کھائیں تو ایسی چال ڈھال، خوراک، رہن سہن اپنانا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا فضل نظر آئے۔ لیکن کون کون سی نعمت کا ذکر کرنا ہے، کس جگہ اور کہاں ذکر کرنا ہے، یہ انسان خود ہی فیصلہ (judge) کر سکتا ہے، خود ہی تجربہ کر کے پتہ چلے گا۔

تواضع کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر کرنا ہی بند چھوڑ دے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَنَا سَيِّدُ وَلَدِ آدَمَ وَلَا فَخْرَ))(۱)

''میں بنی آدم علیہ السلام کا (آدم کے بیٹوں کا) سردار ہوں اور کوئی فخر کی بات نہیں۔''

اللہ نے جو مقام دیا اُس کا اقرار، اُس کا اظہار، اُس کا شکر کہ اللہ نے دیا یہ بات عُجب نہیں پیدا ہونے دے گی۔ اگر کوئی کہتا ہے کہ آپ مجھے یہ کام دے دیجیے، میرا حافظہ اچھا ہے میں یہ اچھی طرح

(۱) جامع الترمذی، کتاب المناقب، باب فی فضل النبی علیہ السلام

کرلوں گی یا کرلوں گا۔ اللہ نے مجھے اچھی یاداشت (memory) دی ہے۔ یہ تواضع ہے یہ نعمت کا شکر ادا کرنے کا اظہار ہے تاکہ اللہ کی اِس نعمت سے لوگوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ بندہ اپنی خوبی پہچانے گا تو ہی اُس کی ذمہ داری ادا بھی کرے گا۔ اگر اپنی خوبی سے ہی بے خبر ہے تو اُس کی ذمہ داری کیسے انجام دے گا۔ اپنی خوبی کی وجہ سے، اپنی نظروں میں بلند نہیں ہونا، فخر نہیں کرنا کہ میرے اندر یہ خوبی ہے اور میں دوسروں سے اِس وجہ سے بہتر ہوں۔ قابل تعریف اور قابلِ عزت ہوں۔ اپنی خوبی کو، اپنے وصف کو اپنا کمال نہ سمجھے، اِس کو بہت سر پر سوار نہ کرے، جتنی ہے اُس کو اتنا ہی رکھے، جیسے ہم نے بات کی کہ درمیانہ (average) ہے تو درمیانہ رکھے۔

جو مقام اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو دیا، تمام انسانوں پر فضیلت دی، اس کے باوجود آپ ﷺ نے فرمایا ''میں فخر نہیں کر رہا۔ اللہ کی طرف سے دَین ہے۔ اللہ پاک نے مجھ کو یہ مقام عطا کیا ہے۔'' خوبی کی وجہ سے اپنی نظروں میں خود بلند نہیں ہوجانا۔

عربی کی ایک کہاوت ہے کہ جولاہے کو ایک دفعہ دو رکعت نفل پڑھنے کی توفیق ہوگئی تو وحی کے انتظار میں بیٹھ گیا۔ سوچا کہ اتنا اعلیٰ عمل کرلیا ہے، اتنی بڑی نیکی کرلی اب تو مجھ پر وحی نازل ہونی چاہیے۔

جیسے کہ ہم قرآن پڑھ کر الہامی خوابوں کے انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ اب خواب کے ذریعے مجھے جنت الفردوس میں میرا مقام دکھا دیا جائے گا۔ یا ہم شکوہ کرتے ہیں کہ ہمیں تو خواب ہی نہیں آتے، کچھ پتہ ہی نہیں چلتا کہ ہم کتنے اچھے مسلمان ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کسی خوبی یا اپنے کسی عمل کو نہ اتنا بڑا سمجھیں کہ اس کو اپنے لیے طرّہِ امتیاز بنالیں اور نہ اتنا حقیر اور گھٹیا سمجھیں کہ اللہ کی ناشکری کرنے لگیں۔ انسان یہ سوچے کہ میں اس عنایت کا، اس چیز کا مستحق نہیں تھا، اللہ نے اپنے فضل اور کرم سے مجھ کو یہ عطا فرمایا ہے۔ اللہ مجھ سے یہ کام لینا چاہتا ہے تو میں کر رہا ہوں۔ میں اللہ کا غلام ہوں جو کام وہ مجھ سے لینا چاہے اس کام کی توفیق بھی وہی دے دیتا ہے۔ ہوسکتا ہے کبھی معاشرے میں بڑا ہی باعزت مقام مل جائے ہوسکتا ہے کبھی معاشرے میں بے عزتی ہوجائے۔ قبول کرلیں۔ دونوں حالتیں اللہ کی طرف سے ہیں۔ وہ مالک ہے۔ نہ عزت پر اِترانا ہے اور نہ بے عزتی پر احساسِ ذلت کا شکار ہوجانا ہے۔ دونوں کے درمیان رہنے کی ضرورت ہے۔

تکبر کا علاج:

اگر تکبر کا احساس ہوجائے تو یہ بڑا خطرناک مرض ہے، اس نے شیطان کو اپنی غلطی کا اقرار کرنے سے روک دیا اور اس میں نافرمانی کی صفت کو جنم دیا۔ فرعون کی قبولیتِ حق کی راہ میں آڑ بنا، یہاں تک کہ وہ حقارت پر اتر آیا، اس مرض کی نشاندہی اور علاج نہایت اہم ہے۔ جب دل میں اپنی بڑائی کا احساس ہو تو استغفار کیجیے، شعور کے ساتھ عاجزی کی دعا مانگیے۔ اگر کسی ایک شخص کو بھی آپ اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں تو توبہ کیجیے اور اس کے لیے دعا کیجیے۔ کبھی ذہن میں خیال آئے کہ میں یہ کام فلاں سے بہتر کرسکتا ہوں تو یہ عُجب ہے۔ فوراً استغفار کیجیے اور اس شخص کے لیے دعا کیجیے کہ اللہ اس کے درجے بلند فرمائے۔ اور نفس کُشی کے لیے وہ کام کریں جن کو آپ حقیر سمجھتے ہیں۔ مثلاً اگر اپنی گاڑی پر تکبر ہے تو کبھی کبھی رکشہ میں سواری کرلیا کریں۔ ایسی جگہ جائیں جہاں آپ کے جاننے والے آپ کو دیکھیں تاکہ یہ بُت ٹوٹ جائے۔ اور اگر آپ کے بچوں میں یہ چیز ہے تو کبھی کبھار اُنھیں بس میں یا ٹیکسی میں سفر کروائیں، اُنھیں بتائیں کہ یہ چیز بہت ضروری ہے۔ بچوں کو یہ باور کروائیں کہ بسوں، رکشوں اور ٹیکسیوں میں بھی ہماری طرح کے انسان ہی سفر کرتے ہیں۔ بچے تھوڑے بڑے ہوجائیں تو انھیں عام سواریوں کے استعمال کی بھی عادت ڈالیں۔ بچوں سے اُن کا کمرہ صاف کروائیں، کچرا دان (dust bin) خالی کروائیں، جوتیاں پالش کروائیں وغیرہ۔ نعمتوں پر اِترانا (flaunt) چھوڑ دیں۔ اپنی قیمتی چیزوں کی نمائش سے ہاتھ روک لیں۔ اپنی نعمتوں کا ذکر ہی مت کریں۔ اپنی تعریف اگر سنیں تو دعا کریں۔

((اللهُمَّ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا يَقُولُونَ، وَاغْفِرْ لِي مَا لَا يَعْلَمُونَ، وَاجْعَلْنِي خَيْرًا مِمَّا يَظُنُّونَ))(۱)

''اے اللہ تو میرا مواخذہ نہ کر جو یہ کہہ رہے ہیں اور مجھے بخش دے جس کا ان کو علم نہیں اور جیسا یہ مجھ کو سمجھتے ہیں اس سے بہتر مجھ کو بنا دے۔''

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ:

تواضع حاصل کرنے کے لیے اوّلاً عاجزی اور انکساری ضروری ہے۔ عاجزی دراصل دل اور روح کی کیفیت کا نام ہے، کسی خاص چال چلنے کا یا اُٹھنے بیٹھنے کے انداز کا نام نہیں ہے کہ انسان جھک

(۱) شعب الایمان للبیھقی، کتاب الحج، باب حفاظ اللسان

جھک کر چلے، آہستہ آہستہ چلے یا بلاوجہ کپڑوں میں پیوند لگالے جب کہ اچھے کپڑے موجود ہوں۔ اس کی چنداں ضرورت نہیں، یہ جھوٹی عاجزی (false modesty) کے زُمرے میں آتی ہے۔ عاجزی تو دل کی کیفیت کا نام ہے کہ آپ اپنے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔ اپنی ذات کے بارے میں زیادہ گفتگو مت کیجیے اور نہ دوسروں کو موقع دیں کہ وہ آپ کے بارے میں زیادہ بات کریں۔ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ذمہ داری سمجھیں اور انھیں دوسروں کے ساتھ بانٹیں۔ نعمت کے ساتھ احساس ذمہ داری بھی آجائے تو تواضع پیدا ہوتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَمَا تَوَاضَعَ أَحَدٌ لِلّٰهِ إِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ))(۱)

''جو اللہ کی خاطر تواضع اختیار کرے گا اللہ اس کو بلند فرمائے گا۔''

اللہ ہم سب کو تواضع پر قائم رہنے کی اور اسے حاصل کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور جن کا علاج ہم کرسکیں اللہ ہمیں ذریعہ بنادے کہ تکبر سے یا تذلل سے ان کو نجات دلاسکیں۔

تکبر، تذلل اور تواضع کی مثالیں:

اب آپ کو تکبر تذلل اور تواضع کی مثالیں کچھ نکات کی صورت میں دی جارہی ہیں۔ ان کا بہت سنجیدگی سے مطالعہ کریں، غور کریں۔ یہ نکات مرض کی نشاندہی کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوں گے۔ مزید یہ بھی پہچانیے کہ کیا یہ باتیں آپ اپنے اندر محسوس کرتے ہیں؟ دوسروں کے بارے میں یہ باتیں سوچنے سے آپ کو ہنسی آئے گی مگر اپنے بارے میں سوچنے سے آپ کو ہنسی نہیں آئے گی۔

☆ مجھ میں اتنی ذہانت کہاں کہ اچھے نمبر آئیں۔ (تذلل)

☆ میں خوب صورت نہیں، مجھے محبت کرنے والا شوہر یا محبت کرنے والی بیوی نہیں ملے گی۔ (تذلل)

☆ میں نے بہترین بچے پالے، بہت اچھی تربیت کی، شوہر بھی مجھ سے راضی ہے۔ میں بہت اچھی ساس ہوں، میری بہو مجھ سے بہت خوش ہے۔ (فخر)

☆ لوگ اپنے بچوں کے بارے میں بالکل بے پرواہ ہیں، نہ ان کی پڑھائی پر دھیان، نہ ادب وتربیت پر۔ میری طرح کسی نے اچھے بچے نہیں پالے۔ فلاں بہت ہی ظالم ساس ہے اپنی

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب استعجاب العفو۔۔۔

بہو سے اتنا بُرا سلوک کرتی ہے۔(تکبر)

☆ ہم تو اللہ والے ہیں ہمارا دل دکھا کر کبھی چین نہ پائیں گے۔(تکبر)۔

اس میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کچھ لوگ ایسے کہتے ہیں کہ ہم اللہ والوں کا دل دکھایا تو دیکھا، اللہ نے کیسی سزا دی۔اس بارے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اس احمق کو یہ پتہ نہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کفار نے کیسے دل دکھایا، اللہ نے ان میں سے کتنوں کو اسلام کی توفیق عطا کر دی۔ اُحد میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی شکست کا سبب بنے تھے، بعد میں اللہ نے کیسے ان کا دل کھولا۔تو ہماری کیا حیثیت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کہ ہم اس خوش فہمی کا شکار ہو جائیں کہ اگر کسی نے میرا دل دکھایا تو سزا ملے گی۔نعوذ باللہ۔یہ چیز اچھی نہیں۔

☆ نیک زندگی گزارنے کے باوجود لوگوں کے سامنے ظاہر (pretend) کرنا کہ ہم تو بڑے ہی گنہگار ہیں۔(تذلل)

☆ لوگوں سے اپنی تعریف سن کر خوشی ہوتی ہے ،اس خوشی کو بڑھنے نہیں دینا بلکہ ضبط (control) کرنے کی ضرورت ہے۔عموماً انسان اپنی رائے دیتے ہوئے گھبراتا ہے کہ لوگ بے قوف سمجھیں گے(تذلل)

☆ میں آپ کی دعوت میں ضرور آتا مگر تینوں گاڑیاں گھر میں نہیں تھیں۔(فخر)

دوسروں کی تعریف سن کر دل چاہتا ہے کہ میری تعریف ہو۔یہ ایک فطری خواہش تو ہے لیکن اس کو اللہ کی طرف لے جائیں کہ اللہ کے ہاں میری تعریف ہو۔اگر آپ اس کو منصرف (deflect) کریں گے تو آپ دیکھئے گا کہ آپ لوگوں سے کتنے غنی ہو جائیں گے۔اس لیے کہ لوگ آپ کی اتنی تعریف کر ہی نہیں سکتے جو آپ سننا چاہتے ہیں۔ہاں! اللہ کے ہاں نیک اعمال کی ،صبر کی اور نیکیوں کی تعریف کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں لگا سکتا۔

☆ دوسروں کی تعریف سن کر یہ خواہش پیدا ہونا کہ لوگ میری بھی تعریف کریں (عجب)

چھوٹے بچے بھی نئے کپڑے پہن کر،عید کے دن پوچھتے ہیں میں کیسا لگتا ہوں یا لگتی ہوں۔ یہ تو بچپن کی بات ہے بڑوں کو اگر یہ خواہش اور ارمان ہو تو یہ عجب ہوگا۔اپنا معاملہ اللہ پر چھوڑ دیں یوں دعا کریں کہ ''اے اللہ میں تیری نظروں میں قابل تعریف ہونا چاہتی ہوں۔'' اس طرح نیکیوں کی طرف رغبت ہوگی تا کہ اللہ کی رضا اور خوشی حاصل کی جائے اس سے بہت فرق پڑے گا۔لوگوں

سے توقعات رکھنا بہت مایوس کن (depress) ہوتا ہے، اداس (upset) رہتے ہیں کہ لوگ تعریف کیوں نہیں کرتے تو اپنے آپ کو اس چیز سے بے نیاز کر دیں، غنی کر دیں، یہ یقیناً مشکل ہے مگر کوشش اور ساتھ ہی اللہ سے دعا کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔

☆ کسی دلہن کے کپڑوں پر اعتراض کرنا کہ اچھا ہے مگر کسی ڈیزائنر (designer) کا نہیں لگ رہا۔ (تکبر)

☆ میری بہو کا میکہ پنجابی ہے لیکن لوگ اچھے ہیں۔ (تکبر)

یہ ''اگر'' اور ''لیکن'' اچھا رویّہ ظاہر نہیں کرتا۔ ہیں تو سندھی مگر اچھے ہیں، یعنی عموماً (generally) تو اچھے نہیں ہوتے ''مگر'' ''لیکن'' یہ اچھے مل گئے۔ یہ بہت ہی متعصّبانہ ذہنیت (prejudicial mind set) کی نشاندہی کرتا ہے، ایسی باتوں سے گریز کریں۔

☆ کوئی تنقید سن کر ہمیشہ ماننے پر تیار رہنا کہ مجھ میں ضرور عیب ہوگا۔ (تذلل)

☆ اپنی غلطی پر معافی (sorry) مانگنا یا غلطی کا اعتراف کرنا مشکل لگتا ہے (تکبر)

☆ آج کل تہجد کے لیے اٹھتا ہوں تو پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے (فخر)

بعض لوگ ہر چیز میں اپنے آپ کو رول ماڈل بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اچھی بیوی دیکھنی ہے تو مجھے دیکھو، اچھی بیٹی بننا ہے تو مجھ سے سیکھو۔ میں اچھی بہو بھی تھی اور ساس بھی مجھ جیسی کوئی نہیں۔ مجھ سے سبق سیکھو، میرے نقش قدم پر چلو، میری بات پلے باندھ لو کبھی نقصان نہیں اٹھاؤ گے۔

☆ وہ اپنے آپ کو پتہ نہیں کیا سمجھتی ہے۔ (تکبر)

☆ اپنی تعریف سن کر اللہ یاد آتا ہے اور اس بات کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ میرا ذاتی کمال نہیں۔ (تواضع)

☆ میں نے فلاں ڈِش (dish) پکائی تھی لوگ تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ (تکبر)

☆ نئی ڈِشز (dishes) آزماتے ہوئے گھبرانا کہ میرے ہاتھ میں ذائقہ نہیں یا مجھ سے نہیں بن سکے گی۔ (تذلل)

☆ اپنی صلاحیتوں کو جاننے پہچاننے کی کوشش کرنا تاکہ ان کا حق ادا کر سکوں۔ (تواضع)

☆ اکثر کام ادھورا چھوڑ دیتا ہوں یا ذمہ داری لیتے ہوئے گھبراتا ہوں۔ (تذلل)

☆ اتنا بڑا کام سرانجام دینا ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ (تکبر)

☆ گھر سجانے میں یا کپڑے سلوانے میں مجھے اپنے ذوق (taste) پر بالکل اعتماد نہیں۔ (تذلل)

☆ دینی علم نہ رکھنے والوں کو کمتر سمجھنا۔ (تکبر)

☆ کسی بھی کام کو اپنی عزت کے خلاف نہ سمجھنا۔ (تواضع)

غریب رشتہ داروں سے ملنے جانا مشکل ہوجاتا ہے۔ تمام گلیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں۔ یا وہاں جا کر کپڑے سمیٹ کر بیٹھنا۔ کچھ لوگ چلے تو جاتے ہیں مگر لگتا ہے کہ سخت مشکل میں ہیں اور یوں برتاؤ (behave) کرتے ہیں جیسے بُلانے والوں پر احسان کیا ہے۔

☆ کہاں بیٹھیں کوئی ڈھنگ کی بیٹھنے کی جگہ ہی نہیں۔ (تکبر)

☆ لوگوں سے گھلنے ملنے میں گھبراہٹ ہوتی ہے۔ (تذلل)

☆ اپنے بارے میں گفتگو کرنا اچھا نہیں لگتا نہ یہ پسند ہے کہ لوگ مجھے گفتگو کا موضوع بنائیں۔ (تواضع)

اب علاج یہ ہے کہ ان تمام نکات (statements) کا جواب ہاں یا نہ میں دے کر غور کریں کہ آپ کسی عارضے میں مبتلا تو نہیں۔

ریاکاری

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الصِّحَّۃَ وَالْعِفَّۃَ وَالْاَمَانَۃَ وَحُسْنَ الْخُلُقِ وَالرِّضَا بِالْقَدْرِ))(۱)

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی))(۲)

((اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَآءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ))(۳)

''ریا'' کا لفظ رَأیٰ سے بنا ہے جس کے معنی دیکھنا ہیں۔ یعنی ریاکاری کا مطلب ہے یہ چاہنا کہ لوگ میرا عمل دیکھیں۔ ''سُمعہ'' سماعت سے بنا ہے، مراد ہے ''سننا'' یعنی کوئی عمل یا نیکی کر کے چاہنا کہ لوگوں کو میری اچھائیوں کے بارے میں پتہ چلے۔ ریاکاری انسان کو نفاق کی طرف لے جاتی ہے، دیکھا جائے تو ریاکاری کا تعلق ''نفاق'' سے ہے اور نفاق سے بڑھ کر تو کوئی دل کا مرض ہو نہیں سکتا۔ نفاق کو سمجھنے کے لیے، ہم مزید چند موضوعات پر گفتگو کریں گے تاکہ ہم نفاق کا احاطہ (grip) کر سکیں۔ سردست ہم ریاکاری پر بات کریں گے۔

منافقوں کے بارے میں قرآن حکیم کی سورۂ نساء میں ذکر ملتا ہے:

{وَ اِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی ۙ یُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَ لَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا} (النساء: ۱۴۲)

''جب یہ منافق نماز کی طرف آتے ہیں تو بہت سستی کے ساتھ آتے ہیں، صرف لوگوں کو دکھانے کو اور اللہ کو یاد ہی نہیں کرتے مگر بہت کم۔''

اس آیت میں ان کی نمازوں کا حال بیان ہوا ہے کہ وہ اللہ کی محبت میں نماز نہیں پڑھتے۔ اگر اُن کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو ہرگز نماز نہ پڑھیں گے، کیوں کہ یہ لوگوں کو دکھانے کے لیے نماز پڑھتے ہیں، تاکہ لوگ اُن سے مرعوب ہوں اور صاحبِ ایمان سمجھیں۔ اس ضمن میں سورۂ ماعون میں بہت سخت آیات نازل ہوئی ہیں:

{اَلَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ اَلَّذِیْنَ ھُمْ یُرَآءُوْنَ} (الماعون: ۶، ۵)

---

(۱) شعب الایمان للبیھقی، کتاب حسن الخلق، فصل فی الحلم والتؤدۃ۔۔۔

(۲) صحیح مسلم، کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ، بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلَ۔۔۔

(۳) کنز العمال فی سنن الاقوال والأفعال، کتاب الدعاء، الفصل السادس جوامع الأدعیۃ۔۔۔

''(جہنم میں جانے والے وہ ہیں) جو اپنی نمازوں سے غفلت برتتے ہیں۔ وہ لوگ جو دکھاوا کرتے ہیں۔''

اس مقام پر بھی نماز میں ریا کاری کا ذکر آیا کہ اُن کے دل نماز نہیں پڑھنا چاہتے مگر دکھاوے کے لیے کچھ نہ کچھ عمل کر لیتے ہیں۔ البتہ اُن کی عبادات کے پیچھے اللہ کی محبت کا جذبہ کارفرما نہیں ہوتا۔

ابن ماجہ میں حدیث مبارکہ ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ یَسِیرَ الرِّیَاءِ شِرْكٌ))(۱)

''بے شک تھوڑی سی ریا بھی شرک ہے۔''

مسند احمد میں حدیث مبارکہ ہے:

((مَنْ صَلَّى يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ صَامَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِي فَقَدْ أَشْرَكَ))(۲)

''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی وہ تو شرک کر چکا، اور جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا وہ شرک کر چکا اور جس نے دکھاوے کی خیرات دی، دکھاوے کا صدقہ کیا، وہ تو شرک کر چکا۔''

اس کے علاوہ نبی اکرم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((اِنَّ أَخْوَفَ مَا أَخَافُ عَلَيْكُمُ الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ وَمَا الشِّرْكُ الْأَصْغَرُ قَالَ الرِّيَاءُ))(۳)

''(اے مسلمانو!) مجھے تمہارے بارے میں جس چیز کا سب سے زیادہ خوف ہے وہ شرک اصغر ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا شرک اصغر کیا ہوتا ہے اے اللہ کے رسول ﷺ؟ آپ نے فرمایا ''ریا کرنا'' یعنی دکھاوا کرنا۔

سُمعہ:

اب اس لفظ ''سمعہ'' کو اچھی طرح پہچان لیجیے۔ اس میں انسان کی نیت، اس کا ارادہ، اس کا مطلوب، اُس کی چاہت یہ ہوتی ہے کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو۔ تاکہ اُس کو ذاتی بڑائی (celebrity status) اور اہمیت مل سکے، لوگ اس کو پہچاننے لگیں، لوگوں میں اُس کا ذکر ہو، یعنی اپنی ذاتی عظمت کے چرچے سننے کا شوق ہوتا ہے اور ذاتی تعریف کی طلب ہوتی ہے۔ وہ تمام

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، بَاب مَنْ تُرْجَى لَهُ السَّلَامَةُ مِنَ الْفِتَنِ

(۲) مسند أحمد، مسند الشاميين، حديث شداد بن اوس رضی اللہ عنہ

(۳) مسند أحمد، مسند الانصار، حديث محمود بن لبيد رضی اللہ عنہ

اعمال بس یہی سننے کو کرتا ہے کہ اس شخص کا تو بڑا چرچا ہے، ہر محفل میں اس کا ذکر ہوتا ہے، اس کو کون نہیں جانتا وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک ریاکاری کا تعلق ہے، اس میں لوگ ہر کام دوسروں کو دکھانے کے لیے کرتے ہیں۔ ان کی نیت اور مطلوب یہ بات ہوتی ہے کہ لوگ اِن کو عبادت کرتے ہوئے دیکھیں، ان سے مرعوب ہوں اور ان کو متقی اور پارسا سمجھیں اور انکے گرویدہ ہو جائیں۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی عبادت کا، اپنی نیکیوں کا اور دین کے راستے میں جو بھی محنت کی ہوتی ہے اس کا نقد صلہ دنیا میں چاہتے ہیں۔ ان کا ارادہ و نیت محض دنیا کی طلب ہوتا ہے۔ اس بارے میں بخاری اور مسلم میں حدیث مبارکہ موجود ہے۔ حضرت جندب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، کہتے ہیں کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ سَمَّعَ سَمَّعَ اللهُ بِهِ))(۱)

''جو سنانے کے لیے کام کرے گا، اللہ اس کو سنوا دے گا''

یعنی جس کو اپنی تعریف سننے کا شوق ہوگا، اللہ اس کا شوق پورا کر دے گا، خوب واہ واہ ہوگی۔ اور جو دکھاوے کے لیے کام کرے گا، اللہ اُس کے اعمال دنیا پر ظاہر کر دے گا، اُس کی یہ تمنا، یہ خواہش، یہ طلب پوری کر دے گا۔ لیکن پھر سوچ لے کہ آخرت میں اس کا کیا انجام ہوگا۔ اگر سب کچھ یہاں لوگوں میں لٹا دیا، لوگوں کی تعریف سمیٹنے میں خرچ کر دیا تو اللہ کے ہاں فروخت کرنے کو کچھ نہ بچے گا، تہی دست و تہی دامن ہی ہوگا۔ یہی اس حدیث کا مطلب ہے کہ اگر کوئی شخص نیک اعمال محض شہرت کی خاطر کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو شہرت دیدے گا۔

ریاکاری کی نشانیاں:

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ریاکار کی تین نمایاں نشانیاں ہوتی ہیں۔ (Three prominent characteristics) (1) تنہائی میں سست اور لوگوں کے درمیان چست رہتا ہے۔ مثلاً جب خلوت میں ہوتا ہے تو نماز پڑھنے کا دل نہیں چاہتا، بلکہ پڑھتا ہی نہیں لیکن جب لوگوں میں ہوتا ہے تو عبادت میں خوب تیزی دکھائے گا۔ (2) لوگوں سے مسکرا کر ملتا ہے، تاکہ لوگ اُس کی وجاہت سے متاثر ہوں، جب لوگ اُس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو اس کی دلی تمنا پوری ہو رہی ہوتی ہے اس لیے بہت خوش ہوتا ہے۔ (3) تیسری پہچان یہ ہے کہ اپنی تعریف سن کر زیادہ عمل کرتا ہے۔ اگر وہ اپنی تعریف سنے، کوئی واہ واہ کرے تو زیادہ عمل کرتا ہے، یا تنقید سن کر عمل کم کر دیتا ہے۔ مثلاً

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الریاء و السمعة

کسی نے کہا آپ حجاب پہن کر بہت پیاری (graceful) لگتی ہیں تو پہننا شروع کر دیا اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ آپ حجاب پہن کر بالکل مائی لگتی ہیں، عمر زیادہ لگتی ہے تو اُتار پھینکا۔ ان مثالوں کو، ان چیزوں کو خود پر اطلاق (relate) کرنے کی کوشش کریں۔ اسی طرح اگر کسی نے ہمارے قرآن پڑھنے پڑھانے کی تعریف کی تو جوش وخروش سے مزید پڑھنا پڑھانا شروع کر دیا۔ اور اگر کسی نے کہہ دیا کہ تم وقت (time) ضائع کر رہے ہو تو بددل ہو کر چھوڑ دیا۔ یہ ریا کار کی علامات ہیں۔

یا پھر کسی قرآن کے طالب علم نے ترجمہ یاد کیا، نمبر بہت اچھے آئے تو خوب شوق سے اگلے امتحان (test) کی تیاریاں شروع کر دیں، اور اگر فیل ہو گیا یا خراب نمبر آئے تو دل ہار دیا، سب چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ یہ علامات اُس شخص کی ہیں جو دوسروں کو دکھانے کے لیے عمل کرتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ جو دوسروں کی تعریف وتنقید کی بنیاد پر فیصلہ کرے وہ پھر اللہ کی خاطر تو کام نہیں کر رہا۔ وہ تو اپنے نفس کی خاطر، اپنی تعریف سننے آیا ہے۔ جب تک تعریفیں ہوتی رہیں گی اللہ کے لیے کام کرتا رہے گا۔ جب تنقید ہوگی، حالات ناگوار ہوں گے، وہ میدان چھوڑ کر بھاگ جائے گا۔

{يَنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ} (البقرۃ:۱۴۳)

''اپنی ایڑیوں پر گھوم جائے گا۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ بیچ محفل میں غمزدہ شکل بنا کر، گردن جھکائے بیٹھا ہے، بہت پریشان اور افسردہ چہرہ بنایا ہوا ہے تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے ٹیڑھی گردن والے، اس گردن کو سیدھا کر لے۔ خشوع کا مقام دل ہے نہ کہ گردن۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ تربیت کا اتنا خیال رکھتے تھے ورنہ کیا ضرورت تھی کسی کو ٹوکنے کی، یہ بھی سوچ سکتے تھے کہ بُرا مان جائے گا۔ لیکن وہ استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ اُن کی ذمہ داری تھی کہ اُمت کی اصلاح کا خیال رکھیں۔ وہ خلیفۂ وقت تھے۔ ظاہر اور باطن دونوں کی حفاظت کرنا، انہوں نے اپنی ذمہ داری سمجھا ہوا تھا۔ لہٰذا ریا کاری کی چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی برداشت نہیں کرتے تھے، ایسا نہ ہو یہ چیز اس کو آخرت میں لے ڈوبے۔

ہر ریا کار اداکار ہوتا ہے۔ اداکاری (acting) کر رہا ہوتا ہے، نیک بننے کا ڈھونگ رچا رہا ہوتا ہے۔ لوگوں کے سامنے ظاہر (pretend) کرتا ہے کہ میرے دل میں بہت تقویٰ ہے، حالانکہ ہوتا نہیں ہے، دل اللہ کی محبت سے خالی اور مخلوق میں مشغول ہوتا ہے۔ مخلوق کی عظمت ہوتی ہے، خالق کی فکر سے خالی اور مخلوق کے ساتھ مشغول۔ حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ''جب کوئی ریا

کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وہ دیکھو میرا یہ بندہ کس طرح میرا ہی مذاق اڑا رہا ہے۔'' تو ریا کاری انتہائی خوفناک چیز ہے۔اس سے حتی الامکان بچنے کی ضرورت ہے۔

ریا کاری کے مختلف انداز:

مختلف طریقوں سے لوگ ریا کاری کرتے ہیں۔کبھی جسم سے اظہار کرتے ہیں،کبھی لباس سے،کبھی گفتگو سے۔جسم سے ریا کاری کا اظہار دو طرح سے ہوتا ہے۔ایک جھوٹی ریا کاری اور دوسری محض ریا کاری۔مثال کے طور پر رمضان ہے روزہ نہیں رکھا لیکن لوگوں کے سامنے شکل ایسی بنائی جیسے روزے سے ہیں۔یہ ریا کاری ہے اور جھوٹ بھی ہے۔دوسری صورت یہ ہے کہ نفلی روزہ رکھا اور شکل صورت ایسی بنائی کہ دیکھنے والا سمجھ جائے کہ یہ شخص روزے سے ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''کیمیائے سعادت'' میں تفصیل کے ساتھ ریا کا ذکر کیا ہے۔ فرمایا ہونٹوں کو اتنا رگڑنا کہ اُن پر پپڑیاں جم جائیں،ہونٹ خشک ہو جائیں،کچھ کہنے کی ضرورت نہ پیش آئے،خود ہی لوگ سمجھ جائیں کہ اِن کا روزہ ہے۔یا بیٹھے بیٹھے اپنے اوپر غنودگی طاری کرنا،تاکہ سب سمجھیں کہ بڑے شب بیداری کرنے والے ہیں۔راتوں کو جاگتے ہیں،تہجّد میں اُٹھتے ہیں تبھی تو نیند کے جھونکے آرہے ہیں۔یہ جسم کی ریا کاری ہے۔

خرچ کرنے میں ریاکاری:

خرچ کرنے میں ریا کاری یہ ہے کہ اللہ کے نام پر جو دیں گے دکھا کر دیں گے۔چیک (cheque) دیا تو سب کے سامنے دیا اور میڈیا کو بھی بلا لیا تاکہ تصویریں چھپ جائیں یا براہِ راست (live coverage) چینل پر آجائے۔ایسی تصویریں ہم روز اخباروں اور TV پر دیکھتے رہتے ہیں۔یتیم خانے میں،ہسپتال میں یا اسکول میں عطیہ (donation) دیا تو وہاں اپنے نام کی تختی (plate) ضرور لگوائی تاکہ لوگوں کو پتہ چلے کہ فلاں صاحب نے اتنا عطیہ (donation) دیا ہے۔ان تمام نیک کاموں کے پیچھے اگر دکھاوے کا جذبہ کارفرما ہے تو پھر یہ ریا کاری ہے۔البتہ اگر کسی کی محبت میں،قلبی تعلق کی وجہ سے،اُس کی تعظیم میں نام رکھ رہے ہیں،ریا کاری مقصود نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں ہے۔لیکن اپنے نام پر کہیں اسکول یا ہسپتال یا ڈسپنسری وغیرہ کھلوانا کہ پتہ چلے کہ میں نے یہ کام کیا ہے میرا نام مشہور ہو،یہ ریا کاری ہے۔

لباس میں ریاکاری:

لباس میں ریا کاری یہ ہے کہ وسعت کے باوجود انتہائی حقیر اور معمولی لباس پہننا کہ لوگ

سمجھیں کہ بہت اللہ والے ہیں، زاہد ہیں، پرہیز گار ہیں، دنیا سے بے نیاز ہیں۔ اس معاملے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے جس باریک بینی سے کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ اُن کو اس کا اجر دے۔ وہ لکھتے ہیں کہ کچھ لوگ ہمارے زمانے میں ایسے ہیں کہ ان کا آنا جانا عوام میں بھی ہے اور بادشاہوں میں بھی ہے۔ اب وہ بادشاہوں کی نظروں میں بھی جچنا چاہتے ہیں اور عوام میں بھی اپنے زہد کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں۔ تو کیسا لباس پہنیں؟ اگر اعلیٰ لباس پہنیں گے تو عوام کی نظروں سے گریں گے اور اگر معمولی لباس پہنیں گے تو بادشاہوں کی نظروں میں باحیثیت نہیں رہ پائیں گے۔ تو وہ قیمتی مگر سادہ لباس پہنتے ہیں کہ عوام جب دیکھیں تو پہچان نہ پائیں کہ کتنا قیمتی ہے، ظاہری سادگی سے دھوکہ کھا جائیں اور بادشاہ اس لباس کی قدر پہچان جائیں اور جان لیں کہ لباس بہت قیمتی ہے۔ اس طرح یہ ریاکار لوگ دونوں طبقات کے منظورِ نظر رہتے ہیں، محل میں بھی قابلِ قبول اور عوام الناس بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ غرباء ان کی سادگی دیکھ کر زاہد سمجھتے ہیں اور امراء لباس دیکھ کر اپنی ٹکر اور پلّے کے سمجھتے ہیں۔ یہ ہے لباس کی ریاکاری۔

گناہوں پر افسوس کرنے میں ریاکاری:

باتوں میں ریاکاری کرنا بھی ایک مہلک کام ہے، دل دکھنے کی وجہ سے۔ تقویٰ کی وجہ سے نہیں بلکہ اداکاری کرتے ہوئے، مصنوعی طور پر (artificially) گناہوں پر افسوس کا اظہار کرنا، واویلا مچانا، لوگوں کے بیچ میں بیٹھ کر اپنے آپ کو حقیر، فقیر، خطاکار اور گنہگار کہنا، اپنے آپ کو جہنمی کہنا، تاکہ لوگ کہیں کہ نہیں آپ تو بہت نیک ہیں، لوگوں سے اپنی تعریف کروانا۔ اگر یہ واقعی اپنے آپ کو حقیر، گنہگار، خطاکار سمجھتا تو لوگوں کے سامنے کبھی بھی اعلانیہ نہ کہتا، چھپا کر رکھتا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اگر کوئی واقعتاً گنہگار اس طرح کی ریاکاری کرے اور لوگ اُسے کہہ دیں کہ واقعی آپ بڑے گنہگار ہیں، ہمیں آپ کی آخرت کی بڑی فکر ہے اور ہمیں بھی خطرہ ہے کہ آپ جہنم میں نہ چلے جائیں تو وہ بُرا مان جائے گا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ میں اپنے آپ کو خطاکار، گنہگار کہتا رہوں اور لوگ مجھے نیک، پاکباز اور پارسا کہتے رہیں۔

محفل اور تنہائی کی نماز وغیرہ:

محفل میں نماز پڑھے گا تو بہت ٹھہر ٹھہر کر، طویل قیام، لمبے لمبے سجدے، لمبے رکوع کرے گا۔ محفل میں قرآن پڑھے گا تو بہترین تجوید کے ساتھ، مخارج بھی درست، سارے اصول بھی درست، اس لیے کہ لوگ عابد سمجھیں۔ اور تنہائی میں نماز پڑھتا ہے تو ٹکریں مارتا ہے، اُٹھک بیٹھک کرتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں ایک حدیث ہے، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ایک دفعہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے نکل کر ہمارے پاس تشریف لائے۔ اس وقت ہم آپس میں مسیح دجال کا تذکرہ کررہے تھے۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے کہا کہ:

((أَلَا أُخْبِرُكُمْ بِمَا هُوَ أَخْوَفُ عَلَيْكُمْ عِنْدِي مِنَ الْمَسِيحِ الدَّجَّالِ قَالَ قُلْنَا بَلَى فَقَالَ الشِّرْكُ الْخَفِيُّ أَنْ يَقُومَ الرَّجُلُ يُصَلِّي فَيُزَيِّنُ صَلَاتَهُ لِمَا يَرَى مِنْ نَظَرِ رَجُلٍ))(۱)

''میں تمہیں وہ چیز بتاؤں جو میرے نزدیک تمہارے لیے دجال سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ ہم نے عرض کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ضرور بتلائیے وہ کیا چیز ہے؟ فرمایا ''وہ شرک خفی ہے، جس کی مثال یہ ہے کہ آدمی نماز پڑھنے کے لیے کھڑا ہو، پھر اپنی نماز کو اس لیے لمبا کردے کہ کوئی آدمی اس کو نماز پڑھتا دیکھ رہا ہے۔''

فرض کریں ایک شخص عام طور پر ۵ سیکنڈ کا سجدہ کرتا ہے لیکن اُس نے محسوس کیا کوئی مجھے دیکھ رہا ہے تو اب اُس نے ۵ سیکنڈ کے بجائے ۸ سیکنڈ کا سجدہ کیا۔ تو جو ۳ سیکنڈ اس نے زیادہ سجدہ میں لگائے وہ یقیناً اللہ کے لیے نہیں تھے۔ لہٰذا سجدے کے اندر اللہ کے ساتھ کوئی اور شریک ہوگیا۔ یہی تو شرک ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کرلیا جائے اور اللہ کے سوا کسی اور کو بھی دِکھانا مقصود ہو۔ پھر شرک ریاکاری کے ذریعے بھی آجاتا ہے۔

ریا کی ایک اور علامت:

ریاکار کی ایک اور علامت یہ ہوتی ہے کہ اپنے عیوب پر شرمندہ نہیں ہوتا، اپنے گناہ پر ندامت محسوس نہیں کرتا، نادم نہیں ہوتا۔ نہ اُس کو ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے، نہ اصلاح کرتا ہے بلکہ اس کو چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ دیکھئے! گناہ چھپانے کی تو ہمیں ترغیب دی گئی ہے، حکم ہے کہ اپنے گناہوں کا اعلان مت کرو، چرچا مت کرو۔ اگر کوئی اس لیے اپنے گناہ چھپاتا ہے تو یہ ریاکاری نہ ہوگی۔ لیکن ساتھ ساتھ وہ اللہ کے سامنے بھی اپنے کیے پر نادم اور شرمندہ ہے۔ ایسے شخص کے گناہ چھپانے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کی ہمت افزائی نہ ہو، وہ بھی اس کو اختیار نہ کرلیں یا لوگ مجھے بُرا نہ سمجھیں۔ اپنے گناہوں کو تو وہ یقیناً بُرا سمجھتا ہے، اصلاح بھی کرتا ہے، عیب کو دُور کرنے کی کوشش بھی کرتا ہے، دوبارہ دہرانے سے توبہ کرتا ہے اور اللہ سے استغفار کرتا ہے۔ لیکن ریاکار نہ استغفار کرتا

(۱) سنن ابن ماجه، كِتَاب الزُّهْد، بَاب الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ

ہے اور نہ گناہ کو بُرا سمجھ رہا ہوتا ہے، اپنے فعل کو گناہ گردانتا ہی نہیں چہ جائیکہ اللہ کے سامنے شرمندہ اور نادم ہوتا۔ یہ صرف اس لیے چھپاتا ہے کہ میری نیکی کا بھرم نہ کھل جائے اور میں لوگوں کی نظروں سے نہ گر جاؤں۔ وہ اس لیے اپنے عیب لوگوں سے چھپانے کی پوری کوشش کرتا ہے۔

ریا کے سہارے کوئی عمل قبول نہیں:

ریا کاری کے ساتھ کوئی نیکی، کوئی عمل، کوئی اچھائی، اللہ کے ہاں قبول نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ ریا کار اللہ کو دھوکا دے رہا ہوتا ہے۔ وہ کہتا تو ہے کہ اللہ کے لیے کر رہا ہوں لیکن اصل میں اپنی شہرت کے لیے نیکیاں کر رہا ہوتا ہے۔ ریا کار کی مثال کسی ایسے تاجر کی سی ہے جو بیک وقت دو لوگوں کو اپنی واحد شے بیچ دے۔ ایک گاہک کو متاع دے کر اُس سے قیمت وصول کر لے اور اگلے گاہک سے بھی اُسی مال کے عوض قیمت وصول کرنا چاہے۔ تو بکا ہوا مال تو کوئی نہیں خریدتا یہ تو دوسرے خریدار کو اُس نے دھوکہ دے دیا۔ تو ریا کار ایسا ہی ہے کہ یہ لوگوں کے ہاتھ اپنی تعریف اور شہرت کی خاطر، سب نیکیاں بیچ دیتا ہے اور پھر اللہ سے بھی امید رکھتا ہے کہ اللہ بھی میرا یہ بکا ہوا مال خرید لے اور مجھے جنت دیدے۔ لیکن اللہ تو ایسا مال نہیں قبول کرتا۔ ہم کسی دکان میں جائیں اور دکان میں کسی سوٹ پر ناقابلِ خرید (sold tag) کی پرچی لگی ہو تو ہم تو اس چیز کو نہیں خریدتے۔ تو یہ ریا کار اپنے سب اعمال کا سودا لوگوں سے کر چکا ہوتا ہے تو اللہ کے ہاں اس کے کسی عمل کا کوئی اجر نہیں۔

حضرت ابوسعید بن فضالہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ:

((إِذَا جَمَعَ اللهُ النَّاسَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ نَادَى مُنَادٍ مَنْ كَانَ أَشْرَكَ فِي عَمَلٍ عَمِلَهُ لِلّٰهِ أَحَدًا فَلْيَطْلُبْ ثَوَابَهُ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللهِ فَإِنَّ اللهَ أَغْنَى الشُّرَكَاءِ عَنْ الشِّرْكِ)(۱)

”جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں سب انسانوں کو جمع کرے گا تو ایک مُنادی یہ اعلان کرے گا کہ جس شخص نے اپنے کسی عمل میں، اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شریک کیا تھا وہ اس کا ثواب اس دوسرے سے جا کر لے لے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ سب شرکاء سے زیادہ بے نیاز ہے کہ اُس کے ساتھ شرک کیا جائے۔“

مسلم کی ایک حدیث مبارکہ میں یہ مضمون آتا ہے کہ:

((قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى أَنَا أَغْنَى

(۱) جامع الترمذی، کِتَاب تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَاب وَمِنْ سُورَةِ الْكَهْف

((اَلشُّرَكَاءِ عَنِ الشِّرْكِ مَنْ عَمِلَ عَمَلًا أَشْرَكَ فِيهِ مَعِي غَيْرِي تَرَكْتُهُ وَشِرْكَهُ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ کی رضا اور رحمت کے علاوہ کسی اور سے کچھ حاصل کرنے کی جو خواہش رکھے تو اللہ اس کو اور اس کے شرک دونوں کو چھوڑ دیتا ہے۔''

ترمذی کی ایک اور حدیث مبارکہ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَعَوَّذُوا بِاللهِ مِنْ جُبِّ الْحَزَنِ قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ وَمَا جُبُّ الْحَزَنِ قَالَ وَادٍ فِي جَهَنَّمَ تَتَعَوَّذُ مِنْهُ جَهَنَّمُ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ قُلْنَا يَا رَسُولَ اللهِ وَمَنْ يَدْخُلُهُ قَالَ الْقُرَّاءُ الْمُرَاءُونَ بِأَعْمَالِهِمْ)) (۲)

تم لوگ غم کی خندق سے پناہ مانگا کرو۔ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا ''یا رسول اللہ غم کی خندق کیا چیز ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جہنم میں ایک وادی یا خندق ہے جس کا حال اتنا بُرا ہے کہ خود جہنم دن میں سو مرتبہ اس سے پناہ مانگتی ہے۔ عرض کیا گیا یا رسول اللہ اس میں کون لوگ جائیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''وہ عبادت گزار یا وہ زیادہ قرآن پڑھنے والے جو دوسروں کو دکھانے کے لیے یہ اعمال کرتے تھے۔''

تو یہ غیر شعوری طور پر جو ریا آجاتی ہے اس سے بچنے کے لیے اللہ کی پناہ تلاش کریں۔ شعوری طور پر تو خیر انسان پہچان لے گا کہ ریا کاری ہو رہی ہے اپنی اصلاح کر لے گا، لیکن اگر اس کو شعور ہی نہیں کہ یہ کام ریا کاری میں شامل ہے، یا میں یہ کر کے اور یہ کہہ کر ریا کاری کا مرتکب ہو رہا ہوں یا ہو رہی ہوں تو اللہ کے علاہ اور کون ہمیں بچائے گا۔ ایک دُعا یہ بھی ہے:

((اَللّٰهُمَّ رَحْمَتَكَ اَرْجُوْ فَلَا تَكِلْنِيْ اِلٰى نَفْسِيْ طَرْفَةَ عَيْنٍ وَّاَصْلِحْ لِيْ شَاْنِيْ كُلَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ)) (۳)

''اے اللہ میں تیری رحمت کا اُمیدوار ہوں۔ پس ایک لمحے کے لیے بھی مجھے میرے نفس کے حوالے نہ کر اور میرے سارے کام تو سنوار دے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔''

تو انسان اللہ سے اپنا تعلق جوڑے، اللہ سے قریب ہو، اپنے اندر اللہ کی محبت پیدا کرے۔

ایک اور دعا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مانگا کرتے تھے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزھد و الرقائق، من اشرک فی عملہ غیر اللہ

(۲) جامع الترمذی، کِتَاب الزُّهْدِ، بَاب مَا جَاءَ فِي الرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب مایقول اذا اصبح

((اَللّٰھُمَّ طَھِّرْ قَلْبِیْ مِنَ النِّفَاقِ وَعَمَلِیْ مِنَ الرِّیَآءِ وَلِسَانِیْ مِنَ الْکَذِبِ وَعَیْنِیْ مِنَ الْخِیَانَۃِ فَاِنَّکَ تَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ))(۱)

''اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو ریا ونمود سے، میری زبان کو جھوٹ سے، اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک کردے۔ بے شک تو آنکھوں کی خیانت اور دلوں کی چھپی باتوں کو جانتا ہے۔''

ریا کا تعلق نیت سے ہے:

سُمعہ و ریا کا تعلق نیت سے ہے۔ دکھاوا (display) کرنے کی نیت ہو، اکڑفوں (flaunt) کرنے کی نیت ہو اور پھر کوئی کام کیا جائے تو پھر وہ ریا کاری ہوگی۔ اب اگر کوئی شخص دوسروں کو ترغیب (encourage) دینے کے لیے کوئی اچھا کام ظاہراً کرتا ہے تو یہ ریا کاری نہ ہوگی، کہ لوگوں کی بھی ہمت افزائی ہو اور وہ اس آدمی سے اثر (inspiration) لیں اور اچھے کاموں میں لگ جائیں۔ یہ ایک اچھا نمونہ پیش کرنا ہوگا۔ پھر سکھانے کے لیے اگر کوئی عمل کرتا ہے کہ لوگ صحیح (proper) طریقہ سیکھ جائیں۔ یہ بھی ریا میں نہیں آئے گا۔

پھر دشمن پر رُعب ڈالنے کے لیے کوئی دکھاوے کا سا انداز اختیار کرتا ہے تو یہ بھی ریا نہ ہوگی بلکہ یہ دشمن کے خلاف ایک چال شمار کی جائے گی۔ اُس پر نفسیاتی دباؤ شمار کیا جائے گا، تاکہ اس کے دل کے اندر مسلمانوں کا رُعب پیدا ہو۔ یہ اُس کی عبادت ہوگی۔ ریا کاری نہ ہوگی۔ حضرت ابودُجانہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ غزوۂ اُحد میں جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنی تلوار عطا فرمائی تو انہوں نے تلوار ہاتھ میں لی، سر پر لال رومال باندھا اور تلوار لے کر وہ اکڑ کر چلنے لگے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھ کر فرمایا ''اللہ تعالیٰ کو یہ چال پسند نہیں ہے، مگر اِس موقع پر پسند ہے اس لیے کہ ان کا رعب دشمن پر پڑ رہا ہے۔''

سورۃ الانفال آیت نمبر ۶۰ میں آتا ہے:

{وَ اَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَ عَدُوَّکُمْ}

''کہ تم جتنی استطاعت رکھتے ہو تم جنگی ساز وسامان تیار کر کے رکھو، تاکہ اللہ کے دشمن اور تمہارے دشمن کے دل میں تمہارا رُعب پیدا ہو جائے۔''

---

(۱) کنز العمال فی سنن الاقوال والأفعال، کتاب الدعا، الفصل السادس جوامع الأدعیة

تو اپنی چیزوں کی نمائش کرنا، دکھاوا کرنا، کہ دشمن ڈر جائے، دشمن اِسلام سے مرعوب ہو جائے۔ یہ جائز ہے یہ دکھاوا نہ ہوگا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں یہ ہوا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ریا اور شہرت کی طلب کے بارے اتنا کچھ ارشاد فرمایا تو صحابہ رضی اللہ عنہم بہت ڈر گئے۔ پھر یہ ہونے لگا کہ اگر کسی کے نیک عمل کے بارے میں لوگوں کو پتہ چل جاتا تھا اور کسی کی نیکی کا چرچا ہونے لگتا تھا اور لوگ اللہ کا نیک بندہ سمجھ کر اس شخص سے محبت کرنے لگتے تو وہ ڈر جاتا تھا کہ شاید ریا کاری ہوگئی ہے اور اب اللہ کے ہاں اس کا یہ عمل قبول نہ ہوگا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا: اس شخص کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا خیال ہے جو اچھا عمل کرتا ہو اور لوگ اس کی تعریف کرتے ہوں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''یہ تو مومن کے لیے دنیا میں نقد بشارت ہے۔'' یعنی پیشن گوئی ہے کہ اللہ نے اس کا یہ عمل قبول فرمالیا۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ایک دفعہ گھر میں نماز پڑھ رہے تھے۔ ایک آدمی آیا اور اس نے نماز پڑھتے دیکھ لیا۔ تو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرے دل میں خوشی پیدا ہوئی کہ اس شخص نے مجھے نماز جیسے اچھے کام میں مشغول پایا، پھر پریشانی ہوئی کہ کہیں ریا تو نہیں ہوگئی۔ پھر انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ذکر کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: یہ ریا نہیں ہے تم کو اس صورت میں تنہائی میں عبادت کا ثواب بھی ملے گا اور لوگوں کے سامنے عبادت کا اجر بھی ملے گا۔

یہ ریا کیوں نہ ہوئی؟ فرق کس چیز کا ہے؟ ارادے کا، تمنا اور چاہت کا فرق ہے، نیت کا فرق ہے، خود نہیں چاہا، خود ہی اللہ کی طرف سے ایسی صورتحال پیدا ہوگئی تو وہ پھر ریا میں شمار نہ ہوگی۔

ریا کا علاج:

اب اگر کسی کو محسوس ہوتا ہے کہ میرے اندر ریا ہے تو اس کا علاج کیا ہے؟ علاج یہ ہے کہ اپنے اندر اخلاص پیدا کرنے کی کوشش کرے اور اپنے بارے میں ایسی باتیں نہ کرے۔ مثلاً میں وقت پر پوری پانچ نمازیں پڑھتا ہوں، روزانہ قرآن کی تلاوت کرتا ہوں، تفسیر بھی زیرِ مطالعہ رہتی ہے، تہجد بھی پڑھتا ہوں، نفلی روزے بھی رکھتا ہوں۔ لیکن اگر کسی کو شوق دلانے کی غرض سے ذکر کیا یا کسی کو ترغیب دینے کی نیت ہے یا کسی کو اللہ کی عبادت پر آمادہ کرنا ہو تو ذکر کرنا برائی نہیں۔ ہاں اپنی نیت کو ٹٹولتے رہیں، سورۂ اخلاص ضرور پڑھیں اور اس کے معنی پر غور کریں اور تنہائیوں کو عبادت سے سجائیں۔ خوبصورت نماز پڑھیں، آہستہ آہستہ، ٹھہر ٹھہر کر قرآن کی مختلف سورتیں یاد کرنے کی کوشش کرتے رہیں

تا کہ نمازوں میں زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت کی جاسکے اور نیک اعمال اختیار کریں۔ چھوٹی سی چھوٹی نیکی کا بھی موقع ضائع نہ ہو، چاہے چڑیوں کو سوکھی روٹی ہی کیوں نہ ڈالیں، اللہ کی خاطر ہونا چاہیے۔ نیت اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہو۔ خواہ راستے سے پتھر ہی ہٹانا کیوں نہ ہو یا کوئی خاردار جھاڑی ہی ہٹانا ہو۔ نیت صرف اللہ کی رضا ہو! اللہ کی خاطر اور اللہ کی محبت میں! پھر اگر لوگوں کی تعریف سننے کو دل چاہے تو فوراً اللہ کو یاد کریں۔ فوراً اپنی توجہ اللہ کی طرف کرلیں، یہ دکھاوا ایک لت (addiction) ہے، اس سے رفتہ رفتہ نجات ملے گی۔ اگر کبھی دل چاہے تو اپنا رخ اللہ کی طرف کرلیں۔

انسان کی نفسیات ہے کہ وہ جب کوئی اچھا کام کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ سب کو پتہ چلے، میری تعریف ہو۔ انسان خودنُمائی پسند (exhibitionist) ہے، لوگوں کی نظروں کا متلاشی رہتا ہے کہ وہ دیکھیں اور سراہیں (appreciate) کریں، وہ اپنی خوبیوں کا مظاہرہ (display) کرنا چاہتا ہے۔ انسان کو اپنی تعریف بہت اچھی لگتی ہے، یہ رجحان (tendency) انسان میں پایا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس طلب کو صحیح رُخ پر ڈالنے کا طریقہ ہمیں بتلادیا کہ یہ جو نمائش کا عنصر تمہارے اندر پایا جاتا ہے، اس کا صحیح رخ یہ ہے کہ قیامت کے دن سب مخلوق کے سامنے انسانوں کے اعمال دکھائے جائیں گے وہاں کے لیے اعمال کی تیاری کی جائے۔ دنیا میں جب کوئی چیز نمائش (exhibition) کے لیے بنائی جاتی ہے تو اس کو آخری شو (final show) سے پہلے بالکل خفیہ رکھا جاتا ہے۔ تو انسان بھی اپنے اعمال دنیا میں چھپا کر رکھے تا کہ قیامت کے دن اللہ اُن کو تمام انسانوں کے سامنے ظاہر (display) کرے۔ قرآن میں آتا ہے:

{وَ اِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ} (التکویر: ۱۰)

''جس دن صحیفے نشر کر دیئے جائیں گے۔''

سورۃ النجم میں آتا ہے:

{وَ اَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی} (النجم: ۴۰)

''اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔''

تو وہاں اس دن سب کچھ دکھا دیا جائے گا، سنا دیا جائے گا۔ دفتر کے دفتر کھول کر رکھ دیئے جائیں گے۔ اللہ بصیر ہے، وہ خوب دیکھ رہا ہے تو اللہ کو دکھانے کے لیے کرو۔ وہ قدر دان بھی ہے اور اجر دینے والا بھی۔ اللہ سمیع ہے، سب سن رہا ہے، اللہ کو سناؤ، اسی سے صلہ چاہو، اس سے تعریف پانے کے لیے کام کرو۔ اس طرح ہم ریاکاری پر ان شاء اللہ قابو پالیں گے۔

اب ایک شخص ہے جو تنہائی میں نماز پڑھتا ہے تو تین کے بجائے پانچ مرتبہ تسبیح پڑھتا ہے، تو رکوع تو لمبا ہوگا اور تین کے بجائے پانچ دفعہ **سبحان ربی الاعلیٰ** کہتا ہے تو سجدہ بھی لمبا ہوگا۔ یا مثال کے طور پر وہ عصر کی سنتیں ضرور پڑھتا ہے، اب اگر وہ کسی مجلس یا محفل میں ہے تو وہاں اس کو کیا کرنا چاہیے؟ میری ناقص رائے میں اس کو وہاں بھی یہ عمل جاری رکھنا چاہیے۔ کیوں کہ تنہائی میں اور محفل میں دونوں جگہ وہ اللہ ہی کے لیے پڑھے گا۔ یہ صرف دکھانے کے لیے نہیں ہوگا، یہ اس کا معمول ہے۔

ریاکاری کا خوف:

مجلس میں شیطان اس کے دل میں یہ خیال ڈالے گا کہ اگر لمبی نماز پڑھی تو لوگ ریا سمجھیں گے، کہیں گے دکھاوے کے لیے لمبی لمبی نمازیں پڑھتا ہے تو بہتر ہے کہ مختصر نماز کر دو اور اس طرح اس کی نیکی میں کمی کروائے گا اور وہ ریا کے خوف کی وجہ سے نماز کو مختصر کرتا ہے، ایک اچھا کام چھوڑ دیتا ہے اس کو ریا کا خوف کہتے ہیں۔ یہ ریا سے بھی بدتر چیز ہے۔ کیوں کہ ریا کاری کرنے والا کم از کم اچھا کام تو کرتا ہے، لوگوں کو دکھانے کے لیے ہی سہی۔ جس کے اندر خوف الریا ہے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہونے کے لیے اچھا کام چھوڑ دیتا ہے۔ تو دونوں کی جڑ میں بیماری مشترک (common) ہے یعنی لوگوں کے دیکھنے کا احساس، دونوں کے اندر بیماری ریا کاری ہے۔ سو کرنے کا کام یہ ہے کہ انسان لوگوں کی نظروں سے اپنے آپ کو نہ جانچے۔ جیسے وہ تنہائی میں کام کرتا ہے، سب کے سامنے بھی اُسی طرح کرے۔ خلوت اور جلوت میں اپنے عمل کو یکساں رکھنے کی کوشش کرتا رہے تو عمل بہتر ہو جائے گا۔ کہیں یہ نہ ہو کہ ریا کاری کے خوف سے اچھے اعمال چھوڑ دے اور شیطان کامیاب ہو جائے۔ شیطان کا ہتھکنڈا کارگر اور اس کا وار غالب آ جائے۔ ہاں اپنی نیت کا تزکیہ ضرور کرتا رہے کہ نیت کے اندر کوئی بگاڑ یا دکھاوا نہ ہو۔ انسان اس کا فیصلہ خود کر سکتا ہے کہ تنہائی میں ہمارا رویہ کیا ہے اور محفل میں کیا ہے؟ کہیں ہم دوغلے پن کا شکار تو نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ریا سے پاک رکھے۔

سرکشی

''سرکشی'' کا مفہوم ہے بغیر کسی وجہ کے لوگوں کے ساتھ زیادتی کرنا، بلاوجہ بُرا سلوک کرنا۔ سرکشی کے لیے قرآن حکیم نے ''بغی'' کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْیُکُمْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ} (یونس:۲۳)

''اے لوگوں تمہاری بغی تمہارے اپنے خلاف جا پڑے گی۔''

اسی طرح سورۃ القصص میں یہ مضمون آتا ہے:

{اِنَّ قَارُوْنَ کَانَ مِنْ قَوْمِ مُوْسٰی فَبَغٰی عَلَیْھِمْ} (القصص:۷۶)

''بے شک قارون موسیٰ علیہ السلام کی قوم میں سے تھا مگر اس نے ان کے خلاف بغاوت کی۔''

سورۂ نحل میں ارشاد ہوا ہے:

{وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ} (النحل:۹۰)

''اللہ تعالیٰ منع فرماتا ہے تم لوگوں کو فحش کاموں سے، اور منکر سے، اور بغی سے۔''

اس سرکشی یا بغاوت کے بہت سے درجے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ بڑے گناہ سے لے کر کمتر درجے کے گناہ تک سب کے سب سرکشی کے زمرے (category) میں آتے ہیں۔ ایک قسم کی سرکشی وہ ہے جو کہ صریح گناہ ہے یعنی دوسروں پر ظلم اور زیادتی۔ جو لوگ اس قسم کی سرکشی کا شکار ہوتے ہیں ان کی شخصیت بالکل مسخ ہو کر رہ جاتی ہے، ان کو معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے۔

کمتر سرکشی:

سرکشی کا کمترین درجہ جن لوگوں میں پایا جاتا ہے انھیں معاشرے میں برا نہیں سمجھا جاتا (نہ وہ واقعتاً برے ہوتے ہیں) لیکن ان میں سرکشی ہوتی ہے جو چھوٹی چھوٹی باتوں میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ ویسے تو دوسروں کے ساتھ اچھے رہتے ہیں، ان کا خیال بھی رکھتے ہیں، ان کے ساتھ اچھے معاملات بھی کر رہے ہوتے ہیں لیکن کہیں کہیں ------- جیسے مشین کی سوئی جگہ جگہ دھاگہ کھینچ لیتی ہے اور سلائی خراب نظر آتی ہے اسی طرح کچھ لوگ ٹھیک ٹھاک چلتے چلتے اچانک اپنے ایک جملے سے یا کسی عمل سے ایک دم اذیت پہنچا دیتے ہیں، جیسے اچھا بھلا کھانا کھاتے کھاتے اچانک دانتوں تلے ہڈی آجائے تو ایک دم انسان کے اعصاب جھنجھلا جاتے ہیں، بالکل اسی طرح سرکشی کرنے

والے اچھا بھلا معاملہ کرتے کرتے اچانک کوئی ناگوار جملہ یا غیر مناسب عمل کر دیتے ہیں جس سے سامنے والے کے اعصاب جھنجھلا کر رہ جاتے ہیں۔

بڑی سرکشی:

جہاں تک بے بنیاد باتوں میں بغاوت (groundless hatred) کا تعلق ہے، جیسے کہ قارون کے متعلق ذکر کیا گیا کہ اُسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نفرت تھی اور پھر وہ پوری قوم سے ہی بغاوت پر اتر آیا، اپنی قوم کے ساتھ ہی زیادتی کرنے پر آمادہ ہوگیا، اپنی قوم کے خلاف اس نے سازشیں شروع کر دیں۔ تو یہ اس نے بہت بڑی بغاوت کا ارتکاب کیا، بعض دفعہ بغاوت اس وجہ سے ہوتی ہے کہ ہم ایک قوم سے تعلق رکھتے ہیں اور ہمارا مخالف دوسری قوم سے، محض اس ایک وجہ سے ہم ان کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ تاریخ میں ایسی کئی مثالیں ہیں کہ لوگوں نے قومیت کے نام پر ہزاروں بلکہ لاکھوں انسانوں کو قتل کروادیا، بے قصوروں کو صرف اس لیے مروادیا کہ وہ کسی اور قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کی پچھلی صدی میں سب سے بڑی مثال ہٹلر (Hitler) ہے۔ اُسے یہودی قوم سے نفرت تھی۔ صرف اس لیے ان گنت انسانوں کو مروادیا کہ وہ یہودی تھے، جس کو آج نسل کشی (genocide) کہتے ہیں۔ یا پھر بوسنیا (Bosnia) میں رہنے والے مسلمانوں کا صرف اس لیے قتل عام کیا گیا کہ وہ مسلمان تھے، یہ یورپ کے کافروں نے کیا۔ بس یہ بغی ہے کہ بلاوجہ، کوئی قصور نہیں، کوئی جرم نہیں، کوئی دشمنی یا جھگڑا نہیں بس صرف اس بنا پر کہ یہ دوسرے مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، الگ قوم ہے۔ جیسے کہ مسلمانوں میں شیعہ سنی کی تفریق ہے جو گہری سے گہری ہوتی جارہی ہے، مرنے مارنے پر اتر آتے ہیں۔ اس کی بنیاد صرف اور صرف بغاوت ہے، یہ دونوں ایک دوسرے کو صرف اس لیے مار رہے ہیں کہ شیعہ سنی الگ فرقے ہیں، عقائد الگ ہیں، اس طرح مسلمان ہوتے ہوئے بھی سرکشی کی وجہ سے قتل وغارت گری پر اتر آئے۔ یہ تو بہت بڑے درجے کی بغاوت ہے۔

تالمود میں قول آتا ہے کہ بغاوت بت پرستی، زنا اور قتل کے برابر ہے۔ یعنی انسان کے لیے انتہائی نقصان دہ ہے۔

جہاں تک ہمارا تعلق ہے اللہ کا لاکھ لاکھ احسان ہے کہ ہم اس بغاوت کا شکار نہیں، ہم گھروں میں رہنے والے، پُرامن معاشرے میں رہنے والے عام انسان ہیں۔ نہ ہمارے پاس وہ طاقت

ہے اور نہ اتنا اختیار ہی ہے کہ اتنے بڑے پیمانے (scale) پر تباہی اور بربادی پھیلائیں، اس طرح بے وجہ نفرت (groundless hatred) کی بنیاد پر کسی کو قتل کیا جائے یا تشدد کا نشانہ بنایا جائے یہ تو ہم الحمدللہ نہیں کرتے۔ دراصل ہم اُن لوگوں میں سے ہیں جو چھوٹی چھوٹی باتوں میں سرکشی کا شکار ہوتے ہیں۔

ماتحتوں کی سرکشی:

جن لوگوں کے اندر سرکشی موجود ہوتی ہے وہ جب ماتحت (subordinate) ہوتے ہیں تو ایک طرح سے بغاوت پر تیار رہتے ہیں، باغی ہوتے ہیں، حکّام (authority) کے ساتھ بغاوت کا جذبہ سرگرم رہتا ہے۔ جس کو انگریزی میں کہا جاتا ہے (rebel without a cause) بلاوجہ بات نہیں ماننی۔ ماتحتوں کی مختلف شکلیں اور درجے ہیں مثال کے طور پر اولاد والدین کے ماتحت ہوتی ہے، اب اگر کسی اولاد میں سرکشی کا جذبہ ہے تو والدین کے ساتھ ہر بات میں ضد اور ہٹ دھرمی پر اتر آئیں گے، حکم نہیں ماننا بلکہ والدین کی ہر بات کے خلاف جانا ہے۔ اگر کوئی کام کرنے کا ارادہ بھی ہوگا لیکن چونکہ ماں باپ نے یہ کرنے کا حکم دیا ہے تو نہیں کریں گے کیوں کہ اندر بغاوت ہے۔ والدین کے چھوٹے سے چھوٹے فیصلوں پر بھی سوال کریں گے، یہ کیوں کریں اور یہ کیوں نہ کریں؟ والدین سے ہمیشہ شاکی رہیں گے، اُن کی ساری خوبیاں نظروں سے اوجھل ہوجائیں گی اور دل کے اندر شکایتیں پلتی رہیں گی، خفگی (resentment) بڑھتی رہے گی، جلتے کڑھتے رہیں گے۔

اسی طرح اگر کسی بیوی میں بغاوت کے جذبات ہیں تو ہر وقت شوہر اور سسرال کے خلاف باتیں کرتی رہے گی۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر شوہر کو چیلنج کیا جائے گا، معمولی معمولی باتوں میں شوہر کی نافرمانی کریگی، خاوند کی ہر بات کے خلاف جانا، الٹ کرنا، ہر وقت ایک محاذ آرائی سی کیفیت رہے گی، شوہر اور سسرال کے خلاف ایک محاذ بنا رکھا ہوگا۔

اسکول یا کالج میں طلبہ میں بغاوت ہوگی تو اساتذہ کے خلاف یا انتظامیہ کے خلاف بغاوت (rebellious attitude) کریں گے۔ یہ قانون کیوں بنایا گیا ہے، امتحان کی یہ تاریخ کیوں مقرر کی ہے، نصاب میں یہ کیوں شامل ہے؟ یہ وہ اندازِ محاذ آرائی ہے جس کی وجہ سے ماحول اور معاشرے میں ہر وقت تصادم (conflict) کی فضا رہتی ہے۔

بغاوت کا ضرر:

بغاوت کی وجہ سے ماحول تناؤ کا شکار (tense) رہتا ہے، ہر وقت لوگوں کے اعصاب تنے رہتے ہیں۔ بغاوت کرنے والا خود بھی پریشانی (tension) میں رہتا ہے اور جس کے خلاف وہ بغاوت کر رہا ہوتا ہے اس کو بھی پریشان کر دیتا ہے، جن بیویوں میں یا بچوں میں بغاوت کا مادہ ہوتا ہے، ایسی بیویوں کے شوہر اور ایسے بچوں کے والدین بہت دُکھی رہتے ہیں۔

بغاوت کرنے والوں کا رویّہ:

ایسے لوگوں کا کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ کس بات پر اڑ جائیں گے۔ کوئی دلیل (logic) نہیں ہوتی، ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر ردّعمل دکھاتے ہیں۔ کسی آفس میں کام کرتے ہوں گے تو بھی رویہ ایسا ہی ہوگا کہ ہم یہ قانون، یہ بات، یہ حکم نہیں مانتے آفس کے ہر قانون اور ہر حکم پر نکتہ چینی ضرور کریں گے۔ ایسا لگتا ہے گویا ان کا مزاج ہی انتقامی ہوگیا ہے (getting back at the world in general) سب کے خلاف ان کے اندر کچھ منفی جذبات پرورش پا رہے ہوتے ہیں۔

پھر اگر یہ ماتحت نہ ہوں بلکہ ان کے پاس طاقت اور اقتدار ہے تو یہ دبانے والے (oppressors) بن جاتے ہیں، تحکم پسند (authoritarian) ہو جاتے ہیں۔ ذرا سی طاقت ہاتھ میں آجائے تو ماتحتوں کو ناحق دبایا جاتا ہے، بہت ہی اکھڑ مزاج (rude) ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے ماتحتوں کی شخصیت کچلنے لگتی ہے، ان کی شخصیتوں میں بگاڑ (distortion) آنے لگتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی آفس میں ایک معمولی سا افسر ہے لیکن کچھ نہ کچھ تو اس کے پاس اختیار ہوگا، اب کوئی کلرک ہے جس کا فائلوں پر اختیار ہے اور کوئی اس کے پاس کوئی فائل مانگنے آتا ہے تو اس کو یہ احساس ہوتا ہے کہ میں ان فائلوں پر مختار ہوں اور یہ بندہ میرا محتاج ہے، مجھ سے کچھ مانگ رہا ہے، اس کو اپنی حیثیت (position) کا احساس ہوتا ہے تو وہ فائل ہوتے ہوئے بھی نہیں دیتا اور بہانہ کر دیتا ہے کہ ڈھونڈنی پڑے گی، اس وقت نہیں مل رہی وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح دوسروں کو پریشان دیکھ کر ان کو ستا کر اور اُداس (upset) دیکھ کر عجیب سی مسرت (satisfaction) محسوس کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن میں معمولی سی بھی سرکشی ہو اور ان کے پاس اختیار (authority) آجائے تو یہ دوسروں کو عاجز اور تنگ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ ایک اور مثال سے سمجھیں کچن میں کام کرنے والا خانساماں ہے یا کوئی اور ملازم ہے، وہ گھر والوں کے ساتھ، اپنے

مالکوں کے ساتھ تو اچھی رہے گی یا رہے گا لیکن جو اُس سے نیچے (juniors) ہیں ڈرائیور، صفائی والی، مالی وغیرہ ان کو تنگ کریں گے، وقت پر ناشتہ، کھانا اور چائے نہیں دیں گے اور ان پر حکم چلائیں گے۔ وہ بیچارے دس دس دفعہ کھانا، ناشتہ، چائے مانگیں گے مگر وہ بہانے بہانے سے ٹالتے رہیں گے اور اس طاقت (power) کا مزہ اُٹھاتے ہیں کہ دینا نہ دینا ہمارے اختیار میں ہے۔ کبھی جلی ہوئی روٹی دے دیں گے یا ٹھنڈی چائے دے دیں گے۔ یہ سوچ سوچ کر ان کا نفس مطمئن ہوتا ہے کہ میں صاحبِ اختیار ہوں۔ اگر کسی استاد میں بغاوت کا مادّہ ہے تو ایسے اساتذہ اپنے شاگردوں کو بے جا ڈانٹ ڈپٹ کر اور سختی کر کے خوشی محسوس کرتے ہیں، معمولی سی غلطی پر کڑی اور سخت سزا دے دیتے ہیں، شاگردوں کی بے عزتی کرتے ہیں، سب کے سامنے اُن کا مذاق اُڑاتے ہیں، سزائیں دیتے ہیں، نظر انداز (ignore) کرتے ہیں۔ اس طرح سے ان کو طاقت کا احساس ہوتا ہے۔ ایسے استادوں کے زیرِ تربیت بچوں کی شخصیتوں پر انتہائی منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ جب تک چھوٹے بچے کو رُلا نہیں دیتے ان کو چین نہیں آتا، چٹکیاں لیں گے، نوچیں گے، چڑائیں گے اور جب بچہ تکلیف سے روتا ہے تو چھوڑ دیتے ہیں۔ شاید اندر کوئی نفسیاتی خرابی ہوتی ہے جس کا اظہار اس منفی رویے میں ہو رہا ہوتا ہے۔ یقیناً کوئی نہ کوئی احساسِ کمتری ہے جس کی وجہ سے بڑوں سے بغاوت کر کے اور چھوٹوں پر ظلم کر کے تسکین (satisfaction) ملتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے۔

((مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيرَنَا وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا)) (۱)

"وہ ہم میں سے نہیں ہے جو ہمارے چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے۔"

اب اگر ایسے لوگ ایک ہی ساتھ کام کر رہے ہیں، ایک ہی درجے اور حیثیت کے لوگ ہیں تو اپنے ہم درجہ ساتھیوں کے حقوق کا خیال نہیں رکھیں گے۔ ان کا جائز حصہ بھی ہتھیانے کی کوشش کریں گے کیوں کہ اُن کو جھڑپ (clash) میں لطف آتا ہے۔ لوگوں کی مخالفت کر کے اُن سے بہتر ہونے کا احساس ہوتا ہے، معمولی سی باتوں میں بھی اظہارِ یکجہتی نہیں کر پاتے۔ مجلس میں اگر کسی نے کہا کہ آج ٹھنڈ زیادہ ہے تو کہیں گے نہیں آج تو موسم معتدل ہے، ایک کہے گا چائے ٹھنڈی ہے تو

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الرحمة

کہیں گے نہیں یہ تو اچھی خاصی گرم ہے۔ یہ رویّہ آپ سب نے کچھ لوگوں میں محسوس کیا ہوگا کہ اُنہیں دوسروں کو نیچا دکھانے سے مطلب ہوتا ہے، دوسروں کی بے عزتی مقصود ہوتی ہے۔ یہ سرکشی کی چند مثالیں ہیں۔

ازراہِ مذاق سرکشی:

ایک اور سرکشی جس کو شاید معاشرے میں بُرا سمجھا ہی نہیں جاتا وہ عملی مذاق (practical jokes) ہے، یہ بھی دراصل بغی ہی ہے۔ یعنی لطف حاصل کرنے کے نام پر یا لطیفے کے نام پر کسی کو تنگ کرنا، تمسخر اُڑانا، بے وقوف بنانا اور پھر اس سے لطف اندوز ہونا۔ مثلاً کسی بھی نمبر پر فون کر کے کہہ دینا کہ آپ کا بچہ حادثے (accident) کا شکار ہو گیا ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی تکلیف اور پریشانی سے مزہ لیتے ہیں، یہ ان کے لیے تفریح ہوتی ہے۔ اپریل فول (april fool) کے نام سے باقاعدہ رسم منائی جاتی ہے جو کہ سراسر سرکشی ہے۔ لوگوں کو بے سروپا خبریں اچانک سنا کر بے وقوف بنایا جاتا ہے، جھوٹ بول کر، کسی کو بے وقوف بنا کر اذیت دینا اور لطف اُٹھانا بھی بغی ہے۔ دوسرے کو رُلا کر، تکلیف پہنچا کر خود مسرت حاصل کرنا قطعی طور پر سرکشی ہے۔

ایسے کاموں سے دنیا میں بھی دوسروں کے دلوں میں بغض، غصہ، نفرت اور دشمنی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور یہ عملی مذاق آخرت کے اعتبار سے بھی نہایت ہی نقصان دہ ہوں گے۔ یہ تمام اعمال جن کا ذکر ہوا یہ کرنے والے بُرے لوگ نہیں ہوتے، بس یہ کچھ عادت سی بن گئی ہوتی ہے کہ بچوں کو رُلا کر یا عملی مذاق کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ عام زندگی میں اچھے لوگ تصور ہوتے ہوں، خوش مزاج ہوں، مددگار بھی ہوں لیکن کہیں کہیں وہ غیر ارادی طور پر، غیر محسوس طریقے سے سرکشی پر آمادہ ہوجاتے ہوں۔ ہوسکتا ہے اس کا آغاز غیر شعوری عمر میں ہی ہوگیا ہو اور یہ عادت بڑھتے بڑھتے جوانی کے ساتھ جوان ہوگئی، بہت سنجیدہ (serious) اور تکلیف دہ شکل اختیار کر گئی، بچپن میں سرکشی کی جھلک تنگ کرنے میں نظر آتی ہے جب اسکول میں بچے اپنے ساتھ والے بچوں کو تنگ کرتے ہیں، کبھی بستہ چھپا دیا، کبھی لنچ بکس (lunch box) چھپا دیا، کبھی کسی بچے کے خلاف دوسروں کو اکٹھا کر لیا۔ اس کو تنہا (isolate) کر دیا اور اس کی پریشانی سے خوش ہو رہے ہیں یا گروہ بنا کر کسی ایک بچے کا مذاق اڑانا شروع کر دیا یہ سراسر سرکشی ہے۔

بعض بچے کسی بلّی یا کتّے کے بچے کو لکڑیوں، ڈنڈوں، پتھروں سے مار مار کر بھگاتے ہیں اور

خوش ہوتے ہیں۔ جاپان میں بچوں میں آپس کے جھگڑوں کی وجہ سے اُن میں خودکشی کی شرح کافی حدتک بڑھ گئی ہے۔ اب تو باقاعدہ سات آٹھ سال کے بچے فون پر اپنے ہم عمر بچوں کو قتل کی دھمکیاں بھی دینے لگے ہیں، یہ شغل بن گیا ہے۔ اگر آپ کے اردگرد کوئی ایسے کر رہا ہے یا کوئی اس قسم کے سرکشی کا شکار بن رہا ہے تو اس کو روکنا چاہیے۔ بعض دفعہ گھر کے بڑے بچوں کو مذاق کا نشانہ بناتے ہیں، بلاوجہ ڈانٹتے ہیں یا مارتے ہیں، اتنا تنگ کرتے ہیں کہ وہ عاجز آجاتے ہیں، اگر والدین کو یہ محسوس ہو رہا ہے کہ گھر کے دیگر افراد بچوں کو سرکشی کا نشانہ بنا رہے ہیں تو اس کو روکنے کی ضرورت ہے یا اگر کسی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ میں کسی کو سرکشی کا نشانہ بنا رہا ہوں تو فوراً رُک جانا چاہیے۔

اسلام پسند نہیں کرتا کہ انسان مظلومی کی زندگی گزار دے اور اس کے اندر کسی ردعمل (reaction) میں بغض پیدا ہو جائے۔ لہٰذا اس تصادم (conflict) کو حل (resolve) کرنا ضروری ہے، اس کو حل کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ} (الشوریٰ: ۳۹)

''وہ لوگ ایسے ہیں کہ جب ان کو بغی پہنچتی ہے تو وہ (برابر کا) بدلہ لیتے ہیں۔''

اگر بدلہ نہیں لیں گے تو دل میں بغض پالتے رہیں گے اور بغض تو خود بہت بری چیز ہے تو بغض پالنے سے بہتر ہے کہ بدلہ لے لیں اور اسی سورۃ میں آگے یہ بات فرمائی کہ:

{فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ} (الشوریٰ: ۴۰)

''جو معاف کر دے اور اصلاح کر لے تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔''

اصلاح کی کوشش کے لیے تصادم ضروری ہے۔ بعض دفعہ جو شخص سرکشی کر رہا ہوتا ہے اس کو خود احساس نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے کے ساتھ زیادتی کر رہا ہے، ایسے لوگ دوسروں کو ایک تختۂ مشق (punching bag) سمجھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر زیادتی کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے ایسے شخص کو احساس دلانا چاہیے کہ آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں، ہوسکتا ہے کہ وہ محتاط ہو جائے۔ جب لوگ خاموشی سے سرکشی برداشت کیے چلے جاتے ہیں تو ہوسکتا ہے سرکشی کرنے والے کو احساس ہی نہ ہو کہ دوسرے کو تکلیف ہو رہی ہے، ذہنی کوفت میں مبتلا ہے، یا پھر ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ خاموشی کی وجہ سے اس کی ہمت بڑھتی چلی جائے اور بغی سے بڑھ کر وہ ظلم واستحصال تک پہنچ جائے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کا ہاتھ روک دیا جائے، اگر معاف کرنے سے اصلاح ہوتی ہے تو

معاف کردیں، اگر احساس دلانے سے اصلاح ہوتی ہے تو احساس دلائیں، اور اگر بدلہ لینے سے اصلاح ہوتی ہے تو بدلہ لے لیں۔ اب یہ فیصلہ صورتِ حال کو دیکھ کر کیا جائے گا کہ اس وقت کیا کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر معاف کرنے سے بہتری نہیں ہو رہی اور سرکشی کرنے والا اپنی سرکشی پر قائم ہے تو پھر احساس (point out) دلانے کی ضرورت ہے۔ اس کو مشورہ (feed back) دیں کہ دیکھیے آپ نے فلاں فلاں موقع پر میرے ساتھ یہ زیادتی کی یہ اچھی بات نہیں ہے، عمومی اطلاق نہ کریں کہ آپ ہمیشہ ہی میرے ساتھ زیادتی کرتے ہیں، بلکہ جس خاص واقعہ کی طرف اشارہ مقصود ہو اس کو متعین (exaclty quote) کریں کہ کل دوپہر کو آپ نے بلاوجہ میرے بچے کو تھپڑ مارا تھا۔ ہمیں متعین (specific) ہونے کی ضرورت ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بغی کرنے والا اُس وقت آپ سے ناراض ہوجائے لیکن ان شاء اللہ تعالیٰ بعد میں محتاط ہوجائے گا۔ جب وہ تنہائی میں سوچے گا تو اُسے اپنی غلطی کا احساس ہوگا۔ اِس بات کو کرنے کے لیے غصہ سے پرہیز نہایت ضروری ہے، آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جاتا اگر سرکشی کو ختم کرنا ہے تو بالکل ٹھنڈے لہجے میں اور دھیمی آواز کے ساتھ مختصراً بات پہنچادی جائے، بات کو طول نہ دیا جائے، مبالغہ نہ کیا جائے تو ان شاء اللہ تعالیٰ بہتری ہوگی۔ مسئلہ یہ ہے جب لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں میں سرکشی کرتے ہیں تو اس کو گناہ نہیں سمجھتے، توبہ بھی نہیں کرتے، ان کو یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم غلطی کر رہے ہیں اس لیے ان کو احساس دلانا چاہیے کہ بغی معمولی گناہ نہیں بلکہ آخرت میں بہت بڑے نقصان کا باعث ہے۔

مطالبات میں سرکشی:

سرکشی کی ایک اور صورت جو کہ بہت عام (common) ہے اور اس کو کہیں سے بھی سرکشی نہیں سمجھا جاتا، وہ بہت زیادہ مطالبات (demands) کرنا ہے۔ یہ بھی زیادتی ہے کہ آپ کسی سے ایسی توقعات لگائے بیٹھے ہیں جن کو پورا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں اور زیادہ مطالبات (demands) وہی کرتے ہیں جو بہت اونچی اونچی توقعات (expectations) لگاتے ہیں۔ اس روِش سے بھی بچنا چاہیے۔

سرکشی ترک کرنے کے لیے صحیح انسان بننا:

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کہا کرتے تھے کہ اگر تم کو صوفی بننا ہے، عابد، زاہد بننا ہے تو بہت ساری خانقاہیں کھلی ہیں وہاں چلے جاؤ لیکن اگر انسان بننا ہے تو یہاں آجاؤ یعنی ہماری مجلس میں

آجاؤ اس لیے کہ یہاں انسان بنایا جاتا ہے۔ مسلمان بننا، عالم بننا، صوفی بننا تو بعد کی بات ہے، اونچے درجے کی بات ہے، پہلے انسان تو بنو، پہلے جانوروں کی صف سے تو نکل آؤ، جانوروں کے اندر سرکشی پائی جاتی ہے، پہلے دوسروں کے اوپر زیادتی کرنے سے تو بچو۔ انسان اس وقت تک انسان نہیں بنتا جب تک اس کو اسلامی معاشرت کے آداب نہ آتے ہوں، لہٰذا پہلے انسان بنو۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم میں لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں تین قسم کے جانور پیدا فرمائے ہیں۔ جانوروں کی ایک قسم وہ ہے جو دوسروں کو فائدہ پہنچاتی ہے، ان سے شاذ و نادر ہی کسی کو نقصان پہنچتا ہے، مثلاً گائے بکری وغیرہ۔ یہ ایسے جانور ہیں جو دودھ کے ذریعے ہمیں فائدہ دیتے ہیں اور جب گائے دودھ دینا بند کرتی ہے تو ہم ذبح کر کے اس کا گوشت کھا لیتے ہیں یعنی سراسر فائدہ پہنچتا ہے۔ جانوروں کی دوسری قسم وہ ہے جو صرف تکلیف پہنچاتے ہیں اور اس کا بظاہر کوئی فائدہ نظر نہیں آتا، مثلاً سانپ، بچھو، درندے وغیرہ۔ یہ سب موذی جانور ہیں۔ جب بھی انسان کو ملیں گے تکلیف دیں گے، ڈنگ ماریں گے۔ جانوروں کی تیسری قسم وہ ہے جو نہ تکلیف دیتی ہے اور نہ فائدہ ہی پہنچاتی ہے۔ جیسے جنگل میں بسنے والے جانور، گیدڑ، لومڑی، بندر وغیرہ۔ ان سے انسان کو نہ کوئی خاص فائدہ ہے اور نہ بہت نقصان ہے۔ جانوروں کی یہ تین قسمیں بیان کرنے کے بعد امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ انسان سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں ''اے انسان! تو اشرف المخلوقات ہے اور سارے حیوانات پر تجھ کو فضیلت دی گئی ہے۔ تو اگر انسان نہیں بنتا بلکہ جانور بننا چاہتا ہے تو کم از کم پہلی قسم کا ہی جانور بن جا جو دوسروں کو صرف فائدہ پہنچاتے ہیں، کوئی نقصان نہیں پہنچاتے جیسے گائے بکری وغیرہ اور اگر تو اس سے بھی نیچے آنا چاہتا ہے تو تیسری قسم کا جانور بن جا جو نہ نقصان پہنچاتے ہیں اور نہ ہی فائدہ پہنچاتے ہیں اور اگر تو نے دوسروں کو فائدہ کے بجائے نقصان دینا شروع کر دیا تو پھر سانپ، بچھو اور درندوں کی صف میں شامل ہو جائے گا۔''

ڈسنے والے لوگ، باتوں کے چبھتے تیر چلانے والے، طنز کے نشتر چبھونے والے یہ سب سرکش ہیں۔ طعنے دینا بھی سرکشی کی علامت ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا بھی حساب لیا جائے گا۔ یہ دل کا مرض ہے جس کا اظہار باتوں اور حرکتوں کے ذریعے ہوتا ہے اس کا علاج یہ ہے کہ انسان قیامت کا منظر ہر وقت اپنے ذہن میں رکھے کہ جب انسان کو دوسروں کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کی قیمت اپنی نیکیوں کی شکل میں ادا کرنا ہوگی۔

قیامت میں سرکشی کا حساب:

صحیح مسلم میں حدیث ہے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((لَتُؤَدُّنَّ الْحُقُوقَ اِلَى أَهْلِهَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتَّى يُقَادَ لِلشَّاةِ الْجَلْحَاءِ مِنَ الشَّاةِ الْقَرْنَاءِ))(۱)

''قیامت کے دن لازماً تمھیں حقوق ادا کرنے ہوں گے حتیٰ کہ بے سینگ والی بکری، سینگ والی بکری سے اپنا بدلہ لے لے گی اگر اس نے دنیا میں اسے سینگ مارا ہوگا۔''

چھوٹے سے چھوٹے ظلم اور زیادتی کے فعل کا بھی حساب ہوگا اور دینے کو صرف نیکیاں ہوں گی۔ نوکروں کے ساتھ زیادتی کی جاتی ہے۔ تنخواہ وقت پر نہ دیں گے، بلاوجہ ٹالتے رہیں گے یہ بھی ان کے ساتھ زیادتی ہے۔ جب ان کا حق واجب ہوگیا، پہلی تاریخ آ گئی تو معاوضہ دیدیا جائے۔ کسی بزرگ کا واقعہ آتا ہے کہ وہ بہت محتاط رہتے تھے۔ ایک دفعہ کوئی شخص ان سے کچھ مانگنے کے لیے آیا، وہ بہت اہم کام میں مصروف تھے، اس اہم کام کو چھوڑ کر انہوں نے فوراً اس کی حاجت پوری کردی، جو رقم مانگ رہا تھا وہ دے دی تو لوگوں نے کہا اتنی بھی کیا جلدی تھی تو جواب دیا، وہ شخص میرے سامنے عاجز بن کر کھڑا تھا، میں نہیں چاہتا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ میرا اس بات پر محاسبہ کرلے کہ فلاں شخص تمھارے پاس ضرورتاً آیا تھا تم نے اُسے اتنی دیر کیوں انتظار کروایا! میں روزِ قیامت کے حساب سے بچنا چاہتا ہوں۔ تو سوالی کو اس کا حق جلد سے جلد دے دیا کریں، بلاوجہ منتظر نہ رکھیں، دیر نہ کریں۔ ان چند باتوں کا تعلق بھی سرکشی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں اس برائی، گناہ کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے اور پھر اس سے بچنے کا راستہ بھی دکھادے۔ آمین!

خلاصہ:

ہر شخص یہ جانچے کہ مجھ میں سرکشی ہے یا نہیں، کیا میں قانون کے بارے میں یہ کہتا ہوں کہ یہ قانون تو میری سمجھ سے بالاتر ہے، میں اس پر عمل نہیں کروں گا۔ اِس اندازِ گفتگو سے کیا پتہ چلتا ہے؟ یہی کہ ہمارے اندر بھی ایک طرح کی سرکشی ہے۔ آج کل ہر جگہ قانون توڑنے کا رجحان ہے اور قانون توڑنے سے پہلے یہی کہا جاتا ہے کہ یہ قانون ہمیں اچھا نہیں لگتا، حالانکہ کوئی قانون جب تک برقرار ہے اُسے ہر حال میں ماننا ہے۔ اسی طرح سگنل کو توڑ کر فخر محسوس کرنا اور بلاوجہ گاڑی غلط طرف

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، تحریم الظلم

چلانا بھی سرکشی ہے، یہ عادت آپ کو اچھے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی ملے گی اور ڈرائیوروں میں تو بہت ملے گی، اس سے ان کو بااختیار ہونے کا احساس ہوتا ہے۔لیکن یہ قانون کی خلاف ورزی کر کے فخر محسوس کرنا بھی سرکشی کی علامت ہے، نوکروں یا ماتحتوں پر غیر ضروری رعب جھاڑنا یا تحکمانہ لہجہ اختیار کرنا بھی سرکشی کی علامت ہے، درشت اور تلخ لہجے میں نوکروں سے بات کرنا بھی مناسب نہیں۔ ہاں اگر کوئی شخص قانون کو غلط سمجھتا ہو اور مطمئن نہ ہونے کے باوجود قانون کی پیروی (follow) کرتا ہو تو یہ سرکشی نہیں۔

چھوٹی چھوٹی باتوں پر شوہر کی مخالفت (oppose) کرنا یا ہر وقت اپنی بات منوانے کی کوشش کرنا یقیناً سرکشی ہے۔ بچوں کو اپنے کنٹرول میں رکھنے کی کوشش کرنا کہ بچے ہمہ وقت سو فیصد میرے قابو میں رہیں، میرے حکم سے اٹھیں بیٹھیں، کھائیں پئیں، یہ زیادتی ہے، ایسا نہیں کرنا چاہیے۔نوکروں یا ماتحتوں کی ضروریات کو نظر انداز کرنا یا اُن سے غفلت برتنا بھی سرکشی ہے۔ مذاق اُڑانا، نقلیں اُتارنا سو فیصد سرکشی میں شامل ہے۔بعض لوگ بچوں کی نقلیں اُتارنے سے بھی نہیں چُوکتے، بچے شرمندہ (embarrass) ہوتے ہیں، یہ بھی بچوں کے خلاف سراسر سرکشی ہے بچوں کو پڑھاتے وقت یا ہدایات دیتے وقت کڑک لہجے (tone) کے استعمال سے گریز کرنا چاہیے۔ ہاں اگر تین چار دفعہ کہنے کے باوجود بچہ نہیں مان رہا تو آپ نے کرختگی دکھانی ہی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ عام بول چال میں یہ طرز اختیار نہیں کرنا چاہیے، جیسا کہ اٹھو پانی لے کر آؤ! اس کے بجائے پیار سے اور میٹھے انداز سے کہنا چاہیے۔ برائے مہربانی ذرا پانی لا دو! اور جب کسی کو اس رویے پر ٹوکا جائے تو یہ معذرت پیش کی جاتی ہے کہ ایسا نہ کریں تو بچے سنتے ہی نہیں، یہ غلط بات ہے۔ بچوں کے ساتھ اپنا لہجہ ہمیشہ دھیما رکھیں۔ نظم وضبط (discipline) کے نام پر دھمکیوں اور ڈانٹ پر آمادہ رہنا، چیخ و پکار کرنا، بات کا آغاز ہی دھمکی سے کرنا کہ ہوم ورک (home work) نہیں کیا تو ٹی وی نہیں دیکھ سکتے۔بعض دفعہ بچوں کو خوفزدہ کیا جاتا ہے کہ ہماری بات نہیں مانو گے تو بوڑھا بابا لے جائے گا، کتا آجائے گا، تمہیں کھا جائے گا، بچے ڈر کر سہم جاتے ہیں۔دراصل یہ طرح طرح کی دھمکیاں اور ڈراوے بچوں کی شخصیت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ بچوں کو رُلانا، ڈرانا، دھمکانا سرکشی ہے، قطعاً مناسب نہیں ہے۔اسی طرح اختیار (authority) ملنے پر دوسروں کو احساس دلانا کہ تم ہمارے محتاج ہو، سراسر سرکشی ہے۔والدین کی حکم عدولی کرنا، اُن کا کہنا نہ ماننا، بدتمیزی کرنا، پلٹ کر

جواب دینا بھی بغاوت ہے۔کسی سے اختلاف (contradict) کر کے یا بات رد کر کے بڑا کار نامہ انجام دینے کا احساس (sense of achievement) ہونا، یہ سب سرکشی ہے۔

اس کا علاج یہ ہے کہ ماضی کی کوتاہیوں پر انسان نادم، پشیمان اور شرمندہ ہو اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہو اور توبہ کرے، قیامت کا منظر سامنے لائے کہ زندگی میں جو دو چار نیکیاں کر پائے ہیں ان سے بھی ہاتھ نہ دھونا پڑ جائے۔حدیث کا مفہوم یاد رکھیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ''وہ ہم میں سے نہیں جو بڑوں کی عزت نہ کرے اور چھوٹوں پر رحم نہ کرے'' فی الحال ہم یہ نہ سوچیں کہ ہمارے خلاف کون کون بغاوت کر رہا ہے بلکہ یہ سوچیں کہ میں کس کے ساتھ بغاوت کرتا ہوں یا کس کس کے ساتھ اس نامناسب رویے کا اظہار کرتا ہوں اور یہ ہو نہیں سکتا کہ ہم بغاوت نہ کرتے ہوں ۔گھر میں یا گاڑی میں (AC) ہوتے ہوئے بھی دوسرے گھر والوں کو استعمال نہ کرنے دینا کہ بل (bill) زیادہ آتے ہیں بالکل سرکشی ہے۔نوکروں کو ان کے حقوق سے محروم کرنا، سسرال والوں سے اچھا سلوک نہ کرنا بغی ہے۔ اپنے لیے کوئی بہانہ (excuse) نہ تراشیں، خود کو معذور (justified) نہ سمجھیں کہ ہم نے تو یہ اس وجہ سے کیا یا اس وجہ سے کیا، اپنے اندر جھانکیے اور اللہ سے ڈریں کہیں وہ کوئی ایسا شخص ہم پر مسلط نہ کر دے جو بغی کرنے والا ہو۔کسی دانا نے کہا ہے کہ اوپر جاتے وقت لوگوں سے زیادتی مت کرو کیوں کہ نیچے آتے وقت ان سے ہی پالا پڑے گا۔ایک انگریزی کا محاورہ ہے کہ

"Keep your words soft and sweet, may be you have to eat them."

ایسا تلخ زہریلا درشت رویہ اختیار نہ کریں کہ کل کوئی آپ سے ایسا ہی سلوک کرے۔

توقعات

تزکیہ کے ضمن میں اب ہم ''توقعات'' (expectations) پر بات کریں گے۔ توقع کا تعلق دل سے ہوتا ہے، یہ دل کی ایک کیفیت کا نام ہے، اس کو امید (hope) بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ صحیح توقع کیا ہوتی ہے اور توقع کی غلط شکل کیا ہوتی ہے؟ کس سے توقع رکھنی چاہیے اور کس سے نہیں۔ اس لیے کہ توقع رکھنا یا نہ رکھنا زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالتا ہے۔ بعض اوقات خوشی اور سکون کا مدار بھی توقعات پر ہو جاتا ہے کیوں کہ صحیح ہستی سے توقع رکھنا خوشی اور سکون کا باعث بنتا ہے اور غلط ہستی سے توقع رکھنا انسان کو پریشان (upset) کر دیتا ہے۔ تو ذہنی سکون کے لیے، اچھی سیرت و کردار کے لیے اور اپنے تزکیہ کے لیے ہمیں اپنی توقعات کا مرکز جانچنا ہے۔

اپنے آپ سے توقع:

انسان کو خود سے یہ توقع رکھنی چاہیے کہ میں اپنے اندر بہتری لانے کے قابل ہوں۔ توقع کو ایک ہتھیار کے طور پر استعمال کیجیے، آلے (gadget) کے طور پر استعمال کیجیے اور اپنے آپ سے مبنی بر حقیقت توقع (realistic expectation) رکھیں۔ یعنی جن چیزوں کا اختیار آپ کے پاس نہیں ان کی توقع اپنے آپ سے مت رکھیے۔ کوئی ایسی چیز جو کہ آپ کے بس سے باہر ہے، پھر بھی اپنے آپ سے توقع کرنا کہ میں اس کو ٹھیک کرلوں گا یا کرلوں گی، یہ توقع لغو ہے اور نتیجے کے اعتبار سے تباہ کن ہے، ہوسکتا ہے یہ آپ کو کسی احساس کمتری (inferiority complex) میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے۔ اپنے اخلاق و کردار کو سنوارنا، اپنے کسی ہنر کو نکھارنا، اللہ کی عطا کی ہوئی صلاحیتوں کو بہتر (improve) کرنا انسان کے اختیار اور بس میں ہے۔ اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اسی طرح اپنے آپ سے یہ توقع رکھیں کہ میں اپنی کوتاہیوں پر قابو پانے کے قابل ہوں، یہ اچھی توقع ہے، مثبت رویّہ (positive attitude) ہے۔ میں شریعت پر عمل کرنے کے قابل ہوں، میں جنت کے اعلیٰ درجات حاصل کرنے کے قابل ہوں، انسان اپنے آپ سے ایسی توقعات رکھے۔ جو اعلیٰ توقعات ہوتی ہیں وہ نیکی کے ارادے کو عمل میں ڈھالتی ہیں۔ اسی طرح لوگ بلندیوں کو حاصل کرنے والے (high achiever) بنتے ہیں۔ لہٰذا اپنے آپ سے اچھی توقع رکھنا اچھی بات ہے۔ اس کا اظہار ہمیں قرآن میں بھی ملتا ہے مثلاً سورۃ القصص میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول آیا ہے، انہوں نے توقع ظاہر کی تھی:

{فَلَنْ اَكُوْنَ ظَهِيْرًا لِّلْمُجْرِمِيْنَ} (القصص: ۱۷)

''کہ اب میں ہرگز بھی مجرموں کا مددگار نہیں بنوں گا۔''

اور سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے والدِ محترم حضرت ابراھیم علیہ السلام سے فرماتے ہیں:

{سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ} (۱۰۲)

''اگر اللہ نے چاہا تو عنقریب آپ مجھ کو صابر پائیں گے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اپنے آپ سے توقع تھی کہ اللہ نے چاہا تو میں صابر رہوں گا۔ سورۂ کہف آیت 69 میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قول ہمیں ملتا ہے انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام سے کہا تھا۔

{سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا}

''بے شک آپ (ان شاء اللہ) مجھ کو صابر پائیں گے۔''

اپنے آپ سے انہوں نے اچھی امید رکھی۔ غور کریں کہ خود سے اچھی اُمید رکھنے سے خود اعتمادی (confidence) پیدا ہوتی ہے، انسان اپنی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے اور وہ مفید کاموں میں لگتی ہیں۔ سورۂ یوسف میں بھی ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا قول ملتا ہے:

{قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ ۚ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ} (یوسف: ۵۵)

''کہا کہ زمین کے خزانوں کا مجھ کو انچارج بنا دیجیے، میں علم والا ہوں اور حفاظت کرنے والا ہوں۔''

ان کو اپنے آپ سے یہ توقع تھی کہ اگر مجھے یہ ذمہ داری دی جائے تو میں اس ذمہ داری کو اچھی طرح ادا کروں گا۔

اچھی توقع کا فائدہ:

اس اچھی توقع کا سب سے بڑا فائدہ کیا ہوتا ہے؟ یہ انسان کو محنت پر آمادہ کرتی ہے، فائدے (incentive) کی امید دلاتی ہے، اور پھر وہ اس پر محنت کرنے کے لیے خوشی خوشی آمادہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً یہ توقع رکھنا کہ اگر مجھے مال ملا تو میں اللہ کی راہ میں خرچ کروں گا، یا موقع ملا تو شہادت کا درجہ حاصل کروں گا۔ اس توقع پر، اس ارادے پر بھی اجر ہے۔ نیکی کی نیت پر بھی نیکی لکھ دی جاتی ہے، خواہ عمل میں نہ آسکے۔ مثلاً اگر شہادت کی تمنّا اور نیت ہے تو بستر پر موت بھی شہادت میں شمار کی جائے گی۔ اور خود سے انسان توقع رکھے کہ اگر کہیں گناہ کرنے کا موقع بھی ملا تو مجھے توقع ہے کہ میں اس سے بچ نکلوں گا اور جب توقع رکھے یا کرے تو ''ان شاء اللہ'' ضرور کہے۔

توقعات پر پورا اُترنے کے لیے ذہنی تیاری ضروری ہے:

اپنے آپ سے توقع رکھنا ایک طرح سے ذہنی مشق (mental exercise) ہے۔ انسان ذہنی طور اپنے آپ کو تیار کر رہا ہوتا ہے اور جب وہ ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے اور پھر کوئی حقیقی صورتحال (real life situation) پیش آتی ہے، کوئی نیکی کا موقع ہاتھ آتا ہے یا انسان کسی

آزمائش میں مبتلا ہوتا ہے تو پھر وہ بوکھلاتا نہیں ہے، بلکہ پورے اعتماد سے کرگزرتا ہے، اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے، موقع سے فائدہ اٹھالیتا ہے۔ ورنہ اگر انسان ذہنی طور پر کسی کام کے لیے تیار نہ ہو تو موقع سامنے آنے پر وہ تذبذب (hesitation) کا شکار ہوجاتا ہے، گومگو کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اتنے میں وہ موقع (opportunity) کھو بیٹھتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ

توقع +موقع= کامیابی (expectation+opportunity=success)

تو انسان کو اپنے آپ سے اچھی امید رکھنی چاہیے۔ اپنے آپ کو خواہ مخواہ کم تر (under estimate) نہ سمجھے۔ حقیقت سے قریب امید رکھے۔ اپنے آپ کو جانچے، پرکھے کہ ہاں میں کیا کرسکتا ہوں، میرے اختیار میں کیا کیا ہے، کیا ممکن ہے۔

اللہ سے توقع:

اللہ سے توقع رکھنا بہت پسندیدہ ہے۔ اس کو قرآن میں ''توکل'' کہا گیا ہے۔ انسان کو اللہ سے توقعات رکھنی چاہئیں۔ بعض اوقات ہماری اپنی ذات ہماری توقع پر پوری نہیں اُترتی، لیکن جو توقعات انسان اللہ سے لگاتا ہے وہ لازماً پوری ہوتی ہیں بلکہ اللہ اُس کی توقعات سے بہت بڑھ کر دیتا ہے۔ اللہ سے خوب توقعات لگائے، اللہ کی اطاعت کرے، اس کے صلے میں توقع رکھے کہ مجھے اس کام کا اجر ملے گا۔ امتحانات، مشکلات اور آزمائشیں آنے پر توقع رکھے کہ اس کا صلہ مجھے اللہ دے گا، اجر ملے گا۔ جب مشکلات آئیں تو اللہ سے توقع رکھے کہ اللہ دُور کردے گا اور اللہ سے ضرور توقع رکھے کہ اللہ میری تمنّائیں اور خواہشات ضرور پوری کرے گا۔ جب اللہ سے اتنی ساری امیدیں ہوتی ہیں تو اس کا مظہر دُعا کی شکل میں نکلتا ہے۔ توقعات کا اظہار ہے دعا۔ یعنی جو کچھ اللہ سے امید (expect) کررہے ہوتے ہیں اس کا اظہار ہم دعا کی شکل میں کررہے ہوتے ہیں اور دعا تو ہے ہی عبادت، لہٰذا توقع بھی عبادت کا ذریعہ ہے۔ اللہ سے اچھی اچھی توقعات رکھنا انسان کو مایوسی سے بچالیتا ہے، پُرامید رکھتا ہے۔

﴿وَلَا تَايْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يَايْـَٔسُ مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ اِلَّا الْقَوْمُ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (یوسف:۸۷)

(حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے بیٹوں سے مخاطب ہوکر کہتے ہیں) ''اے میرے بیٹو! اللہ کی رحمت سے مایوس مت ہو اللہ کی رحمت سے تو صرف کافر ہی مایوس ہوا کرتے ہیں۔''

تو اللہ سے کون توقع نہیں لگاتا؟ جو کافر ہوتا ہے۔ مومن تو اپنے رب سے بہت توقعات (expectations) اور امیدیں رکھتا ہے اللہ یہ بھی دے گا، اللہ یہ بھی کرے گا۔ سورۃ الکہف آیت 16 میں اصحابِ کہف کا قول نقل ہوا ہے۔

{فَاْوٗٓا اِلَى الْكَهْفِ يَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ يُهَيِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا}(الکھف:۱۶)

''چلو تم غار کی طرف، تمہارا رب تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے گا اور تمہارے معاملات میں آسانی پیدا کرے گا''

یہ اللہ سے امید تھی کہ اللہ کی خاطر ہم یہ کام کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ضرور ہماری مدد کرے گا۔ انسان کو یہ توقع پُر اُمید رکھتی ہے کہ ایک ذات ایسی اعلیٰ وارفع موجود ہے جو ہر شے پر قدرت رکھتی ہے، سب دیکھ رہی ہے وہ ہماری مدد و رہنمائی کرے گی۔ اس امید پر اس کے حواس بگڑتے (nerves shatter) نہیں ہیں، مشکل آنے پر مایوسی (depression) کا شکار نہیں ہوتا، اللہ کی ذات پر امید انسان کے اعصاب مضبوط کر دیتی ہے، انسان کو ہمت اور اعتماد حاصل ہوتا ہے، کسی حال میں اس کا سر نہیں جھکتا، ہمت نہیں ہارتا اپنے رب کے ساتھ اس کا تعلق کبھی خراب نہیں ہوتا۔ صرف اس امید کی وجہ سے کہ میرا رب مجھ کو اچھا ہی دے گا۔ سورۂ مریم میں بھی ہمیں اللہ سے اس امید کا ذکر ملتا ہے جو بندہ اللہ سے لگائے رکھتا ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنے رب کو پکارا:

{عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا}(مریم:۴۸)

''مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہ رہوں گا''

اپنے رب کو پکار کر میں ناکام نہیں ہو سکتا، اتنی پختہ اُمید اور یقین تھا کہ اللہ ضرور میری دعا سنے گا اور میری مدد فرمائے گا۔ کوئی نقصان ہو جائے، کوئی مسئلہ پیش آ جائے پھر توقع رکھنا کہ اللہ بہتری کرے گا اس کا ذکر ہمیں سورۂ قلم میں بھی ملتا ہے:

{عَسٰى رَبُّنَآ اَنْ يُّبْدِلَنَا خَيْرًا مِّنْهَآ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ}(۳۲)

''امید ہے ہمارا رب اس سے بہتر دے گا ہم اپنے رب سے زاری کرنے والے ہیں''

یہاں واقعہ کچھ یوں تھا کہ چند بھائی تھے جن کے بخل کی وجہ سے ان کا سارا باغ جل کر خاکستر ہو گیا۔ جب انہوں نے اپنے جلے ہوئے باغ کو دیکھا کہ اتنا نقصان ہو گیا تو ان کی زبان پر یہ الفاظ آئے انہوں نے کہا:

{فَلَمَّا رَاَوْهَا قَالُوْٓا اِنَّا لَضَآلُّوْنَ ۙ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ}(قلم:۲۶،۲۷)

''جب انہوں نے باغ کو دیکھا تو کہا شاید ہم رستہ بھول گئے ہیں، (نہیں) بلکہ ہم محروم ہو گئے ہیں''

لیکن انہوں نے اس نقصان سے دل نہیں ہارا، اُمید قائم رکھی کہ اللہ ہی دینے والا ہے وہی لینے والا بھی ہے۔ جب ایسی سوچ ہو تو پھر نقصان بھی قابل برداشت بن جاتا ہے، شخصیت ٹوٹ پھوٹ کا شکار نہیں ہوتی۔ انسان کبھی بھی پھر نقصان کے نتیجے میں ذہنی اور نفسیاتی مریض نہیں بنتا۔ بڑے سے بڑا

نقصان بھی سہہ لیتا ہے کہ چلو اللہ مالک ہے وہ اور دے دے گا، ہمیں اسی کے سامنے عاجزی ظاہر کرنی ہے اور اسی سے مانگنا ہے۔ پھر اور کوئی قدم اُٹھانا ہو، اللہ کی خاطر کسی نامعلوم (unknown) منزل کی طرف جانا ہو تو بھی اللہ سے اُمید رکھنی چاہیے۔ سورۃ الصّٰفّٰت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول آتا ہے:

{وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ}(۹۹)

''میں تو چل پڑا ہوں اپنے رب کی طرف عنقریب وہی مجھ کو ہدایت دے گا۔''

اللہ سے امید ہو کہ اللہ کی خاطر نکلے ہیں تو اللہ کبھی رسوا نہیں کرے گا، اللہ مجھے کبھی ناکام نہیں کرے گا اور اگر دنیا میں کوئی خطا ہو گئی ہے تو اللہ معاف کر دے گا۔ یہ امید استقامت دیتی ہے ورنہ اگر یہ امید نہ ہو کہ اللہ مجھے معاف کرے گا تو نا اُمیدی انسان کو مزید اندھیروں میں دھکیل دیتی ہے۔ سورۃ الشعراء کی آیت ۵۱ میں یہ مضمون آتا ہے:

{اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ یَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰیٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِیْنَ}

''ہم کو اُمید ہے ہمارا رب ہماری خطائیں بخش دے گا کہ ہم پہلے مومن ہیں۔''

یہ اُن جادوگروں کا قول ہے جو فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کرنے کے لیے بلائے تھے لیکن وہ جادوگر سمجھ گئے کہ جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام دکھا رہے ہیں وہ محض جادو نہیں ہو سکتا اور ایمان لے آئے، اپنی پچھلی زندگی پر افسوس کیا اور انہوں نے اس اُمید کا اظہار کیا کہ اللہ ہماری وہ غلطیاں معاف کر دے گا جو ہم سے ہو چکی ہیں۔

تو اللہ سے پُر اُمید رہنا انسان کو نا اُمیدی سے بچا لیتا ہے اور اللہ سے تعلق بہت مضبوط ہو جاتا ہے۔ ایسا تو کوئی اور رشتہ یا تعلّق ہو ہی نہیں سکتا جیسا کہ خالق اور مخلوق کے درمیان ہوتا ہے۔ سورۂ طلاق میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَمَنْ یَّتَوَكَّلْ عَلَی اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ}(طلاق:۳)

''اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کی کفایت کرے گا (اللہ اس کو کافی ہو جائے گا)۔''

وہ مسبب الاسباب ہے، وہ بغیر اسباب کے، جو تم چاہو گے تم کو دے دے گا، وہ کسی کا محتاج نہیں، اسباب اس کے محتاج ہیں تو خوب مانگو، خوب پکارو۔ سورۃ النساء آیت نمبر ۸۷ میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِیْثًا﴾

''اللہ سے زیادہ کس کی بات سچی ہو گی۔''

اور ایک حدیث پاک میں ارشاد ہے:

((مَنْ لَمْ يَسْأَلِ اللهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ))(۱)

''بے شک جس نے اللہ سے سوال نہ کیا وہ اس پر ناراض ہوگا۔''

اللہ سے نہ مانگنا، سوال نہ کرنا، دعا نہ کرنا تکبر ہے جو اللہ کو بالکل پسند نہیں۔ اللہ کا وعدہ ہے:

﴿ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المؤمن: ۶۰)

''مجھے پکارو میں تمہیں جواب دوں گا، میں تمہاری سنوں گا۔''

ہمیں یقین کرنا ہے، بھروسہ کرنا ہے، وہ سنتا ہے اور حاجات پوری کرتا ہے۔ یہ اُمید یقین کے ساتھ قائم رہنی چاہیے۔ انسان مایوسی سے بچتا ہے، پُرامید رہتا ہے تو مظلومیت طاری نہیں ہوتی، خود پر ترس نہیں کھاتا (never allows self pity) مطمئن رہتا ہے، پُرسکون رہتا ہے، اللہ کی رضا میں راضی رہتا ہے اور نیکیوں پر عمل کرتے ہوئے ثابت قدم رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اللہ اس طرح ہمیں اپنی صلاحیتوں کو پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے آپ سے اچھی توقع رکھیں اور اللہ سے اپنی توقعات رکھیں۔

دوسروں سے توقعات:

دوسروں سے توقعات کو دو زمروں (categories) میں بانٹا جاسکتا ہے۔

(۱) اپنے فائدے کے لیے دوسروں سے توقعات لگانا۔ یہ تو محض اُداسی اور غم کا نسخہ ہے۔ مثلاً فلاں لوگ میرے لیے یہ کردیں گے، وہ کردیں گے۔ یہ مجھے اچھا سمجھیں گے، میری تعریف کریں گے، مجھے یہ دیں گے، مجھے وہ دیں گے۔ یہ توقعات انسان کو پریشان (upset) رکھتی ہیں، ان سے بچنے کی ضرورت ہے۔ (۲) دوسروں سے ان کے فائدے کے لیے توقعات لگانا۔ یعنی انسان کو اپنا فائدہ مطلوب نہیں ہے بلکہ ان کے فائدے کے لیے ان سے توقع لگا رہا ہے مثلاً وہ یہ کام کریں گے تو اس سے ان کو فائدہ ہوگا، دین کا پیغام ان تک پہنچا دینا کہ اگر قبول کرلیں تو ان کا فائدہ ہوگا۔ جیسے مائیں اپنے بچوں سے توقع رکھتی ہیں کہ وہ اپنی چیزیں، اپنا بستہ، کپڑے یا کھلونے خود اپنی جگہ پر رکھیں گے۔ تاکہ ضرورت پڑنے پر چیزیں ڈھونڈنی نہ پڑیں، وقت ضائع نہ ہو وغیرہ وغیرہ۔ تو اللہ کے لیے بندہ دوسروں سے توقع رکھے، اوروں سے اللہ کی بندگی اختیار کرنے کی توقع رکھے۔ اس سے آخرت میں انہی کا اجر محفوظ ہوگا اور دنیا بھی سنور جائے گی۔ ایسی توقع رکھنا احسن ہے۔

دوسروں کی ہم سے توقعات:

پھر ایک توقع وہ ہوتی ہے جو دوسروں کو ہم سے ہوتی ہے۔ اس حوالے سے محتاط رہنے کی ضرورت

---

(۱) جامع الترمذی، كِتَاب الدَّعَوَاتِ، بَاب مِنْهُ

ہے، یہ تھوڑا نازک معاملہ ہے۔ جب دوسرے ہم سے توقعات لگاتے ہیں تو ان کا کس حد تک خیال رکھا جائے، کتنی اہمیت دی جائے۔ اس معاملے میں ''شریعت'' اور ''فطرت'' دونوں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ جہاں تک شریعت نے اجازت دی ہے، وہاں دوسروں کی خواہشات کا احترام کیا جائے، یعنی والدین، شوہر یا بیوی کی، اولاد، بھائی بہن یا دیگر قرابت داروں کی توقعات کی رعایت رکھنی چاہیے، کیوں کہ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے سے تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی غیر منطقی توقع ہے یا شریعت کے خلاف ہے تو یہ پوری نہیں کی جاسکتی۔ سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

{وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا} (العنکبوت:۸)

''(تو والدین کی اطاعت کر) لیکن اگر وہ یہ تجھے مجبور کریں کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو ان کا کہنا نہ ماننا۔''

یہ توقع شریعت کے خلاف ہے۔ شریعت کے خلاف توقعات تو پوری کی ہی نہیں جاسکتیں۔ اس کے سوا جس حد تک استطاعت ہو، بس میں ہو، دوسروں کی جائز توقعات کو پورا کرنا نیکی ہے، اس کا اجر ہے، یہ احسان کا درجہ ہے۔ ایک تو ہے لوگوں کا حق ادا کرنا یہ تو فرض کا درجہ ہے، یہ تو کرنا ہی کرنا ہے، نہیں ادا کریں گے تو گناہ گار ہوں گے۔ اور دوسرا یہ کہ کسی حق سے بڑھ کر دینا، یہ توقعات پر پورا اُترنا ہوا، اوروں کی توقعات پر پورا اُترنے والا محسن بن جاتا ہے۔ یہ احسان کی روش انسانوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہیے۔ انسانوں کو حتی الامکان حق سے بڑھ کر دیں، ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا بہت اجر ملے گا۔

دوسروں سے کچھ کرنے کی توقع:

توقع کا ایک رخ یہ ہے کہ انسان کسی نیکی کے بدلے دوسروں سے توقع رکھے کہ وہ میرے لیے کچھ کریں گے۔ یعنی اگر انسان کسی کے ساتھ نیک سلوک کردے تو یہ توقع لگالے کہ اب وہ بدلے میں میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی کام کرے گا، یہ بھی ایک طرح کی فقیری ہے۔ دوسروں سے کچھ ملنے کا منتظر رہنا۔ دیکھیں، ہاتھ پھیلانے والا تو ہاتھ پھیلانے والا ہی ہے، چاہے وہ پیسے کے لیے ہاتھ پھیلائے یا کسی اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں ایک قاعدہ دیا ہے کہ

((اَلْیَدُ الْعُلْیَا خَیْرٌ مِنَ الْیَدِ السُّفْلٰی)) (۱)

''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

تو تم دینے والے بنو لینے والے نہ بنو، خود کو دوسروں کا محتاج مت کرو۔ دوسروں سے توقعات

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر۔۔۔

لگانے کا نقصان کیا ہوتا ہے۔ اب اس میں دو ہی احتمال ہیں، یا تو کوئی ہماری توقع پر پورا اُترے گا یا توقع پر پورا نہیں اترے گا۔ تیسری تو کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ اِن دونوں صورتوں میں ہمارا ہی نقصان ہے۔ توقع پر پورا اُترتے ہیں تو بھی نقصان، اور نہیں اُترتے تو بھی گھاٹا۔ وہ کس طرح سے؟ یوں کہ اگر ہم نے کسی سے توقع لگائی اور وہ پوری ہوگئی تو اُس کا احسان نہیں مانیں گے، قبول (acknowledge) نہیں کریں گے اور سراہیں گے نہیں، بلکہ سوچیں گے کہ ان کو تو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، ہم ان سے یہی اُمید (expect) لگائے ہوئے تھے۔ خاص طور پر ہمارے ہاں سسرالی رشتوں میں یہ چیز بہت پائی جاتی ہے۔ اگر ساس نے بہو سے توقع لگائی کہ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گی، خدمت گزار ہوگی اور اگر وہ یہ کر دکھاتی ہے تو ساس کہتی ہے اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، کون سا بڑا کام کیا۔ نہ اس کی تعریف کرے گی اور نہ اس کا احسان مانا جائے گا۔ تو فائدہ کیا ہوا! تعلقات بہتر تو نہ ہوئے۔

کچھ لوگ اپنی توقع کو دوسروں پر فرض کر دیتے ہیں، توقعات کو توقعات نہیں سمجھتے، اگلے کا احسان نہیں جانتے۔ سمجھتے ہیں یہ تو اس کا فرض تھا، اس کو یہی کرنا چاہیے تھا تو اس سے کوئی بہتری نہیں آتی۔ اور اگلے کے اوپر یہ چیز بوجھ بنتی چلی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس نے تو اپنی طرف سے کوئی اضافی کام خوشی خوشی کیا تھا، اب تو وہ پچھتائے گا کہ لو، یہ تو اب مجھ پر فرض ہی ہوگیا، یہ تو اب مجھ پر پابندی لگا دی کہ میں ایسا ہی کرتا رہوں۔ یہ بات تو سامنے والے کی پریشانی کا باعث بنتی ہے اور اگر پھر وہ ہماری توقعات پر پورے نہیں اُترتے تو شکایتیں اور بدمزگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک اور بات یاد رکھیں جب ہم کسی سے توقعات بڑھاتے ہیں تو وہ بھی ہم سے توقعات بڑھاتے ہیں۔ پھر وہ بھی صرف حق پر راضی نہیں رہتے۔ بلکہ اپنی بہت ساری خواہشات کو اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوئی اب توقع رکھی جاتی ہے کہ سب لوگ بخوشی مبارک باد دینے آئیں گے۔ بعض دفعہ لوگ ڈر کی وجہ سے بھی جاتے ہیں، ان کا دل بالکل نہیں چاہ رہا ہوتا مگر ان کو پتہ ہوتا ہے کہ اگر نہیں گئے تو شامت آجائے گی۔ بادِلِ نخواستہ چلے جاتے ہیں۔ اب جب اُن کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوگی اور کوئی اُن سے معذرت کرلے تو جواب ہوگا ہم بھی تو آپ کے ہاں آئے تھے، آپ کیوں نہیں آئے؟ اس طرح ہم دوسروں سے توقعات بڑھا بڑھا کر اپنی زندگیاں بوجھل بنا دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی ہلکی رہے، کوئی ہم سے بہت امیدیں نہ لگائے تو پہلا کام یہ کریں کہ خود دوسروں سے توقعات وابستہ نہ کریں۔ کسی نے کوئی بھلائی کر دی تو اچھی بات ہے، نہیں کی تو کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ رویّہ کہ میں نے فلاں کے ساتھ اتنا کیا، لیکن میرے مشکل وقت میں کسی نے ساتھ نہیں دیا، میں نے فلاں کا یہ کام کیا

مگر اُس نے شکریہ کے دو بول بھی نہیں بولے۔ یہ اُمیدیں ہماری زندگی میں تلخیاں پیدا کرتی ہیں۔

رشتہ داروں کا خیال بلا توقع اللہ کے لیے رکھا جائے:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ''اصلاحی خطبات'' میں رشتہ داروں کے بارے میں لکھا ہے کہ رشتہ داروں کا خیال محض اللہ کی خاطر رکھو۔ یہ سوچ کر اچھا سلوک مت کرو کہ یہ میرے گُن گائے گا یا میرا شکریہ ادا کرے گا یا پھر میری تابعداری کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نیک عمل کرنے کے باوجود خوشی حاصل نہ ہوگی۔ اب اگر ہم بہوؤں کی بات کریں تو وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ ساس ہر جگہ ان کے گُن گائیں، قدم قدم پر شکریہ ادا کریں اور جب ایسا نہیں کیا جاتا تو ذمہ داریاں تو پھر بھی ادا کرنا پڑتی ہیں لیکن دلی آمادگی کے بغیر، مارے بندھے، جس سے کوئی خوشی نہیں ملتی۔ اس لیے کہ اپنے آپ کو بلاوجہ دوسروں کی تعریف کا محتاج بنایا۔ اگر محض اللہ کی خاطر کریں تو اللہ کے ہاں تو بلاحساب اجر ہے اور دنیا میں بھی بندہ خوش اور مطمئن رہے گا۔ ورنہ جل جل کر، کُڑھ کُڑھ کر، رو رو کر زندگی گزرے گی کہ ہمیں صلہ نہیں ملتا، بدلہ نہیں ملتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک فقیر دوسرے فقیر سے کچھ مانگے۔ بھلا ایک فقیر کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ تو کیوں نہ بادشاہ سے مانگیں جو دینے والا ہے۔

ایک شخص کا واقعہ آتا ہے کہ کسی نے اس کو بتایا کہ فلاں بادشاہ بہت سخی ہے، ہر ایک کو نوازتا ہے، تمہاری حاجتیں بھی پوری کرے گا، یہ سن کر وہ شخص بادشاہ کے پاس اپنی حاجتیں لے کر پہنچ گیا۔ جب وہاں گیا تو دیکھا کہ بادشاہ جائے نماز پر بیٹھا ہے اور ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ شخص دروازے ہی سے واپس آ گیا۔ اُس نے سوچا جب یہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے، خود کسی کا محتاج ہے تو میں کیوں اس سے مانگوں۔ میں اُسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے یہ بادشاہ مانگ رہا ہے۔ کاش کہ ہم یہ نکتہ سمجھ لیں تو ہماری زندگیاں کتنی آسان ہو جائیں۔ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں، لوگوں کے ساتھ احسان کریں، ان کی توقعات پر پورے اتریں لیکن محض اللہ کی رضا کی خاطر!

مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی غلط فکر کی وجہ سے عربی زبان کی ایک مثل مشہور ہوگئی کہ رشتہ دار بچھو جیسے ہیں، ہر وقت ڈنک مارنے کی فکر میں رہتے ہیں، کبھی راضی نہیں ہوتے۔ یہ مثل اس لیے مشہور ہوئی کہ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اس توقع کے ساتھ کیا گیا کہ ان کی طرف سے اچھا برتاؤ ہوگا، لیکن جب توقع کے مطابق حسنِ برتاؤ نہ ملا تو پھر وہ بچھو ہو گئے، اب بُرے لگنے لگے۔ اسی طرح ساس سے یہی شکوہ رہتا ہے کہ وہ تو تعریف ہی نہیں کرتی، سسرال والے تو تعریف ہی نہیں کرتے، اگر کوئی بہو اپنی ساس یا نندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے تو شوہر

کو جا جا کر جتلاتی ہے تا کہ وہ تعریف کریں۔ اور اگر شوہر تعریف نہ کرے تو دل چھوٹا کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ یہ سراسر حماقت ہے، خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنا وقار (dignity) قائم رکھیں۔

دنیا میں راحت سے رہنے کا ایک ہی نسخہ: مخلوق سے توقعات نہ رکھنا

دنیا میں راحت سے رہنے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں سکون (tranquility) ہو۔ یہ آزمایا ہوا نسخہ ہے کہ مخلوق سے توقعات ختم کر دیں، مثلاً فلاں شخص میرے کام آئے گا، میرے ساتھ اچھا کرے گا، فلاں شخص میرے دُکھ درد، میری پریشانی و مشکل میں شریک ہوگا، میری مدد کرے گا۔ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ سے توقعات رکھیں۔ تو پھر اگر مخلوق کی طرف سے کوئی اچھائی ملے گی تو وہ خلافِ توقع ہوگی اور اس سے بہت خوشی ہوگی اس لیے کہ آپ توقع نہیں کر رہے تھے۔ اور اگر مخلوق کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو زیادہ رنج نہیں ہوگا اس لیے کہ اچھائی کی توقع تو پہلے بھی نہیں تھی، اس لیے صدمہ اور رنج زیادہ نہ ہوگا۔ ہم جو کہتے ہیں کہ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، تم سے اس کی توقع نہیں تھی، تمہارے اس سلوک سے بہت دکھ ہوا، اس طرح کی باتیں کہنا چھوڑ دیں۔ اچھائی کی توقع کے بغیر جو خوشی مل جائے وہ اضافی (bonus) خیر ہے۔

والدین کی اولاد سے بے جا توقعات:

اسی طرح والدین بھی اولاد سے بہت زیادہ توقعات قائم کر لیتے ہیں اور پھر اپنے بچوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ جو بچے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہے ہوتے ہیں اُن سے بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیوں کہ اکثر لوگ غیر حقیقی توقعات لگا بیٹھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی زندگی کا مرکز و محور ہماری ذات بن جائے لیکن یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ ان کی اپنی زندگیاں ہیں، اپنے مسائل، اخراجات، پریشانیاں، دوست احباب اور رشتہ داریاں ہیں تو ان سے اتنی توقعات لگانے سے کچھ فائدہ تو ہوتا نہیں، اُلٹا نقصان ہی ہوتا ہے کہ ماں باپ بچوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ بچے جو بھی کریں والدین کو کم ہی لگتا ہے، توقعات کا اظہار شکایتوں کی شکل میں ہوتا ہے، پژمردگی (depression) کا شکار ہو جاتے ہیں، بیمار پڑ جاتے ہیں۔

نہ شکریہ مانگو نہ شکایت کرو:

بعض لوگ اچھے گھروں میں رہ رہے ہوتے ہیں، اچھا کھانے کو ملتا ہے، معاشرے کے اندر عزت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک بیوی دی، یا اچھا شوہر دیا، یا پھر صالح اولاد دی، مگر کسی نعمت کا احساس نہیں ہوتا کیوں کہ توقع کے مطابق نہیں ملا۔ کتنی ناشکری اور اپنے آپ کو اذیت دینے والی

بات ہے۔خود اپنی شخصیت کچل کر رکھ دیتے ہیں،خود کو دوسروں کا محتاج کرتے ہیں۔اس کا علاج یہ ہے کہ فیصلہ کرلیں کہ ایک ہفتہ تک کوئی شکایت نہیں کرنی۔نوکر نہیں آیا، پانی نہیں آیا، بجلی یا گیس ختم ہوگئی۔ساس نے شکریہ نہیں کہا،نند نے گھر کے کام میں مدد نہیں کی، یہ سب شکایتیں ایک ہفتہ کے لیے چھوڑ دیں۔ان شاءاللہ تعالیٰ اللہ کی مدد سے توقعات سے چھٹکارا مل جائے گا۔اپنی ذمہ داری اور فرائض پوری طرح ادا کریں، سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔اگر شکریہ کے لیے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کیں تو دنیا میں شکریہ کی صورت میں صلہ پالیا، پھر اللہ کے ہاں اجر نہیں ہوگا۔قرآن میں آتا ہے کہ:

{اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا} (الدھر: ۹)

(''نیک لوگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے) ہم تو کھلاتے ہیں تم کو اللہ کی خاطر، ہم تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر چاہتے ہیں۔''

ہم اپنی ذات کی بڑائی کے لیے نیک سلوک نہیں کرتے، ہم اللہ کی رضا اور خوشی حاصل کرنے کو یہ نیکیاں کرتے ہیں تو دوسروں کا شکریہ اور دعا (جزاک اللہ) زیادہ سے زیادہ دیا کریں اور دوسروں کے احسانات کو یاد رکھیں۔

خواتین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب وہ رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں تو کتنی پریشان ہوتی تھیں۔اب اللہ نے شوہر دیا، اپنا گھر دیا تو شکر نہیں کرتیں، قدر نہیں کرتیں۔اور ذرا سوچیں کہ جن چیزوں کی شکایت کرتی ہیں وہ کتنی بے ضرر ہوتی ہیں۔کوئی ساس کوڑے لے کر مار پیٹ نہیں کرتی، نہ بھوکا پیاسا رکھتی ہے، نہ شوہر سے ملنے سے روکتی ہے، کوئی بھی ایسی نہیں، بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوک جھونک ہوتی ہے تو سوچیں اس سے بہتر متبادل (alternate) کیا تھا؟ اگر آج تک گھر بیٹھی رہتی تو اچھا تھا؟ تو کیا وہ زندگی بہتر ہوتی؟ پُرسکون ہوتی؟ جب اللہ تعالیٰ نے ارمان پورے کردیئے تو وہ کافی نہیں لگتا۔اگلے گھر آتے ہی بہت سی توقعات لگالیتی ہیں۔

جب احسانات کو یاد رکھتے ہیں تو دل کے اندر جگہ بنتی ہے۔اور اگر کدورت آرہی ہے تو اس بندے کو چاہیے کہ جس سے گلہ شکوہ پیدا ہورہا ہے اس کو تحفہ دیں، اس کے ساتھ وقت گزاریں۔جب توقع پوری نہیں ہوتی تو ہم کھنچ جاتے ہیں، پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اس سے دُوری پیدا ہوجاتی ہے۔تو آپ اپنی طرف سے اپنے مقام پر قائم رہیے، آپ کو پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، احسان کی روش پر قائم رہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''اللہ تو محبت کرتا ہے محسنوں سے''، جس سے اللہ محبت کررہا ہے اس کو کسی کی محبت کا رونا رونے کی ضرورت نہیں۔

جن توقعات کو پورا کرنے کے نتیجے میں یعنی احسان کے نتیجے میں اللہ جنت جیسی نعمت دے رہا ہے

تو پھر کسی اور سے کیا شکریہ چاہیے؟ کیا بدلہ مطلوب ہے؟ اور انسان یہ بھی یاد رکھے کہ کس کس موقع پر میں دوسروں کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ ہمیں یہ تو یاد ہی نہیں رہتا لیکن اگر دوسرے ممنون نہ ہوں تو ہماری انا پر چوٹ لگتی ہے یہ بھی بیمار انا کی نشانی ہے۔ یاد رکھیں کہ میں کب کب لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی انسان سب کی توقعات پر پورا اتر جائے، ماں باپ، بہن، بھائی، شوہر، سسرال، اولاد، انسان کے اندر کتنی کمی ہے یہ بات یاد رہے گی تو دوسروں کی کمزوری کا بھی احساس رہے گا۔ اب توقعات بعض دفعہ بہت بڑھ جاتی ہیں۔ رشتہ جتنا قریبی ہوتا ہے توقعات اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ رشتہ بہت ہی قریبی ہو جائے مثلاً شوہر بیوی کا، تو بیوی کی توقع ہوتی ہے کہ بغیر کہے شوہر جان لے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ کہنا کچھ نہیں بس ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ میں کیا چاہ رہی تھی یہ تو انتہائی غیر حقیقی توقع ہے۔ ہر شخص تو ایسا مزاج شناس نہیں ہوتا کہ چہرے کے تاثرات کو سمجھ جائے کہ دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے جیسے سر میں درد ہے منہ سے نہیں کہوں گی خود شوہر میری تکلیف کو سمجھ جائے اور دوائی لا دیں۔ پھر غصہ آتا ہی رہے گا، کسی کو میرا احساس نہیں، قدر نہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی غیر حقیقی توقعات ہیں جو لوگ رکھتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ

((لاتسئل الناس شیئا))(۱)

''تم لوگوں سے کچھ نہ مانگنا۔''

ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہاتھ سے کوڑا یا چابک گر جاتا تو ارد گرد کھڑے لوگوں سے نہیں کہتے تھے بلکہ خود اُتر کر چابک اُٹھاتے تھے، خود ہی سارے کام کیا کرتے، اتنی بھی توقع نہ رکھی کہ اتنا چھوٹا کام بھی کسی سے کروالیں۔ تو حقیقت ہے کہ یہ خوش رہنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس میں انسان متحرک (active) رہتا ہے، ذہنی طور پر پُرسکون (relax) رہتا ہے، اپنے آپ کو مظلوم نہیں سمجھتا، اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میرا رب سب دیکھ رہا ہے۔ ساری توقعات اللہ سے لگا لیجیے، اللہ آپ کو آپ کی توقعات سے بڑھ کر دے گا۔ اللہ سے آپ جو بھی توقع لگائیں گے وہ حقیقی (realistic) ہوں گی جب کہ انسانوں سے لگائی گئی توقعات بعض دفعہ غیر حقیقی ہو جاتی ہیں تو یہ تکلیف کا، صدمے کا سبب بنتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم دوسروں کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کریں اور دوسروں سے توقعات کم سے کم کریں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور ہمیں خوش اور پُرسکون رہنے کا گُر سکھا دے اور وہ گُر یہ ہے کہ دوسروں سے توقعات نہ رکھی جائیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزكاة، باب كراهية المسألة

تصورات

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَعُوۡذُبِکَ مِنۡ مُنۡکَرَاتِ الۡاَخۡلَاقِ وَالۡاَعۡمَالِ وَالۡاَھۡوَاءِ وَالۡاَدۡوَاءِ))(۱)

''اے اللہ! بے شک میں بُرے اخلاق، بُرے اعمال، بُری خواہشوں اور بُری بیماریوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

ہم توقعات پر بات کر چکے ہیں کہ اللہ سے جو توقعات لگائی جاتی ہیں ان کو'' توکّل'' کہتے ہیں۔ اللہ پر توکّل کرنے کا اور اُس سے توقعات وابستہ کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ انسانوں سے توقعات رکھنے کے کیا فائدے اور نقصانات ہیں؟ ان پہلوؤں پر بات ہو چکی۔ توقع دراصل ہے کیا؟ انسان کا ایک خیال، ایک سوچ یا پھر ذہن کا ایک ''تصور۔'' قرآن حکیم میں لفظ ''تصور'' تو استعمال نہیں ہوا لیکن اس کے قریب تر معنی کا لفظ ''ظن'' قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی سوچنا (conjecture) اور تصور (imagine) کرنا۔ بالفاظِ دیگر کسی شے کو سوچنا ''تصور'' اور اس کے بارے میں کچھ خیالات رکھنا ''تصورات'' کہلاتا ہے۔

ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا جس میں دین اور دنیا کی بہتری ہو۔ یہ تصور انسان کو فائدہ دیتا ہے، اس کا عمل بہتر بناتا ہے اور اس کی شخصیت بھی نکھرتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے ''تذلل'' پر بات کی تھی کہ اگر کوئی شخص تذلل کا شکار ہے اور اپنے اندر سے اس احساسِ کمتری کو دور کرنا چاہتا ہے تو اپنے اُس عیب پر توجہ دے جو احساسِ کمتری کا سبب بن رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی خرابی یا کمی ہو جس کی وجہ سے وہ تذلل کا شکار ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی گناہ سے نہیں بچ پا رہا۔ اب سب سے پہلے تو وہ یہ تصور کرے کہ میں نے اس گناہ کو ترک کر دیا ہے، اللہ کے فضل سے مجھے نجات مل گئی ہے۔ اور دوسری طرف اُس گناہ سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ تو جب یہ عیب نکل جائے گا تو تذلل بھی دُور ہو جائے گا۔ کسی بھی ارادے کی یا کسی بھی اچھے عمل کی ابتدا تصور سے کی جاسکتی ہے۔ اچھا ارادہ بھی تصور ہی ہے، ایک خیال ہے جو دماغ میں آیا۔ اس طرح تصور کی مدد سے تذلل دور ہو جائے گا۔ پھر اگر کسی شخص کا غصہ تیز ہے اور وہ اپنے غصے کی وجہ سے پریشان ہے، اس پر قابو پانا چاہتا ہے۔ غصہ اس کی شخصیت کو بدنما کر رہا ہے، عیب دار کر رہا ہے تو کیا کرے؟ تصور کرے کہ مجھے غصہ نہیں آتا، تصور میں لے کر آئے کہ میں ٹھنڈے مزاج کا ہوں اور

(۱) جامع الترمذی، کِتَاب الدَّعَوَاتِ، بَاب دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ

ان حالات (situations) کا تجزیہ کرے جن میں اُسے غصہ آتا ہے۔ اور پھر تصور میں لائے کہ کوئی مجھے غصّہ دلا رہا ہے، اور میں کس کس طرح اپنے غصے کو ضبط (control) کر رہا ہوں۔ اپنے تصور میں یہ مشق (practice) کرے کہ مجھے غصہ دلایا جا رہا ہے مگر میں خاموش ہوں، کوئی ردعمل نہیں دکھا رہا۔ میں نے کچھ عملی اقدامات کر لیے مثلاً پانی پیا، کھڑا ہوا تھا تو بیٹھ گیا، بیٹھا ہوا تھا تو لیٹ گیا، استغفار پڑھنے لگا، وضو کرنے چلا گیا۔ یہ سب سوچیں ذہنی مشق (rehearsal) ہیں۔ یوں سمجھیں کہ تصور یا ظن خود کار تجویز (auto suggestion) کا کام کرتا ہے۔ اپنے آپ کو ہم خود تجویز (suggest) کر رہے ہوتے ہیں کہ اس طرح کے حالات میں ہمیں اس قسم کے رویّے کا اظہار کرنا چاہیے۔ تو جب ہم اس طرح اپنے تصور میں اپنی کمزوریوں سے لڑتے رہیں گے تو ان شاء اللہ حقیقی زندگی میں بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کی آواز بہت اونچی ہے، بہت چیخ کر بولنے کی عادت ہے تو تصور کریں کہ آپ دھیمی آواز میں بات کر رہے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب سے، اپنے دوست احباب سے مناسب آواز میں محوِ گفتگو ہیں۔ لہٰذا جب حقیقی صورتِ حال (real life situation) پیش آئے گی تو اپنی کمزوریوں اور عیوب پر قابو پانا بہت آسان ہو جائے گا۔ ایک اور مثال دیکھیں کہ کچھ لوگ بیٹھے آپس میں کسی کی غیبت کر رہے ہیں اور آپ کو یہ غیبت بہت بُری لگ رہی ہے۔ کیوں کہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ اب تصوّر کریں کہ میں گفتگو کا رُخ کس کس طرح بدل سکتا ہوں کہ لوگوں کی توجہ غیبت سے ہٹ جائے۔ تاکہ جب ایسی کوئی صورت حال سامنے آئے تو آپ ذہنی طور پر اس کا تدارک کرنے کے لیے تیار ہوں، اس کو سنبھالنے کی تیاری آپ پہلے سے کر چکے ہوں۔

یہ جو کامیاب بزنس مین ہوتے ہیں ان کے بارے میں سروے (survey) کیا گیا کہ جب انھیں کسی اہم اجلاس میں جانا ہوتا ہے تو یہ پہلے اپنی تیاری (home work) کے طور پر پوری میٹنگ کو ذہن میں لے آتے ہیں، اس کا ایک خاکہ تصور میں بنا لیتے ہیں، کون کون میز پر بیٹھا ہوگا، کس ترتیب (order) سے بیٹھے ہوں گے، کہاں کیا چیز پڑی ہوگی، میرے دائیں بائیں کون ہوں گے۔ پھر یہ پوری مشق کرتے ہیں کہ کیا کیا کہنا ہے، کیا کیا زیرِ بحث (discuss) لانا ہے، کیا باز پرس (inquiries) کرنی ہے، اس پورے منظر نامے کو تصور میں لے آتے ہیں۔ تو جب یہ لوگ اس طرح ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر کے وہاں جاتے ہیں تو یقیناً تمام معاملات قابو (control) میں رہتے ہوں گے، ایسے موقعوں پر یہ لوگ دوسرے لوگوں کے متوقع رویّے کو بھانپ لیتے ہیں اور کسی بھی طرح کی صورتحال سے نپٹنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، یہ سب تیاریاں پہلے سے کر کے رکھتے ہیں۔ جو کامیاب کمانڈر ہوتے ہیں وہ پہلے سے منصوبہ بندی کر کے جنگ میں جاتے ہیں، اور تین چار قسم کے

لائحہ عمل (strategies) پہلے سے تیار کر کے میدان میں اترتے ہیں۔ دشمن کی چالوں کا پہلے سے ہی حل نکال کر بوقت ضرورت اطلاق کرتے ہیں اور دشمن کو پسپا کر دیتے ہیں۔

اللہ نے صرف انسانوں کے اندر قوتِ تصوّر رکھی ہے، یہ حیوانوں میں نہیں ہوتی۔ اس طریقے سے مختلف حالات میں مختلف قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنا مشکل نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت میں تصوّر کی صلاحیت اللہ نے رکھی ہے اور قرآن کے تمام احکامات بھی انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ قرآن اپنے قاری کی قوتِ تخیل (Power of imagination) کو، قوتِ تصوّر کو بہت اُبھارتا ہے۔ لفظوں میں تصاویر کھینچی جاتی ہیں تاکہ ہمارا تصور متحرک (activate) ہو جائے، ہمارا تصوّر زرخیز ہو جائے۔ قرآن میں کئی بار آتا ہے {وَلَوْ تَرٰی} ''کاش تم دیکھو۔'' {وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ} ''تم نے کیا سوچا وہ بدلے کا دن کیا ہے۔'' {ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ} (الانفطار: ۱۸،۱۷) پھر تم نے کیا سوچا وہ بدلے کا دن کیا ہے۔'' پھر قرآن کی مختلف سورتوں میں آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے مثلاً ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، سوچیں ذرا وہ کیا منظر ہوگا؟'' آسمان کی طرف دیکھ کر تصور کریں کہ یہ وسیع و عریض آسمان کیسے پھٹے گا۔ سورج کیسے لپیٹا جائے گا، سورج جو اتنی قوت اور توانائی اور حرارت دے رہا ہے، وہ کیسے لپیٹ دیا جائے گا۔ ان باتوں سے تذکیر حاصل کرنے کا ہمارے تصورات سے گہرا تعلق ہے۔

تصورات کا اثر عمل پر پڑتا ہے اور جب انسان قیامت کی تیاری کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ تصورات مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کا کیا نقشہ کھینچا ہے، ہماری تصور کی آنکھ کو روشن کیا گیا، اُجاگر کیا گیا، اور ہمیں سوچنے پر مجبور کیا گیا کہ یہ ہے جنت جو تمہارے لیے تیار کی گئی ہے۔ سو تیاری کرو، تاکہ اپنا ٹھکانہ اس پُرسکون، پُرامن، خوبصورت، دلکش، دل نشین مقام پر بنالو۔ اگر کوشش کرو تو اس کو اپنا لو گے، یہ تمہارے نام ہو جائے گا۔ سورۃ رحمٰن میں کیا خوب صورت نقشہ ہے۔

{وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ}

(الرحمٰن:۔ ۴۶-۴۷-۴۸)

''اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت) ہیں۔''

یعنی دو باغ ہیں گھنیرے، سبز اور سایہ دار۔ ان آیات سے انسان کے ذہن میں ایک سکون

(tranquility) کا احساس پیدا ہوتا ہے۔کون نہیں چاہے گا ایسی جگہ بسیرا کرنے کا! ہر طرف پھل، پھول، نہریں، آبشاریں، گھنے گھنے سایہ دار درخت، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، سکون، آرام، کوئی فکر، کوئی پریشانی نہیں، کھانا پینا بافراغت ہے۔ یہ سب تصور کر کے ایک سکون کا احساس ہوتا ہے۔اور دیکھیں کہ تصور کیسے انسان کو پُرسکون کرتا ہے۔اور ایسے ہی تصور کی طاقت انسان کو پریشان بھی کرتی ہے جب جہنم کا نقشہ پیش ہوتا ہے۔لوہے کے ہتھوڑے برسائے جائیں گے، کھولتا پانی ان کے اوپر انڈیلا جائے گا، ان کی کھالیں جب پک کر اتر جائیں گی تو دوبارہ کھالیں اُگ آئیں گی تاکہ بار بار جلنے کا مزہ چکھیں۔ پینے کو خوفناک چیزیں دی جائیں گی، زقوم کھانے کو ملے گا۔تصورِ عذاب ہی سے جھرجھری آتی ہے، ڈر لگتا ہے۔انسان کی سوچ اور انسان کے تصورات انسان کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اچھی چیزیں سوچنے سے خوشی محسوس ہوتی ہے اور تکلیف دہ چیزیں سوچنے سے انسان افسردہ اور بیمار ہوجاتا ہے۔محض تصور ہی سے یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں تو یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔جسمانی اور ذہنی صحت کا بڑا گہرا تعلق ہمارے تصورات سے ہے۔تصور میں یہ سب لائیں گے تو تیاری بھی کریں گے اور اگر تصور میں نہیں لائیں گے تو تیاری بھی نہیں کریں گے۔

تو یہ تصور بہت اچھی چیز ہے قرآن میں اس کے لیے ''ظن'' کا لفظ آیا ہے۔پھر ''تذکر اور تفکر'' بھی دراصل تصورات ہی کی شکلیں ہیں۔یہ سب تصورات کے اچھے استعمالات ہیں۔دنیا میں جتنی بھی ایجادات ہوئیں ہیں ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ تصور ہی سے تو ہوئی! پہلے ذہن میں ایک خاکہ یا نقشہ بنتا ہے کہ یہ چیز یوں ہوسکتی ہے، پھر قدم بڑھاتے بڑھاتے، تصور کرتے کرتے، ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔

تصور کا استعمال غلط ہو تو وہ نقصان دہ ہوجاتا ہے۔مثال کے طور پر سورۃ الکھف میں مضمون آتا ہے:

{وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا}

(الکھف: ۳۶)

''میں تو تصور نہیں کرسکتا کہ قیامت آئے گی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹایا بھی جاؤں تو ضرور اس سے اچھی جگہ پاؤں گا۔''

جن چیزوں کے بارے میں یقینی خبر آچکی، ان پر یقین نہ کرنا اور اس کے برعکس یا مختلف تصور قائم کرلینا انسان کو شک میں مبتلا کردیتا ہے۔حقیقت کے برخلاف اگر کسی نے اپنی مرضی سے تصور قائم کرلیا تو یہ کیا ہوا؟ خود ہی سوچ لیا، کوئی ذہن میں خاکہ (image) بنالیا جو حقیقت سے بالکل مختلف ہے۔تو ان دو چیزوں کا جب ٹکراؤ (clash) ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں شک (Doubt)

جنم لیتا ہے۔ سورۂ جاثیہ کی آیت ۳۲ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا}

''اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ بے شک حق ہے، (سچا ہے، حقیقت ہے) اور قیامت اس کے آنے میں تو کوئی شک نہیں'' تم نے کہا ''ہم نہیں تصور کر سکتے کہ یہ قیامت کیا ہوتی ہے، گمان سا ہوتا ہے اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں۔''

غور کریں کہ ان کو حق پر کیوں یقین نہ آیا؟ شک کی وجہ سے! تو انسان کو چاہیے کہ اپنے تصوّر کو قرآن کے تابع رکھے۔ اگر قرآن سے ہٹ کر کوئی تصور قائم کریں گے تو شک کا مرض جنم لے گا۔ غلط تصوّر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بغیر ثبوت (proof) کے دوسروں کے بارے میں کوئی تصور قائم کر لیا جائے۔ خود ہی سوچ لیا، خود ہی تصور گھڑ لیا، خود ہی اندازہ لگا لیا تو یہ ظن اور گمان نقصان دہ ہوتا ہے۔ سورۃ الحجرات میں اللہ نے فرمایا:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ} (۱۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان کرنے سے بچو۔ بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں کون سے گمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ یعنی لوگوں کے بارے میں سوچنا کہ وہ ایسا ہے، ویسا ہے۔ آگے فرمایا بعض گمان گناہ بن جاتے ہیں۔ یعنی ہر تصور کو منع نہیں کیا، بدگمانی کو منع کیا گیا ہے۔ بدگمانی بھی تصور کی ایک قسم ہے، بغیر جواز کے کسی کے بارے میں تصور کر لینا کہ وہ میرا بُرا چاہتا ہے یا وہ میرا دشمن ہے۔ یہ چیز رویّے میں خرابی اور بگاڑ پیدا کرتی ہے، تعلقات میں کھچاؤ اور بگاڑ آجاتا ہے۔ تو بلا ثبوت تصور کو بھی منع کیا گیا ہے۔

تصور انسان کو متحرک (motivate) بھی کرتا ہے۔ کوئی شخص مشکلات میں گھرا ہے یا کسی پریشانی کا شکار ہے اور وہ تصور کرے کہ ان مشکلات کا نتیجہ اچھا نکلے گا تو پھر وہ مشکلات ہلکی لگنے لگتی ہیں۔ لہٰذا اچھا گمان رکھیں، اچھا تصوّر کریں ورنہ اگر بُری بُری باتیں سوچتے رہیں گے تو خرابی ہی خرابی ہے۔ جو محنت کر رہا ہے، جو مشقت کر رہا ہے، جو پریشانی اُٹھا رہا ہے، اسے چاہیے کہ انجام کے بارے میں ضرور سوچے کہ اس کا انجام کتنا اچھا ہوگا۔ اس طرح بندہ مطمئن اور پُرامید رہتا ہے، کام میں لگا رہتا ہے۔ مثال کے طور کوئی بچہ امتحان کی تیاری میں کتنی مشکل اٹھا رہا ہوتا ہے، کھیل کود چھوڑ کر، دیگر مشغلے ترک کر کے، تیاری (preparation) میں مصروف ہے۔ یہ سب وہ اچھے نتیجے کے لیے برداشت کرتا ہے۔ اب اگر وہ تصور کرے کہ اتنی محنت کے باوجود اگر فیل ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس

طرح کا تصور اُس بچے کو پڑھائی سے دور کر دے گا۔

اُمید کیا ہے؟ یہ بھی تصوّر ہی ہے۔ مثلاً جب کسی کی شادی ہوتی ہے تو عموماً ایسے موقع پر اچھی اُمید رکھی جاتی ہے، کہ اب زوجین ایک نئی زندگی شروع کریں گے، اپنا گھر ہوگا، بچے ہوں گے وغیرہ۔ پھر وہ اس کے لیے بھرپور محنت اور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر شادی سے پہلے ہی لڑکی سوچ لے کہ میری شادی کامیاب نہیں ہو سکے گی، مجھ سے میرے سسرال والے خوش نہیں رہیں گے، میرا شوہر مجھ سے محبت نہیں کرے گا، میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ تو یہ نا اُمیدی اُس کی شادی کی ناکامی کی باعث بن جائے گی۔ تو بُرا تصور انتہائی حوصلہ شکن (demotivating) ہوتا ہے، یہ خود کو تکلیف پہنچانا ہے، اپنے آپ کو اذیت (torture) دینا ہے۔ اور اچھی اُمید رکھنا، اچھی سوچ رکھنا، اچھے تصورات رکھنا، انسان کو شاداب (fresh) رکھتا ہے اور انسان سعیِ پیہم کرتا رہتا ہے، بڑی بڑی دشوار گھاٹیاں عبور کر لیتا ہے، اِس اُمید پر کہ ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔

تخیل:

حقائق پر مبنی چیزوں کے بارے میں سوچنا تصوّر کہلاتا ہے اور غیر حقیقی، غیر معقول چیزوں کے بارے میں سوچنا ''تخیل'' کہلاتا ہے۔ خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا (flights of fancy)، عمل کا، محنت کا، کوئی ارادہ نہ ہو، نہ اپنے آپ کو متحرک (motivate) کرنے کا ارادہ ہو، صرف خیالوں ہی خیالوں میں زندگی گزار دینا، خیالی پلاؤ پکانا۔ بعض لوگوں کو اس تخیل کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ فریبِ خیال (hallucination) میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔ یہ منشیات (drugs) بھی دراصل کیا کام کرتی ہیں؟ انسان کو تخیل کی دنیا میں لے جاتی ہیں، ٹھوس حقائق سے بالکل رشتہ کاٹ دیتی ہیں۔ انسان کسی غیر حقیقی، غیر عقلی دنیا میں، خوابوں خیالوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے "if wishes were horses, beggars would ride" یعنی اگر تخیلات سے کوئی بہتری ہوتی تو فقیر سب سے آگے ہوتے۔

یہ جو بچوں کی کہانیاں (fairy tales) ہوتی ہیں جن میں پریاں ہوتی ہیں، خوفناک دیو ہوتا ہے، یہ کہانیاں بچوں کو پریوں کے دیس میں لے جاتی ہیں۔ کیا پریوں کے دیس کا کہیں وجود ہے؟ کیا پریاں اصل میں کوئی مخلوق ہیں؟ نہیں! یہ صرف تخیل ہے، کوئی تصور نہیں۔ خوبصورت شہزادے (charming prince) کا تصوّر، سنڈریلا (cinderella) کا تصوّر، یہ سب تخیل ہے، اور یہ انسان کی شخصیت پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ انسان کی قوتِ عمل کو شل اور بے حس کرنے والی چیز

ہے۔ جب کہ ''تصوّر'' قوتِ عمل کو بڑھانے والی چیز ہے، عمل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تخیل انسانی ذہن کو مفلوج (paralysed) کر دیتا ہے، جیسے کہ شیخ چلی کی کہانیاں۔ جب شیخ چلی بازار میں مرغی کے انڈے بیچنے جا رہا تھا اور ایک منصوبہ (plan) بنا رہا تھا کہ میں انڈے بیچ کر یہ خریدوں گا، پھر وہ خریدوں گا، یونہی کاروبار کرتے کرتے نواب اور امیر کبیر بن جاؤں گا لیکن چلتے چلتے ایک ٹھوکر لگی اور سارے انڈے گر کر ٹوٹ گئے اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انہی کہانیوں نے بچوں کو اس خیالی دنیا کا باسی بنا دیا ہے۔ اب لڑکیوں کے دماغ میں اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر بھی ویسی ہی ہے، یعنی خوبصورت اور پُروجاہت، (tall and handsome) جس کا کہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے آج کل لڑکیوں کے لیے شوہر کا معیار صرف ظاہری شکل وصورت اور مال و دولت رہ گیا ہے۔ متقی، نمازی یا شریف النفس انسان نہیں چاہیے۔ لڑکوں کو بھی فلموں اور کہانیوں والی شہزادیاں چاہیے۔ لمبی، دبلی، گوری اور سانچوں میں ڈھلی ہوئی باربی (barbie) چاہیے۔ اس تخیل کو اتنا زیادہ اُبھارا گیا ہے کہ لوگوں کا معیار ہی اس قسم کی لڑکیاں بن کر رہ گئی ہیں کہ لڑکی ہو تو ایسی ہو۔

اسلام ہمیں تخیلات سے نکال کر تصورات میں لے کر آتا ہے۔ حقیقی چیزوں کے بارے میں سوچو، خوابوں کی دنیا میں مت رہو۔ گناہوں کے خیال سے لذّت لینا بھی گناہ ہے، گناہ کر نہیں سکتے تو گناہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں، مثلاً کسی نامحرم کا خیال ہمہ وقت دل میں پالنا، اس کے بارے میں سوچنا۔ زیادہ تر شاعری تخیل ہی تو ہے۔ سورۃ الشعراء آیت ۲۲۵ اور ۲۲۶ میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

{ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ ○ وَ اَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ ○ }

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرمارے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں۔''

شاعر ہر وادی میں دیوانہ وار پھرتے ہیں، کبھی آسمانوں کی بات کریں گے تو کبھی زمین کی۔ ہر مصرعے میں مختلف داستان بیان ہوتی ہے، مختلف حالات کا ذکر ہوتا ہے، ایک انتہا (extreme) سے نکلیں گے تو دوسری انتہا (extreme) میں جا پہنچیں گے۔ اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ تو تخیل انسان کا کردار کمزور کر دیتا ہے لہٰذا اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ تخیل کی انتہائی شکل یہ ہوتی ہے کہ باقاعدہ کچھ لوگ نظر آنے لگتے ہیں، یہ تو خیر بیماری (schizophrenia) ہے، بندہ مجبور ہوتا ہے اس کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا لیکن یہ بھی تخیل ہی کا بگاڑ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دو چیزیں ہیں

''تصورات'' جو مثبت (positive) قوت ہے اور تخیلات جو کہ منفی (negative) چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تصوّرات پر توجہ (focus) رکھنے کو کہا ہے۔ جنت کا تصوّر کرو، جہنم کا تصوّر کرو، قیامت کا تصور کرو۔ حشر کا میدان ذہن میں لاؤ۔ اپنے آپ کو بہتر بنانا چاہتے ہو تو پہلے اپنے آپ کو بہتر تصوّر کرو۔ تم مثبت سوچیں سوچو۔ اگر منفی سوچو گے، خراب تصورات ذہن میں لاؤ گے تو افسردہ (depress) ہو کر بے عمل ہو جاؤ گے۔ فطرت میں اللہ تعالیٰ نے تصوّر کی قوت اس لیے رکھی ہے کہ ہم ظاہر کو ہی سب کچھ نہ سمجھ بیٹھیں بلکہ اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اپنے تصور کا استعمال کر کے چیزوں کی حقیقت دیکھ لیں، اَن دیکھی چیزوں کو مان لیں، ہمارا ایمان تو ایمان بالغیب ہی ہے۔ حقیقت تو غیب کے پردے میں ہے، وہ تو اس دنیا سے تعلق ٹوٹنے کے بعد ظاہر ہوگی۔ ہم غیبی دنیا کا تجربہ اپنی آنکھوں سے تو نہیں کرتے، نہ سونگھتے ہیں، نہ چکھتے ہیں، نہ کسی اور طرح محسوس کرتے ہیں، تو اگر ہمارے پاس قوتِ تصور نہ ہوتی تو ہم غیب پر کبھی ایمان نہ لا پاتے۔ تو تصور بہت مبارک چیز ہے۔

اَمَانیّ:

قرآن حکیم میں غلط تخیلات کے لیے ''اَمَانی'' کا لفظ آتا ہے۔ شیطان کہتا ہے میں لازماً انھیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤں گا۔ جھوٹی آرزو تخیل ہی ہے۔ جھوٹی آرزو ہی نے تخیل کے ذریعے شرک کا چرچا دنیا میں کر دیا۔ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیوی دیوتا گھڑ لیے۔ تو یہ انسان کو عقیدے کی خرابی کی طرف لے کر گیا اور عمل میں بھی خرابی کا باعث بنا۔

''توہمات'' (superstitions) دراصل تخیل کی ایک شاخ ہے جس کو ہم وہم ہو جانا کہتے ہیں۔ مثلاً اگر شیشہ ٹوٹ جائے تو سہاگ پر آنچ آنے والی ہے، ازدواجی زندگی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے، یا کالی بلی راستہ کاٹ گئی تو پریشانی آنے والی ہے اور اگر سیڑھی کے نیچے سے گزر گئے تو بُرا شگون ہے۔ یہ سب ''توہمات'' ہیں اور یہ تخیل ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ چیزیں پھر انسان کو بزدل بنا دیتی ہیں، اللہ سے دُور کر دیتی ہیں، عمل کے اندر شرک پیدا ہونے لگتا ہے۔ تخیل کا اور وہم کا علاج یہ ہے کہ شرک پر جو آیات آئی ہیں، اُن پر غور کیا جائے۔ جتنی زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہوگی، جتنی اللہ سے قربت ہوگی، اتنا ہی ''تخیل'' اور ''وہم'' کا علاج ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ تخیل اور وہم مٹ جائے گا اور اس کی جگہ صحیح چیز کا تصوّر دماغ میں آجائے گا۔ سوچوں سے اور خیالات ہی سے متعلق ایک چال ہے جو شیطان استعمال کرتا ہے اور وہ ہے ''وسوسہ'' (compulsive thought)۔ سورۃ الناس میں شیطان کا نام ہی ''وسواس'' آیا ہے، جس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

{مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ ۙ الْخَنَّاسِ} (الناس:۴)

''جو پھسلائے بدی سے اور چھپ جائے۔''

شیطان بار بار آتا ہے، پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ حدیثِ پاک میں مضمون آتا ہے کہ شیطان کی تھوتھنی جیسی ناک ہوتی ہے، جس طرح کسی کُتے کی یا اسی سے ملتے جلتے کسی اور جانور (dog family) کی ہوتی ہے۔ وہ انسان کے دل پر اپنی ناک رکھتا ہے، سونگھتا ہے، اگر وہ دل اللہ کے ذکر میں مصروف ہوتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر اللہ کے ذکر سے غافل پاتا ہے تو دل میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے، دل پر قابض (occupy) ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے، شیطان انسان کے جسم میں ایسے گردش کرتا ہے جیسے خون گردش کرتا ہے، جس طرح دل جسم میں خون رواں کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کے وسوسے اور شیطانی خیالات بھی پورے جسم میں گردش کرتے ہیں۔ اور پھر شیطانی اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ اس وسوسے سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تزکیہ کا ایک اہم ہدف دلوں کو وسوسوں سے بچانا ہے۔ اور اگر وسوسے سے پوری طرح بچانے پر ہم قادر نہ ہوں تو کم از کم اس پر عمل نہ کریں۔ جو فاسد خیال دل میں آیا ہو اس پر عمل نہ کریں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وسوسے کے بارے میں پوچھا گیا کہ دل میں کفر اور شرک اور فسق فجور کے جو وسوسے آتے ہیں اُن کا کیا حکم ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ وسوسے خالص ایمان کی علامت ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس قول سے کتنا اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ مومن کے لیے تو گناہ کا خیال وسوسے سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب کہ کافر یا منافق کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس خیال پر عمل کر جاتا ہے۔ تو اگر کسی خیال کو وسوسے تک ہی محدود کر دیا، یہ ایمان کی وجہ سے کیا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات کہی کہ میرے دل میں ایسے ایسے وسوسے آتے ہیں کہ میں اُن کو زبان پر لانے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ میں جلا کر راکھ کر دیا جاؤں۔ تو میں کیا کروں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ تو ایمان کی علامت ہے۔ ایمان تھا تو تمہیں یہ خیال آیا کہ یہ غلط وسوسہ ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو تم کو احساس بھی نہ ہو پاتا کہ یہ غلط خیال ہے۔'' اور دوسری بات یہ کہ چور وہیں پر آتے ہیں جہاں کوئی خزانہ ہو۔ جس دل میں ایمان کی دولت ہے، وہیں شیطان ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وسوسوں کے ذریعے سے۔ یہ وسوسہ شیطان کا عمل ہے اور شیطان ایمان کا چور ہے۔ اور وسوسے پر پریشان ہونا ایمان کی علامت ہے، ورنہ اگر کفر ہوتا تو بُرے خیالات پر پریشانی نہ ہوتی۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کا شکر

ہے کہ اس نے شیطان کے مکر کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا۔ کتنی پیاری بات ہے شیطان کی چال کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا، بس خیال تک محدود رہ گیا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے درگزر فرمایا ہے۔'' گناہ کا وسوسہ دل میں آئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا، جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔ گناہ کے خیال کا فوری توڑ یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگ لی جائے۔ جیسے کہ یوسف علیہ السلام نے دعا کی تھی:

{وَ اِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَ اَكُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ} (۳۳)

''اللہ اگر تو نے مجھے ان عورتوں کی چالوں سے دُور نہ کیا، تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔''

تصوّر، تخیل اور وسوسے میں فرق:

تصوّر، تخیل اور وسوسے میں کیا فرق ہے؟ تصوّر اور تخیل میں انسان کی اپنی کوشش (effort) کا دخل ہوتا ہے۔ اپنے ارادے سے، اپنی کوشش سے وہ کوئی چیز سوچتا ہے۔ جب کہ وسوسہ میں اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا، خود بخود ایک خیال دل میں آجاتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اچانک کہیں سے ایک حملہ ہو جاتا ہے، جیسے ایک دم کوئی کیڑا کاٹ لیتا ہے بغیر اطلاع دیئے، بغیر محسوس ہوئے۔ اسی طرح یہ وسوسہ بے ضابطہ کہیں سے آجاتا ہے اور جب آتا ہے تو اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اپنی طرف سے، سوچ کر، گناہ کا تصوّر قائم کرنا یا ارادہ کرنا، یہ شعوری عمل ہے، اس پر گناہ ہوگا۔ وسوسہ کا لفظ ہمیشہ بُرے مفہوم (sense) میں استعمال ہوتا ہے یعنی کسی نجس خیال کو وسوسہ کہتے ہیں۔

بدشگونی بھی دراصل وسوسہ ہی ہے۔ وسوسہ دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، اس کو دماغ میں جگہ مت دیں، فوراً اعوذ باللہ پڑھ لیں، زیادہ توجہ نہ دیں کیوں کہ وسوسہ توجہ سے پلتا ہے، نشوونما پاتا ہے، توجہ کا محتاج ہوتا ہے، توجہ نہ دی جائے تو محو ہو جاتا ہے، اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اور اگر توجہ دی جائے تو پھر یہ پختہ (concrete) ہونے لگتا ہے، قدم جمانے لگتا ہے۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ ہم وسوسوں پر توجہ دیں۔ اُس پر بات چیت کریں تاکہ وہ پختہ سے پختہ تر ہو جائے اور دوسروں تک بھی فاسد خیالات پہنچ جائیں۔ لہٰذا اس کو بالکل اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ کوئی برا خیال آئے تو اللہ کی پناہ طلب کریں۔ جتنا سوچیں گے، دوسروں سے تذکرہ (discuss) کریں گے، اتنا ہی ذہن میں پختہ ہوتا چلا جائے گا۔

ایک اور علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں مصروف کر لیں اور اگر کسی چیز کے بارے

میں وہم آرہا ہے کہ یوں کروں گی تو یہ ہوجائے گا تو پھر وہ کام ضرور کیجیے تا کہ وہم نکل جائے اور معلوم ہوجائے کہ سب جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت دعا ہے، ''اے اللہ میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی مشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرما دے اور اے اللہ! میری فکروں کو، میری پریشانیوں اور خواہشات کو ایسا بنا دے جیسا تجھے پسند ہے اور جن سے تو راضی ہے۔'' یعنی جو عمل میں کروں وہ تجھ کو راضی کرنے والا ہو۔ کیوں کہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ انسان کی فکر، پریشانی اور خواہش بندے کو شیطان کے راستے پر لے جائے۔ یہ بہت ہی اچھی اور پیاری دعا ہے، انسان محتاط رہے، اللہ سے لو لگا کر رکھے، اور اللہ کی یاد کو دل میں رکھے تو ان شاء اللہ تعالیٰ شیطان کا حملہ مؤثر نہ ہوگا۔ لیکن حملہ تو وہ ضرور کرے گا۔ کبھی یہ مت سوچیں کہ ہم تو قرآن پڑھنے والے ہیں، ہم پر تو شیطان حملہ کر ہی نہیں سکتا، کسی وسوسے اور اندیشے کا ہم شکار ہو ہی نہیں سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو اللہ کے ذکر سے غافل ہے وہ تو شیطان کے لیے تر نوالہ ہے۔ اس کے اوپر تو کوئی خاص محنت کرنی ہی نہیں پڑتی۔ شیطان کی پریشانی کا باعث تو وہ بنتا ہے جو اللہ کے ذکر کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ رہا ہے۔ جو اللہ کو بھولا بیٹھا ہے شیطان کو اس سے کوئی خطرہ نہیں، نہ وہ اس میں دلچسپی (interest) لیتا ہے، یہ تو خود شیطان ہی کا دوست ہے۔ شیطان کو خطرہ مومن سے ہے، جو اللہ کی راہ میں چل پڑے اور اپنا تعلق قرآن سے جوڑے۔ شیطان سب سے شدت سے اُسی پر حملہ آور ہوتا ہے، اُسی کو بہکاتا اور ورغلاتا ہے، اللہ سے دُور کرنے کے لیے اس پر محنت مشقت کرتا ہے، فکروں اور پریشانیوں میں مبتلا کرتا ہے، اس انسان سے ڈرتا ہے، تو وہ اُس کو اندر ہی اندر کمزور کرنا چاہتا ہے، اندیشوں اور وسوسوں کے ذریعے۔ تو اندیشہ اور وسوسہ کو ایمان کی کمزوری ہرگز نہ سمجھیں، بلکہ یہ ایمان کی مضبوطی ہے۔ اپنے آپ کو مصروف کرلیں، اللہ سے اچھی اچھی اُمیدیں لگائیں، اچھی مثبت سوچ رکھیں، اور یہ سوچیں کہ یہ وہم، توہمات ہیں یہ اندیشے ہیں، ان سے کچھ نہیں ہوتا اللہ میری تقدیر میرے پیدا ہونے سے پہلے لکھ چکا ہے، مجھے کیا گھبراہٹ۔ اللہ پر توکل ہے، اللہ تو بہتر مولا، بہتر مددگار ہے، میں مومن ہوں مجھے کیا فکر۔ پھر وسوسوں کا، زندگی پر منفی اثر نہیں ہو پاتا۔ اس یقین کا زندگی پر مثبت اثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے خیالات کا تجزیہ کرسکیں، اِن کا جائزہ لے سکیں، اور اللہ ہمارے خیالات کو پاکیزہ کردے۔ آمین ثم آمین!

حمیّت

((اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلٰھَا))(۱)

((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ مُّنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَآءِ وَالْاَدْوَآءِ))(۲)

((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی))(۳)

حمیّت (loyalty) کو عام الفاظ میں وفاداری کہا جاتا ہے، اردو زبان میں حمیّت کو غیرت بھی کہا جاتا ہے جو کہ ایک خوبی ہے، اچھا وصف ہے۔ غیرت مند انسان نہ ہونا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ انسان کو اپنی ذات کے لیے غیّور ہونا چاہیے، اپنے خاندان کے لیے بھی غیرت ہونی چاہیے کہ کوئی اس کے خاندان والوں کو بُرا بھلا نہ کہے، بلاوجہ ایذا اور تکلیف نہ پہنچائے، ملک اور قوم کے بارے میں بھی غیرت ہونی چاہیے کہ ملک کی بدنامی نہ ہو، ہمارے ملک کو کوئی بُرا بھلا نہ کہے، تو یہ غیرت یا حمیّت بہت پسندیدہ چیز ہے۔

حمیت سب سے پہلے اللہ اور اس کے دین کے لیے:

انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی میں ترجیحات (priorities) متعین کرلے کہ اُس کی زندگی میں اہم ترین چیز کیا ہے جس کے بارے میں حمیّت ہونی چاہیے۔ سب سے اہم چیز ہے ''دین۔'' اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے انسان میں سب سے زیادہ حمیّت ہونی چاہیے، وفاداری ہونی چاہیے۔ اللہ کے ساتھ لوگوں کی وفاداری اُس کے احکام کی تکمیل کا جذبہ اور اس کے ساتھ محبت دیکھ کر خوشی کا احساس ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس اللہ کی نافرمانی ہوتا دیکھ کر اور دین کے احکامات ٹوٹتے دیکھ کر انسان کے اندر شدید غصے اور غضب کے جذبات ابھرنے چاہئیں، اُس کی غیرت یہ دیکھ کر تلملا اُٹھے، دکھ، غم اور غصے کا احساس ہو۔ حدیث میں ایک واقعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نسبت سے نقل ہوا ہے۔

((أَوْحَی اللّٰہ عَزَّوَجَلَّ اِلٰی جِبْرِیلَ عَلَیْہِ السَّلَامُ أَنِ اقْلِبْ مَدِینَۃَ کَذَا وَکَذَا بِأَھْلِھَا،

---

(۱) صحیح مسلم، کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَۃِ وَالاِسْتِغْفَارِ، بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ

(۲) جامع الترمذی، کِتَاب الدَّعَوَاتِ، بَاب دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَۃَ

(۳) صحیح مسلم، کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَۃِ وَالاِسْتِغْفَارِ، بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ

قَالَ فَقَالَ يَا رَبِّ اِنَّ فِيهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، قَالَ فَقَالَ اقْلِبْهَا عَلَيْهِ وَعَلَيْهِمْ، فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ))(۱)

''ایک دفعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فلاں بستی کو وہاں کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ''اے اللہ اس بستی میں تیرا ایک بندہ ایسا بھی ہے جس نے کبھی زندگی میں پلک جھپکنے کی دیر تک (blink of an eye) بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس پر بھی اُلٹو اور باقی بستی والوں پر بھی۔ کیوں کہ میری اُس بستی میں میری نافرمانیاں ہوتی رہیں اور یہ سب دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ تک کبھی نہ بدلا، (سب کچھ دیکھتا رہا لیکن اس کی تیوری پر بل نہ آیا۔ اس کی غیرت نے یہ سب گوارا کرلیا، اس کو اپنے رب کی نافرمانی دیکھ کر بُرا نہ لگا۔ یہ اپنی ہی نماز روزے میں مشغول رہا۔ اور دوسروں کے سُدھار اور اصلاح کی فکر نہ کی۔ اس کو میرے احکامات کا علم تھا۔ لیکن یہ میرے احکامات کی پامالی خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہا۔ اس وجہ سے یہ تو اُن سب سے بڑا مجرم ہے۔)''

ذاتی عبادات میں انسان مصروف ہو، فرائض ادا کرتا ہو لیکن دینی غیرت اور حمیّت کا فقدان ہو تو ایسی عبادات اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہیں۔ اس حمیّت کے ہی نتیجے میں تو بندہ نہی عن المنکر کرتا ہے، معاشرے میں سدھار اور اصلاح کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ دوسروں کی آخرت کی فکر کرتا ہے۔ یہی تو دینی حمیّت ہے، اس کام میں اس کا کوئی ذاتی مفاد (cause) تو ہے نہیں۔ یہ تو محض اللہ کی خاطر اور اُس کی رضا کے لیے، دین کی حفاظت کے لیے دوڑ دھوپ ہے۔ اگر اذان ہوتی ہے اور کوئی نماز نہیں پڑھ رہا تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ تو نہیں، آپ کا کیا بگڑتا ہے؟ پھر ہم کیوں دکھ اور تکلیف محسوس کرتے ہیں اور باقی لوگوں کو کہتے ہیں اُٹھو نماز ادا کرو۔ صرف دین کی حمیّت کی وجہ سے! ہمیں دین کی بے وقعتی اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے کہ یہ بندہ کیوں اللہ کی بات نہیں مانتا، اللہ کے حکم کو اتنا ہلکا کیوں سمجھ رہا ہے اُس کی نافرمانی ہمیں تکلیف دیتی ہے یہ دینی غیرت کا تقاضا ہے۔

جیسے اگر کسی مجلس محفل میں کوئی کسی کے والدین کا مذاق اڑائے تو وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ اگر بدلہ نہ بھی لے تو وہاں سے اُٹھ ضرور جائے گا، اپنی ناراضگی کا، غم وغصہ کا اظہار ضرور کرے گا۔ یہ حمیّت کی وجہ سے ہوتا ہے کیوں کہ ہماری اپنوں سے وفاداریاں ہیں۔ ہماری غیرت یہ گوارا

(۱) شعب الایمان للبیھقی، احادیث فی وجوب الامر والنھی عن المنکر علی من قدر علیھما بما قدر علیہ

نہیں کرسکتی کہ ہمارے والدین یا خاندان والوں کو کوئی بُرا بھلا کہے یا مذاق اڑائے۔ اس طرح دینی حمیّت کا تقاضا ہے کہ جہاں دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو وہاں انسان نہ بیٹھے۔

سورۃ الانعام اور سورۃ النساء میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ:

{اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَ یُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖٓ ۚ اِنَّکُمْ اِذًا مِّثْلُھُمْ} (النساء: ۱۴۰)

''مت بیٹھو اُن لوگوں کے ساتھ جو دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر تم نے یہ کام کیا تو تم بھی انہی میں سے ہو جاؤ گے۔''

حمیّت کا تعلق اولین اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے اور پھر باقی معاملات میں درجہ بدرجہ اپنے مقام مرتبے کے لحاظ سے انسان میں حمیّت اور غیرت ہو۔

اگر حمیّت اللہ کے لیے نہیں ہے یا پھر اللہ کے لیے کم ہے، خاندان یا قبیلے کے لیے زیادہ ہے، ان سے وفاداری (loyalty) ان کی عزت کا احساس زیادہ ہے، بہ نسبت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی عزت کے تو ایسی حمیّت کو حمیّتِ جاہلیہ کہا جائے گا۔ سورۃ الفتح میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

{اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِھِمُ الْحَمِیَّۃَ حَمِیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ} (الفتح: ۲۶)

''اور جب بنا دی اپنے دلوں میں ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا جاہلیت کی حمیّت۔''

تو یہ جاہلی حمیّت یعنی خاندان، کنبے، قبیلے، رشتہ داروں کے ساتھ اندھی وفاداری، اُن کے بارے میں زیادہ احساس اور غیرت کا اظہار کرنا اور اللہ کے بارے میں بے نیاز ہو جانا، یہ چیز اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے۔

اللہ کے سوا کسی سے غیر مشروط وفاداری (unconditional loyalty) رکھنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُن کی ہر بات ٹھیک لگے گی۔ کچھ بھی کریں، غلط کریں، صحیح کریں، الٹا کریں، سیدھا کریں، سیاہ کو سفید کہیں، دن کو رات کہیں، ہر چیز نبھائیں گے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔ اس لیے کہ اس سے وفاداری ہے یا یہ کہ میرا خاندان ہے اور یہ میری حمیّت کا تقاضا ہے۔ اور دین کی صحیح بات کو نہیں مانیں گے کہ میرے خاندان والے نہیں مانتے۔ مشرکین مکہ سے جب کہا جاتا تھا ''آ جاؤ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف'' تو ان کا جواب ہوتا، ''کافی ہے ہمارے لیے

جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔'' یعنی وہ اپنی وفاداری کا مرکز اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو نہیں بناتے۔ یہ ہے حمیّتِ جاہلیہ، یہ پسندیدہ نہیں۔ تو جب ہم اسلام کے نور میں آ گئے ہیں تو ہمیں یہ بالکل زیب نہیں دیتا کہ کوئی بھی رسم، کوئی بھی طریقہ، کوئی بھی سوچ جو دورِ جاہلی کی پیداوار ہو، اُس کو اپنی زندگی میں شامل کریں۔ جب پہچان ہوگئی ہے تو نجات حاصل کرنے کا ارادہ کر لینا چاہیے۔

''حیا'' (Modesty):

حیا کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ'' حیا فطرت کی محافظ ہے۔'' (Guardian of our nature) شریعت انسان کی عادتوں کو فطرت سے قریب کرنا چاہتی ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ ہماری عادتوں کو جبلّت سے قریب کر دے۔

حیا انسان کا خاصّہ:

حیا اُن انسانوں میں ہوتی ہے جو جبلّت سے بلند زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ جانور صرف جبلّت کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں اس لیے جانوروں کے اندر حیا نہیں ہوتی۔ شیطان کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ کسی طرح ہمیں جانوروں کی سطح پر لے آئے۔ فطرت کے تقاضوں سے غافل کر دے۔ کسی طرح بہکائے اور واردات کرے۔ تو اللہ نے ہمیں محتاط رہنے کی تاکید کی ہے، فرمایا:

{ يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ وَمَنْ يَّتَّبِعْ خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ فَاِنَّهٗ يَاْمُرُ بِالْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ } (النور: ۲۱)

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرنا جو بھی شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرے گا تو شیطان تو حکم دیتا ہے فحش کام اور بُرائی کا۔''

شیطان کا طریقہ واردات دو چیزوں میں مضمر ہے، فحاشی اور منکرات۔ ان دو ہتھیاروں سے وہ انسانوں پر حملہ کرتا ہے اسی لیے اللہ نے ان دو حربوں سے ہمیں پہلے ہی خبردار کیا ہے۔ سورۃ النحل میں آتا ہے:

{ وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَاۗءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ } (النحل: ۹۰)

''اللہ تعالیٰ روکتا ہے (منع کرتا ہے) فحش سے اور منکر سے اور زیادتی کرنے سے۔''

حیا انسان کی فطرت میں ہے:

حیا انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ یہ کوئی سکھانے والی چیز نہیں ہے بلکہ انسان یہ سیکھا سکھایا

پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھیں تو حیا کا تصور ہمیں اُن کی حیات مبارکہ میں بھی ملتا ہے۔ جب شیطان کے بہکانے میں آ کر حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا علیہا السلام نے وہ جنت کا پھل کھایا جس سے اللہ نے منع کیا تھا تو ان کے ستر کھل گئے اور انہوں نے فوراً اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ کیوں کہ ایک فطری جذبہ اُن کے اندر موجود تھا کہ یہ عریانیت (nakedness) اچھی شے نہیں ہے۔ غور کریں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا، صرف اکیلے میاں بیوی تھے لیکن اُنہوں نے پھر بھی فوراً اپنے آپ کو ڈھانپنا شروع کر دیا۔

منکرات میں مبتلا ہونا:

شیطان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ انسان کو براہِ راست فحش کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ درجہ بدرجہ انسان کو فحش کاموں میں لگاتا ہے، پہلے منکرات کی طرف راغب کرتا ہے۔ منکر کا مطلب ہے بُرائی۔ اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کے بُرے ہونے پر فطرت دلالت کرتی ہے، اُس کو پہچانتی ہے، جیسے جھوٹ، چوری وغیرہ۔ اور منکر کے اندر وہ بُرائیاں بھی شامل ہیں جن کا بُرا ہونا انسان خود سے نہیں جان سکتا۔ ایسی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتا دیا ہے مثلاً سود، سور کا گوشت، رشوت وغیرہ۔ ''منکر'' دراصل وہ سب کام ہیں جو انسان کی فطرت (human nature) کو مسخ (distort) کر دیتے ہیں جب کہ شریعت کا مقصد انسان کی فطرت کی حفاظت اور اُس کو خالص رکھنا ہے۔ اس لیے شریعت میں سود اور رشوت جیسی آمدن کے ذرائع پر پابندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ ذرائع سے رزق حاصل کرنا ''منکر'' ہے اور یہ منکر انسان کو فحش کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا انسان حرام اور ناجائز کمائی میں ملوث ہوگا اُتنے ہی بے حیائی والے اعمال بڑھتے چلے جائیں گے اور اندر سے حیا ختم ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن نے ہمیں یہ سبق سکھا دیا کہ حیا چاہتے ہو تو سب سے پہلے حلال کماؤ اور حلال کھاؤ۔ اسی لیے سود کے بارے میں حدیث مبارکہ ہے:

((دِرْهَمٌ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنْيَةً))[1]

''سود کا ایک درہم لینا چھتیس دفعہ زنا کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے۔''

زنا کاری کا برا ہونا تو ہم پر واضح ہے لیکن سود کھانا برا نہیں سمجھا جاتا۔ دراصل منکر میں پڑنا ہی

(۱) مسند احمد، مسند الانصار، حدیث عبداللہ بن حنظلۃ رضی اللہ عنہ

انسان کو بے حیا بنا دیتا ہے۔ جب اللہ کا خوف نہ ہو، آخرت کا ڈر نہ ہو، شریعت کی پروا نہ ہو، تو بندہ بے حیا ہو کر رہ جاتا ہے۔

اسی طرح شراب کو حرام کیا اُس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کو اپنی حفاظت سے غافل کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو حفاظتی قوتیں رکھی ہیں، ایک ہے خوف اور دوسری ہے حیا۔ شراب ان دونوں جبلّی حسیات (instincts) کو دبا دیتی ہے۔ نشے کی حالت میں انسان ایسے ایسے بے حیائی کے کام کر جاتا ہے جو عام طور پر کبھی نہ کرے۔

''حیا'' اور ''حیات'' دونوں لفظوں کا مادہ (root) ایک ہی ہے۔ اگر حیا ہے تو حیات ہے اور اگر حیا مٹ جائے تو پھر معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی خطرے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حیا کا روایتی تصور:

جب ہم حیا کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں حیا کا ایک روایتی سا تصور آتا ہے۔ ایک خاص قسم کی وضع قطع کو حیا سمجھا جاتا ہے اور حیا کو صرف عورت کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے کہ حیا تو بس عورت کو کرنی چاہیے حالانکہ ایک خاص وضع قطع اختیار کرنا اور عورت کا حیادار ہونا ''حیا'' کا حصّہ ہے مگر یہ کُل حیا نہیں ہے۔ دوسری طرف حیا کو کمزوری یا کم ہمتی یا اعتماد کی کمی (under confidence) کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے کہ شاید تعلیم کی کمی کی وجہ سے حیا پیدا ہوتی ہے، یہ کسی کمزوری کی علامت ہے۔ یہ بھی ایک انتہا (extreme) ہے۔

دراصل حیا ایک پورا روّیہ (attitude) ہے، خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ درست رویّے کا نظام ہے۔ خالق کے ساتھ جب حیا ہوگی تو اللہ کے ساتھ ہمارا رویّہ درست رہے گا اور مخلوق کے ساتھ بھی ہم حیا رکھیں گے تو یہاں بھی ہمارا رویہ درست رہے گا۔ حیا کی حیثیت انسان کے دماغ میں محافظ کی سی ہے۔ حیا انسان کی فطرت کی بھی محافظ ہے اور انسان کی عقل کی بھی محافظ ہے۔ جو خیالات آتے ہیں اُن کو حیا چھان دیتی ہے۔

حیا ایک پورے رویّے کا نام ہے:

ایک طرح سے یوں سمجھیں کہ حیا ایک چھلنی کی طرح ہے جس میں سے سوچ اور خیالات چھن کر نکلتے ہیں، بُرے خیالات چھٹ جاتے ہیں، اچھے خیالات اور سوچ پروان چڑھتے ہیں اور عمل

میں نمودار ہوتے ہیں اور یہی تو تزکیہ ہے کہ انسان کے خیالات پاکیزہ ہوجائیں۔ تو پتہ چلا کہ تزکیہ حاصل کرنے کے لیے باحیا ہونا نہایت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ سے حیا:

اللہ تعالیٰ سے درست تعلق کی بنیاد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ''الحیا'' اور ''الذُّل''، ''حیا کا ہونا'' اور ''عاجزی کا ہونا'' اگر انسان میں یہ دو خصوصیات ہیں تو اللہ سے اُس کا رویّہ درست ہوجائے گا۔ اللہ سب سے اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس سے حیا کی جائے۔ ترمذی میں حدیثِ مبارکہ ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اسْتَحْيُوا مِنَ اللهِ حَقَّ الْحَيَاءِ))(۱)

''اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی اُس سے حیا کرنی چاہیے۔''

مخاطبین نے عرض کیا: الحمدللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''نہیں!'' یعنی حیا کا مفہوم اتنا محدود نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ تم سر اور سر میں جو خیالات اُن سب کی نگرانی کرو اور پیٹ اور اُس کے متعلقات کی حفاظت کرو۔ یعنی دماغ کو فحش خیالات سے اور پیٹ کو حرام غذا سے بچاؤ۔ اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہونی ہے اُس کو یاد کرو اور جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنائے گا وہ دنیا کی آرائش اور عشرت سے دستبردار ہوجائے گا اور اس چند روزہ زندگی کے عیش کے مقابلے میں آگے آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لیے پسند اور اختیار کرے گا۔ بس جس نے یہ کیا تو سمجھو اللہ سے حیا کرنے کا حق اُس نے ادا کردیا۔

تو پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ سے بھی حیا ہوتی ہے۔ جب انسان تنہا ہوتا ہے اُس وقت بھی اللہ سے حیا کرنی چاہیے۔ اپنے خیالات کی نگرانی کرنی چاہیے۔ سوچ تو ایسی چیز ہے جو کسی کو سنائی نہیں دیتی، صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارا کیسا پردہ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے خیالات کو لوگوں کی نظروں سے اُوجھل کردیا، یہ ہمارا پردہ ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ انسان کی سوچ اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے، اللہ سب جانتا ہے۔ ہمارے شعور میں

(۱) جامع الترمذی، کتاب صفة القيامة والرقائق والورع، باب منه

اور ہمارے لاشعور میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ جانتا ہے۔ تو انسان اپنے خیالات کے بارے میں بھی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے۔ بُرے خیالات یا بُری سوچ آ جائے تو فوراً استغفار کرنا چاہیے۔

اللہ سے حیا کرنے کا ایک اظہار اس طرح بھی ہوگا کہ انسان کبھی تنہائی میں بھی بے لباس نہ ہو۔ خواہ کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن اللہ تو موجود ہے، فرشتے تو ہیں۔ شیطان ہمیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے ہم اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں کوئی شرعی ضرورت ہو تو اجازت ہے لیکن اُس وقت کی بھی مسنون دُعائیں ہیں جن کو پڑھنا چاہیے۔

والدین سے حیا:

اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہوتا ہے۔ تو والدین سے بھی حیا کرنی چاہیے۔ والدین سے حیا کا ایک بالکل غلط تصور رواج پا گیا ہے کہ بعض مسائل بچے والدین سے نہیں پوچھ پاتے، اس لیے کہ انہیں شرم آتی ہے۔ مثلاً بلوغت کے بعد جسمانی تبدیلیاں (physical and emotional changes) پیدا ہوتی ہیں۔ تو بچے اپنے ماں باپ سے یہ بیان (discuss) ہی نہیں کر پاتے، کہتے ہیں ہمیں شرم آتی ہے۔ اس طرح کی شرم اچھی نہیں۔ بعض دفعہ والدین بھی بچوں سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ شرم مناسب نہیں۔ والدین سے حیا اس بات میں ہونی چاہیے کہ وہ کام کرتے ہوئے شرم آئے جن سے والدین ناراض ہوتے ہوں یا اُن کی عزت پر حرف آئے۔ یا انھیں شرمندگی اُٹھانی پڑے۔ پہلے زمانے میں بچے کوئی غلط کام کرتے تھے تو اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم کو شرم آنی چاہیے! اور ماں باپ بچوں کو تاکید کرتے تھے کہ دیکھو کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ ہمیں شرمندگی اُٹھانی پڑے تو اُن کو ماں باپ کی عزت کا خیال رہتا تھا۔ اس جملے سے بڑھ کر کوئی تنبیہ نہیں ہوتی تھی کہ تمہیں شرم نہیں آتی، یہ آخری (ultimate) ڈانٹ ہوتی تھی یعنی غلط کام کرنے پر بچے کو غلطی کا احساس دلایا جاتا تھا تاکہ شرمندگی (guilt) کا شعور جاگے۔ یوں سمجھیں کہ خود بچے کو ایک طرح سے خود پر حاکم (judge) بنانے کی تربیت دی جاتی تھی کہ اُسے آئندہ کسی کے کہنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ وہ خود جانچ سکے، اچھا کیا ہے بُرا کیا ہے۔ شعور بیدار کیا جاتا تھا تو شرم کی وجہ سے وہ اس غلطی کو درست کرتا تھا اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا تھا اور آئندہ اپنی اُس غلطی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

موجودہ دور میں حیا کی جگہ بے حیائی نے لے لی:

بچے کو شرم کا احساس دِلا کر دو چیزیں دی جاتی ہیں۔ ایک بہتری کی ترغیب دی جارہی ہوتی ہے اور دوسرے بچے کو خود اپنے بارے میں باشعور کیا جارہا ہوتا ہے تاکہ خود اپنے آپ کو (judge) کرلے۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقۂ تربیت تھا لیکن اب اس سے منع کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں شرم و ندامت (guilt، shame) کا کلچر نہیں ہونا چاہیے، جو بچے کرتے ہیں اُن کو کرنے دو۔ اگر تم بچوں کو روکو گے تو ان کے اندر احساسِ جرم پیدا ہوگا، احساسِ کمتری پیدا ہوگی، ان کی شخصیت مسخ (distort) ہوجائے گی۔ اب علمِ نفسیات (Psychology) نے اس پشیمانی اور شرم کو قابلِ مذمت عمل قرار دے دیا۔ لہٰذا اب حیا شخصیت کی خوبی نہیں بلکہ شخصیت کا عیب بن گئی ہے۔ اور جن کے اندر حیا نہیں اُن لوگوں کو بہادر (bold) اور بااعتماد (confident) سمجھا جانے لگا، اعتماد (confidence) اور سرکشی (defiance) کے مابین فرق نہ رہا، اب شیطان کو اور کیا چاہیے۔ جونہی فطرت کے محافظ کی چھٹی کی، شیطان تو پوری فوج لے کر حملہ آور ہوگیا، ہر طرح سے بے حیائی کو مزین کردیا، خوبصورت بنا کر پیش کیا۔ ایک طرف برقی (electronic) اور مطبوعہ (print) میڈیا کی طرف سے ذہن سازی (brain washing) شروع ہوگئی۔ قلوب و اذہان میں یہ بات بٹھادی گئی کہ حیا مردانگی کے خلاف ہے اور یہ تصور دیا گیا کہ جو مرد جتنا زیادہ نڈر اور بہادر ہوگا، اتنا ہی زیادہ بے حیا ہوگا۔ مثلاً یہ قانون نافذ کرنے والے سپاہی (law enforcement soldiers) جن کو عام طور پر بہادر سمجھا جاتا ہے وہ بغیر گالی کے بات ہی نہیں کرتے تو اس طرح رفتہ رفتہ حیا کا تصور مٹتا چلا گیا۔ شیطان نے بے حیائی کو بڑا خوبصورت بنادیا۔

{وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ} (الانفال:۴۸)

”اور جب شیطان نے اُن کے لیے اُن کے برے اعمال مزین کردیئے۔“

اس طرح حیا کو مردوں میں سے ختم کردیا گیا۔ آج اگر کسی لڑکے کو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ شرمیلا ہے تو اُس کے لیے اس سے بڑی کوئی بے عزتی نہیں ہوسکتی۔ یا کسی لڑکے کو یہ کہہ دینا کہ بڑا شریف ہے تو اُس کی مردانگی پر بن آتی ہے۔ اب جب معاشرے میں ہم مردانگی کے اس مسخ شدہ معیار (distorted image) کو اپناتے ہیں اور اسی کو مردانگی سمجھنے لگتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ

معاشرے میں فساد ہی مچے گا، بے راہ روی عام ہوگی، عزتیں کہاں محفوظ رہیں گی۔ بے حیائی کی وجہ سے زن وشو کے تعلق میں خرابی آ جاتی ہے اس لیے کہ مرد عورت کے تعلق میں جو پردہ ہے وہ تو حیا کا ہے۔ مرد اور عورت کا صحیح تعلق استوار ہو نہیں سکتا اگر اُن کے اندر حیا نہ ہو، جب حیا اُٹھ جائے گی تو تعلقات بگڑ جائیں گے۔

بچوں کو حیا کی راہ پر ڈالیں:

بچوں کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ آج نوجوانوں نے رول ماڈل (role model) بُرے لوگوں کو بنایا ہوا ہے تو اس میں والدین کا بھی قصور ہے۔ والدین اُن کو صحیح رول ماڈل (role model) نہ دے پائے۔ ایسے بھی لوگ دنیا میں گزرے ہیں جو انتہائی جری بہادر تھے۔ انتہائی کرشماتی (charismatic) تھے، دنیا کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا، جنگیں بھی لڑتے تھے اور ساتھ ساتھ انتہائی باحیا بھی تھے، نظریں نیچی رکھنے والے تھے۔ اپنی عزت کی حفاظت کرنے والے تھے، زنا سے بچنے والے تھے، زنا کو بہت بُرا اور گناہ سمجھتے تھے۔ اس کی مذمت (condemn) کرتے تھے۔ تو ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ ایسی شخصیات یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے میں بتائیں۔ اپنے بچوں کو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں سے متعارف کرائیں۔ تاکہ بجائے اِدھر اُدھر کی کہانیوں کے ان اعلیٰ ترین لوگوں کے بارے میں پڑھیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں بتائیں تاکہ ان کے کردار کی تعمیر اسی طرز پر ہو کہ یہ لوگ کیسے بہادر اور باحیا تھے، کیا زبردست لوگ تھے۔

خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں آتا ہے کہ:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا))[1]

''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غیر شادی شدہ لڑکی سے زیادہ حیادار تھے۔''

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اندر اتنی شرم اور حیا تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام ساتھیوں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی تھی، مکمل ستر ڈھانپنے والا لباس پہنتے تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران (thigh) پر نظر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ اسلام میں اتنی حیا ہے کہ جب مردے کو بھی نہلایا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحیاء

جاتا ہے تو اُس کے پردے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ موٹی چادر اوپر ڈالی جاتی ہے اور چادر کے نیچے سے نہلایا جاتا ہے تاکہ جسم نہ کھلے۔ تو مردے کی ران پر بھی نظر ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ کجا یہ کہ مرد عورتیں، لڑکے لڑکیاں نیم عریاں حالت میں بازاروں میں گھومیں پھریں۔

حیا بہادری و مردانگی دکھانے میں رکاوٹ نہیں:

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان تعلیمات پر عمل کیا لیکن یہ تعلیمات قیادت و سیادت میں حائل نہیں ہوئیں، حیا رکاوٹ (impediment) نہیں بنی، بہادری، مردانگی کی راہ میں، جنگیں لڑیں اور جیتیں، دشمنوں اور اسلام کے مخالفین کے چھکے چھڑا دیئے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے کھیل بھی کھیلے، تیراکی بھی کی اور فاتحین عالم بھی قرار پائے لیکن ستر کبھی نہ کھلے۔ تو زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لیے یا ترقی کے لیے ستر کا کھلنا کوئی شرط نہیں۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ بہت زیادہ حیا دار تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ((أَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثمان رضی اللہ عنہ)) (۱) ''سب سے زیادہ حیا کرنے والے عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔'' خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ حیا صرف عورت کے لیے ضروری ہے اور مرد کے لیے ضروری نہیں۔ مرد کے لیے بھی حیا اتنی ہی ضروری ہے جتنی عورت کے لیے ضروری ہے۔

لڑکے کیا، لڑکیاں بھی حیا کھو بیٹھیں:

جب ہم فطرت سے دُور ہٹے تو بیٹوں کو باحیا بنانے کی بجائے اپنی بیٹیوں کو بھی حیا سے محروم کر دیا۔ ہم نے کہا کہ ہم اپنے بچوں میں برابری (equality) کریں گے۔ چلیں برابری (equality) بھی کرنی ہی تھی تو لڑکوں میں حیا کی صفت اور خوبی پیدا کرتے، لیکن ہم نے ظلم یہ کیا کہ بیٹے تو حیا سے عاری تھے ہی، بیٹیوں کو بھی حیا کے زیور سے محروم کر دیا۔ اب لڑکیاں بھی شرم و حیا کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ بے حیائی (immodest) کو وہ بھی اعتماد (confidence) اور بہادری (bold) سمجھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حیا کا تصور قرآن سے سیکھا ہی نہیں۔

حیا کی زندگی:

نہ ہم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سامنے رکھا' نہ ازواجِ مطہرات کو، نہ صحابیات رضی اللہ عنہن کو' نہ قرآن کی تعلیمات کو ماڈل بنایا۔ کاش! ہماری زندگی میں قرآن کا نور ہوتا تو ہمیں حضرت مریم علیہا السلام کا کردار

(۱) جامع الترمذی، کتاب المناقب، مناقب معاذ بن جبل و زید بن ثابت رضی اللہ عنہم

نظر آتا کہ باحیا لڑکی کیسی ہوتی ہے، کیسی باوقار (dignified) ہوتی ہے، کیسی پُراعتماد ہوتی ہے۔ وقت پڑے تو پورے اعتماد سے مردوں سے بات کرتی ہے۔ اور کاش! ہم نے قرآن سمجھا ہوتا تو پتہ چلتا کہ گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہونے والی زوجہ کی طرح حیا کے ساتھ کام بھی کرتی ہیں۔

{فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ} (قصص: ۲۵)

''تو اُن دونوں عورتوں میں سے ایک عورت آئی حیا کے ساتھ چلتی ہوئی۔''

تو حیا دراصل نامحرم مرد اور عورت کے درمیان تعلق کا بنیادی تقاضا ہے، معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک حد بندی (distance) کے ساتھ معاملہ کرنا، ایک دوسرے کی ذات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے صرف موضوع پر توجہ رکھنا، پورے اعتماد (confidence) کے ساتھ معاملہ کرنا ہے۔ بات چیت میں گھٹیا پن نہ ہو، لبھانے (flirtation) کا سا انداز نہ ہو۔

حیا کا تقاضا:

حیا کا آغاز سوچ سے ہوتا ہے، جذبات سے ہوتا ہے۔ پہلے یہ ارادہ کرلیں کہ ہمیں حیا کرنی ہے اور پھر اس کا اظہار جسم اور لباس وغیرہ سے ہوگا۔ صد افسوس کہ آج "TV" کے ڈراموں نے، فلموں نے، فحش ناولوں نے حیا کے احساس کو بالکل ختم کر دیا۔ حیا ہمارے معاشرے سے ایسے اُٹھی کہ اب جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ انسان زبان پر نہیں لاسکتا۔ سورۃ الانعام میں ارشاد الٰہی ہے۔

{وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ} (۱۵۱)

''تم بے حیائی کے قریب بھی مت جاؤ، نہ ظاہر نہ پوشیدہ۔''

تو یہ حیا کا تقاضا ہے کہ بندہ اخلاق باختہ مناظر نہ دیکھے، آنکھوں کو خیانت سے بچانا ہے، آنکھوں کا بھی پردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنے سے منع فرمادیا ہے انسان اُن کو نہ دیکھے۔ نہ تنہائی میں بیٹھ کر کوئی ایسی چیز دیکھی جائے اور نہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ انسان یہ معیار بنا لے کہ جو چیزیں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے وہ تنہائی میں بھی بیٹھ کر نہیں دیکھیں گے، شوہر کے ساتھ بیٹھ کر بھی نہیں دیکھیں گے، اس لیے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ انسان کے ضمیر کو تو پتہ ہے کہ یہ غلط کام ہے۔

جسم اور ذاتی معاملات کے بارے میں حیا:

اسی طرح اپنے جسم کے بارے میں حیا ضروری ہے۔ انسان کو محتاط رہنا چاہیے کہ جسم کہیں کھل نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْکُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِکُمْ وَ رِیْشًا} (الاعراف:۲۶)

''اے آدم کے بچو! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل فرمایا ہے۔ جو تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانپنے والا ہے اور موجب زینت بھی۔''

تو ایسا لباس پہننا چاہیے جس میں جسم نمایاں نہ ہو، پورا ڈھک جائے، ساتر لباس ہو۔ تنہائی میں بھی انسان بے لباس نہ رہے۔ کسی بھی شرعی ضرورت کے بغیر جسم نہ کھولا جائے۔ یہ جسم کے بارے میں حیا کے احکام ہیں۔

معاملات میں حیا یہ ہے کہ جو معاملات تنہائی میں ہوتے ہیں جن میں کہ جسم کھلتا ہے اُن کا ذکر کسی کے سامنے نہ کیا جائے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ مشہور صحابی تھے۔ اُن کا نکاح ہوا تو صبح کو بے تکلّف دوستوں نے پوچھا کہ رات کیسی گزری؟ اُنھوں نے نظر انداز کر دیا، جب دوستوں نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسی لیے دروازے اور تالے بنائے ہیں کہ جائز اور مباح کام بند دروازوں کے پیچھے ہو اور جب اُس کا ذکر کھلم کھلا شروع ہو جائے تو یہ چیز بے حیائی میں شامل ہو جاتی ہے۔'' تو ازدواجی زندگی کے بارے میں گفتگو کرنا یا چھیڑ چھاڑ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ نہ تو خود اعتمادی کی علامت ہے کہ ہم اپنے راز کے معاملات بھی اوروں کے سامنے کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ اپنائیت کی علامت ہے۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم دوستوں میں کوئی بات پوشیدہ (secret) نہیں ہے، ہم تو آپس میں ہر بات کرتے ہیں۔ یہ ذاتی (private) باتیں دوسروں کو بتانا مناسب نہیں ہے، نہ دوسروں کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کھود کرید کرنا چاہیے۔

حیا اور بے حیائی کی تاثیر:

اسی طرح حیا ہی انسان کو رواداری سکھاتی ہے، مروت اور لحاظ سکھاتی ہے۔ بڑوں بزرگوں کے سامنے انسان زبان درازی نہیں کرتا، بدتمیزی کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ حیا

کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بڑے غلط بات بھی کہہ رہے ہوں تو ہمت نہیں ہوتی کہ اُن کو ٹوک دیں یا تصحیح کر دیں۔ گُجایہ کہ اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ شرم اور حیا رکاوٹ بن جاتی ہے اور زبان کے غلط استعمال سے انسان کو بچا لیتی ہے۔ بے حیائی کی وجہ سے چہرے کا نور چلا جاتا ہے۔ چہرے بے رونق ہو جاتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا تو حال یہ تھا کہ کوئی ناگوار بات بھی آپؐ کے سامنے ہوتی تو آپ ﷺ زبان سے نہیں کہتے تھے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں اگر کوئی چیز آپ ﷺ کو بُری لگتی تھی ہم آپ ﷺ کے چہرے سے پہچان جاتے تھے۔'' یعنی آپ ﷺ کی حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ آپ ﷺ زبان سے تنقید نہ کریں، کسی چیز کو بُرا نہ کہیں۔

اس کے علاوہ بے باکی سے ہر چیز پر تبصرہ کرنا، تنقید شروع کر دینا، سب کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دینا یہ بھی حیا کی قِلّت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غیبت کرنا، طنز و طعنہ کے ذریعے کسی کی عزت کو تار تار کر دینا، بے دھڑک کسی کا مذاق اُڑانا یہ سب بے حیائی کے مظاہر ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حیا کا مطلب فقط ''پردہ'' ہے، بس چہرہ ڈھانپ (cover) لو تو حیا کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ حیا کا بس ایک حصّہ ہے، حیا کا کامل تصور نہیں ہے۔ تو معاملات سے، بات چیت کے انداز سے، حرکات و سکنات سے حیا چھلکنی چاہیے۔ انسان کے شقی اور بدبخت ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ ''قِلَّةُ الْحَيَا'' (lack of modesty) ہو۔ حیا زبان کے غلط استعمال سے بھی باز رکھتی ہے اور اس سے مروّت بھی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو خالی ہاتھ کیسے لوٹائیں، کوئی مدد طلب کرے تو کیسے مدد نہ کریں۔ دل چاہتا ہے آپ کے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بھی شان ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں مضمون آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا))[1]

''بے شک تمھارے رب میں حیا اور کرم کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے شرماتا ہے کہ اس کا بندہ اُس کے آگے ہاتھ پھیلائے اور اللہ اُس کو خالی ہاتھ لوٹا دے۔''

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء

بچوں کی تربیت میں حیا کا خاص خیال رکھا جائے:

اپنی اولاد کی تربیت میں حیا، رواداری اور مروّت کو نہ بھولیں۔ بچپن ہی سے زبان کے بارے میں بچوں کو محتاط کریں، لباس کے بارے میں محتاط کریں۔ چھوٹی عمروں میں بھی بچوں کو عریاں (revealing) کپڑے مت پہنائیں۔ یہ اکثر بیٹیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو بالکل گڑیوں کی طرح لگتی ہیں۔ بچیوں کو ضرور سجائیں، سنواریں، کلپ (clips) لگائیں، چوڑیاں پہنائیں، (hair bands)، ربن (ribbon)، فراک (frocks) جو جی چاہے پہنائیں لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ مغربی طرز کا ہو۔ بہت پتلا لباس، بہت تنگ لباس یا بغیر آستینوں (sleeveless) کے لباس وغیرہ سے گریز کریں۔

یہ اساتذہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں حیا کو پروان چڑھائیں، حیا کا تصور اجاگر کریں۔ والدین اور استاد دونوں کا یہ کام ہے۔ ترمذی اور مسندِ احمد میں حدیث مبارکہ ہے، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيمَانِ وَالْاِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ))(۱)

''حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور ایمان کا مقام جنت ہے۔ اور بے حیائی بدکاری میں سے ہے۔ کوڑا کرکٹ ہے، بُری چیز ہے اور بدی آگ میں لے جانے والی ہے۔''

ایک حدیث مبارکہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((لِكُلِّ دِينٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَيَاءُ))(۲)

''ہر دین کا کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔''

ایک اور واقعہ بخاری اور مسلم میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گزر انصار میں سے ایک شخص پر ہوا اور وہ اس وقت اپنے بھائی کو شرمیلے پن کے بارے میں نصیحت اور ملامت کر رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

((دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْاِيمَانِ))(۳)

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الحیاء

(۲) موطأ امام مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی الحیاء

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الحیاء من الایمان

''اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو کیوں کہ حیا تو ایمان کا جز یا ایمان کا پھل ہے۔''

تو حیا اتنی اچھی چیز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْحَیَاءُ لَا یَأْتِی اِلَّا بِخَیْرٍ))(۱)

''حیا صرف خیر ہی کو لاتی ہے۔''

صحیح بخاری میں ایک اور حدیث مبارکہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ مِمَّا أَدْرَکَ النَّاسُ مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ))(۲)

''اگلی نبوت کی باتوں میں سے جو کچھ لوگوں نے پایا ہے اُس میں سے ایک مقولہ یہ بھی ہے کہ جب تم میں شرم اور حیا نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو۔''

جب شرم نہ رہی، حیا نہ رہی ہو تو پھر جو مرضی کرو۔ پھر تمہیں کوئی بے حیائی کا کام بُرا نہیں لگے گا، عار محسوس نہیں ہوگی، سب کچھ کر گزرو گے یعنی جب حیا نہیں تو ایمان نہیں اور جب ایمان نہیں تو کون سی شے انسان کو گناہ سے روکے گی، اسی لیے حیا کو بہت زیادہ عام (promote) کرنے کی ضرورت ہے۔

دو چیزوں میں حیا نہیں:

اب دو چیزیں ایسی ہیں جن میں حیا نہیں ہونی چاہیے۔ علم سیکھنے میں اور اظہارِ حق میں۔ جہاں تک علم سیکھنے کا تعلق ہے تو ایک عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ دو ''م'' والے علم حاصل نہیں کر سکتے، ایک ''مُتَکَبِّر'' یعنی تکبر کرنے والا اور دوسرا ''مُسْتَحْیٖ'' یعنی شرم کرنے والا۔ لہٰذا سیکھنے سکھانے میں حیا نہیں ہونی چاہیے۔ شرعی مسائل ہوں، پاکی ناپاکی کے مسائل ہوں، ان کو پوچھنے اور بتانے میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔

دوسرے: حق کے اظہار میں بھی شرمانے کی ضرورت نہیں کہ فلاں بُرا منالے گا۔ یہ رواداری نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں فرمایا ہے:

{وَاللّٰهُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ}(۵۳)

''اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا حق بیان کرنے سے''

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحیاء

(۲) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار

توحق بیان کر دینا چاہیے۔ پھر فرمایا:

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا} (البقرۃ:۲۶)

''اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ وہ مچھر کی مثال بیان کرے یا اس سے بھی کمتر چیز کی۔''

توعلم اور حق ان دو چیزوں میں شرمانا نہیں چاہیے۔ کوئی شخص کہے کہ ہمیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے شرم آتی ہے۔ اس معاملے میں جھجک اچھی شے نہیں ہے۔

حیا حاصل کرنے کے لیے انسان کیا کرے؟ سب سے پہلے تو پوری روح کے ساتھ نماز پڑھے، نماز باحیا بنائے گی۔ جس طرح کا لباس ہم نماز میں پہنتے ہیں دیگر زندگی میں بھی ویسا ہی لباس پہننے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَ الۡمُنۡکَرِ﴾ (العنکبوت:۴۵)

''بے شک نماز تو روکتی ہے فحش سے اور منکر سے''

اور حیا حاصل کرنے کے لیے ایمان کا جو سرچشمہ ہے یعنی قرآن، اس سے انسان تعلق جوڑے۔ تو اللہ تعالیٰ سے بہت دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عفت اور عصمت کی حفاظت کرنے والا بنا دے اور اللہ ہمارے اندر حیا پیدا کر دے۔ آمین

حُبّ

''حُبّ'' کے معنی ہیں ''محبت''، یہ جذبہ بھی دل کے اندر ہوتا ہے، دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ حُبّ اور حَبّ ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ حُبّ کہتے ہیں محبت کو اور حَب کہتے ہیں دانے (seed) کو، بیج کو۔ انسان جس چیز کا بیج مٹی میں دباتا ہے، اُسی کا پودا نکلتا ہے اور پودے کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ کس پودے یا پھل کا بیج دبایا گیا تھا۔ بالکل اِسی طرح محبت تو دل کے اندر دبی ہوتی ہے۔ اظہار جب ہم کرتے ہیں، عمل جو ہمارا ہوتا ہے۔ اُس سے پتا چلتا ہے کہ ہمیں کس سے محبت ہے؟ ہمارے دل میں کس کی محبت ہے؟ اس محبت کی نوعیت کیا ہے؟ جہاں تک محبت کا تعلق ہے، تو محبت، انتہائی مطلوب جذبہ ہے، پسندیدہ چیز ہے۔ اسلام خوش گوار جذبات کا اظہار چاہتا ہے اور ناگوار جذبات کو دبانا چاہتا ہے۔ جیسے کسی بدبودار چیز کو ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے تاکہ بدبو نہ پھیلے، اسی طرح ناگوار جذبات بدمزگی پیدا کرتے ہیں اور خوش گوار جذبات خوشبو کی طرح ہوتے ہیں، ہوا میں پھیل کر پورے ماحول کو معطّر کر دیتے ہیں، مشامِ جاں کو فرحت پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے کے اندر خوش گوار جذبات کا اظہار ہو۔

محبت زندگی میں چاشنی پیدا کرتی ہے، خوب صورتی اور مٹھاس لاتی ہے۔ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اُن کا نام لے کر فرمایا کہ ''اے معاذ رضی اللہ عنہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' ذرا سوچیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی کیا کیفیت ہوگئی ہوگی، یہ سن کر اُنہیں کتنی مسّرت اور خوشی ہوئی ہوگی۔ بعض دفعہ ہم تکلف برتتے ہیں اور بے ساختہ جذبات کا اظہار نہیں کر پاتے، کنجوسی برتتے ہیں۔ غلط فہمی (misunderstanding) کا خدشہ ہوتا ہے یا یہ کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی مفاد پوشیدہ ہے، یا پھر ٹھکرائے جانے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے لوگ جذبات کے اظہار سے ڈرتے ہیں۔ لیکن جہاں رشتوں میں باہم اعتماد ہو، انسان اپنے نیک جذبات کا اظہار ضرور کرے۔ والدین کے ساتھ، بچوں کے ساتھ، شوہر کے ساتھ، شوہر کے والدین کے ساتھ ضرور (share) کریں کہ آپ کو اُن سے محبت ہے، یہی مشورہ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے ایک اور صحابی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا کہ اگر تم فلاں سے محبت کرتے ہو تو اُس کو جا کر بتاؤ تم اس سے محبت کرتے ہو۔'' اس سے اُس کا دل بھی خوش ہوگا اور تعلقات بھی بہتر ہوں گے، خوش گوار ہوں گے۔

مسند احمد میں حدیث پاک ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مومن تو محبت اور اُلفت کا مرکز ہے، اور اس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے کوئی محبت نہیں کرتا اور دوسرے اس سے الفت نہیں کرتے۔''

تو یہ بہت اچھی چیز ہے کہ لوگ آپ سے محبت کریں اور آپ لوگوں سے محبت کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں محبت کرتے تھے۔ اس لیے کہ جب آپس میں محبت ہوتی ہے تو یقین بھی ہوتا ہے، اعتماد بھی ہوتا ہے اور محبت بڑا زبردست جذبۂ محرکہ (motivating factor) ہے۔ یہ قربانیاں دینا سکھاتا ہے۔ بڑے سے بڑے مشکل مرحلوں کو محبت آسان کر دیتی ہے۔ بڑے بڑے ناگوار حالات بندہ جھیل جاتا ہے فقط محبت کی وجہ سے۔ کیوں کہ محبت چاشنی اور مٹھاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:

{وَ اَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ ؕ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مَّاۤ اَلَّفْتَ بَیْنَ قُلُوْبِهِمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَیْنَهُمْ ؕ} (الانفال:۶۳)

''اللہ نے مومنوں کے دلوں میں محبت ڈال دی، ان کے دل جوڑ دیے۔ اگر آپ زمین بھر کی دولت خرچ کر دیتے تو بھی اُن کے دلوں میں محبت پیدا نہ کر سکتے تھے۔''

ہمیں بھی چاہیے اللہ سے دعا کریں:

((اَللّٰهُمَّ اَلِّفْ بَیْنَ قُلُوْبِنَا وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَیْنِنَا)) (۱)

''اے اللہ ہمارے دلوں میں الفت پیدا کر دے، اور ہمارے معاملات کی اصلاح کر دے۔''

ایک دفعہ محبت پیدا ہو جائے، تو بدگمانی اور بدظنی ہونے کے امکانات بھی بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی سے محبت ہے اور کوئی اس کے بارے میں آپ کو کوئی بُری بات کہے تو آپ فوراً اس کا دفاع (defend) کریں گے کہ یہ نہیں ہو سکتا وہ ایسا کہہ ہی نہیں سکتا۔ اُس کا مطلب وہ نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ اور کوئی کام آپ کو کتنا بھی ناگوار لگتا ہو لیکن محبت اس کو آسان کر دیتی ہے۔ مائیں کیسے راتوں کو بچوں کے لیے جاگتی ہیں۔ یہ محبت ہی کا جذبہ ہے جو جگاتا ہے، یہ ممتا ہے، محبت ہے اور یہ بہت ہی زبردست جذبہ ہے۔

شیطان محبت کا غلط استعمال سکھاتا ہے:

جب محبت اتنی طاقت ور ہے تو سوچیں کیا شیطان اس محبت کے جذبے سے بے گانہ رہے گا؟

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب التشہد

اس پر حملہ آور نہ ہوگا؟ کیا اِس محبت کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش نہ کرے گا؟ محبت کا غلط استعمال نہ سکھائے گا؟ شیطان ضرور اس جذبے سے انسان کو گمراہ کرتا ہے اور اُسے باور کراتا ہے کہ یہ اُس کے اپنے دل کی بات ہے، اُس کی اپنی ذات سے یہ جذبہ پھوٹا ہے، کسی خارجی قوت کا اس میں عمل دخل نہیں ہے۔

محبت کی اقسام:

اب ہم دیکھیں گے محبت کی کتنی قسمیں ہیں، کس سے کریں؟ کتنی کریں؟ کہاں بے انتہا اور کہاں محدود کریں؟ اور کس سے محبت نہ کریں۔ علماء کا کہنا یہ ہے کہ محبت کی ۱۴ اقسام ہیں:

☆ واجب محبت ☆ مباح محبت ☆ مکروہ محبت ☆ حرام محبت

واجب محبت:

کچھ محبتیں ایسی ہیں جو ہم پر واجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ} (البقرۃ:۱۶۵)

''ایمان والے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں شدید تر ہوتے ہیں۔''

لہٰذا اللہ سے شدید محبت ہونی چاہیے۔ پیار کسی سے بھی ہوسکتا ہے اور اپنائیت کسی سے بھی ہوسکتی ہے اور کوئی بھی دل ونظر کو بھا سکتا ہے لیکن محبت اور وفاداریاں صرف اللہ سے وابستہ ہونی چاہیں۔ یا چلیں محبت بھی کسی سے ہوسکتی ہے لیکن ''عشق'' (adoration) صرف اور صرف اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ انسان کو اللہ کا عاشق اور دیوانہ ہونا چاہیے۔ اللہ ہی کا نام، اللہ ہی کا کلام، اللہ ہی کا ذکر، اللہ ہی کے کام انسان کی زندگی کا مقصد اور دِل کی ٹھنڈک بن جائیں۔ اللہ کی رضا زندگی کا حاصل بن جائے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الْحُبُّ فِي اللهِ وَالْبُغْضُ فِي اللهِ)) (۱)

''بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو۔ اور وہ بغض وعداوت ہے جو اللہ کے لیے ہو۔''

سو اللہ کو پہلے دِل کی مسند پر بٹھا دیں! اللہ بادشاہ ہے۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرنی ہے۔ اور جو لوگ اللہ سے محبت نہیں کر پاتے وہ سراسر اپنی غفلت کی وجہ سے نہیں کر پاتے۔ اور قرآن کیا ہے؟ ذِکر، یاددہانی ہے، قرآن آپ کو طریقے بتا دیتا ہے کہ تم کون سے

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، بَاب مُجَانَبَةِ أَهْلِ الْأَهْوَاءِ وَبُغْضِهِمْ

طریقے اختیار کرو گے تو تمھیں اللہ سے محبت ہو جائے گی۔ جو اللہ سے محبت کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کا کلام پڑھ لے تو پھر اس کو اپنے محبوب کی نشانیاں اَنفُس و آفاق میں نظر آنے لگیں گی۔

اللہ سے محبت میں اپنا ہی سکون و اطمینان ہے:

جب ہم اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں تو کیا اس کا کوئی فائدہ اللہ کو ہوتا ہے؟ اللہ تو ہماری محبتوں اور عبادتوں سے بے نیاز ہے۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنی زندگی خوشیوں، سکون اور اطمینان سے بھر لیتا ہے، اُس کو فطری و روحانی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ خود خوش رہتا ہے۔ تو اللہ سے ہمیں محبت کرنی چاہیے۔

انسانوں سے محبت بھی اللہ کی خاطر ہو:

انسانوں سے بھی اللہ کی خاطر محبت کرنی چاہیے۔ اپنی ساری محبتوں کو انسان اللہ کی محبت کے تابع کر دے، اللہ کی محبت سے منسلک کر دے، اُس کی محبت کا ایک اظہار مخلوق سے محبت کی صورت میں ہو۔ پھر آپ دیکھیں گے دنیا کی جتنی مباح محبتیں ہیں وہ کبھی آپ کے لیے رنج والم، دکھ اور تکلیف کا سبب نہیں بن سکیں گی۔ پھر دنیا کی یہ مباح محبتیں مجبوری، محتاجی اور کمزوری نہیں بنتیں۔ ہم پھر اِن محبتوں کے محتاج نہیں رہتے بلکہ پھر یہ ساری محبتیں، انسان کی قوت بن جاتی ہیں۔ جنت حاصل کرنے میں معاون بن جاتی ہیں۔ یہ محبتیں کبھی بھی اللہ اور بندے کے درمیان حائل نہیں ہوتیں، رکاوٹ (barrier) نہیں بنتیں، بلکہ یہ محبتیں اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ اُس وقت ہوتا ہے جب اِن سب چیزوں کو اللہ کی محبت کا تابع رکھا جائے۔

اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے کی فضیلت:

مسند احمد میں حدیث پاک ہے ابی عمامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس بندے نے بھی اللہ کے لیے کسی بندے سے محبت کی اس نے اپنے رب ہی کی عظمت اور توقیر کی''

ہر محبت کو اللہ کی محبت کے تابع کرنے سے یہ محبتیں بھی عبادت بن جائیں گی۔ اجر و ثواب کا باعث بن جائیں گی۔ ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں اُس میں فرمایا:

((سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ قَالَ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِينَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِينَ فِيَّ وَالْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ))(۱)

(۱) موطأ امام مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المتحابین فی اللہ

''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری محبت واجب ہے اُن لوگوں کے لیے جو باہم میری وجہ سے محبت کریں اور میری وجہ اور میرے تعلق سے کہیں جُڑ کر بیٹھیں اور میری وجہ سے باہم ملاقات کریں اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کریں۔''

جو شخص اپنی محبتوں میں اس عنصر کو شامل کرے گا اُس کے لیے اللہ کی محبت واجب ہو جائے گی، تو تمام محبتوں کو اللہ کی محبت کے تابع کر دیں۔ اللہ کی خاطر، دوسروں سے محبت کریں، تو اس کا اتنا بڑا اجر ہے۔ ایک اور صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت فرماتے ہیں، ''ایک شخص اپنے ایک بھائی سے جو ایک دوسری بستی میں رہتا تھا ملاقات کے لیے چلا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی گزر گاہ پر ایک فرشتے کو بٹھا دیا۔ جب وہ اُس مقام سے گزرا تو فرشتے نے اُس سے پوچھا تمہارا کہاں کا ارادہ ہے۔ اُس نے کہا میں اِس بستی میں رہنے والے اپنے ایک بھائی سے ملنے جا رہا ہوں۔ فرشتے نے دریافت کیا، کیا اُس پر تمہارا کوئی حق احسان ہے یا کوئی عہد ہے جس کو پختہ کرنے جا رہے ہو۔ اُس بندے نے کہا نہیں! میرے جانے کا باعث اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس بھائی سے اللہ کے لیے محبت ہے۔ پھر فرشتے نے اُس شخص سے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس یہ بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرتا ہے جیسے تم اللہ کے لیے اُس بندے سے محبت کرتے ہو۔''

اللہ کی محبت میں دوسروں کا خیال کرنا کہ وہ اُس اللہ کے بندے ہیں جس سے ہمیں محبت ہے۔ یہ خیال اور احساس ہمیں دوسروں سے توقعات رکھنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ آپ کیوں کسی سے تعلق قائم کرتے ہیں؟ آپ کیوں کسی سے محبت کرتے ہیں؟ اللہ کی خاطر نا! تو جب اللہ کی خاطر ہم کسی سے محبت کرتے ہیں پھر ہمیں توقعات بھی اللہ ہی سے لگانی چاہئیں کہ اللہ ہی اس کا صلہ اور اجر دے گا۔ ورنہ ہم لوگوں سے لوگوں کی خاطر محبت کریں گے تو عام طور پر محبت سے بندھی ہوئی توقعات پوری نہ ہو سکیں گی اور جی میں گِلے شکوے پیدا ہوں گے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ محض خدا کے لیے خلقِ خدا سے محبت کرے۔

ایک اور حدیث آتی ہے ابو داؤد میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((عَنْ عُمَرَبْنَ الْخَطَّاب رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰہِ لَاُنَاسًا مَا ھُمْ بِاَنْبِیَاءَ وَلَا شُھَدَاءَ یَغْبِطُھُمُ الْاَنْبِیَاءُ وَالشُّھَدَاءُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ بِمَکَانِھِمْ مِنَ اللّٰہِ تَعَالٰی قَالُوا یَا رَسُولَ اللّٰہِ تُخْبِرُنَا مَنْ ھُمْ قَالَ ھُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوا

بِرُوحِ اللهِ عَلَى غَيْرِ أَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا أَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا فَوَاللهِ إِنَّ وُجُوهَهُمْ لَنُورٌ وَإِنَّهُمْ عَلَى نُورٍ لَا يَخَافُونَ إِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُونَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ)) (۱)

''اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن بہت سے انبیاء اور شہداء اُن کے خاص مقام قُرب کی وجہ سے اُن پر رشک کریں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیں بتلا دیجیے وہ کون بندے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا وہ ایسے بندے ہیں جنہوں نے بغیر کسی رشتے اور قرابت، یا مالی لین دین کے، محض اللہ کے لیے باہم محبت کی۔ بس قسم ہے اللہ کی! قیامت کے دِن اُن کے چہرے نورانی ہوں گے، بلکہ سراپا نور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور عام انسانوں کو جس وقت خوف و ہراس ہوگا اُس وقت وہ بے خوف اور مطمئن ہوں گے۔ اور جس وقت عام انسان مبتلائے غم ہوں گے، وہ اُس وقت بے غم ہوں گے۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''معلوم ہونا چاہیے، جو اللہ کے دوست اور اُس سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں، اُن کو خوف اور غم نہ ہوگا۔''

ایک اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللهَ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي)) (۲)

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، کہاں ہیں میرے جلال کی خاطر محبت کرنے والے، آج میں اُن کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں گا، جب کہ آج میرے عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''

دل میں اللہ کی محبت پیدا کرنے کے لیے مشق کی ضرورت ہے:

اللہ کی محبت اپنے دلوں میں کیسے پیدا کی جائے؟ اس بارے میں علماء کہتے ہیں اِس کے لیے مشق کرنی پڑتی ہے۔ اتنی قیمتی اور اعلیٰ چیز بیٹھے بٹھائے حاصل نہیں ہوتی۔ کتاب ''اصلاحی خطابات'' کی جلد نمبر ۹ میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرھن

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ و الآداب، باب فی فضل الحب فی اللہ

''اب اگر دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لیے ہو جائیں، تو یہ درجہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو مشق کرنی ہوتی ہے۔'' بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کی غرض سے جاتا ہے تو یہ حضرات اس طرح تربیت کرتے ہیں یہ ساری مباح محبتیں باقی رہیں، اسلام محبتوں کو مٹانے کے لیے نہیں آیا! اللہ سے شدید محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ باقی کسی سے محبت ہی نہ رہے، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی محبتوں کا زاویہ (angle) بدل جائے۔ نکتۂ نظر تبدیل (change) ہو جائے، اور یہ تمام محبتیں حقیقتاً اللہ کے لیے ہو جائیں۔

ڈاکٹر عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اِن محبتوں کو بدلنے کے لیے سالہا سال تک مشق کی ہے، تب کہیں جا کر کامیابی ہوئی۔ اور مشق اس طرح کی، مثلاً گھر میں داخل ہوئے، کھانے کا وقت ہے، شدید بھوک لگی ہوئی ہے، کھانا سامنے لگا ہوا ہے، اور دِل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے کھانا شروع کر دیں لیکن شروع کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے نفس کو روکا اور دِل میں خیال لایا کہ نفس کے تقاضے کے لیے نہیں کھاؤں گا، ہاتھ روک لیا اور پھر سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شکر ادا کرتے ہوئے اپنی احتیاج کے مطابق کھا لیا کرتے۔ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اِس سنت کی اتباع کرنی چاہیے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں کھانا کھاتا ہوں۔ پھر کھانا شروع کیا تو اللہ کی خاطر اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے پر کھایا۔

دیکھیے! اپنے نفس کی تربیت کے لیے مجاہدہ چاہیے۔ ابھی تو حال یہ ہے کہ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو ہمیں بسم اللہ پڑھنا بھی یاد نہیں رہتا۔ جو اللہ نے خاص مہربانی سے مجھے رزق عطا کیا ہے۔ کتنے ہی لوگ اس نعمت سے محروم ہوں گے، اُن کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہ ہوگا۔ اس لیے اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس کے نام سے کھانا شروع کریں۔

دنیا میں انسان کسی سے بھی محبت کرے تو ضروری تو نہیں کہ اس کا جواب محبت ہی کی صورت میں ملے۔ یک طرفہ محبت (One sided love) بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن یقین رکھیں کہ جو اللہ سے محبت کرتا ہے اللہ اس محبت کے بدلے ہزار گنا بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ اور یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ {وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا} (النساء:۸۷)

آپ یہ محبت نہ تول سکتے ہیں نہ ناپ سکتے ہیں اور انتہا یہ کہ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ سے ہم جتنی چاہیں محبت کر لیں کبھی مضر نہیں ہوگی، کبھی گھاٹا یا نقصان نہیں ہوگا۔ فائدہ ہی فائدہ ہے۔

وارے نیارے ہوجائیں گے۔اس لیے کثرت سے دعا کرنی چاہیے۔

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّکَ))(۱)

''اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیری محبت کا،اور اِس شخص کی محبت کا جو تجھ سے محبت کرے۔اور اُس عمل کا جو مجھ کو تیری محبت تک پہنچادے۔''

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت:

دوسری واجب محبت اللہ کے رسول نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے۔اللہ کے بارے میں بھی محبت کا خیال کم ہی لوگوں کو آتا ہے۔ہم اللہ سے جذباتی تعلق نہیں رکھتے بلکہ ہمارا تعلق بڑا official،formal ، distant،اور ٹھنڈا ٹھنڈا سا ہے۔جو ہمیں 70 ماؤں سے بھی زیادہ چاہتا ہے، ہماری محبت میں حرارت نہیں ہے، اللہ سے تعلق میں جذبات کی گرمی ہونی چاہیے۔بے ساختہ پن ہو۔اللہ کا نام سن کر دل میں ہلچل ہونی چاہیے۔نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام سن کر دل میں کچھ کیفیت ہونی چاہیے۔آنکھوں میں نمی کا احساس ہو۔دل ہمارا untouched،لاتعلق نہ رہے۔اپنائیت اور قربت کا احساس ہو۔جب تک جذبات شامل نہیں ہوں گے، ایمان نہیں آسکتا۔ اللہ کا ذکر سن کر ہمیں خوشی ہو،رونا آئے،محبت اُبلتی پڑتی ہو اور انسان کو کسی سے جتنی زیادہ محبت ہوتی ہے،اُس کا اتنا ہی زیادہ ذکر کرنا اور سننا چاہتا ہے نبی اکرم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بھی اتنی ہی اور ایسی ہی محبت ہونی چاہیے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ}(آل عمران: ۳۱)

''اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اِن سے کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو تم میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہماری محبت کس نوعیت کی ہونی چاہیے؟ اس بات کا پتا تب ہی چلے گا جب ہم اُن کو جانیں گے،اُن کی سیرت پڑھیں گے،اُن تمام حالات وواقعات سے گزریں گے جو انہیں پیش آئے،اُن کی پیدائش سے لے کر اُن کے وصال تک تمام حالات سے باخبر ہوں گے۔تبھی تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کے تقاضے سمجھ آئیں گے۔جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت واجب ہے تو آپ کو جاننا بھی واجب ٹھہرا۔تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے کامل محبت اور ایک قدرتی تعلق پیدا

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید

ہو۔کسی بھی انسان سے محبت اس کی معرفت کا نتیجہ ہوتی ہے، کسی کے جمال کی وجہ سے، کمال کی وجہ سے یا جلال کی وجہ سے ہمیں اس سے محبت ہوجاتی ہے۔ جہاں تک اللہ کا تعلق ہے تو ہر صفت کا کامل اظہار اللہ کی ذات میں موجود ہے۔ اگر ان صفات کا ادنیٰ سا پرتو بھی کسی میں دِکھ جائے تو لوگ اس شخص کے گرویدہ ہوجاتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اتنے حسین تھے تو اُن کا بنانے والا کتنا خوب صورت ہوگا۔ اس طرح اللہ کے دیدار کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور انسان دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنا دیدار نصیب فرما۔ ہم جنت میں تیرے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں۔ یہ تڑپ محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت بھی ٹوٹ کر ہونی چاہیے، کیوں کہ خالق کو بھی اپنی تمام تر مخلوقات میں سب سے زیادہ محبت اپنے رسول سے ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ میں اُس کو اُس کے والدین سے، اُس کی اولاد سے اور تمام کے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہوجاؤں۔''

یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت کا معیار ہے۔ اس حدیث کے ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد سن کر فرمایا کہ: ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ پیارے ہیں۔ والدین سے، اولاد سے لیکن اپنے نفس، اپنی جان سے زیادہ پیارے ہیں یا نہیں! یہ میں نے کبھی سوچا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔ انھوں نے کُھلے دل سے سچائی کا اعتراف کیا۔ ہمارے اسلاف زبانی کلامی لوگ نہیں تھے، وہ لوگ جو بولتے پوری ذمہ داری کے ساتھ سوچ سمجھ کر بولتے۔'' تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں فرمایا: ''اے عمر رضی اللہ عنہ! تمہارا ایمان ابھی مکمل نہیں۔'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے میری جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔''

ایسی محبت ہمیں اپنے رب سے اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہونی چاہیے۔ حدیث میں آتا ہے۔

((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ))(۱)

''ہر شخص اُس کے ساتھ ہوگا، جس سے اُس نے محبت کی ہوگی۔''

ہوسکتا ہے ہمارے اعمال اس لائق نہ ہوں کہ ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ آخرت میں رہیں، لیکن اُن سے محبت ہمیں وہاں پہنچا دے گی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب تک ہمارے لیے اجنبی رہیں گے ان

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه

سے محبت کا بیج نہیں لگ سکے گا۔ اجنبیوں سے محبت تو نہیں ہوا کرتی۔ محبت کے لیے جاننا ضروری ہے، تبھی اپنائیت پیدا ہوتی ہے اور پھر قربت بڑھتی ہے، پھر کہیں محبت پیدا ہوتی ہے۔ ذرا سوچیں نہ کبھی آپ ﷺ کے زندگی کے حالات پڑھے، نہ آپ کے دن و رات کے معمولات کو جانا، نہ آپ ﷺ کی سیرت اور احادیث کا مطالعہ کیا تو پھر کیسے آپ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ صرف زبانی کلامی دعویٰ مناسب نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ سے محبت جنت پانے کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح اللہ سے محبت کی ایک بہت بڑی مثال دیکھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی کہ:

قَالَ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْهِ (یوسف:۳۳)

''اے میرے رب! مجھ کو تو قید زیادہ پسند ہے بہ نسبت اُس چیز کے جس کی طرف یہ مجھ کو دعوت دیتی ہیں۔''

یعنی انسان کو اذیت اور سزا قبول ہو جائے لیکن اللہ کی نافرمانی ہرگز قبول نہ ہو۔ کیا یہ محبت کا کوئی معمولی درجہ ہے؟ دراصل انسان کو اللہ سے ایسی ہی محبت ہونی چاہیے کہ ہجومِ بلا اُسے مایوس نہ کر سکے۔

قرآن سے محبت:

پھر واجب محبتوں میں سے ''قرآن کی محبت'' سے بھی دلوں کو آباد کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اللہ کا کلام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ محبوب ہے تو اُس کا کلام بھی محبوب ہونا چاہیے۔ بڑے شوق اور نہایت دل چسپی سے اِسے پڑھنا چاہیے۔

کعبہ سے محبت:

کعبہ سے محبت بھی ایمان کا تقاضا ہے۔ ذرا سوچیں لوگ کیسے دیوانہ وار والہانہ انداز میں کعبہ کا طواف کرتے ہیں۔ اہل ایمان کے دل میں کتنی خواہش وتمنا ہوتی ہے کہ زندگی میں کم از کم ایک بار اللہ کے گھر کا دیدار ہو جائے۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ یہ شوق مسلمانوں میں زندہ ہے، برقرار ہے۔ ہر عمر، ہر ملک، ہر زبان اور رنگ ونسل کے مسلمان ہر سال بغیر کسی جبر کے حج پر جاتے ہیں۔ اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے روضۂ مبارک کا دیدار کرتے ہیں۔

نیک لوگوں سے محبت:

نیک لوگوں سے بھی محبت ہونی چاہیے، اُن کے ساتھ اُن کی صحبت میں رہنے کی خواہش اور

محبت ہونی چاہیے۔ اس کی دعائیں تو پیغمبروں نے بھی کی ہیں۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قرآن حکیم میں بیان ہوئی:

{وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ} (یوسف: ۱۰۱)

''اللہ مجھ کو صالحین کے ساتھ ملا دے۔''

اسی لیے نیک لوگوں کی زندگی کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے تاکہ سلف صالحین کی صحبت کی صورت پیدا ہو جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت:

ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا روایات میں ذکر پڑھتے ہیں تو دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں ازواج مطہرات کا ذکر پڑھتے ہیں اور خاص طور پر واقعۂ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا صبر پڑھ کر کتنا دل چاہتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو چشم تصور سے دیکھا جائے کہ آپ کیسی ہوں گی، اُن کی شخصیت کتنی خوب صورت تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتنی محبوب تھیں۔ پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں انسان سوچتا ہے تو اُن کے حالات کے مطابق ایک نقشہ کھنچتا چلا جاتا ہے۔ خوب صورت اور معصوم چہرۂ مبارک، چکّی پیستی ہوئی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ گود میں، باپ سے شدید محبت کرنے والی بیٹی۔ نہ ہم نے ان کو دیکھا، نہ اُن سے ملے۔ پھر بھی ہمارے دلوں میں اُن کی کشش موجود ہے۔ یہ بھی مبارک محبت ہے۔ اللہ اِس کو قائم رکھے اور مزید بڑھائے۔

دین کے مددگاروں سے محبت:

ہمیں دین کے مددگاروں سے بھی محبت ہونی چاہیے۔ اُن کی چھوٹی موٹی کمزوریوں کو درگزر کریں، اُن کی باتوں کا بُرا نہ مانیں، اُن کے عیب نہ ٹٹولیں، اُن کی عزت و احترام کریں، اُن کی مدد کریں اور اُس مقصد سے بھی محبت کریں۔ اگر اللہ سے محبت ہوگی تو پھر اُس کے لیے جینے والے ہر شخص سے محبت ہوگی، اس کے راستے کے ہر مسافر کی دل میں قدر ہوگی۔

اللہ سے سچی محبت کی نشانی:

اللہ کی محبت کی علامت اور نشانی کیا ہے؟ اُس کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی محبت کا یہ تقاضا ہو کہ میں دنیاوی محبتوں کو خیر باد کہہ دوں، جن چیزوں سے مجھے محبت ہے میں اُن میں سے کسی

بھی محبت کو چھوڑ دوں، تو میں فوراً اُس کو چھوڑ دوں۔ اُس وقت انسان کی طبیعت پر نا قابل برداشت بوجھ نہ ہو۔ ظاہر ہے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اُس کو چھوڑنا تو مشکل ہوتا ہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کتنی ہی محبتیں اللہ کی راہ میں قربان کیں۔ اگر یہ انسان کا رویہ اللہ کے حکم پر فوراً عمل، فرماں برداری، سرِتسلیم خم کرنے کا ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہیں۔ اُس کی کمزوری نہیں رہیں، مجبوری نہیں رہیں، اللہ کے احکام ماننے میں رکاوٹ نہیں رہیں۔ انسان اور اللہ کے درمیان یہ رکاوٹ (barrier) نہیں بنیں بلکہ قربت کا ذریعہ بنی ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ان محبتوں کے دام میں گرفتار ہو کر اللہ کو بھول جائیں یا پسِ پشت ڈال دیں۔

مباح محبتیں:

مباح محبتیں (permissible affections) کون سی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا:

{ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَ الْبَنِيْنَ وَ الْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ}(۱۴)

''مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت (یعنی انسان فطری طور پر محبت کرتے ہیں) بیویوں سے، بیٹوں سے (مراد ہے بچوں سے) اور ڈھیروں ڈھیر مال سے، سونے چاندی کے خزانوں سے اور نشان زدہ گھوڑوں سے۔''

یہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان کو اہل وعیال اچھے لگتے ہیں، مال مویشی دل کو لبھاتے ہیں، جائیداد اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب محبتیں دل کے اندر پیوست کر دی ہیں۔ فرمایا:

{هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ}(المؤمن: ۳۹)

''یہ سب کچھ تو دنیا کی زندگی کا سامان ہے''

تو ان چیزوں سے محبت کرنے کو منع نہیں کیا گیا۔ یہ محبتیں حرام کے زمرے (category) میں نہیں آتیں، یہ مباح ہیں۔ ان سے محبت کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح دنیا کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے کیوں کہ یہ دنیا اللہ نے بنائی ہے۔

مباح محبتوں کی اہمیت:

دیکھا جائے تو ان مباح محبتوں کی وجہ ہی سے دنیا کی رونق چل رہی ہے، ورنہ اگر دولت میں

کشش نہ ہوتی، اولاد کی خواہش دل میں نہ ہوتی اور شادی بیاہ کا ارمان اور ضرورت نہ ہوتی تو کوئی کیوں محبت کرتا، مشقتیں جھیلتا، دوڑ دھوپ کرتا۔ یہ ساری رونقیں (hustle bustle) انہی کی وجہ سے ہیں۔ دوسرے انہی نعمتوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے جنت کی پہچان بھی کرائی ہے۔ قرآن میں جب جنت کا ذکر آتا ہے تو وہاں کے محلات کا، پاکیزہ جوڑوں کا، زیورات کا اور خوب صورت لباس کا بھی ذکر آتا ہے۔ جنت کی ان نعمتوں کی پہچان کی غرض سے ان کی جھلک دنیا ہی میں دکھادی گئی۔ تاکہ جنت کا تصور کرکے زندگی کا مقصد اسی کے حصول کو بنائیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے ان مباح محبتوں کو نبھانے پر جنت کا وعدہ کیا ہے۔ یعنی اگر ہم والدین کے حقوق احسن طریقے سے ادا کریں تو جنت کے حق دار بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں اور قرابت داروں کے حقوق رکھے ہیں۔ ایک انسان ان کے حقوق ادا کرکے جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ اور سب سے بڑا حق تو یہ ہے کہ یہ تمام مباح چیزوں کو اللہ سے جوڑ دیا جائے۔ اللہ سے ان کا (connection) کردیا جائے۔ پھر یہ تمام ''مباح محبتیں'' واجب محبتوں تک پہنچنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ایک سیڑھی اور ایک ذریعہ بن جاتی ہیں، اللہ کی محبت کو حاصل کرنے کا۔ یہ ساری محبتیں ایک طرح سے آخرت میں، جنت کو پانے کی (currency) ہیں۔ یہ تمام حق ادا کرو، جنت پالوگے۔ اور یہی محبتیں امتحان بھی ہیں۔ کہیں ان کے اندر ہم الجھ کر نہ رہ جائیں۔ اگر دولت کی محبت دل میں نہ ہوتی زکوٰۃ دینے کا کیا اجر ہوتا۔ اگر کھانے پینے کی محبت دل میں نہ ہوتی، تو روزہ رکھنے کا کیا اجر ہوتا۔ اللہ کا فرمان ہے

{لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ} (آل عمران: ۹۲)

''تم ہرگز نہیں پہنچ سکتے نیکی تک، جب تک تم اُن چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن سے تم محبت کرتے ہو۔''

یہ نعمتیں اور ان سے محبت فطری طور پر ہمارا امتحان بھی ہے۔ انہی نعمتوں کے ذریعے سے ہم آزمائے بھی جائیں گے، اور اجر کے مستحق ہوں گے اگر ہم ان پسندیدہ چیزوں کو فطری محبت کے باوجود، اللہ کی راہ میں، اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ ان کے اندر الجھ کر نہ رہ جائیں۔ ان کو زندگی کا مقصد نہ بنالیں، دینے والے کو بھول جائیں اور اُس کی دی ہوئی نعمتوں ہی کی پرستش کرنے لگیں۔

مباح محبتوں کی حدود:

اللہ تعالیٰ نے یہ تمام زینتیں دنیا میں رکھی ہیں تاکہ ہمیں آزمائے کہ ہم جنت کے خریدار بنتے ہیں یا اسی دنیا میں گم ہوجاتے ہیں جو بالآخر ختم ہوجانے والی ہے۔ اسلام میں ''انسان دوستی'' تو یقیناً بہت پسندیدہ ہے لیکن ''انسان پرستی'' کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ انسانوں سے اتنی محبت ہوجائے کہ حبّ اللہ کے تقاضے نظر انداز ہونے لگیں۔ یہ مباح محبتیں اُس وقت تک جائز ہیں جب تک یہ واجب محبتوں کے تابع رہیں، اپنی حدود (limits) کے اندر اندر رہیں۔ اگر ان مباح محبتوں کا مقام ہماری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ، اور اللہ کی کتاب سے سب سے بڑھ جاتا ہے تو یہ حد سے بڑھ جانا ان جائز محبتوں کو بھی ناجائز بنا دیتا ہے۔ کیوں کہ ایک مباح چیز کا حد سے بڑھ جانا اس کو پسندیدہ کی بجائے مکروہ بنا دیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۴ میں فرمایا ہے:

﴿ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَ اَبْنَآؤُكُمْ وَ اِخْوَانُكُمْ وَ اَزْوَاجُكُمْ وَ عَشِيْرَتُكُمْ وَ اَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَ تِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَ مَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَاۤ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ وَ جِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴾

''اے نبی ﷺ ان سے کہہ دیجیے اگر تمہیں تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد، اور تمہارے بہن بھائی، اور تمہارے جوڑے (میاں بیوی) اور تمہارا کنبہ، اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت تمہاری جس کے نقصان کا تم کو اندیشہ لگا رہتا ہے، اور تمہارے وہ گھر جو تمہیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں تمھیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اُس کے رسول ﷺ سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو پھر انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اس آیت میں ان لوگوں کو فاسق کہا گیا جو مباح محبتوں کے دام ہی میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ یہی ہماری سب سے بڑی آزمائش ہے۔ اس آیت میں ایک ترازو ہے جس کے ایک پلڑے میں ان آٹھ محبتوں کو ڈالیں اور دوسرے پلڑے میں اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور جہاد کی محبت ڈالیں اور خود دیکھ لیں کون سا پلڑا بھاری ہے۔ خود ہی اندازہ ہوجائے گا ہم آخرت میں کہاں کھڑے ہوں

گے اور کس سلوک کے مستحق ہوں گے۔ یہ تو پھر بھی آٹھ (۸) محبتوں کا بیان ہے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایک ہی محبت میں پھنس کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بھول جاتے ہیں، ایک ہی نعمت کو پا کر غافل ہو جاتے ہیں اور دیوانہ وار اُس کو پوجنے لگتے ہیں۔

ان محبتوں پر قابو (control) پانے کی ضرورت ہے۔ اور یہی بہت بڑا جہاد ہے کہ ہم مباح محبت کو ناجائز ہونے سے بچالیں۔ اچھی خاصی جائز چیز سے محروم نہ ہو جائیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص خوب محنت مشقت کر کے حلال روزی کماتا ہے لیکن اگر وہ اس حلال کمائی کو کسی ناجائز چیز پر خرچ کر دے تو اُس نے اپنا کتنا نقصان کیا۔ حلال چیز کے غلط استعمال نے ایک اچھی چیز کو برا بنا دیا۔ حلال چیزیں اچھی ہیں، ہماری زندگی کی رونقیں ہیں۔ یہ ساری محبتیں، والدین کی، اولاد کی، رشتہ داروں کی، مال کی اور گھر کی، متاعِ دنیا ہیں۔ لیکن ان میں حد سے زیادہ ملوث ہو جانا اور ان محبتوں کی خاطر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کو قربان کر دینا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ انسانوں کا اپنی محبتوں کو جائز حد کے اندر رکھنا بہت بڑا جہاد ہے، اس کے لیے سالہا سال کی محنت چاہیے۔ اس کو منضبط کرنے کا طریقہ وہی ہے جو ڈاکٹر عبدالحی رحمۃ اللہ علیہ نے بتایا ہے کہ بندہ جو بھی کام کرے وہ شعوری طور پر سوچ کر کرے کہ میں یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کر رہی ہوں یا کر رہا ہوں اور یہ ایک طویل جہاد ہے جس کے لیے طویل مدت چاہیے۔ جب انسان ان مباح محبتوں کو اللہ کی محبت کے تابع کر دیتا ہے تب یہ محبتیں اُس کی طاقت بن جاتی ہیں، کمزوری نہیں بنتیں، اُس کے پاؤں کی بیڑیاں نہیں بنتیں، اُس کو مزید جلا (empower) بخشتی ہیں۔ جو اللہ کی خاطر ان چیزوں سے محبت کرتا ہے وہ ہمیشہ دینے والا ہوتا ہے، لینے والا نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں سے توقعات نہیں رکھتا، اُس کی شخصیت بہت مضبوط رہتی ہے۔ ایسے شخص کو دنیا کی مباح محبتیں کبھی دکھ نہیں پہنچائیں گی، اذیت کا سبب نہیں بنیں گی، کبھی رنج نہیں پہنچائیں گی۔ اُس کی زندگی کو خوش نما (positive out look) بنائیں گی۔ اُس کی زندگی میں سکون اور خوشیاں پھیلائیں گی۔

اللہ سے دنیوی خوشیوں کے لیے محبت رکھنا:

اگر کوئی اللہ سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ اُس کی دنیا کی خوشیاں برقرار رہیں، مثلاً نماز اس لیے پڑھتا ہے کہ صحت اچھی رہے، زکوٰۃ اس لیے دیتا ہے کہ مال چوری نہ ہو۔ یعنی ہر نیکی اور عبادت کے پیچھے نیت یہ ہو کہ دنیاوی خوشیاں قائم و دائم رہیں، جاری و ساری رہیں اور جن دنیاوی نعمتوں سے مجھے

محبت ہے ان پر آنچ نہ آئے۔ اللہ سے محض اس لیے دُعا، سوال اور آہ وزاری کہ دنیاوی نعمتیں قائم رہیں، ان کو کچھ نہ ہونے پائے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اداس (upset) رہتے ہیں۔ کوئی نقصان ہوجائے، خسارہ ہوجائے اللہ سے بدگمان ہوتے ہیں اور لوگوں کی طرف سے بھی مخدوش (insecure) رہتے ہیں۔

اصل حق اللہ اور اس کے دین کا ہے:

اس معاملے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نفس کا ہم پر حق ہے یہ مضمون تو ہمیں حدیث پاک میں ملتا ہے:

((فَاِنَّ لِجَسَدِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَيْنِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِكَ عَلَيْكَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا))(۱)

''تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تیرے اوپر حق ہے، تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

لیکن یہ نہ ہو کہ یہ سب حقوق ادا کرتے کرتے اللہ کا حق ادا کرنے کا وقت ہی نہ بچے۔ مال کے لیے روئیں، اولاد کے لیے روئیں، کاروبار وغیرہ کی فکر میں گھلتے رہیں اور کبھی دین کا خیال ہی نہ آئے کہ دین کا بھی ہم پر حق ہے۔ دین کے لیے بھی فکرمند اور پریشان ہونا چاہیے۔ ہمارے مال اور وقت میں، ہماری توجہ اور محبت میں ہمارے دین کا بھی حصہ ہے۔ ہر ایک کی یاد میں رونا آئے اور اللہ کی یاد میں کبھی آنکھ پرنم نہ ہو، یہ نہیں ہونا چاہیے۔

حرام محبت:

چوتھی قسم حرام محبت کی ہے، یعنی ایسی محبت جو گناہ کا باعث بنے یا بذات خود گناہ ہی سے محبت ہوجائے۔ یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا اُن سے محبت، جن چیزوں سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا ہے اُن کی طرف رغبت، یا اُن میں ملوث ہوجانا، یہ بڑا فتنہ ہے۔ ناجائز چیزوں میں کشش محسوس کرنا بھی فتنہ فساد ہے۔ قرآن میں سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۸۸ میں آتا ہے کہ:

{وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا}

''وہ پسند کرتے ہیں کہ اُن کی تعریف کی جائے، ایسے کاموں پر جو اُنہوں نے نہیں کیے''

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف

یہ اپنی تعریف کی خواہش ہے، اپنی شہرت کی

تمنا اور اپنی مدح (flattery) سننے کا شوق، قصیدوں کا شوق، دل چاہے کہ لوگ میری تعریف کریں، خوشامد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان چیزوں سے منع فرمایا ہے اور اس کی قرآن میں بہت مذمّت (condemn) کی گئی ہے۔ تو جائز چیزوں پر بھی اپنی تعریف پسندیدہ نہیں۔ رسولوں نے ہمیشہ اپنی قوم سے کہا تھا۔

{مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ} (الفرقان:۵۷)

''میں اس کام کا تم سے کوئی صلہ کوئی اجر نہیں مانگتا۔''

تعریف کی شکل میں بھی رسولوں نے اپنی قوموں سے اجر نہ مانگا، نہ احسان جتایا۔ وہ اپنے رب سے اجر کے طلب گار ہوتے تھے۔ جائز کاموں پر بھی بہت تعریف چاہنا اور اپنی شہرت کی خواہش دل میں رکھنا انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

اسی طرح ایسی چیزوں سے محبت کرنا، جن سے اللہ نے منع کیا، مثال کے طور پر شراب یا زنا یا جُوا۔ یہ سب حرام محبتیں ہیں ان سب سے بچنا چاہیے۔ اپنے آپ کو بھی ان سے دور رکھیں اور اپنے دل کو بھی ان سے بچائیں۔ حرام چیزوں کی محبت دل میں اُس وقت آتی ہے جب اردگرد کے لوگوں میں یہ چیزیں رچی بسی ہوں۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ حرام کاریوں میں ملوث ہونے کے باوجود دنیا میں ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا، بلکہ یہ تو بہت مزے (enjoy) کر رہے ہیں، خوش باش ہیں۔ اور شیطان تو گناہوں کو بہت ہی خوب صورت، اور پُرلطف (enjoyable) دکھاتا ہے تو جب وہ دیکھتا ہے کہ گناہ میں اتنی رنگینی اور مزہ ہے اور کوئی سزا بھی نہیں مل رہی تو پھر اس کے دل میں بھی یہ شیطانی خیال آتا ہے کہ پھر میں کیوں محروم رہوں! اور پھر رفتہ رفتہ وہ ان چیزوں کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

دنیا کی پرکشش چیزیں امتحان کے لیے ہیں:

شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ گناہوں کو، حرام کردہ چیزوں کو اچھا اور خوب صورت کر کے دکھائے۔ اگر یہ گناہ اتنے پرکشش (attractive) نہ ہوتے تو پھر ان سے بچنے کا کیا اجر ہوتا؟ یہ تو پھر امتحان نہ ہوتا۔ یہی تو امتحان ہے کہ چمک دمک کے باوجود ان سے منہ موڑ لیا جائے۔ اسی بات پر اجر و ثواب (reward) ہے۔ جو لوگ ان چیزوں کو آرٹ کے ذریعے، اشتہارات کے ذریعے پُرکشش بنا کر دکھاتے ہیں، یا ان کو مال کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں اور لوگوں کو گناہوں کی طرف مائل

کرتے ہیں وہ اللہ کے ہاں رسوا ہوں گے۔ نقد سزا یہ ہے کہ اللہ کی محبت اور رحم سے محروم ہوں گے، یعنی واجب محبت سے محروم ہو جائیں گے، انتہائی قیمتی (valuable) چیز سے تہی دست ہو جائیں گے۔ اور حقیر و گھٹیا محبتوں پر اکتفا کر لیں گے، جس کا نتیجہ بھی خسارہ ہی نکلے گا۔ خلاصہ یہ کہ نہ ان حرام چیزوں کے قریب جانا چاہیے اور نہ ان کا شوق یا خواہش دل میں آنے دیں۔ ہر طرح ان سے دُور رہیں اور درحقیقت یہ انسان کے لیے بڑی آزمائش ہے کہ اُسے ایسے شخص سے محبت ہو جائے، اُس کا گرویدہ ہو جائے جو اللہ سے محبت نہ کرے۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہے۔

اللہ سے محبت کرنے والوں ہی سے محبت رکھنی چاہیے:

سب سے اچھی اور مبارک چیز یہ ہے کہ ہم جن سے محبت کریں وہ خود بھی اللہ سے محبت کرتے ہوں۔ تبھی تو یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ:

((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ أَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ))(۱)

''اے اللہ! مجھے اپنی اور اس شخص کی محبت دے جو تجھ سے محبت رکھتا ہے''

اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے، ان سے جڑنا چاہیے۔ فرض کریں آپ کے والدین کو اللہ سے محبت نہ ہو تو یہ کتنی بڑی آزمائش ہے۔ آپ کے شوہر کو، اولاد کو، ان رشتوں کو جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے مگر وہ اللہ سے محبت نہ کرتے ہوں یا ہمارے دوست احباب جو ہمیں عزیز ہیں، ہمارے دکھ سکھ میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں لیکن وہ اللہ سے دور ہوں تو پھر یہ لوگ آپ کے لیے فتنہ و آزمائش بن جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں انسان واجب کو سب سے اوپر رکھے اور باقی محبتیں اگر قربان کرنا پڑیں تو قربان کر دے لیکن اللہ کی محبت نہ چھوڑے۔ ایسے لوگوں کی محبت کبھی بھی دل میں پیدا نہ ہو جو اللہ سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ}

(المجادلہ: ۲۲)

''تم نہیں پاؤ گے ایک قوم کو جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں اُن لوگوں سے جو جنگ کر رہے ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔''

ایمان والے بیک وقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے اور ان کے دشمنوں سے کیسے محبت کر سکتے ہیں۔ اُس تہذیب اور اس کلچر سے کیسے محبت ہو سکتی ہے جو اسلام دشمنی پر مبنی ہو۔ جو قومیں

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید

اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہیں ان سے دلی تعلق کیسے پیدا ہوسکتا ہے۔ وہ نظام جو خدا دشمنی پر کھڑا ہوا ہے ایک مسلمان کے خوابوں کا محور کیسے ہوسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ ''اے اللہ ہمیں حرام محبتوں سے بچالے اور واجب محبت کا حق ادا کرنے والا بنادے اور ناجائز اور مکروہ محبتوں کے فتنے سے بچالے۔'' ہم مباح چیزوں کو ناجائز حد تک لے جائیں اور حلال چیزوں کو اپنے لیے باعثِ فتنہ بنالیں۔ احادیث کی کتابوں میں اتنی خوب صورت دُعائیں آئی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی محبت مانگی گئی ہے۔ ایک دُعا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّكَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ وَاجْعَلْ خَشْیَتَكَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدِی وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَآئِكَ اِذَا اَقْرَرْتَ اَعْیُنَ اَھْلِ الدُّنْیَا مِنْ دُنْیَاھُمْ فَاَقْرِرْ عَیْنِیْ مِنْ عِبَادَتِكَ))(۱)

''اے اللہ اپنی محبت کو میرے نزدیک تمام چیزوں کی محبت سے بڑھادے۔ اے اللہ تو اپنا خوف میرے نزدیک تمام چیزوں کے خوف سے بڑھادے۔ اے اللہ تو اپنی ملاقات کے شوق میں دنیا کی حاجات مجھ سے کاٹ دے۔ اے اللہ جب تو دنیا والوں کو، ان کی دنیا سے ٹھنڈک اور لذت دے تو میری آنکھوں کی لذت اور ٹھنڈک اپنی بندگی میں رکھ دے!''

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ یَّنْفَعُنِیْ حُبُّهٗ عِنْدَكَ، اَللّٰھُمَّ مَا رَزَقْتَنِیْ مِمَّآ اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ قُوَّةً لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ اَللّٰھُمَّ مَا زَوَیْتَ عَنِّیْ مِمَّآ اُحِبُّ فَاجْعَلْهُ فَرَاغًا لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ))(۲)

''اے اللہ! مجھ کو اپنی محبت عطا کر اور اس شخص کی محبت دے جس کی محبت مجھے تیرے قریب کرنے میں فائدہ دے۔ اے اللہ! جو تو نے مجھے عطا کیا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں تو اس کو میرے ان کاموں کے لیے قوت کا سبب بنادے، جن سے تو محبت رکھتا ہے۔ اے اللہ! جو تو نے مجھ سے لے لیا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں، تو اس کو ان کاموں کے لیے فراغت کا باعث بنا جن سے تو محبت کرتا ہے۔''

دیکھیں یہ کتنی عظیم دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیں مسنون دُعائیں اسی طرح مانگنی چاہئیں۔

---

(۱) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، کتاب الدعا، الفصل السادس جوامع الادعیہ

(۲) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید

مختلف محبتوں کی نشان دہی:

ہمیں یہ دیکھنا ہے کون سی محبت واجب ہے، کون سی مباح اور کون سی حرام کے زمرے (category) میں آ رہی ہے۔

دو چیزوں کو تو صرف دیکھنے کا بھی اجر ہے: خانہ کعبہ کو اور والدین کو۔ خانہ کعبہ تو ہمارے گھر میں نہیں ہوتا لیکن والدین تو ہوتے ہیں۔ اُن سے ضرور محبت کریں، والدین کو محبت بھری نظر سے دیکھنا بھی صدقہ ہے۔ حدیث میں مضمون آتا ہے کہ:

''والدین کو محبت کی نگاہ سے، مسکرا کر دیکھنے پر مقبول حج کا ثواب ملتا ہے۔''

کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم والدین کو دن میں سو بار دیکھیں تو کیا سو مقبول حج کا ثواب پائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم عمل کرتے کرتے تھک جاتے ہو، اللہ اجر دیتے دیتے نہیں تھکتا۔''

اس میں احتیاط یہ رکھنی ہے کہ والدین اگر کسی ایسی بات کا حکم دیں جس کا اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو اطاعت نہیں کرنی۔ ہاں ان کی عزت و شرف میں کمی نہ آنے پائے لیکن ان کی بات پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اگر ہم یہ حدود کھینچ لیں اور ان کا لحاظ کر سکیں تو یہ بڑی بات ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم مخالفت اور حمایت دونوں میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کو مسلسل توازن میں رکھنا آسان بات نہیں ہے، یہ لمحہ لمحہ جہاد ہے۔ ہم کبھی ادھر ڈھلک جاتے ہیں اور کبھی اُدھر بڑھ جاتے ہیں۔

خاندان کے دباؤ میں آ کر رسمِ مہندی میں جانا، ورنہ بڑی بدمزگی ہوگی۔ یعنی خاندان کی محبت مباح سے بڑھ کر ناجائز میں چلی گئی۔ اس محبت نے اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر آمادہ کر دیا۔ یا پھر رات گئے تک آپ کے بچوں نے پڑھائی کی تو انھیں فجر کی نماز کے لیے نہیں اُٹھایا۔ یعنی مائیں اپنے بچوں سے اتنی محبت نہ کریں کہ انہیں اللہ کا فرمان بردار بنانے سے ہچکچائیں۔ اولاد سے محبت مباح تھی، مگر ہم اُسے حرام کے درجے تک لے گئے۔ امتحان سروں پر ہیں، روزہ کی حالت میں پڑھنا مشکل ہے، اس لیے بچے روزہ نہ رکھیں، یہ محبت بھی حرام کے درجے میں چلی گئی۔ یعنی اللہ کی نافرمانی کرنا تسلیم کر لیا لیکن اولاد کو تکلیف دینا گوارا نہ ہوا، ان کو بے آرام کرنا ٹھیک نہیں لگا۔ اسی طرح بیٹیاں جب بالغ ہو جائیں تو حجاب فرض ہے لیکن والدین نہیں کرواتے کہ لوگ ہنسیں گے، دوست کیا کہیں گے، اس کی عمر کی اور کوئی لڑکی پردہ نہیں کرتی۔ یا پھر اس ڈر سے کہ رشتے آنے بند

ہوجائیں گے اگر ہم نے بیٹیوں کو پردہ کروادیا۔یعنی اولاد کی محبت اللہ کی محبت سے، اس کے حکم سے آگے بڑھ گئی۔سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَ اَھْلِیْکُمْ نَارًا وَّ قُوْدُھَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَۃُ عَلَیْھَا مَلٰٓئِکَۃٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ}

(التحریم:٦)

''اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔اس جہنم پر ایسے فرشتے ہیں جو انتہائی سخت دل وتندخو ہیں۔وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، وہ تو وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دے دیا جائے۔''

کیا ہم اپنی اولاد کو ایسے سخت گیر فرشتوں کے حوالے کرسکیں گے۔یہ کیسی محبت ہے کہ اپنی اولاد کو جہنم کا نوالہ بنادیا، یہ تو محبت کی صحیح تعبیر نہ ہوئی بلکہ الٹا ظلم اور دشمنی کی اپنی اولاد سے۔مباح محبتوں کا حق اس وقت ادا ہوسکتا ہے، جب اس کو اللہ کی محبت کے تابع رکھا جائے اور جب ان کو اللہ کی محبت سے جوڑ دیا جائے۔یہ بھی بڑا جہاد ہے جو کرنے کی ضرورت ہے۔

پھر یہ ہے کہ اگر قرآن کا کوئی حکم یا اُس کی حکمت سمجھ نہ آئے یا کسی معاشرتی اقدار، تصورِ عدل سے ٹکراتا ہوا محسوس ہو تو پھر بھی عمل ترک نہ کرے اور یہی گمان رکھے کہ اس میں میری بھلائی ہے۔یہ واجب محبت ہے۔قرآن سے ہمیں ایسی ہی محبت ہونی چاہیے۔

ایک عورت کو زیورات بہت پسند ہیں، لیکن وہ زکوٰۃ کے بارے میں بھی بہت محتاط ہے تو اب یہ زیور کی مباح محبت ہے۔لیکن یہ صورت حال ہو کہ زیور تو بہت پسند ہوں، مگر زکوٰۃ دینے کی ہمت نہیں ہو تو اس طرح ایک مباح محبت حرام ہوگئی۔زیور عورت کو پسند ہے، اللہ نے خریدنے اور پہننے سے منع نہیں کیا لیکن اتنی محبت نہ ہوجائے کہ زیور خرید خرید کر جمع کرلیں، خوب پہنیں اور ''بطر'' کا شائبہ ہوجائے۔یا پھر زکوٰۃ ادا نہ کی تو وبال سر پر آگیا۔خلاصہ یہ کہ اچھی خاصی مباح محبت ہماری غلطیوں کی بنا پر ناجائز اور حرام محبت میں تبدیل (convert) ہوجاتی ہے۔

ایک اور مثال دیکھیں کسی کے بھائی کی شادی تھی، بہت کوشش کے باوجود تقریب مخلوط ہوئی اور چوں کہ بھائی کی شادی تھی اس لیے شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔لیکن بھائی کی محبت کے نتیجے میں اللہ کی ناراضی مول لی، قرآن کا حکم توڑا اور اللہ کے رسول ﷺ کی سنت پر سمجھوتا

(compromise) کیا۔

اگر آپ کے دل میں یہ خوف آتا ہے کہ میرا شمار اُن اُمتیوں میں نہ ہو جو آپ ﷺ سے لیے رنج اور رسوائی کے باعث ہوں گے۔ تو یہ آپ ﷺ سے محبت کی نشانی ہے، یہ بہت نیک جذبہ ہے۔ ہمیں ہر گھڑی امّتی ہونے کا پاس ہونا چاہیے۔

اللہ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر شعوری طور پر دل سے سبحان اللہ نکلتا ہو یہ مستحب ہے۔ شعوری طور پر اللہ کی نعمتوں کا ادراک رکھیں، اللہ کی مہربانیوں اور لطافتوں پر نظر رکھیں اور ان احسانات کے بدلے اللہ کا شکر بجالائیں۔

قرآن پڑھنے پڑھانے والوں سے بھی محبت رکھیں، کیوں کہ نیک لوگوں سے محبت رکھنا اللہ سے محبت کی راہ آسان کرتا ہے۔ اس نیت سے محبت کریں کہ وہ ہمیں اللہ سے اور دین سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نتیجہ :

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب جائز چیزوں کی محبت واجب محبتوں پر حاوی ہو جائے تو یہ حرام کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ اور ہمارا امتحان یہ ہے ان محبتوں میں اعتدال رکھا جائے۔ دنیاوی رشتوں کی محبتیں اور جبلّی محبتیں کبھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور جہاد کی محبت سے آگے نہ بڑھ جائے۔

قرآن کا کثرت سے مطالعہ کریں اور کائنات پر غور کیا کریں تا کہ اللہ کی عظمت پیدا ہو۔ نبی اکرم ﷺ کی سیرت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات زندگی پڑھا کریں تا کہ اُن سے جذباتی وابستگی اور اپنائیت کا تعلق پیدا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی محبت کرنی چاہیے، ان کی تعظیم اور احترام بھی لازم ہے، یہ بھی واجب محبت ہے۔ اور اپنے جذبات کو ایسے ڈھالنا ہے کہ ہر چیز سے اللہ کی خاطر محبت کرنے لگیں۔

اللہ تعالیٰ خالص محبت کی توفیق عطا فرمائے! آمین، یارب العالمین۔

حرص (Greed)

حرص جس کو ''لالچ'' اور ''طمع'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو اپنی ذات میں یہ نہ اچھی ہے، نہ بُری ہے۔ بلکہ اس کا استعمال اس کو اچھا یا بُرا بناتا ہے۔

مطلوب حرص:

اگر انسان میں اپنے لیے بھلائی کا جذبہ ہے، اپنے ساتھ مخلص (sincere) ہے، اور اپنوں کے لیے بھلائی کا حریص ہے تو الحمدللہ یہ بہت اچھا جذبہ ہے۔ انسان کے اندر یہ خواہش وتمنا ہونی چاہیے کہ میرا بھلا ہو جائے اور دوسروں کا بھی بھلا رہے تو یہ حرص بُری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ}(التوبۃ:۱۲۸)

''البتہ تحقیق آ گیا تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق گزرتا ہے۔ تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔''

اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لفظ ''حریص'' استعمال ہوا ہے، آپ ﷺ کے دل میں شدید تمنا تھی کہ انسانیت فلاح پالے۔ ایسی حرص انتہائی مبارک ہے جو دوسروں کو جنت کے اعلیٰ درجوں تک پہنچانے کے لیے ہو اور دوسروں کو آگ سے بچانے کے لیے ہو۔ سورۃ البقرہ میں مسلمانوں کو خطاب کیا گیا ہے:

{اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ}(البقرۃ:۷۵)

''کیا تم طمع رکھتے ہو، اس بات کی کہ وہ تمہاری بات کی تصدیق کریں گے۔''

یہاں بنی اسرائیل اور اُن کے بارے میں مسلمانوں کے نیک خیالات کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ مشرکین کے پاس کبھی کوئی رسول نہیں آیا، یہ ہمیشہ رسالت کے آداب سے بیگانہ رہے، کتاب کے جاننے والے نہیں تھے، اس لیے یہ اسلام کی اتنی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل جب اسلام کی دعوت اور پکار سنیں گے تو وہ نبی اکرم ﷺ فوراً ایمان لے آئیں گے۔ یعنی مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے بارے میں حرص تھی کہ وہ بھی مشرف باسلام ہو جائیں۔ تو یہ ایسی حرص ہے کہ انسان کے پاس اگر کوئی خیر ہے یا کوئی اچھی چیز ہے اور اس کو حرص

ہے کہ یہ خیر اور لوگوں کو بھی مل جائے کوئی محروم نہ رہے۔ دل میں لالچ اور حرص پیدا ہو کہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہوں، فائدہ اُٹھائیں۔ یہ تو بے غرضی والی حرص ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((اِحْرِصْ عَلٰی مَا یَنْفَعُكَ))(۱)

''ان کاموں کی حرص کرو، جو تم کو فائدہ پہنچانے والے ہیں۔''

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{فَاسْتَبِقُوا الْخَیْرٰتِ}(البقرۃ:۱۴۸)

''نیکیوں میں سبقت کرو۔''

{وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ}(آل عمران:۱۳۳)

''دوڑو اللہ کی مغفرت کی طرف۔''

ہمیں یہ حرص ہونی چاہیے کہ مغفرت میرے حصے میں آ جائے اور یہ حرص ہونی چاہیے کہ بہت سارے نیک اعمال آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شوق بھی اس ضمن میں قابل دید تھا۔ جیسے ہی نبی ﷺ وئی ارشاد فرماتے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس پر عمل کرنے کو لپکتے۔ مثلاً ایک حدیث میں ذکر ہے کہ کوئی شخص اگر کسی مسلمان کی نماز جنازہ میں شریک ہو تو اُس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے اور اگر تدفین میں بھی شریک رہے تو دو قیراط اجر ملتا ہے۔ ''قیراط'' وزن کا ایک پیمانہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث مبارکہ سن کر فرمایا: ''افسوس ہم نے بہت سے قیراط ضائع کر دیے۔ اگر حدیث پہلے سنی ہوتی تو ہم ضائع نہ کرتے۔'' یعنی نیکیاں کمانے کی حرص ہوا کرتی تھی۔ کوئی موقع چھوٹنے نہ پائے۔

تو ہم بھی اگر کسی کی عبادت کا یا نیک اعمال کا سنیں تو ہمیں بھی اسے اختیار کرنے کی حرص ہونی چاہیے۔ کوشش کریں کہ کوئی نہ کوئی نیکی اعمال نامے میں ہمہ وقت جمع ہوتی رہے۔

کوئی سنت خواہ چھوٹی سے چھوٹی بھی ہو، اُس پر عمل کی جستجو ہونی چاہیے۔ اصلاحی خطبات میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ایک دفعہ کسی گاؤں میں دعوت کے لیے جا رہے تھے، زوجہ بھی ساتھ تھیں۔ جنگل میں پیدل کا سفر تھا اور ساتھ میں کوئی غیر بھی نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا نبی اکرم ﷺ کی بہت سی سنتوں پر عمل کی توفیق ہو گئی ہے۔ لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کا ابھی تک موقع نہیں ملا۔ آپ نے سوچا کیوں نہ اس سنت پر بھی عمل

(۱) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فی الأمر بالقوۃ وترک العجز۔۔۔

ہوجائے۔تو آپ نے اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگا کر اُس پر بھی عمل کرلیا۔کیا شوق ہے سنت پر عمل کرنے کا اور ہر سنت کتنی خوب صورت ہے۔مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دوڑ لگانے کا شوق نہیں تھا مگر سنت پر عمل کی غرض سے انھوں نے یہ کیا۔یہ ہے اتباع سنت! یہ اچھی حرص ہے۔

حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ ''دو چیزوں کا حریص کبھی سیر نہیں ہوتا، دو چیزوں کا لالچ ایک دفعہ لگ جائے تو وہ لالچ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ایک علم اور دوسری دولت''

علم جتنا بھی ہو، کم لگتا ہے، طلب بڑھتی رہتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ اور علم جمع ہو جائے اور انسان کے پاس جتنی دولت آجائے اُسے کم ہی لگتی ہے۔ظاہر ہے ان دو چیزوں میں سے علم کی حرص اچھی شے ہے۔

بُری حرص:

اب بُری حرص کی طرف آتے ہیں۔بُری حرص وہ ہے جو دنیا کے لیے ہو۔حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ))(۱)

''ابن آدم کو ایک وادی سونے سے بھری ہوئی بھی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ دو مل جائیں۔ اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔''

قرآن میں آتا ہے۔

{اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ ○ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ} (التکاثر: ۱، ۲)

''غفلت میں ڈالے رکھا تم کو تکاثر کی دوڑ نے حتیٰ کہ تم قبر تک پہنچ گئے۔''

پیسے کی حرص اگر انسان کو ہو جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔بہت خراب اور مہلک چیز ہے، انتہائی منحوس ہے۔یہ انسان کی زندگی کا مزہ بھی کرکرا کر دیتی ہے۔عام طور پر حرص اور بخل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔یعنی مال و دولت آ بھی جائے اور پھر کہیں جائے بھی نہ۔یعنی جو حریص ہوتے ہیں وہ عام طور پر بخیل بھی ہوتے ہیں۔جمع کر کر کے رکھتے ہیں، دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ہمارے معاشرے میں جو آخرت کا حریص ہے اُسے انتہا پسند (extremist) کہہ دیتے ہیں اور جو دنیا کا حریص ہے اُسے ہم عالی ہمت اور اولوالعزم (ambitious) کے الفاظ سے سراہتے ہیں۔یعنی دنیا کا حریص

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، بَاب مَا يُتَّقَى مِنْ فِتْنَةِ الْمَالِ

ہونا تو اچھی بات ہے اور آخرت کا حریص ہونا باعثِ شرم اور حماقت ہے۔

آخرت کا حریص پُرسکون، دنیا کا حریص بے سکون:

آخرت کا حریص ہونا انسان کو پُرسکون کر دیتا ہے اور دنیا کا حریص ہونا سکون غارت کر دیتا ہے۔ جو آخرت کے حریص ہوتے ہیں وہ کوئی شکایت نہیں کرتے کیوں کہ آخرت کے لیے زیادہ سے زیادہ جمع کرنا، زیادہ سے زیادہ تیاری کرنا اُن کے بس میں ہوتا ہے۔ کیوں کہ سب کے لیے برابر کا موقع (equal opportunity) ہے۔ یہ ایسی حرص ہے جو بآسانی پوری کی جاسکتی ہے۔ چھوٹی سی نیکی سے لے کر بڑی سے بڑی نیکی کے لیے میدان کھلا ہے۔ آئیں ہمت کریں اور نیکیوں کے خزانے اپنے نام کرلیں۔

جو دنیا کے حریص ہوتے ہیں وہ عموماً بے سکون رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا حاصل کرلینا انسان کے اپنے بس میں نہیں ہے جب اُسے اپنی پسند کی دنیا نہیں مل پاتی تو انسان جھنجلاتا (frustrate) ہے۔ آپ خود مشاہدہ کر سکتے ہیں یہ لفظ آج کل کتنا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے حریص بہت جھنجلاتے (frustrate) ہیں۔ اداس (upset) رہتے ہیں۔ پریشان (tension) رہتے ہیں کیوں کہ ان کو اتنا ملتا نہیں جتنی ان میں ہوس ہوتی ہے۔ حریص لوگ لمبے لمبے منصوبے (plan) بناتے رہتے ہیں۔ ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ حرص لوگوں کو چوری، بے ایمانی، دھوکا اور رشوت تک پہنچا دیتی ہے۔ ہاتھ میں پیسا نہیں ہے، جائز طریقے پر اُس چیز کو حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا، تو پھر کیا کیا ہتھکنڈے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ آج کل ایک عام سی چیز ہوگئی ہے۔ یہ حرص کا مظہر ہے۔ بعض لوگ معمولی معمولی چیزوں کی چوریاں کرتے ہیں مثلاً کسی کا کلپ اُٹھالیا، لپ اسٹک (lipstick) چُرالی کسی کی۔ کوئی سکہ پڑا مل گیا تو اُٹھالیا اور چُپ کر گئے۔ ایسی معمولی معمولی اور حقیر چیزیں بھی گناہ گار بنا دیتی ہیں۔ دل کے اندر لالچ اور حرص گھر کر لیتی ہے، دنیا بہت محبوب ہوجاتی ہے۔ حرص کی وجہ سے انسان کی عزت بھی ختم ہوتی ہے اور اُس کی شخصیت بھی پَنپ نہیں پاتی۔

حرص کا مظاہرہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کوئی ہر چیز کے بارے میں پوچھنے لگے، یہ کہاں سے لیا ہے؟ کہاں ملتا ہے؟ کب لی اور کتنے کی لی؟ دنیا کی ایک ایک چیز ان کی نظروں میں رہتی ہے کسی کے پاس دیکھتے ہیں تو فوراً حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دل میں حرص پیدا ہوجاتی ہے کہ ہمارے پاس بھی یہ چیز آجائے۔ اگر وہ چیز حاصل کرلیں تو تھوڑی دیر کی خوشی ہوتی ہے پھر کسی دوسری چیز کو کسی کے

پاس دیکھ کر پھر اُن کا سکون ختم ہوجاتا ہے۔ کوئی چیز اگر حاصل بھی ہوجائے تو وہ کافی نہیں لگتی اور نگاہیں پھر نئی اشیاء پر مرکوز ہوجاتی ہیں۔

حرص کے مقابلہ میں قناعت:

نبی اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

((أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللهُ بِمَا آتَاهُ))(۱)

''کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو دولتِ اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور جو اللہ نے اُسے دیا وہ اس پر قناعت کرتا ہے۔''

ایسے شخص کو نبی اکرم ﷺ نے کامیاب اور بامراد کہا ہے جس کو اللہ نے انتہائی قلیل روزی پر بھی قانع بنادیا تو حرص کا علاج قناعت ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں دُعا آتی ہے:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِيْ بِمَا رَزَقْتَنِيْ وَبَارِكْ لِيْ فِيْهِ))(۲)

''اے اللہ مجھے قناعت کرنے والا بنادے اس روزی پر جو تو نے مجھے دی اور اُسی میں میرے لیے برکت ڈال دے۔''

حدیث مبارکہ ہے ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ الْغِنٰى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنٰى غِنَى النَّفْسِ))(۳)

''دولت مندی مال واسباب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اصل دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔''

یعنی حرص کبھی بھی ختم نہیں ہوتی، چاہے لکھ پتی سے کروڑ پتی ہوجائے یا ارب پتی، کھرب پتی کیوں نہ ہوجائیں۔ حرص ختم نہیں ہوتی۔

اصل چیز دل کی بے نیازی ہے۔ ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

أبا ذر يقول: قال رسول الله صلى الله عليه و سلم: (يا أبا ذر تقول كثرة المال الغنى؟) قلت: نعم قال: (تقول قلة المال الفقر؟) قلت: نعم قال ذلك ثلاثا

---

(۱) صحيح مسلم، كتاب الزكاة، باب فى الكفاف والقناعة

(۲) مصنف ابن ابى شيبة، كتاب الدعاء، باب مايدعو به الرجل بين الركن والمقام

(۳) صحيح البخارى، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس---

ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم: (الغنی فی القلب و الفقر فی القلب) (۱)

''ابوذر کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال زیادہ ہونے کا نام تونگری ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں حضور ﷺ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال کم ہونے کا نام فقیری اور محتاجی ہے۔'' میں نے عرض کیا ''ہاں! حضور ﷺ ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے۔'' یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ((اَلْغِنٰی فِیْ الْقَلْبِ وَ الْفَقْرُ بِالْقَلْبِ))

''دولت مندی دل کے اندر ہوتی ہے اور فقیری اور محتاجی بھی دل کے اندر ہوتی ہے۔''

جو جتنا حریص ہوتا ہے اتنا ہی فقیر ہوتا ہے۔ جتنا بھی زیادہ مال آئے اس کو کم ہی لگتا ہے۔ الماریاں بھری ہوئی ہیں کپڑوں سے، لیکن کہیں گے کچھ پہننے کو ہے ہی نہیں۔ بینک بیلنس بھرے پڑے ہیں۔ گھر اور جائیدادیں کئی رقبوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر بھی دل اُسی میں اٹکا ہوا ہے جو دوسروں کے پاس ہے، اصل فقر تو یہ ہے۔ اور جو ہر حال میں اللہ کا شکر کرے، وہی اصل غنی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انصار میں سے کچھ لوگوں نے ایک دفعہ آپ ﷺ سے کچھ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے اُن کو عطا فرمایا مگر اُن کی مانگ ختم نہ ہوئی۔ انہوں نے پھر طلب کیا آپ ﷺ نے پھر عطا فرمایا یہاں تک کہ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس تھا وہ سب ختم ہو گیا اور کچھ نہ رہا۔ تو آپ ﷺ نے ان انصار سے فرمایا:

''سنو! جو مال دولت بھی میرے پاس ہوگا اور کہیں سے آئے گا میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا اور اپنے پاس ذخیرہ نہیں کروں گا۔ بلکہ تم کو دیتا رہوں گا۔ مگر یہ بات خوب سمجھ لو کہ اس طرح مانگ مانگ کر حاصل کرنے سے آسودگی اور خوش عیشی حاصل نہ ہوگی۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو خود عفیف (یعنی اپنی عزت کو سنبھالنے والا) بننا چاہتا ہے حرص نہیں کرتا، ہاتھ نہیں پھیلاتا کسی کے آگے۔ یعنی جو دوسروں کے آگے اپنے آپ کو ہاتھ پھیلانے سے بچانا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی مدد فرماتا ہے اور سوال کی ذلّت سے اُس کو بچا دیتا ہے اور جو کوئی بندوں کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر کرنے سے بچنا چاہتا ہے یعنی اپنے آپ کو بندوں کا محتاج اور نیاز مند بنانا نہیں چاہتا، اللہ تعالیٰ اس کو بندوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔''

ہمیں اس کی تمنا کرنی چاہیے۔ حرص کیا کرتی ہے ہمیں دوسروں سے مانگنے کا عادی بناتی ہے، یہ دے دو، وہ دے دو۔ اور مانگنا چاہے کھلم کھلا بھیک مانگنا ہو یا فرمائش کرنا حرص ہی ہے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، باب و من غرائب أبی ذر رضی اللہ عنہ

حرص اور بخل:

ہم نے عرض کیا تھا کہ حرص کے ساتھ بخل ضرور ہوتا ہے۔ حریص چاہتا ہے چیزیں آتی رہیں اور خرچ بھی نہ ہوں۔ اس وجہ سے وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ نہ خود پر خرچ کرتا ہے اور نہ دوسروں کو دینا چاہتا ہے۔ ان چیزوں کی طرف سے فکر مند رہتا ہے، دھڑکا لگا رہتا ہے کہیں میرے پاس سے چلی تو نہیں جائے گی، کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ایسے دنیا جمع کر کے تو کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

سو اللہ تعالیٰ سے غنیٰ اور قناعت کی دُعا کرنی چاہیے۔ یہ حرص کا علاج ہے جو اللہ نے دے دیا ہے اُس پر اللہ قانع کر دے۔ اللہ تعالیٰ لالچ سے بچالے۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی قناعت مانگی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لاَّ یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لاَّ یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لاَّ تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لاَّ یُسْتَجَابُ لَھَا))(۱)

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو بے خوف ہو اور ایسے نفس سے جو کہ سیر نہ ہو (جس کی خواہشات ختم ہی نہ ہوں) اور ایسی دُعا سے جو مقبول نہ ہو۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرص اور لالچ سے اپنی پناہ میں رکھے، یہ زندگی کا سکون ختم کرنے والی، برباد کرنے والی چیز ہے۔ بلکہ ایک اور حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِیَّاکُمْ وَالشُّحَّ فَاِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالشُّحِّ اَمَرَھُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا وَاَمَرَھُمْ بِالْقَطِیْعَۃِ فَقَطَعُوْا وَاَمَرَھُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا))(۲)

''حرص اور طمع سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے اُن کو بخل کرنے کو کہا تو اُنہوں نے بخل اختیار کیا۔ اسی نے اُن کو قطع رحمی (یعنی حقوق قرابت کی پامالی کے لیے) کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی۔ اسی نے اُن کو بدکاری کے لیے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔''

یہ سب چیزیں کس سے پیدا ہوئیں؟ حرص سے۔ یہ سب حرص کے پھل پھول ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔ ان برائیوں اور خباثتوں سے محفوظ رکھے۔

(آمین یارب العالمین)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب الشح

خیانت

خیانت پر گفتگو کا آغاز ہم صحیح مسلم کی ایک حدیث سے کریں گے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَرْبَعَةٌ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ (۱))

''منافق کی چار علامتیں ہوتی ہیں: (۱) جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ (۲) جب وعدہ کرتا ہے، خلاف ورزی کرتا ہے۔ (۳) جب اس کے پاس امانت رکھوائی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے۔ (۴) جب جھگڑتا ہے تو پھٹ پڑتا ہے یعنی غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔

نفاق:

ہم ان صفحات میں دراصل نفاق ہی کے مختلف پہلو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نفاق کی بیماری اتنی گھمبیر ہے، اتنی ہلاکت خیز، خوف ناک اور پُر پیچ ہے کہ کسی ایک عنوان کے تحت اس کو سمجھنا ناممکن ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کئی سمتوں سے اس کا گھیرا تنگ کریں۔ سر دست ہم خیانت کے پہلوؤں پر بات کریں گے، کیوں کہ کچھ سطور قبل ہمارے سامنے حدیث آئی تھی کہ منافق کے پاس جب امانت رکھوائی جاتی ہے تو وہ خیانت کر بیٹھتا ہے۔ عربی میں اس کو ''غِش'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے دھوکا ہوتا ہے، خیانت بھی ایک طرح سے دھوکا ہی ہے، اس کو غُلول بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے:

{وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ} (المؤمنون:۸)

''مومن تو وہ ہیں جو اپنی امانتوں کی اور عہدوں کی نگرانی کرتے ہیں۔''

یہ شان ہوتی ہے مومن کی۔ قرآن میں خیانت کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ منافقین خود خیانت کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کو الزام دیتے تھے۔ یہ بھی منافق کا ایک طریق واردات ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کرتا اور دوسروں پر الزام تراشیاں کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے حق میں فرمایا کہ:

{وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ} (آل عمران:۱۶۱)

''کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہوگا۔ پھر ہر جان کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی

(۱) صحیح مسلم، کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ، بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلَ۔۔۔

پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔"

جو نرمی رسول ﷺ کے دل میں تھی، جو خیر خواہی آپ ﷺ کے دل میں تھی، اس کے تحت ان منافقین کے لیے بھی آپ ﷺ کے دل میں درد تھا۔ آپ ﷺ ان کی بھی حمایت کیا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کو خیانت کاروں کی حمایت سے روک دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"آپ ﷺ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والے مت بنیے، چھوڑ دیجیے اِن کو۔ اے نبی ﷺ! آپ ﷺ مومنوں کی حمایت کیجیے، ان کی طرف سے آپ ﷺ اللہ سے درخواست کیجیے۔ ان منافقوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔"

سورۃ انفال میں فرمایا ہے:

{اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ} (الانفال: ۵۸)

"بے شک اللہ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔"

سورۃ مومن میں فرمایا:

{يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ} (المؤمن: ۱۹)

"اللہ تو نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ سینے چھپاتے ہیں اُس کو بھی جانتا ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے ہمیں امانت کی بہت تاکید کی ہے اور خیانت سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ مسند احمد میں حدیث مبارکہ ہے ابوعمامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَى الْخِلَالِ كُلِّهَا اِلَّا الْخِيَانَةَ وَالْكَذِبَ)) (۱)

"مومن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔"

مومن نہ خیانت کرسکتا ہے اور نہ جھوٹ بول سکتا ہے، اس کے علاوہ بہت سی کمزوریاں مومن کے اندر ہوسکتی ہیں۔ لالچ ہوسکتا ہے، کسی بے حیائی کے کام میں بھی کبھی ملوث ہوسکتا ہے۔ غیبت بھی کرسکتا ہے۔

جامع ترمذی میں ایک حدیث مبارکہ میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

((التَّاجِرُ الْأَمِينُ الصَّدُوقُ الْمُسْلِمُ مَعَ الشُّهَدَاءِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۲)

"سچا اور امانت دار سوداگر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔"

ابوداؤد میں ایک اور حدیث ہے

((عَنْ سُفْيَانَ بْنِ أَسِيدٍ الْحَضْرَمِيِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

(۱) مسند أحمد، مسند الانصار، حديث ابو عمامه الباهلي رضی اللہ عنہ

(۲) سنن ابن ماجه، كتاب التجارة، باب الحث على المكاسب

يَقُولُ كَبُرَتْ خِيَانَةً أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ حَدِيثًا هُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَأَنْتَ لَهُ بِهِ كَاذِبٌ))(۱)

سفیان ابن اُسَید الحزرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے:

''یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی بیان کرو جب کہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔''

یعنی ایک شخص کا اتنا رعب ہے، اس انداز کے جھوٹ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیانت سے تعبیر کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بہت عرصہ خادم رہے، وہ فرماتے ہیں کہ کوئی خطبہ ایسا نہ تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیا ہو اور اُس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہ فرمایا ہو کہ:

((لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ))(۲)

''اس شخص کا کوئی دین نہیں، جس میں عہد کا پاس نہیں اور ایسے شخص کا کوئی ایمان نہیں، جس میں امانت نہیں۔''

عربی زبان میں امانت کے معنی ہیں ''کسی شخص پر کسی بات کا بھروسا کرنا''، یہ لفظی معنی ہیں ،یعنی بھروسا (trust) کرنا کسی پر، لہٰذا ہر وہ چیز جو دوسرے کے سپرد کی گئی ہو، اس کے حوالے کی گئی ہو یہ سوچ کر کہ یہ اس کا خیال رکھے گا، اس کا حق ادا کرے گا، وہ چیز امانت بن جاتی ہے۔ تو یوں جانیں کہ عہدہ بھی امانت ہے۔ ہر ذمہ داری جو سونپی جائے امانت ہے۔ ذمہ داری کا حق ادا کرنا پڑے گا۔

ہمارے ہاں امانت کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف مال دولت، نقد پیسا، زیور رکھنا ہی امانت ہے، جب وہ مانگے تو پوری پوری واپس کر دے، صرف یہ امانت ہے۔ حالاں کہ امانت کے بہت وسیع معنی ہیں۔

مختلف امانتیں:

ہم دیکھیں گے کہ کیا کیا باتیں امانت کے زمرے میں آتی ہیں۔ اور کہیں ہم خیانت کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔

اللہ کی امانت:

اللہ کی امانت سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے خالق کا ہی ہم پر سب سے زیادہ حق ہے۔ اللہ نے ہمارے پاس کیا چیز امانت رکھوائی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اس کا ذکر آتا ہے:

{إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی المعاریض

(۲) مسند احمد، مسند المکثرین، حدیث انس بن مالک

وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ} (۷۲)

''اور ہم نے اس امانت کو زمین اور آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا تو اُنہوں نے اس کو اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اُٹھالیا۔''

یہ کس امانت کا ذکر کیا جارہا ہے؟ وہ کون سی امانت ہے جو ہم نے اُٹھالی؟ کسی انسان کو بھی وہ عالم یاد نہیں، جب اُس نے بارِ امانت اُٹھایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ نے ایک خاص امانت ہم انسانوں کو دی ہے۔ ''دین'' جس کے لیے ہمیں بااختیار زندگی دی ہے اور اس بااختیار زندگی کے ساتھ اللہ نے ایک جسم عطا کیا ہے۔ جس میں آنکھ دی ہے، کان دیے ہیں، زبان دی ہے۔ یہ سب ہمارے پاس امانت ہیں۔

اپنی ذات کی امانت:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے اصلاحی خطبات میں بہت تفصیل سے اس معاملے پر روشنی ڈالی ہے۔ سب سے پہلے زندگی کی امانت کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر زندگی جس جسم کے اندر مقید ہے وہ بذات خود ایک امانت ہے۔ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی ہمیں کسی صلے کے طور پر نہیں دی، نہ ہم نے مانگی تھی بلکہ ہمارے پاس رکھوادی گئی ہے۔ جسم بھی ہماری ذاتی جاگیر نہیں ہے، جس کے ساتھ ہم جو چاہیں سو کریں، بلکہ اللہ نے ہمارے پاس رکھوایا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ کا مالک ہوں تو یہ اُس کی غلط فہمی ہے۔ وہ بھلا مالک کیسے بن گیا؟ کیا اُس نے یہ اعضا خریدے ہیں؟ جو شے بغیر ملکیت کے کسی کے پاس رکھوائی جائے، وہ امانت ہی ہوتی ہے۔ اور اگر ہم دنیا بھر کی دولت خرچ کر دیتے، تب بھی یہ آنکھیں نہ خرید سکتے۔ یہ سراسر اللہ کی عنایت ہے، اللہ ہی نے ان میں دیکھنے کی صلاحیت رکھی ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ آنکھیں امانت ٹھہریں، ان کی حفاظت کرنا اور ان کا حق ادا کرنا ہے۔ سورۃ مومن کی آیت گزر چکی ہے کہ اللہ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے۔ تو آنکھوں کی امانت یہ ہے کہ ان کو اگر اسی طرح استعمال کیا جائے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے، جیسی اس کی مرضی ہے تو پھر امانت کا حق ادا کر دیا۔ اگر ہم ان چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیں جن پر نگاہ کرنے سے روکا گیا ہے تو یہ نظروں کی خیانت ہے۔ اور ایمان تو ہے ہی امانت کا نام، ایمان دار امین ہوتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اس کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کی پاس داری نہیں۔'' یعنی ایمان کا تقاضا ہے کہ آنکھوں کو امانت سمجھ کر اُن کی حفاظت کی جائے۔

اسی طرح کان بھی امانت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں سننے کی صلاحیت دی ہے۔ ہم تفریحی باتیں بھی سن سکتے ہیں، ایک دوسرے کی گفتگو بھی سن سکتے ہیں، کئی آوازیں سن سکتے ہیں لیکن بس چند آوازوں پر پابندی ہے۔ غیبت نہ سُنی جائے، موسیقی سے بچا جائے اور فحش باتوں کو پھٹکنے بھی نہ دیا

جائے۔ اگر اپنے کانوں کو کچھ چیزوں سے بچالیا تو ہم نے امانت کی حفاظت کر لی اور اگر ان حرام چیزوں میں مبتلا ہو گئے تو گویا خیانت کر ڈالی۔

اسی طرح زبان بھی امانت ہے۔ جن باتوں سے اللہ نے منع فرمایا ہے وہ ہرگز زبان پر نہ آئیں ورنہ یہ خیانت ہو جائے گی۔ زبان سے کفریہ، شرکیہ، فحش اور بے حیائی والے کلمات ادا نہ کرے۔ اللہ کے ذکر میں اور اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، اُن میں زبان کو مصروف رکھے۔ زبان اُس کے ذکر سے تر رکھے، ایسا شخص زبان کی امانت کا حق ادا کر دے گا۔

سو پہلی امانت زندگی اور صحیح سالم جسم ہے۔ اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ اگر یہ ذاتی چیز ہوتی تو اس کو سلب کرنے کا اختیار ہوتا۔ چوں کہ جان ہماری ملکیت نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔ ہم اس میں خیانت کیسے کر سکتے ہیں۔ اللہ نے جان دی ہے اور صرف اللہ ہی کو حق ہے کہ وہ جب چاہے اُس کو لے لے۔ ہم اس کو ضائع نہیں کر سکتے۔ یہ خیانت ہو جائے گی۔ تو اسلام میں خودکشی کا تصور موجود نہیں۔ خودکشی کرنا کبیرہ گناہ ہے، یہ بہت بڑی خیانت ہے۔ اللہ کی مرضی کے خلاف اپنی جان خود لے لی۔ یہ چند چیزیں ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

انسانوں کی امانتیں اور ان میں خیانت:

انسانوں کے ساتھ تعلقات اور معاملات پر نظر دوڑائیں کہ انسانوں کے ساتھ خیانت کس کس طرح کی جاتی ہے؟ مال و دولت اور زیورات میں تو اب کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی نے کسی کے ساتھ خیانت کی لیکن پھر بھی اگر کسی کے پاس کوئی امانت ہو تو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خاص طور پر ہمیں یہ نصیحت فرمائی ہے۔

{اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا} (النساء:۵۸)

”کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اُن کے اہل کی طرف لوٹا دو۔“

جب سے بینک اور لاکر کا رواج پڑا ہے، تب سے لوگ ایک دوسرے کے پاس اپنی چیزیں عام طور پر نہیں رکھواتے۔ لیکن چھوٹی موٹی چیزوں کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔ کتابیں، گھر کے استعمال کی چیزیں، کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ۔ اکثر لوگ کتابیں پڑھنے لے جاتے ہیں اور پھر کبھی واپس نہیں کرتے، یہ بھی خیانت ہے۔ یا تو لاپرواہی برتنے کی وجہ سے کھو جاتی ہیں، یا بچوں کے ہاتھوں پھٹ جاتی ہیں یا اُن کے گھر سے کوئی اور اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے، وہ کتاب یا کوئی اور شے جو آپ مانگ کر لائے تھے، وہ لوٹانا ضروری ہے۔ مانگی ہوئی چیزیں ضرور

واپس کریں، وہ امانت ہیں۔عموماً ہم قریبی رشتہ داروں کی چیزیں نہیں لوٹاتے۔ دُور پرے کے لوگوں کی چیزیں پھر بھی لوٹا دیتے ہیں۔خواہ ماں سے کوئی چیز لیں، بھائی بہن یا قریبی دوست ہی سے کچھ کیوں نہ لیا ہو،ضرور واپس کرنا چاہیے۔

اصل جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ امانت میں خیانت نہ ہو۔اگر آپ نے عاریۃً کوئی چیز لی ہے تو اُس کو واپس کرنا آپ پر فرض ہے اور اس کے مالک کا حق ہے۔آپ نے اپنی بیٹی سے پنسل یا قلم مانگا تو استعمال کر کے واپس کیجیے۔اس طرح بچوں کی بھی تربیت ہوگی کہ دوسروں کی چیزوں پر قبضہ نہیں کرنا اور آپ بھی اُن کے لیے نمونہ بن جائیں گے۔

اگر کوئی آپ کے ہاں کھانا بھجوائے تو بہتر یہ ہے کہ برتن اُسی وقت دھو کر واپس کر دیں یا پھر جلد از جلد واپس کریں۔ مدّتوں اپنے گھر میں مت رکھیں اور نہ اُن کو استعمال کریں۔ایسا نہ ہو کہ وہ ٹوٹ جائیں یا استعمال کے قابل نہ رہیں۔امانتوں کو پوچھے بغیر استعمال نہیں کر سکتے اس کا خیال رکھا کریں۔ پاس پڑوس سے کبھی کبھار کوئی مشین بھی لے لی جاتی ہے۔اس معاملے میں بھی احتیاط برتیں،کہیں استعمال کے دوران خراب نہ ہو جائے،اور پھر اچھی طرح صاف کر کے پہلی فرصت میں واپس کیجیے۔ یہ آپ کا فرض ہے،دوسرے کو اپنی چیز مانگنا نہ پڑے۔اپنے بچوں میں بھی یہ عادت ڈالیں کہ کسی کی کوئی چیز بغیر اجازت کے نہ اُٹھائیں اور اگر مانگ کر لی ہے تو لازماً واپس دیں۔

عہدے کی امانت:

اب امانت کا تعلق عہدے یا ذمہ داری یا ملازمت سے جوڑیں۔کسی نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ میں دن کے آٹھ گھنٹے کام کروں گا تو اب اُس کو کام کرنا ہے۔اگر وہ اس میں کمی کوتاہی کر رہا ہے تو اس امانت میں خیانت کر رہا ہے،اپنے قول (commitment) میں خیانت کر رہا ہے۔کوئی اچانک مجبوری آ جائے کہ پورا وقت نہ دے سکے تو اطلاع ضرور دے لیکن عہد کر کے اس طرح اوقات میں اطلاع دیے بغیر کمی بیشی کرنا خیانت میں شمار ہوگا۔

مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا معمول تھا کہ تدریس کے دوران اگر اُن سے کوئی دوست احباب ذاتی غرض سے ملنے آ جاتے تو وہ وقت نوٹ کر کے ملاقات کرتے اور یوں مہینے میں ایسی ذاتی مصروفیات کے اوقات کا حساب لگا کر انتظامیہ کو بھیج دیتے کہ مہینے میں اتنے گھنٹے ہم نے اپنے کاموں میں صرف کیے ہیں۔تنخواہ سے یہ پیسے کاٹ لیے جائیں۔ یہ کوئی اساطیری قصے (fairy tales) نہیں سنائے جا رہے، بلکہ نیک لوگ امانت کا اسی قدر خیال رکھتے ہیں۔اندازہ کریں اتنے امانت دار اور ایسے دیانت دار تھے کہ ان اوقات کی تنخواہ نہیں وصول کرتے

تھے جن کو ذاتی کاموں میں خرچ کر دیا ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ آتا ہے جب وہ خلیفہ تھے تو وہ اندھیرے میں چراغ جلا کر حکومت کا کوئی کام کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن کے بھائی اُن سے ملنے کے لیے آ گئے، جیسے ہی وہ داخل ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چراغ بجھا دیا۔ اُن کے بھائی نے کہا یہ آپ نے کیوں کیا؟ اُنہوں نے جواب دیا اس لیے کہ اس چراغ میں بیت المال کا تیل جل رہا تھا اور تم ذاتی بات کرنے آئے ہو۔ اگر بیت المال کے تیل کی روشنی میں تمہارے ساتھ ذاتی گفتگو کروں گا تو خیانت ہو جائے گی۔

ایک اور واقعہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ دارلعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، پھر استاذ بنے تو اُن کی تنخواہ دس روپے تھی۔ جب عمر زیادہ ہوگئی، تجربہ زیادہ ہوا تو مجلس شوریٰ نے ان کی تنخواہ بڑھانے کی تجویز دی تو دس روپے کی بجائے پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ کر دی گئی۔ جب اُن کو دس کی جگہ پندرہ روپے تنخواہ ملی تو اُنہوں نے پوچھا یہ کیوں؟ بتایا گیا کہ مجلس شوریٰ کا فیصلہ ہے کہ آپ کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ آپ نے اضافی تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے میں جوان تھا، زیادہ وقت پڑھاتا تھا، اب بوڑھا ہو گیا ہوں، زیادہ پڑھا نہیں سکتا، کم وقت دیتا ہوں۔ اس لیے میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں۔

شاگرد کو دیے گئے نمبر بھی گواہی ہوتی ہے کہ اس نے کتنی محنت کی ہے اور کتنی تیاری کی ہے۔ کتنے نمبر اس کا حق ہیں؟ طلبہ عام طور پر شکایت کرتے ہیں کہ ہمیں کم نمبر ملے ہیں، ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا حساب کتاب کی غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اگر غلطی سے نمبر زیادہ دے دیے جائیں تو کوئی نہیں بتاتا کہ مجھے غلطی سے زیادہ نمبر مل گئے ہیں، ان کو کم کر دیا جائے۔ شاگرد کو چاہیے کہ وہ احساس کرے کہ اگر میں نے یہ غلطی پوشیدہ رکھی تو خیانت ہو جائے گی۔ ان نمبروں پر میرا حق نہیں بنتا۔ اس کو ان نمبروں کو واپس کرنا چاہیے، ورنہ خیانت کا مرتکب ہو جائے گا۔

آج حال یہ ہے کہ کہیں مفت فون کرنے کو مل جائے یا کسی آفس میں فون کی سہولت ہو تو فوراً جگہ جگہ فون کرنا شروع کر دیں گے۔ دفتروں میں خاص طور پر اہل کار اور افسران لمبی لمبی کالیں کر کے ادارے کا وقت اور پیسا ضائع کر کے خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور کان پر جوں تک نہیں رینگتی کہ دفتر کی چیزیں ذاتی کاموں کے کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ وَ تَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ ﴾ (الانفال:۲۷)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خیانت مت کرو اور تم اپنی امانتوں میں بھی خیانت مت کرو۔“

خیانت کے جواب میں خیانت جائز نہیں:

اگر ایک شخص خیانت کرتا ہے تو اُس کے ساتھ کیا روّیہ کرنا چاہیے، اس بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

((وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَكَ))(۱)

''جو تمہارے ساتھ خیانت کرے، اُس کے ساتھ خیانت مت کرو۔''

اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عملی طور پر کر کے دکھایا۔ غزوہ خیبر کا واقعہ ہے، یہودی بڑے طاقت ور تھے۔ اپنے قلعوں کے اندر بند ہو کر بیٹھ گئے تھے اور مسلمانوں نے اُن کا محاصرہ کیا ہوا تھا، حالت جنگ تھی اور حالت جنگ میں دشمن کا سارا مال حلال ہوتا ہے۔ واقعہ آتا ہے کہ ایک چرواہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا، یہودیوں کی بکریوں کا ریوڑ چرا رہا تھا، اُس نے اسلام قبول کر لیا اور کہا ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے حکم دیجیے میں کیا کروں'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس وقت اللہ کی راہ میں جہاد ہو رہا ہے، اس میں حصہ لے لو'' اس نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ بکریاں تمہارے پاس یہودی کی ہیں، ان کو واپس کر دو پھر تم آنا، وہ گیا بکریاں واپس کیں، دوبارہ آیا، جنگ میں حصہ لیا اور لڑتا ہوا اللہ کی راہ میں شہید ہوا'' اس نے ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھی، صرف کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں اس کو جنت الفردوس میں دیکھ رہا ہوں۔'' صرف ایک عمل شہادت سے پہلے کر گیا اور وہ تھا امانت کی واپسی!! اور پھر شہادت کا رتبہ بھی ملا۔ دیکھیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امانت کا کتنا خیال رکھا۔ جنگ ہو رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امانت کا مال واپس کروایا۔ حالاں کہ یہودی دشمن تھے، وہ تو قدم قدم پر رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خیانت کا معاملہ کر چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سبق نہ دیا کہ چوں کہ وہ خیانت کرتے رہے ہیں ہمارے ساتھ تو ہم بھی خیانت کریں اور اُن کے مویشی رکھ لیں۔ تو یہ دھوکا دینا، خیانت کرنا، یہ مسلمانوں کی شان نہیں۔

مریض کی بات امانت:

اسی طرح کوئی مریض اپنی کیفیت یا مرض کسی ڈاکٹر کو بتاتا ہے تو اُس کی بات ڈاکٹر کے پاس امانت ہے۔ اُس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کے مرض کا تذکرہ ہر آنے والے کے ساتھ کرے، خود تک محدود رکھنا چاہیے۔

اسی طرح اگر کوئی آپ کو کوئی بات بتاتا ہے اور یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ اسے پوشیدہ رکھیے گا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجل یأخذ حقه۔

پھر اگر آپ کسی سے اس کا ذکر کرنا چاہ رہے ہیں تو پہلے اجازت لے لیں، پوچھ لیں کہ کیا میں دوسروں سے مشورہ لے سکتا ہوں۔ اگر اجازت دے تو پھر دوسرے سے راہ نمائی لیں ورنہ آپ کے پاس اختیار نہیں ہے کہ کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کریں، یہ آپ کے پاس امانت ہے۔ بعض خواتین اپنے شوہروں کو اپنا ہی حصہ سمجھتی ہیں، یعنی جو مجھے پتا ہے، وہ میرے شوہر کو بھی پتا ہونا چاہیے۔ یہ تو ایک ہی بات ہے اور بلا جھجک دوسروں کی کہی ہوئی باتیں اپنے شوہروں کو بتا دیتی ہیں۔ یہ خیانت ہے، گناہ ہے۔ عورت کو چاہیے کہ شوہر کو بتانے سے پہلے جس کی بات ہے، اس سے اجازت لے۔ یاد رکھیں تمام راز امانت ہوتے ہیں، کسی اور کو اُن کے بارے میں بتانا خیانت ہے۔

خیانت پر خیانت:

ہمارے معاشرے کی ایک خامی یہ ہے کہ مثلاً ایک خاتون دوسری سے رازداری میں کہتی ہے کہ یہ بات فلاں نے مجھے بتائی ہے مگر تم کسی کو مت بتانا، تیسری خاتون اگلی سے بھی یہی تقاضا کرتی ہے اور بتا دیتی ہے، اس طرح ایک زنجیر (chain) بن جاتی ہے، ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ اپنے تجسس (curiosity) پر قابو رکھیں اور دوسروں کو بھی اگر کوئی راز افشا کرتے سنیں تو منع کر دیں کہ یہ خیانت ہے۔ دوسروں کی اصلاح کریں اور ان کی مدد کریں۔ کوئی آپ کو کسی کا راز بتانا چاہے تو منع کر دیں اور اگر آپ خود کسی کے بارے میں کسی سے پوچھ رہے ہیں اور وہ کہہ دیتا ہے کہ اس نے بتانے سے منع کیا ہے تو اصرار نہ کریں، مزید کھود کرید نہ کریں۔

کسی کا فون اور چھپی بات سننا خیانت ہے:

اس طرح ٹیلی فون پر دوسروں کی گفتگو سننا خیانت ہے۔ انگریزی میں کہاوت ہے:

"Ear droppers never hear good about themselves"

''جو چھپ چھپ کر دوسروں کی گفتگو سنتے ہیں، اپنے بارے میں کوئی خیر نہیں سنتے۔''

اگر گھر میں یا دفتر میں ٹیلی فون کا ایکسٹینشن ہے تو کبھی بھی جان بوجھ کر دوسرے سیٹ سے دوسروں کی باتیں مت سنیں، اگر کبھی فون اٹھایا اور پتا چلا کہ پہلے سے بات چل رہی ہے تو فوراً اپنی طرف والا سیٹ رکھ دیں، چھپ کر سننا تعلقات کے لیے بھی بُرا ہے اور گناہ تو ہے ہی۔ حدیث مبارکہ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کے خط پر نظر دوڑائی، اس نے آگ میں جھانکا۔ کسی کی نجی گفتگو سننے کی اتنی ممانعت ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''مجلسیں امانت ہوتی ہیں۔'' مجلس میں جو بات کی گئی ہوتی ہے، وہ بھی امانت ہوتی ہے، اب یہ نہ ہو کہ مجلس میں کوئی بات سنی اور اُس میں تھوڑا بہت سچ جھوٹ ملا کر سیاق و سباق سے کاٹ کر دوسروں کے سامنے بتانا شروع کر دیا۔ یہ امانت میں خیانت بھی

ہے اور جھوٹ ملانے کا گناہ بھی، اس لیے ان چیزوں کے بارے میں بہت ہی محتاط رہنا چاہیے۔

دھوکا اور خیانت:

جہاں تک دھوکے کا تعلق ہے، یہ تو ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے۔ کتنی ہی چیزوں میں دھوکا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی خیانت ہی کی ایک قسم ہے۔ دھوکا اب ہمارا مزاج بن گیا ہے۔ یہ بُرائی ہی نہیں رہی۔ درزی بچا ہوا کپڑا رکھ لیتا ہے اور یہ گمان بھی نہیں کرتا کہ وہ خیانت کر رہا ہے، یہ گناہ ہے۔ یہ کپڑا کسی کی امانت تھی یا بیل (lace) لگوانے دی اور آپ نے ضرورت سے زیادہ دے دی لیکن جو بچ گئی وہ واپس نہ ملی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج کل دواؤں کے اندر بھی ملاوٹ اور دھوکا عام ہے۔ تعمیرات میں ٹھیکے دار دھوکا کرتے ہیں، صحیح مال نہیں لگاتے یا کم لگاتے ہیں۔ مشروبات میں ملاوٹ، مصالحوں میں ملاوٹ، دودھ دہی میں ملاوٹ، گوشت کو دھو دھو کر وزن بڑھاتے ہیں اور جانور کے اندر پانی انجیکٹ کرتے ہیں۔ بے ایمانی اتنی عام ہوگئی ہے کہ بے ایمانی اور ایمان داری کا فرق ہی لغو ہو گیا ہے۔ اور کہیں کہیں تو بے ایمانی اور دھوکے بازی ذہانت کی علامت بن گئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں تو یہ عام ہے۔ یہ علم کی خیانت ہے، ایسی تعلیم کا کوئی اجر کوئی ثواب نہیں۔ بے ایمانی سے حاصل شدہ علم سے آگے چل کر کیا حلال رزق کمائیں گے اور ایمان کی زندگی کیوں کر گزاریں گے۔

اسی طرح اشتہارات ہی دیکھ لیں۔ کس قدر جھوٹ، مبالغہ آرائی اور دھوکا دہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ قانونی طور پر اس جھوٹ کے پلندے پر گرفت بھی ممکن نہیں ہے، آپ اگر اشتہاری دعووں کو غلط بھی ثابت کر دیں تو کمپنی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اور جو لوگ اس اشتہار میں اداکاری کرتے ہیں وہ بھی جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس طرح اتنے بڑے پیمانے پر جھوٹ کو عمدہ بنا کر انسانوں کو خریداری کا حریص بنایا جاتا ہے۔

وعدہ اور خیانت:

''وعدے'' کو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے عمومی طور پر لیا ہے اور بہت ساری باتوں کو وعدے کے ذیل میں لائے ہیں۔ مثلاً عہدہ تو وعدہ ہے ہی اور زبان (commitment) دینا بھی وعدہ ہے۔ پھر اگر کسی جگہ کا ویزا (visa) لیتے ہیں تو یہ بھی وعدہ ہے۔ یعنی آپ وعدہ کرتے ہیں کہ اس ملک کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ جب آپ کسی ہوائی جہاز کا ٹکٹ لیتے ہیں تو اس کی شرائط کے پابند ہوتے ہیں۔ اگر ان شرائط کو نہ مانا تو یہ بھی وعدہ خلافی ہو جائے گی۔ لہٰذا ایسی چیزیں مت لے کر جائیں جو کہ ممنوع ہو۔ مگر ہم یہاں بھی دھوکا کرتے ہیں۔ جو چیزیں ان ممالک میں لے

جانا منع ہے وہ چھپا چھپا کر لے جاتے ہیں، پان یا کوئی اور مصالحہ جات جو باہر نہیں ملتے اُن کو چھپا کر ساتھ لے جانا کہ کسٹم والے نہ دیکھ سکیں، یہ بھی دھوکا دینا ہے۔ ذرا سوچیں کہ قیامت کے دن ہم اپنے اعمال کس طرح چھپائیں گے، لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ انسانوں کی نظر سے خواہ بچ بھی جائیں مگر اللہ کی نظر سے نہیں بچ سکتے۔ یہ گناہ ہے، چوری ہے اور دھوکا ہے۔

پھر ہوائی سفر میں ایک خاص حد تک سامان لے جانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن ہمارے لوگ باہر ملکوں سے واپسی پر ایسی شاپنگ کرتے ہیں، جیسے پاکستان میں کچھ ملتا ہی نہیں۔ اور جب زائد سامان جہاز والے روکتے ہیں تو انھیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اس میں بھی امانت کا خیال رکھنا ہے۔ اسی طرح جتنی مدت کا ویزا لیا ہے، اتنے ہی عرصہ رکیں۔ مثلاً لوگ عمرے کا ویزا لے کر سعودی عرب جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ چلو حج تک رہ لیں گے۔ ویزا خود ایک عہد اور امانت ہے، عمرے کے ویزے پر حج کرنا تو زیادتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی ملک کی شہریت لی ہے اور وہاں کے کچھ قوانین دین کے خلاف ہیں تو شہریت ترک کر دیں یا مسافر بن کے رہیں۔ ایسے ممالک میں بسنا اور ان کے قوانین کو نہ ماننا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ملک کی قومیت تو شوق سے لے لیں، شہری ہونے کے ناتے سارے فوائد بھی اُٹھائیں مگر انکم ٹیکس ادا نہ کریں کہ یہ تو دشمن ملک ہے، ہم کیوں ان کو فائدہ پہنچائیں۔ یہ عجیب دوہری منطق (twisted logic) ہے۔ کچھ مسلمانوں کا ان ممالک میں سب سے بڑا جہاد یہی ہے۔ یاد رکھیں یہ کوئی جہاد نہیں ہے، یہ سراسر خیانت اور وعدہ خلافی ہے۔ جس ملک کے جو قوانین ہیں، وہ آپ کو ضرور ماننے ہیں۔ یہاں تک کہ سڑک کے قوانین کو بھی ماننا لازمی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ ہم یہاں کے شہری ہیں اور یہاں کے قوانین پر عمل کریں گے۔

آج کل معاشرے سے بھروسہ بالکل ختم ہوگیا ہے، اعتبار اُٹھ گیا ہے، ہر آن دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مثلاً مزدور نے پیسے تو پورے لے لیے ہیں، پتا نہیں کام ٹھیک سے کرے گا یا نہیں۔ دکان دار نے سامان صحیح تول کر دیا، یا نہیں۔ اصل چیز خرید رہے ہیں یا نہیں۔ اگر دکان دار نے تولتے وقت پیاز کی ڈلی بچالی تو کیا کیا اُس نے؟ اس ڈلی کی وجہ سے اُس کا سارا مال مذموم اور مشکوک ہوگیا۔ معاشرے میں اعتماد کی فضا خراب کی، خیانت کی۔ یہ بھی ایک طرح کا معاشروں پر عذاب ہے کہ اُن میں سے امانت اُٹھ جائے۔ ابھی ہم نے امانت دار تاجر کا مقام پڑھا کہ وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے درمیان ہوگا، جو بے ایمانی نہیں کرتا، وعدہ خلافی نہیں کرتا، خیانت نہیں کرتا۔

ہم عام طور بچوں سے کیے ہوئے وعدے کو وعدہ ہی نہیں سمجھتے اور اس وعدے کو کبھی نہیں نبھاتے۔ بلکہ یہ ایک معمولی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے وعدہ پورا

کرنے کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ جھوٹ بولنے کی عادلت بھی انھیں بڑوں سے پڑتی ہے۔ اور امانت میں بے احتیاطی بھی بچے اپنے بڑوں ہی سے سیکھتے ہیں۔ عموماً بڑے بچوں سے چیزیں لے کر واپس نہیں کرتے، چنانچہ امانت کی اہمیت اُن کے سامنے نہیں آ پاتی۔

امانت کے مختلف مواقع:

امانت کا مفہوم ذہن میں رکھنا چاہیے۔ کسی پر کسی معاملے میں بھروسا کرنا امانت ہے۔ ہاں اگر کوئی بات ہورہی ہے اور آپ سے کسی نے راز میں رکھنے کو نہیں کہا تو پھر آپ کو اختیار ہے۔ یہاں آپ نے صرف اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ سیاق وسباق سے علیحدہ کرکے بات بیان نہ کی جائے۔ اپنے محلِ وقوع میں رکھ کر بات بتائی جائے اور اُس کے اندر غیبت بھی نہ ہو اور اپنی طرف سے کوئی جوڑ توڑ نہ ہو، کسی کی بدنامی یا بے عزتی مقصود نہ ہو۔

مثال کے طور پر کسی کا چھپا ہوا عیب دیکھ لیا اور دیکھنے والے کو کسی نے پابند بھی نہیں کیا کہ اس عیب کو پوشیدہ رکھنا۔ تو یہ ہماری اخلاقی حس بتائے گی کہ ہم یہ عیب اوروں کے سامنے بیان کرتے ہیں یا نہیں، اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے۔ یہ تصور کریں کہ اگر میری کوئی ایسی ویسی بات دوسروں کو جا کر کوئی بتائے تو مجھے کیسا لگے۔ کیا مجھے دھوکے (betrayal) کا احساس نہیں ہوگا کہ اس نے میری لاج نہیں رکھی۔ اگر ہمیں اپنے بارے میں یہ احساس ہورہا ہے کہ فلاں کو مجھے بے آبرو نہیں کرنا چاہیے تھا تو خود بھی کسی کا عیب دیکھ کر آگے نہ بتائیں۔ بعض اوقات کوئی لفظوں میں آپ سے نہیں کہتا کہ یہ بات آگے مت کہنا بلکہ یہ مضمر (understood) ہوتی ہے۔ اب مریض تو ڈاکٹر سے نہیں کہتا کہ میرے اس مرض کے بارے میں کسی کو مت بتائیں۔ ڈاکٹر کو خود اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں مریض کی بیماری کا کسی سے ذکر نہ کروں۔

اسی طرح میت کو غسل دیتے ہوئے کوئی جسمانی عیب نظر آ گیا تو کسی کو نہ بتایا جائے۔ یہ خیانت ہوجائے گی۔ کیا ہم چاہیں گے کہ مرنے کے بعد ہمارا کوئی عیب کسی کو بتایا جائے۔ یہ ایک بہت آسان سا معیار ہے کہ جو چیز ہمیں اپنے لیے پسند نہیں، وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔

بعض اوقات سیاق وسباق کے بغیر بات کی جائے تو اس کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دورانِ گفتگو ہوتی ہیں اور جس مقام ومحل پر گفتگو پہنچی ہوتی ہے اس جگہ کوئی خاص جملہ بالکل مناسب ہوتا ہے۔ لیکن اگر صرف وہ جملہ اُچک کر کسی اور کے سامنے بیان کردیں تو اُس کا رنگ ہی بدل جائے گا۔ یہ بدترین خیانت ہے کہ آپ نے کسی کی بات کو یوں پیش کیا۔ ہوسکتا ہے دورانِ درس ایک بات ہورہی ہو تو وہ انتہائی سنجیدہ، بامعنی اور اہم لگ رہی ہو۔ لیکن اس ساری

بات میں سے ایک جملہ اُٹھا کر کسی کے سامنے، بچوں کے سامنے یا والدین کے سامنے بیان کرنے سے ہوسکتا ہے، اس بات کا حق ادا نہ ہو سکے بلکہ الٹا اس کا مذاق بن جائے، لوگ کہیں کیا حماقت کی بات ہے۔ اور ایسا عموماً ہوتا ہے۔ اس طرح سے پیش کی گئی بات اپنا وقار کھو بیٹھتی ہے۔

مشورے کی امانت:

مشورے کے بارے میں بھی احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ یہ بھی امانت ہے:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))(۱)

''مشورہ دینے والا امین ہوتا ہے۔''

دوسروں کو ایسا مشورہ دیں، جیسا آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں، یہ امانت ہے۔ دوسروں کو ایسا مشورہ نہ دیں کہ اُن کو نقصان پہنچے یا اُن کے ساتھ زیادتی ہو جائے، مثلاً کسی بات کے بارے میں آپ کو پتا ہی نہ ہو لیکن آپ پھر بھی مشورہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں یا اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے دوسروں کو مشورہ دیں۔ مشورہ دراصل امانت ہے۔ دیکھیں ایک شخص آپ پر بھروسا کر کے آپ سے راہ نمائی کی درخواست کرتا ہے کہ آپ اُسے بہترین مشورہ دیں گے۔ کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا بھی خیانت ہے، امانت کا مفہوم ذہن میں وسیع رکھیں، تو اگر آپ نے پُرخلوص مشورہ نہ دیا تو خیانت کی۔ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی نے آپ سے مشورہ مانگا اور انسان کو یہ محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کے فائدے کا مشورہ دے دیا، اس کو صحیح مشورہ دیا تو اس کا فائدہ ہوگا اور میرا نقصان ہو جائے گا تو بعض دفعہ انسان مشورہ دیتے وقت سامنے والے کا فائدہ دیکھنے کی بجائے، اپنا فائدہ دیکھتے ہوئے اس کو مشورہ دیتا ہے، یہ خیانت ہے۔ مشورہ مانگنے والے کا فائدہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ مشورے کو مشورے کی طرح دیا جائے، حکم کی طرح نہیں اور یہ توقع کرنا کہ اب وہ ضرور میرے مشورے کو مانے گا اور اگر وہ نہ مانے تو ناراض ہونا۔ پھر تو یہ حکم ہوا مشورہ تو نہ ہوا۔ مشورہ کے اندر تو اختیار (choice) ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بات قبول کرنا چاہے یا نہ کرنا چاہے۔

دفتر کے متعلق امانت:

دفتر میں جیسا کہ عام طور پر کاغذ، پنسل، فوٹو اسٹیٹ مشین، ٹیلی فون اور دیگر کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ تو دفتر کی چیزوں کو صرف دفتری امور ہی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ آفس کے قلم اور دیگر سامان ذاتی کاموں میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بھی خیانت ہے۔ معاشی معاملات میں خیانت،

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی المشورہ

گھر والوں اور بچوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے کہ اُن پر خیانت سے کمایا ہوا مال خرچ کیا جائے۔ یا آفس نے آپ کو یہ سہولت دی ہوئی ہے کہ کاروباری حکمت عملی کے لیے آپ کسی کو کھانا کھلا سکتے ہیں، اپنے گاہک کو یا کسی خاص آدمی کو اور اس کا خرچہ کمپنی اُٹھائے گی۔ اب آپ اس سہولت کو اپنے گھر والوں پر استعمال کریں، اپنے بیوی بچوں کو کھانا کھلانے لے جائیں تو یہ غلط ہے۔

یا آفس نے آپ کو صرف دفتری کام کے لیے کار کی سہولت (facility) دی ہوئی ہے تو اُسے بغیر اجازت ذاتی کاموں میں مت استعمال کریں۔ لیکن اگر آپ کے ملازمتی معاہدے (service contract) میں یہ تمام سہولیات ذاتی استعمال کرنے کی اجازت ہے تو ذاتی استعمال کے لیے بھی گاڑی، ڈرائیور، پٹرول اور ٹیلی فون وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حد کے اندر اندر ہونا چاہیے یہ نہیں کہ پورے پاکستان دفتر کی گاڑی میں گھوم پھر رہے ہیں۔ صرف دفتری کام اور شہر کے اندر گھریلو ضروریات تک ہی استعمال رہنا چاہیے۔

کمپنی کی رعایت میں خیانت:

اسی طرح بعض کمپنیوں کی طرف سے (free medical) بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر کی فیس، دوائی، آپریشن کا خرچ وغیرہ۔ اس میں بھی بعض لوگ بہت ناجائز چیزیں شامل کر دیتے ہیں۔ بچوں کے دودھ کے ڈبے، کاسمیٹک دوائیاں وغیرہ یہ سب ناجائز ہے۔ کمپنی ان چیزوں کی ذمہ دار نہیں اور نہ ہی یہ علاج معالجے کی مد میں آتی ہیں۔ یہ بہت بڑی خیانت ہے، بے ایمانی ہے، امانت میں خیانت ہے۔ بعض لوگ کسی اور کا علاج کروا کے بل اُس کے نام کا بنوا دیتے ہیں جس کو کمپنی نے سہولت دے رکھی ہے۔ مثلاً بیٹی ماں سے کہے کہ آپ علاج کروالیں اور بل میرے نام سے بنوالیں جو کمپنی ادا کر دے گی۔ یہ خیانت کی بڑی مثال ہے۔

جہاز کی چیزوں میں خیانت:

بعض لوگ ہوائی جہاز سے اترتے ہوئے بیت الخلاء (wash rooms) کی معمولی چیزیں اٹھا لیتے ہیں، بلکہ بعض تو کمبل اور تکیے تک اپنے ہینڈ بیگ میں ٹھونس لیتے ہیں۔ کھانے کے بعد کانٹے اور چمچے اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ یہ سب معمولی چیزیں ہیں مگر خیانت اور چوری کا گناہ وہی ہے۔ ان دونوں میں بال برابر فرق نہیں۔ ان حقیر اور معمولی چیزوں کے لیے انسان اپنا گراں مایہ ایمان گنوا بیٹھتا ہے۔ یہ مومن کے لیے کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ

فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ وَإِنْ قَضِيبًا مِنْ أَرَاكٍ)) (۱)

"اگر کسی نے ذرہ برابر بھی کسی کی چیز لی ہے تو قیامت کے دن وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا" صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے پوچھا "کہ کوئی معمولی سی چیز بھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا پیلو کی ایک ٹہنی بھی۔"

درخت کی شاخ (branch) نہیں بلکہ چھوٹی سی ٹہنی (twig) بھی کسی کی بغیر پوچھے لی ہے یا دھوکا دے کر لی ہے تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ مومن کو اپنی شایان شان زندگی گزارنا چاہیے، غنی ہو کر زندگی گزارنا چاہیے۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لالچ میں نہ آئیں۔ چوری تو دُور کی بات ہے یہ جو ہوٹلوں کے کمروں میں چھوٹی موٹی چیزیں رکھی ہوتی ہیں، وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ یہ چیزیں دورانِ قیام استعمال کی جائیں گی، انھیں سمیٹ کر گھر لے آنا بہت ہی گھٹیا حرکت ہے۔ خیانت کے علاوہ اس سے حرص و ہوس بھی ٹپکتی ہے۔

اسی طرح ہوٹل میں بہت سارے کاغذی رومال (tissue papers) لا کر رکھ دیے جاتے ہیں، نمک اور کالی مرچ وغیر رکھی جاتی ہیں۔ اب اگر کسی کے دل میں یہ آئے کہ نمک مرچیں تو کسی وقت کام آسکتی ہیں اور رومال بھی وقت بے وقت کام آجاتے ہیں، اس لیے وہ ساری چیزیں بیگ میں رکھ لیں، یہ انتہائی غیر مناسب بات ہے۔ اُنھوں نے یہ سب سامان اس لیے دیا تھا کہ یہ آپ اُسی مقام پر استعمال کریں گے، گھر لے جانے کو نہیں دیا تھا، یہ خیانت بھی ہے اور دیکھنے میں بھی برا لگتا ہے۔

یا پھر آپ کسی ایسے ہوٹل میں گئے، جہاں ایک خاص رقم ادا کرنے کے بعد جتنا مرضی کھا سکتے ہیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان کا بھروسا اور امید یہ ہے کہ جتنا آپ کو کھانا ہوگا، آپ اُتنا ہی نکالیں گے۔ اُنہوں نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ آپ کھانا ضائع کریں گے۔ یہ بھی ایک طرح کی خیانت ہے۔ اسراف میں تو یہ یقینا آجاتا ہے جو کہ سخت ناپسند ہے، بہت گری ہوئی حرکت ہے، لالچ اور حرص کا اظہار ہے، ساتھ ساتھ رزق کی بے حرمتی اور سخت ناقدری بھی ہے۔ شادی بیاہ وغیرہ میں بھی اس طرح کتنا ہی کھانا ضائع ہوتا ہے۔

پبلک مقامات وغیرہ کی خیانت:

حکومت اگر کوئی آرام گاہ یا باغ بناتی ہے تو ہماری سہولت کے لیے بناتی ہے۔ آپ ان جگہوں کو امانت سمجھ کر استعمال کریں۔ کچرا نہ پھینکیں، چیزیں مت توڑیں، بچوں کے جھولوں پر بڑے بیٹھ کر اُن کا ستیاناس نہ کریں، جھاڑیاں اور پھول بھی امانت ہیں۔ یہ سب کسی اور کی ملکیت ہیں۔ وہاں سے پھول توڑنا خیانت ہے، پودے اور پھول مت توڑیں، بعض لوگ چلتے چلتے چھڑی سے پودوں کو

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم

مارتے چلے جاتے ہیں، چلتے چلتے راستے کے قریب پودوں کے پتے نوچتے چلے جاتے ہیں، یہ خواہ مخواہ چیزوں کو خراب کرنا ہے۔

ایک دفعہ ایک پاکستانی جاپان گیا اور ایک ریل گاڑی میں سفر کیا۔ وہاں کی ریل گاڑیاں بہت آرام دہ (luxurious) ہوتی ہیں اور بہت ہموار (smoothly) چلتی ہیں۔ ساتھ میں ایک جاپانی مسافر بھی بیٹھا تھا اور کافی پی رہا تھا۔ اتفاقاً کچھ ہلکا سا جھٹکا لگا تو کافی کے چند قطرے نیچے گر گئے۔ یہ جاپانی اُٹھا، اپنی کافی کا کپ کافی ہولڈر میں رکھا، ایک گیلا tissue لے کر آیا اور قالین کو رگڑ کر صاف کیا، کافی کا داغ مٹا دیا۔ جن اقوام کو امانت کا شعور ہوتا ہے وہ قومیں ترقی کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو سرکاری املاک کی حفاظت اور امانت کا تصوّر بھی نہیں پایا جاتا کہ ہمارے لوگ پاکستان میں اس طرح سرکاری املاک (public property) کا خیال رکھیں۔

گھریلو مکالمات میں خیانت:

فرض کریں آپ کے کسی دوست کے بیٹے نے آپ کے بیٹے کو ایک دن اپنے گھر پر گزارنے کی دعوت دی۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بھیج دیا، جب بیٹا واپس آیا اور آپ نے اُس سے پوچھنا شروع کیا، بتاؤ وہاں کیا کیا ہوتا ہے، کیا کھایا، کیا باتیں ہوئیں، یہ کیسے ہوا وہ کیسے ہوا وغیرہ یہ مناسب نہیں، یہ بھی خیانت ہے۔ بچوں سے اس طرح جاسوسی مت کروائیں۔ ہاں یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے سارا دن کیا کیا، کیا کھیل کھیلے، یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں آپ کا بچہ کسی غلط کام میں مشغول تو نہیں رہا۔ اس نیت سے پوچھنا تو ٹھیک ہے لیکن یہ پوچھنا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا؟ گھر میں کون کون رہتا ہے؟ نوکر چاکر ہیں؟ دادا دادی رہتے ہیں، عورتیں پردہ کرتی ہیں یا نہیں؟ نوکروں کے سامنے بغیر نقاب کے آتی ہیں یا نہیں؟ اور اُس معلومات کی بنا پر نفاق کا فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ دیکھا! سب منافق ہیں۔ اور پھر بے رخی اختیار کر لی، خود تعلقات بگاڑ لیے اور تجسس کر کے گناہ گار بھی بنے۔ ایسے سوالات انتہائی غیر مناسب ہیں۔ اپنے بچوں سے اُن کے دوستوں کے گھریلو معاملات کے بارے میں کھوج لگانا، یہ اچھی چیز نہیں۔

اب ایک خاتون ہے جو کہ پردہ اور حجاب کی پابند ہے۔ وہ کیوں پردہ کرتی ہے؟ اس لیے کہ وہ اپنی زینت چھپانا چاہتی ہے، اپنا چہرہ چھپاتی ہے، اپنا جسم چھپانا چاہتی ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اُس کے بارے میں کسی غیر مرد کو پتا چلے۔ اب اگر کسی غیر مرد کے سامنے جا کر اُس خاتون کا حلیہ، روپ رنگ، ناک نقشہ، ڈیل ڈول وغیرہ سب بتا دیا جائے۔ تو اس کا پردہ تو زائل ہو گیا نا!

میاں بیوی کے متعلق ضروری بات:

ایک بات یہاں بیان کرنا ضروری ہے کہ عورت کبھی شوہر کے سامنے غیر عورت کے حسن کی

تعریف نہ کرے۔ باپردہ عورت کی تو کبھی بھی نہ کرے۔ یہ تو خیانت کا بھی ارتکاب ہے اور اپنے شوہر کو بھی جو اس کا نامحرم تھا، فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث ہے۔ ان باتوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

اسی طرح شوہر کے رازوں کی حفاظت بھی امانت سمجھ کر کرنی چاہیے۔ قرآن میں آیا ہے کہ:

{حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ} (النساء: ۳۴)

''وہ شوہر کے رازوں کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں۔''

شوہر کے ساتھ جو بھی معاملات ہیں، شوہر کے راز، اُس کی عزت اور گھر بار وغیرہ امانت ہیں۔ اُن میں دوسروں کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔ یا بعض دفعہ شوہر اپنی کم زوریاں، اپنے خدشات یا شکوے شکایات بیوی سے کرتا ہے، ان کو اوروں تک پہنچانا سخت خیانت ہے۔

کرائے کے گھروں کی خیانت:

کرائے کے گھروں پر قبضہ کر کے بیٹھ جانا، کسی صورت خالی نہ کرنا، مالک مکان کو تنگ کرنا یہ تو سو فی صد خیانت ہے۔ کیوں کہ گھر امانت کے طور پر کرائے پر دیا جاتا ہے اور مالک مکان معاہدہ کرتا ہے کہ جب ہم مکان خالی کرنے کو کہیں تو آپ دو تین مہینے میں خالی کر دیں گے۔ اگر آپ اس معاہدے کی پاس داری نہیں کرتے تو یہ سو فی صد خیانت ہے۔

بجلی میں خیانت:

بجلی کی چوری بھی سراسر خیانت ہے۔ بجلی کا میٹر بند کرنا یا پھر وہ کارندہ جو ہر مہینے بجلی کا میٹر چیک کرنے آتا ہے اُس کو ہزار پانچ سو روپے ماہ وار دے کر من مرضی کا بل بنوانا۔ یہ حکومت کے ساتھ خیانت ہے۔ اس طرح یہ خیانت بدترین چوری بھی بن جاتی ہے۔

کیا بچوں پر نظر رکھنا خیانت ہے؟

کسی کے نجی خطوط پڑھنے کی ممانعت کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ کسی کے خط پر نظر دوڑانا، آگ میں نظر جھونکنے کے برابر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ماں چاہتی ہے کہ میں اپنے بچوں پر نظر رکھوں تو کیا وہ ان کی چیزیں بغیر اجازت دیکھ سکتی ہے۔ جی ہاں! لیکن اس میں مناسب بات یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اعتماد میں لے اور سب کو اُن کے معیار کے مطابق اچھائی اور بُرائی سے آگاہ کرے اور بچوں کو بتادے: ''میں جب چاہوں گی، تمہارے بستے دیکھوں گی، الماری چیک کروں گی، تمہارا موبائل چیک کروں گی۔''

سسرال کی باتیں امانت ہیں:

اگر آپ کے سسرال میں سب اکٹھے رہتے ہیں۔ دس طرح کی باتیں ہوتی ہیں، کبھی اونچ نیچ ہو جاتی

ہے، نند اور ساس میں تلخ کلامی ہوجاتی ہے غرض جتنا بہو کو پتا ہوتا ہے، اتنا کسی اور کو نہیں پتا ہوتا اور وہ اپنے سسرال کا سب اگلا پچھلا جانتی ہے۔ لیکن دھیان رہے کہ سسرال کی باتیں امانت ہیں۔ ان کو میکے میں جا کر بتانا بددیانتی ہے اور بہت بڑی خیانت ہے۔ ہر گھر میں ایسے معاملات ہوتے رہتے ہیں، سب کی کچھ نہ کچھ کمزوریاں ہوتی ہیں۔ سب کے معاملات میں بناؤ اور بگاڑ آتے رہتے ہیں۔ ان باتوں سے زیادہ دل چسپی نہ رکھیں اور نہ انھیں کہیں جا کر موضوع سخن بنائیں ورنہ یہ تو گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے والا معاملہ ہوجائے گا۔

میکے کی امانت:

اسی طرح میکے کی باتیں سسرال آ کر نہ بتائیں، سوائے مشورہ کی غرض سے، اس کی گنجائش ہے کہ کوئی مشورہ درکار ہو۔ بعض دفعہ انسان کو کسی پر بھروسا ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کوئی عورت سسرال اور میکے کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے اُسے شریکِ خیال کرتی ہو، اُسی سے مشورہ لیتی ہو یہ اور چیز ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو خود اپنی ساس پر بھروسا ہو اور وہ اپنے میکے کے کچھ معاملات ساس کو بتا کر اُس سے مشورہ لینا چاہتی ہو تو یہ اور بات ہے۔ لیکن سسرال میں بیٹھ کر کھلم کھلا اپنی بھابیوں کی بُرائیاں کرنا یہ چیز مناسب نہیں ہے۔

تاک جھانک کی خیانت:

کسی کے گھر میں جھانکنا بھی خیانت ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ راہ چلتے چلتے بے اختیار گھر میں جھانک لیتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

نوکروں کے ذریعے کسی کے گھر کے حالات معلوم کرنا:

نوکروں کے ذریعے بھی لوگوں کے گھروں کے حالات دریافت کیے جاتے ہیں۔ چوں کہ کام کرنے والیاں آس پاس کئی گھروں میں کام کرتی ہیں۔ اب ان سے پوچھنا ”پڑوس میں کیا چل رہا ہے“ یہ بھی خیانت ہے۔ آپ نے ایک طرح سے اس عورت کو گناہ پر آمادہ کیا اور اُس نے کسی کا بھروسا توڑا، یا پھر مشترکہ خاندانی نظام میں ایک کام کرنے والی گھر میں سب کا کام کرتی ہے۔ اس سے پوچھنا کہ دیورانی یا ساس کیا کیا کر رہی تھیں یا کیا باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب باتیں بھی خیانت میں چلی جائیں گی۔

مسجد نبوی سے چوری:

مسجد نبوی میں ہر زبان کے قرآن مجید رکھے ہوتے ہیں۔ کسی نے بتایا ہے کہ اب وہاں ترجمے والے قرآن نہیں رکھے جاتے، کیوں کہ بہت سے لوگ اپنی اپنی زبان والے ترجمے اُٹھا کر ساتھ لے جاتے تھے۔ بغیر اجازت کسی بھی چیز کا اُٹھا لینا چوری شمار ہوتا ہے کجا مسجد نبوی سے چوری کرنا! یہ تو اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ کتنی عبرت کی بات ہے کہ رحمت للعالمین ﷺ کی

مسجد میں گئے اور وہاں سے اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔ وہ مصاحف امانت تھے۔ انہوں نے اس نیت سے رکھے تھے کہ لوگ یہ قرآن یہیں پڑھیں گے اور پھر رکھ کر چلے جائیں گے۔

سب سے بڑی خیانت:

اور ہم سب سے بڑی خیانت اللہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا تھا۔

{اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا} (سورۃ اعراف: ۱۷۲)

''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ہم سب نے کہا تھا کیوں نہیں! ہم گواہ ہیں۔''

اس گواہی کے باوجود شرک کرنا یا اللہ کو اللہ کا حق نہ دینا، یہ بھی یقیناً خیانت کی بدترین شکل ہے۔

اساتذہ کی خیانت:

کوئی ٹیچر وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھتا۔ سرکاری درس گاہوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسکول موجود ہے لیکن اساتذہ نہیں آتے۔ تنخواہیں لیتے ہیں، سہولیات بھی استعمال کرتے ہیں مگر سرکار کی طرف سے جو ذمہ داری سونپی گئی ہے اور جس ذمہ داری نبھانے کا انھوں نے وعدہ بھی کیا ہے، اُس کا کوئی احساس نہیں کہ ہم خیانت کر کے گناہ گار ہو رہے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ فضا بہت عام ہے۔ اپنی ذمہ داری، اپنے عہدے اور وعدے کی نزاکت محسوس نہ کرنا اور اس کا حق ادا نہ کرنا۔ بہت سے لوگ چھٹی لینے کے لیے ڈاکٹروں سے جعلی سرٹیفکیٹ لکھوا کر لے آتے ہیں۔ فون کر کے بیماری کا بہانہ بنا دیتے ہیں اور کسی ذاتی کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دفتر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ جھوٹ بھی ہے، خیانت بھی ہے اور دھوکا بھی ہے۔ بیمار نہیں ہوتے، مگر دفتر فون کر کے کہہ دیتے ہیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں، میں نہیں آؤں گا اور گھر پر رہ کر کوئی ذاتی کام کر لیتے ہیں۔ یہ صریح جھوٹ ہے۔

ہمیں پورے شعور کے ساتھ خیانت کا احساس کرنا ہوگا۔ خیانت کے کئی پہلو ہیں اور نہ صرف مال و اسباب بلکہ افکار و خیالات میں بھی خیانت ہوتی ہے۔ تبھی تو قرآن میں الفاظ آتے ہیں:

{يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ} (المؤمن: ۱۹)

''اللہ تو جانتا ہے نظروں کی خیانت اور دل جو چھپاتے ہیں۔''

نامحرم کو دیکھنا نظروں کی خیانت ہے اور نامحرم کے بارے میں سوچنا اُس کے تصوّر سے لطف اندوز ہونا، ذہن کی خیانت ہے۔ خیانت کی ہر صورت سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ دُعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ ہمیں امانت دار بنا دے۔ ایمان دار بنا دے اور عہد کی پابندی کرنے والا بنا دے۔ آمین!

غصّہ

ہمارا موضوع غیض وغضب اور غصہ ہے۔ ہم انگریزی میں بھی اس کے لیے کئی الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً (anger) اس میں شدت کا احساس موجود ہے۔ ایک اور لفظ استعمال ہوتا ہے (upsetness) یہ بھی غصہ ہی ہے۔ (frustration) جس کو اردو میں جھنجھلاہٹ کہتے ہیں، یہ بھی غصے ہی کا اظہار ہوتا ہے۔ یا پھر (irritation) چڑچڑاپن، مزاج کا درہم برہم ہوجانا۔ یہ بھی غصہ ہی کا اظہار ہے۔ قوتِ غضب انسان کے اندر موجود ہے، انسان کو قدرتی طور پر غصہ آتا ہے، اس لیے اگر ہم اپنی شخصیت کو نکھارنا چاہتے ہیں، سنوارنا چاہتے ہیں، پاک صاف اور خوب صورت بنانا چاہتے ہیں اور جنت کا شہری بننا چاہتے ہیں، تو غصے پر قابو پانے کی کوشش کریں۔ کسی کا قول ہے، کسی شخص کی اس وقت تک تعریف مت کرو جب تک اُسے غصّے کی حالت میں نہ دیکھ لو، کیوں کہ انسان کی اصلیت غصے کی حالت میں سامنے آتی ہے۔

یہ ناممکن ہے کہ کسی شخص کو کبھی غصہ ہی نہ آئے۔ اللہ نے انسان کی سرشت میں غصہ رکھا ہے، اللہ سے بڑھ کر ہمیں کون جان سکتا ہے اسی لیے انسانوں سے یہ تقاضا نہیں کیا گیا کہ وہ کبھی اس صلاحیت کا اظہار نہ کریں، اللہ تعالیٰ انسان سے ناممکنات کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ تقاضا یہ ہے کہ صحیح موقع پر، صحیح مقدار میں، صحیح جگہ اور صحیح وجہ سے غصہ کیا جائے۔ مثلاً غصہ کے اظہار میں شریعت کی حدود پامال نہ کرے، گالم گلوچ پر نہ اُتر آئے، تہمت اور بہتان لگانے سے اجتناب کرے وغیرہ۔ یعنی ہمیں سکھایا گیا ہے کہ غصے میں گناہوں کا ارتکاب نہ ہو اور غصے میں آپے سے باہر ہوکر، بے قابو ہوکر، ایسے کام نہ کر بیٹھیں جو گناہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

غصہ ایک طرح سے فائدہ مند بھی ہوسکتا ہے اگر اس کو سُدھالیا جائے۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ غصہ سے فائدہ اُٹھائیں تو اس کو سُدھانا (tame) ہوگا۔ علماء نے غصہ کو شکاری کُتّے سے تشبیہ دی ہے۔ اگر تربیت یافتہ ہے تو مالک کے لیے فائدہ مند بنے گا یعنی شکار پکڑ کر لائے گا اور اگر وحشی ہوگا تو تباہ کن ثابت ہوگا، اپنے مالک ہی کو چیر پھاڑ دے گا۔ سو اس جذبے کو سُدھانا ہے، صحیح رُخ پر لانا ہے۔

جب انسان کو کوئی بات ناگوار گزرتی ہے تو اُسے غصہ آتا ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناگواری کا دائرہ اتنا وسیع کرلیا کہ ہر چھوٹی چھوٹی بات برداشت سے باہر لگنے لگے تو ہر وقت غصے ہی میں رہیں گے، بات بات پر طیش آجائے گا۔ یاد رکھیں غصے کے وجود کو ماننا (acknowledge) گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ غصہ کرنے کی سند (license) دے دی گئی ہے جب چاہیں، جہاں چاہیں

غصہ کرتے پھریں، یہ درست نہیں۔ غصہ وہ دُرست ہے جو ناانصافی اور ظُلم کے خلاف دل میں پیدا ہو، دین کی غیرت کی وجہ سے دل میں پیدا ہو، اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی غیرت کی وجہ سے دل میں آئے۔ پہلی بات جو غصے کی حمایت میں کی گئی اُس کو سن کر خوش نہیں ہونا چاہیے بلکہ غصے کی شرائط ملحوظ رکھنی چاہییں۔ جب ہم یہ ذہن میں رکھیں گے کہ غصہ حق کی خاطر کرنا ہے، اور دین کی غیرت کی وجہ سے کرنا ہے تو پھر ہم دیکھیں گے کہ غصہ کے باقی سب دروازے بند ہوتے چلے گئے ہیں، کسی اور وجہ سے غصہ کرنے کا جواز نہیں رہا۔

دین اور اللہ کی خاطر غصہ:

اگر کبھی دین کی خاطر غصہ آجائے تو اُسے بھی صحیح رُخ (channalize) پر رکھنا چاہیے۔ اس کا اظہار مثبت طریقے سے کرنا چاہیے تاکہ خیر برآمد ہو اور اصلاح کا سبب بنے۔ سو دین کی خاطر اگر غصہ آتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ جب چاہا، جو چاہا، جس کو چاہا کہہ دیا۔ اس کی گنجائش نہیں ہے، اس معاملے میں بھی کچھ حدود کا خیال رکھنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے غصہ مطلوب ہے، انسان کے دل میں جس کی عزت اور محبت ہوتی ہے، اس کی توہین دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ جس کی محبت دل میں ہوتی ہے، اس کا مذاق اڑتا دیکھ کر غصہ آتا ہے، اُس کی نافرمانی دیکھ کر غصہ آتا ہے۔ ایسا شخص تو بڑا سفاک ہے جس کو اللہ کی خاطر کبھی غصہ نہ آئے۔ انتہائی خودغرض، بے حمیت ہے جو اللہ کی نافرمانی اور مخالفت ہوتے ہوئے دیکھتا ہے اور اس کے اندر غصہ نہیں پھوٹتا!! مگر خیال رہے کہ غصے کا اظہار رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرنا ہے۔ اللہ کی حق تلفی ہوتے دیکھ کر، اللہ کی محبت کی وجہ سے، اللہ کے لیے غیرت کی وجہ سے غصہ آنا مطلوب ہے۔ پھر جو چیزیں اللہ سے منسوب یعنی شعائر اللہ ہیں، اُن کی بے حرمتی ہوتے دیکھ کر بھی انسان کو غصہ آنا چاہیے، قرآن کی بے حرمتی، مسجدوں کی بے حرمتی، نبی اکرم ﷺ، خانہ کعبہ، یا اللہ والوں کی بے حرمتی، ان سب چیزوں کا تعلق چوں کہ اللہ سے ہے، ان کی بے عزتی دیکھ کر غصہ آئے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جب یہ پتا چلا کہ بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی ہے تو ان کی کیفیت کیا ہوئی سورۃ الاعراف آیت ۱۵۰ میں ملاحظہ کیجیے۔

{وَ لَمَّا رَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا}

''اور موسیٰ علیہ السلام لوٹے، اپنی قوم کی طرف، انتہائی غصے میں اور انتہائی افسوس کے ساتھ۔''

نبی اکرم ﷺ کو بھی غصہ آتا تھا۔ لیکن کبھی آپ نے اپنی ذات کے لیے غصہ نہیں کیا۔ بلکہ آپ ﷺ نے ہمیشہ دین کی خاطر غصہ کیا۔ جیسے ایک دفعہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے کچھ طویل

نماز پڑھائی جو لوگوں کے لیے آزمائش بن گئی۔ لوگوں نے آ کر شکایت کی تو آپ ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یوں سمجھایا:

((فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا مُعَاذُ أَفَتَّانٌ أَنْتَ)) (۱)

''اے معاذ رضی اللہ عنہ! کیا تم لوگوں کو فتنے میں ڈال رہے ہو''

یعنی کیوں اتنی لمبی نماز پڑھا رہے ہو کہ لوگ بے زار ہو رہے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ کو غصہ آیا۔ ایک دفعہ ایک عورت نے چوری کی، اُس کی سفارش کروائی گئی کہ اس کو معاف کر دیں یہ اونچے قبیلے کی عورت ہے۔ حدود اللہ میں سفارش کی جا رہی تھی۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ أَنَّ فَاطِمَةَ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا)) (۲)

''اللہ کی قسم! اگر فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت محمد ﷺ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔''

یہ آپ ﷺ کو بہت بُرا لگا کہ اللہ کے حکم کے خلاف سفارش کیوں کرائی گئی۔ تو آپ ﷺ کو غصہ جب بھی آیا دین کے لیے آیا۔ اپنی ذات کے لیے آپ ﷺ کو کبھی غصہ نہیں آیا۔ نہ کبھی بدلہ لیا اور دین کے لیے بھی جب غصہ آیا وہ کبھی بھی آپ ﷺ پر حاوی نہ ہوا۔ اس غصہ نے آپ ﷺ کو کبھی بے قابو نہیں کیا اور غصے کی کیفیت میں آپ ﷺ نے کبھی کوئی اقدام بھی نہیں کیا۔ بلکہ غصے کو قابو کر کے پھر قدم اُٹھایا۔ پھر صحابہ رضی اللہ عنہم میں بھی ہمیں مثالیں ملتی ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک جنگ میں شریک تھے، ایک کافر پر قابو پا لیا۔ اُس کی گردن کاٹنے والے تھے کہ اس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے منہ پر تھوک دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فوراً اس کو چھوڑ دیا۔ کہا اب تک تجھ کو اللہ کی خاطر قتل کرنا چاہتا تھا، اب تو نے مجھ پر تھوک دیا ہے اور مجھے غصہ دلا دیا ہے۔ اب اگر میں تجھ کو اس غصے میں آ کر قتل کر دیتا تو میں اپنی ذات کا بدلہ لیتا اس لیے چھوڑ دیا۔ دیکھیں صحابہ کرام بھی انسان ہی تھے، انھیں بھی غصہ آتا تھا مگر برداشت کرتے تھے۔ گویا غصے پر قابو پانا ناممکن نہیں، غصے پر قابو پایا جا سکتا ہے۔ ہمیں یہ ذہن نشین کرنا ہوگا کہ غصے میں آپے سے باہر نہیں ہونا اور ہوش و حواس نہیں کھونا چاہیے۔ ہمیں خود کو کمتر نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم یہ نہیں کر سکتے، اگر شکست کا پہلے ہی اعتراف کر لیا تو پھر فتح حاصل نہیں ہوگی۔ مسلمان مجاہد ہوتا ہے، ہمیں مجاہدوں والی زندگی گزارنی ہے، ہمیں اپنے نفس سے بھی جہاد کرنا ہے، اور شیطان کے خلاف بھی اور ساری زندگی اس جہاد میں گزارنی ہے۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الاذان، باب من شکا امامہ اذا طول

(۲) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار

پہلے تو یہ پکا ارادہ کرلیں کہ غصے پر قابو پانا ہے۔ میں مسلمان ہوں، بدنما شخصیت مجھے زیب نہیں دیتی، بدوی شخصیت مجھے زیب نہیں دیتی، غصہ شخصیت کو بدنما کر دیتا ہے، بگاڑ دیتا ہے۔ مجھے اپنے آپ کو سنوارنا ہے۔ میں نبی اکرم ﷺ کی اُمت میں سے ہوں اور آپ ﷺ کی تو قرآن نے گواہی دی ہے۔

{وَ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ} (القلم:۴)

''آپ تو بہت اونچے اخلاق پر ہیں۔''

یہ ہمارے رسول ﷺ ہیں، جن کی ہم اُمت ہیں، ہم کچھ تو اُن کی پیروی کریں کہ ''اللہ تعالیٰ ہمارے غصے کو جنت حاصل کرنے کا ذریعہ بنادے اور اس غصے کو ہمارے آگ میں جلنے کا سبب نہ بننے دے۔'' اللہ نہ کرے دنیا میں بھی غصے کی آگ میں جلتے بھنتے رہیں اور آخرت میں اسی کی وجہ سے جہنم کی آگ کے سپرد ہو جائیں۔ ''اے اللہ! ہمارا غصہ تو اپنے لیے کر دے، جیسا کہ تجھے پسند ہے'' اور یہ ممکن ہے ناممکن نہیں، کچھ چیزیں فوری طور پر سامنے آتی ہیں، کچھ غصے کے مواقع ایسے ہوتے ہیں، جب انسان کو احساس ہو جاتا ہے اور انسان اپنے آپ کو فوراً قابو میں کر لیتا ہے۔ اور کچھ چیزیں مشق (practice) سے آتی ہیں۔ کچھ چیزوں میں مہینے لگیں گے، کچھ پر قابو پاتے پاتے سالوں لگ جائیں گے۔ لہٰذا اپنے غصے پر قابو پانا تین اہداف میں تقسیم کر دیتے ہیں۔

(1) ایک ہے فوری ہدف، یعنی کچھ عادتوں کو آج ہی ختم کر دیں۔

(2) دوسرا ہدف اگلے 3 مہینوں کے لیے متعین کریں کہ اس مدت میں ان چیزوں پر قابو پالیں گا۔

(3) اور کچھ اہداف کی میعاد طویل کر دیں، ان پر قابو پانے کے لیے لمبا عرصہ درکار ہے۔ یہ ایک حقیقت پسندانہ طریقہ ہے۔ خود سے یہ توقع کرنا کہ ہم بالکل برف کے تودے بن جائیں گے، کسی بات پر غصہ نہیں آئے گا، نہ بچوں پر، نہ نوکروں پر اور نہ شوہر پر یا شوہر کو بیوی پر تو یہ ناممکن ہے۔ اپنے آپ سے بہت زیادہ غیر حقیقی توقعات نہ رکھیں۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مثالیں موجود ہیں وہ غصہ کرتے تھے۔ یعنی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی خاطر اُنہوں نے غصہ کیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ غصہ دو شرائط کے ساتھ کرنا جائز ہے۔ (1) پہلا اللہ کے لیے کیا گیا ہو (2) دوسرا غصے کا اس طرح اظہار ہو کہ اس میں شریعت کا کوئی حکم نہ ٹوٹے۔ یعنی غصے کو اپنے اوپر حاوی نہ ہونے دیں، غصے پر قابو پا کر اقدام کیا جائے۔ اس لیے کہ غصہ سے مغلوب ہو کر کوئی کام کیا جاتا ہے، تو انسان کا عقل سے تعلق کٹ جاتا ہے۔ جب غصہ آئے اپنے آپ کو تھام لیں، ردعمل ظاہر نہ کریں۔ ہاتھ کے ہاتھ جواب نہ دیں۔ تھوڑی دیر رُک کر فیصلہ کریں۔

بہت کم لوگ اللہ کی خاطر غصہ کرتے ہیں اور اُس کو جائز حدوں کے اندر رکھ پاتے ہیں۔ زیادہ تر غصہ اپنی ذات کے لیے کیا جاتا ہے اور جو اظہار کیا جاتا ہے وہ ناجائز طریقے سے کیا جاتا ہے۔ جس میں بہت سا گناہ اور لوگوں کی حق تلفی شامل ہوجاتی ہے اور محض خرابی اور تلخی پیدا ہوتی ہے۔

غصے کے متعلق قرآن وحدیث کے ارشادات:

قرآن حکیم اور حدیث مبارکہ میں اس بارے میں ہمیں بہت تاکید ملتی ہے۔ سورۃ آل عمران آیت 134 میں فرمایا گیا:

{وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ}

''جو غصے پر قابو پالیتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں اور اللہ تو ایسے محسنوں سے محبت کرتا ہے۔''

ہم یہی تو چاہ رہے ہیں کہ اللہ کی محبت کے مستحق ہوجائیں۔ اللہ ہم سے محبت کرے۔ اس کے لیے بہت ہی ضروری ہے کہ غصے پر قابو پایا جائے۔ سورۃ الشوریٰ آیت نمبر 37 میں فرمایا:

{وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ}

''اور جب ان کو غصہ آتا ہے وہ معاف کردیتے ہیں۔''

بخاری اور مسلم میں حدیث ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ))(۱)

''پہلوان وہ نہیں جو مقابل کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے حقیقتاً، جو غصہ کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔''

کتنی پیاری بات ہے کہ غصہ پر قابو پانا Strength، طاقت اور بہادری کی علامت ہے۔

ابوداؤد کی حدیث مبارکہ ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَإِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ))(۲)

''بے شک غصہ شیطان کی طرف سے ہے اور بے شک شیطان آگ سے بنایا گیا ہے۔''

جب غصہ آتا ہے تو انسان کی کیفیت عجیب سی ہوجاتی ہے۔ جسم گرم ہوجاتا ہے۔ شیطان جو آگ سے بنا ہے انسان کے اندر سرگرم عمل ہوجاتا ہے، انسان کا سر، مُنہ لال اور گرم ہوجاتے ہیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحذر من الغضب

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب مایقال عند الغضب

غصے کی وجوہ:

اب ہم غصہ کی چند وجوہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ ہر کسی کو ایک ہی بات پر غصہ نہیں آتا، ہر ایک کی اپنی وجہ ہوتی ہے۔ سو جس کو اپنے اندر جو وجہ نظر آئے وہ اس کا محاسبہ کرے اور اس کو ترک کرنے کی کوشش کرے۔

پہلی وجہ:

غصہ آنے کی سب سے بڑی وجہ لوگوں کی توقعات، امیدوں اور ارادوں کا پورا نہ ہونا ہے۔ مایوسیاں (disappointments)، محرومیاں (unfulfilled desires) اور ناکامیاں (failures) انسان کو مشتعل کر دیتی ہیں۔ بچے ویسے نہیں نکلے جیسی امید تھی، شادی اُس جگہ نہیں ہوئی جہاں چاہت تھی، نوکری حسب منشا نہیں ملی، کسی سے توقعات لگائی تھیں وہ توقعات پر پورا نہ اُترا۔ اس طرح کی باتوں سے غصہ پیدا ہوتا ہے۔ انسان ماضی پر، لوگوں پر، اور تقدیر پر بار بار اعتراض کرتا رہتا ہے، شکایتیں کرتا رہتا ہے، پچھتاتا رہتا ہے اور اُس کا غصہ بڑھتا رہتا ہے۔ ایسا شخص خود کو انتہائی مظلوم سمجھتا ہے اور اپنی حسرتوں کا، محرومیوں کا بدلہ وہ لوگوں پر غصہ کر کے لیتا ہے۔ اس کا علاج کیا ہے؟

غصے کا علاج:

اس کا علاج مرحلہ وار ہوگا۔ سوچ سے شروع ہو کر عمل تک جائے گا۔ دنیاوی ناکامیوں پر جو غصہ آتا ہے اُس کے پیچھے اصل مرض حُبُّ الدنیا ہے۔ دنیا کی محبت اس قدر دل میں پیدا ہو جاتی ہے کہ اِس کے ضائع ہو جانے پر انسان غم سے نڈھال ہو جاتا ہے، اُس کا دل جلتا بھنتا رہتا ہے، اندر ہی اندر گھلتا رہتا ہے، بدمزاج ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے اس سوچ کی اصلاح کرنی چاہیے۔ اپنے آپ کو یہ باور کرائیں:

{ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ } (البقرۃ: ۲۰)

''بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

(مَاشَآءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَالَمْ یَشَأْلَمْ یَكُنْ) (۱)

''جو اللہ نے چاہا وہ ہوا، اور جو اس نے نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔''

تقدیر پر ایمان اور تقدیر پر راضی رہنا انسان کے غضب کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ جب انسان اپنے اوپر یا دوسروں پر الزام تراشی کرتا ہے، ناکامیوں کا ذمے دار ٹھہراتا ہے تو بھی اُس کے اندر غصہ بھر جاتا

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا اصبح

ہے۔انسان کو چاہیے کہ اپنے آپ کو سمجھائے کہ ٹھیک ہے تدبیر میں نے کی تھی، اگر تدبیر میں کوئی کمی رہ گئی یا کسی سے کوئی غلطی ہوگئی تو آئندہ یہ تجربہ میرے کام آئے گا۔لیکن فی الحال جو نتیجہ نکلا ہے یہ تو تقدیر میں لکھا تھا۔میں کچھ بھی کرتا، انجام یہی ہونا تھا۔اس طرح تقدیر پر ایمان صبر پیدا کرتا ہے۔

دوسری تدبیر یہ کرے کہ قرآن حکیم کھول کر پڑھنا شروع کر دے۔قرآن میں جا بجا دنیا کے فانی اور حقیر ہونے کا ذکر ہے۔اور پھر سوچے کہ میں کس کے لیے اتنا غمگین ہو رہا ہوں، کیا اس دنیا کی اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت ہے۔فلاں رشتے کی، فلاں نوکری کی، فلاں گھر کی یا کسی اور چیز کی اللہ کی نظر میں کیا حیثیت ہے۔

اولاد کی تربیت اور اس کی جواب دہی بھی دراصل کوشش سے متعلق ہے۔اللہ ہماری محنت اور ہماری کوشش دیکھے گا۔اگر ہم نے اپنی طرف سے اچھا پالنے کی پوری کوشش کی، اچھی تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا۔اب آگے وہ جا کر اولاد نا خلف نکلے تو خود کو کوسنا نہیں چاہیے بلکہ اللہ کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لینا چاہیے۔اور سوچ لیں کہ دنیا اس قابل ہی نہیں کہ اس پر افسوس کیا جائے۔حدیث مبارکہ میں آتا ہے کہ:

((وَلَوْ كَانَتْ الدُّنْيَا تَزِنُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا قَطْرَةً أَبَدًا)) (۱)

''اگر دنیا کی حقیقت اللہ کی نظر میں مچھر کے پر کے برابر ہوتی تو اللہ کافر کو اس میں سے پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیتا کبھی بھی''

یوں سوچیں کہ اللہ کی نظر میں اس کی اتنی وقعت ہے تو میں نے اس کو اتنا عظیم کیوں بنا دیا۔نہ ملی تو نہ سہی۔تھوڑی عمر ہی کے لیے یہاں رہنا ہے! یہ دنیا تو ایسی ہے کہ اگر کوئی ایک بھی اُمید، ایک بھی منصوبہ، ایک بھی توقع پوری نہ ہوتی، کوئی کامیابی نہ ملتی تو بھی کوئی بڑی بات نہ تھی۔یہ سوچ کر اللہ سے تعلق ضرور جوڑ کر رکھے اور یہ دُعا مانگتے رہنا چاہیے:

''اے اللہ! اس دنیا میں جو بھی ناکامیاں مجھ کو ملی ہیں جو بھی محرومیاں ملی ہیں، ان کو تو میری آخرت کے لیے کامیابی بنا دے۔میری ادھوری اور ناکام آرزوؤں کو آخرت کا خزانہ بنا دے۔ذخیرہ بنا دے۔''

یہ کرنے سے اُس کے دل کو سکون اور اطمینان حاصل ہوگا اور پھر مزاج میں بھی ٹھہراؤ آنا چاہیے۔اگر یہ نہیں کریں گے تو پچھتاوا ہوگا، غصے کی حالت میں اندر ہی اندر سلگتا رہے گا تو اللہ کو ناراض کر کے آخرت کا نقصان بھی اُٹھائے گا۔اُس ناشکری کے رویے سے اللہ بھی ناراض ہوگا اور

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب مثل الدنيا

دنیا بھی نقصان میں رہے گی۔ دنیا اور آخرت کے نقصان کا تصور غصّہ کم کرنے میں مدد کرے گا۔ انسان کو دیکھنا چاہیے کہ غصہ کا نتیجہ کس قدر مہلک اور خوف ناک نکلے گا۔

میں لوگوں پر چیختا ہوں، بُرا بھلا کہتا ہوں، بچوں کو ڈانٹتا رہتا ہوں۔ ہر وقت افسردہ (Depressed) رہتا ہوں۔ یہ تو میں اپنے اوپر اور دوسروں پر زیادتی کر رہا ہوں۔ اللہ کے ہاں سزا تو ملے گی، تو جہنم کا خیال بھی غصہ کو ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ یہ ڈر غصے کی آگ پر پانی کے چھڑکاؤ کا کام کرتا ہے، اور یہ ڈر ہی کی تاثیر ہے کہ کوئی سخت غصے میں ہے اور زور کا دھماکا سنائی دے تو غصہ رفو چکر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کوئی خاتون سخت غصہ میں سیخ پا ہو رہی ہے، چیخ چلا رہی ہے اور اچانک اوپر سے چھپکلی اُس کے اوپر گر جائے تو منظر تبدیل ہو جائے گا۔ اب چھپکلی سے جان چھڑانے میں لگ جائے گی، چھپکلی کے خوف سے سارا غصہ غائب ہو جائے گا۔ اس کی بجائے اللہ کا خوف دل میں پیدا کریں، جہنم کی سزا کا ڈر دل میں رکھیں تو ان شاء اللہ تعالیٰ فرق پڑے گا۔

غصے کے مفاسد:

جو شخص غصہ کرتا ہے وہ اپنے ہاتھوں اپنی دنیا خراب کرتا ہے۔ اپنے اردگرد کے لوگوں کو تنگ کرتا ہے، وہ بھی شکایتیں کرتے ہیں، اُن کے دل بھی دُکھتے ہیں۔ اس طرح اُن کے ذہن اور دل پر بُرے اثرات پڑتے ہیں، پورا ماحول سہما ہوا ہوتا ہے۔ ایک شخص کے غصہ کی وجہ سے پورے گھر کا ماحول بگڑ جاتا ہے۔ دنیا بھی برباد ہوتی ہے اور آخرت بھی بگڑ جاتی ہے۔ اللہ کے فیصلے پر ناراض رہنے سے اللہ کا تو کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسی لیے اللہ کی مخلوق کو تشدد کا نشانہ بناتا ہے، اُن سے بدلہ لیتا ہے۔ اللہ تک تو رسائی ہے نہیں، مخلوق پر اپنی بھڑاس نکالتا ہے۔ دنیا میں بھی آرزوئیں پوری نہ ہوئیں اور آخرت میں بھی اپنے غصے کی وجہ سے سخت جواب دہی کا سامنا ہوگا۔ یہ کوئی عقلمندی کی بات تو ہے نہیں! اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے والی بات ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، مشکوٰۃ میں حدیث مبارکہ ہے:

((اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبْرُ الْعَسَلَ)) (۱)

”بے شک غصہ ایمان کو ایسے فاسد کر دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو“ (یہ ایک بہت کڑوی چیز ہوتی ہے اس کو اگر شہد میں ملا دیا جائے تو شہد کی شیرینی خراب ہو جاتی ہے)

یعنی غصہ ایمان کو بگاڑ دیتا ہے، ایمان کی چاشنی سے محروم کر دیتا ہے۔ کتنے ہی گناہ ہیں جو انسان عام حالات میں نہیں کرتا لیکن غصے کی حالت میں کر گزرتا ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ، کتاب الآداب، باب السلام

ابوداؤد میں حدیث مبارکہ ہے۔

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِیُّ)) (۱)

''سخت گو اور درشت خو آدمی جنت میں نہیں جائے گا۔''

اس لیے کہ غصہ اور بدزبانی کا آپس میں تعلق ہے۔ غصہ میں آدمی اپنی زبان پر قابو نہیں رکھ پاتا، نہ جانے کیا کچھ اُلٹا سیدھا بول دیتا ہے۔

غصے کی دوسری وجہ:

غصے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی انسان کے ساتھ بہت ظلم اور زیادتی ہوئی ہو، بہت زیادہ ناانصافی کا شکار ہوا ہو۔ ایسی صورت حال میں یا تو وہ بدلہ لینے کی قدرت رکھتا ہوگا یا پھر بے بس ہوگا۔ اگر وہ بدلہ لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود بدلہ نہیں لیتا تو غصہ پیدا نہیں ہوگا۔ ایسا شخص حلیم انسان ہے، اُس کے اندر قوت برداشت ہے، صابر انسان ہے۔

لیکن اگر اُس کے ساتھ زیادتی ہوئی اور وہ بدلہ لینا چاہتا ہے لیکن بدلہ نہیں لے سکتا، اپنے آپ کو مجبور اور بے بس محسوس کرتا ہے تو غصہ اور تلخی پیدا ہوتی ہے، جھنجلاہٹ اور چڑچڑاپن پیدا ہوتا ہے۔ ایسی صورت حال میں کیا کیا جائے۔ زیادتی کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے، اگر ماضی میں اُس کے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی یا ناانصافی ہوئی تھی، کبھی جان کو خطرہ ہوا تھا یا عزت کو خطرہ ہوا تھا یا مال پر حملہ ہوا تھا اور وہ بدلہ نہ لے سکے تو اندر ہی اندر غصہ پکتا رہے گا، سلگتا رہے گا۔

بعض دفعہ جس شخص پر زیادتی ہوتی ہے وہ خود کو بھی برابر کا قصوروار سمجھتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی کا مال چوری ہوا اور اُس کے اندر یہ احساس پیدا ہو جائے کہ میرا اپنا قصور تھا میں نے احتیاط نہ برتی۔ اب یہ غصہ دوطرفہ ہو گیا۔ اپنے اوپر بھی، اور جس نے زیادتی کی اُس کے اوپر بھی۔

ایسے غصے کے لیے تدبیر:

سب سے پہلے اپنے آپ کو فاصلے پر لے جائے اور خود کو یہ باور کرائے کہ میرا قصور نہیں تھا، اُس جرم میں اپنے آپ کو شامل نہ کرے۔ پہلے اس جرم سے اپنے آپ کو بری کر لے کہ میں بے قصور ہوں۔ بعض لوگ اپنے آپ کو قصوروار ٹھہرا کر اپنے آپ سے بھی بدلہ لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو چاقو وغیرہ سے زخمی کر لیتے ہیں، اپنی نبض کاٹ لیتے ہیں، اپنے آپ کو اذیت اور تکلیف پہنچاتے ہیں۔ یعنی غصے کا رُخ اپنی طرف ہو جاتا ہے جس کا ظہور ان صورتوں میں ہوتا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی حسن الخلق

یہاں یہ سوچنا چاہیے کہ ایک حادثہ ماضی میں ہوا، اب گذر چکا، اب آگے بڑھنا چاہیے۔ساتھ ساتھ اللہ سے اچھی جزا کی، اچھے بدلے کی اُمید رکھے۔ اللہ دیکھ رہا ہے کہ میرے ساتھ زیادتی ہوئی ہے، میں اس زیادتی کا بدلہ نہیں لے سکتی یا نہیں لے سکتا۔ میرے بس میں وہ مجرم نہیں، لیکن اللہ کے بس میں تو ہے! اللہ تو ہر چیز پر محیط ہے، قہار ہے، ذوانتقام ہے، حسیب ہے۔ اللہ ضرور بدلہ لے گا اور مجھے اس کا اچھا صلہ دے گا۔

کچھ لوگ اپنے بچپن میں ماں باپ کی عدم توجہی (neglect) کا شکار رہے ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے اندر غصہ پیدا ہوتا ہے، محرومی کا احساس، نہ چاہے جانے کا احساس جنم لیتا ہے۔ یا ماں باپ میں طلاق ہوگئی، خوب جھگڑے اور فساد کے بعد علیحدگی (separation) ہوئی۔ ایسے واقعات اُن کے ذہنوں پر بہت بُرا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ یا بعض دفعہ والدین کسی ایک بچے کو بہت لاڈ پیار (pamper) کرتے ہیں اور دوسرا بچہ احساسِ محرومی (neglected) کا شکار ہوجاتا ہے۔ یہ زیادتی ہے، اس کا بھی غصہ دل کے اندر جمع ہوتا رہتا ہے اور ایسے بچوں کا غصہ عجیب طرح سے نکلتا ہے۔ ان کو خود وجہ معلوم نہیں ہوتی مگر لاشعور میں کوئی چیز موجود ہوتی ہے۔ ایسا غصہ زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتا اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر ظاہر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی کم قیمت کا تحفہ دے دے تو وہ آپے سے باہر ہوجاتے ہیں۔ عام طور پر ایسے لوگوں کا غصہ حیران کن ہوتا ہے، دوسرے لوگ اُن کے اس شدید ردعمل پر حیران رہ جاتے ہیں کہ اس میں ایسی کون سی غصے کی بات ہے۔ لیکن وہ بچپن کے واقعات ایک خلش بن کر دل میں رہ جاتے ہیں کہ جب میں چھوٹا تھا یا چھوٹی تھی تو سب سے گھٹیا چیز مجھے ملتی تھی، بڑے بہن بھائیوں کے چھوٹے کپڑے مجھے پہننے پڑتے تھے، ان کو ہر دفعہ نیا جوڑا ملتا اور مجھے ان کا پہنا ہوا جوڑا ملا کرتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

علاج:

انسان اپنے آپ کو ٹٹولے کہ اُسے غصہ کیوں آتا ہے۔ ہوسکتا ہے وہ کسی نتیجے پر پہنچ جائے اور اُسے اپنے شدید غصے کی کوئی وجہ ہاتھ لگ جائے۔ ایک اور فائدہ مند ترکیب یہ ہے کہ وہ کسی سمجھدار شخص کو اپنا طبیب بنالے اور اس سے اپنے مسائل (syndromes) ڈسکس (discuss) کرلے، اپنے ماضی سے تھوڑا بہت آگاہ کردے تاکہ مرض کی تشخیص میں مدد مل سکے، وہ چھپی ہوئی وجوہ کھوج (extricate) سکے۔ بعض دفعہ ہمارا ذہن بہت الجھا (complicated) ہوا ہوتا ہے، ہمیں اپنے اعمال کی علّتیں خود نہیں مل رہی ہوتیں۔ انسان خود اپنا جائزہ نہیں لے پاتا کہ اُس کی بیماری کی وجہ کیا ہے؟ سو غصے کی وجہ معلوم کرلینا ایسا ہے جیسے آدھی جنگ جیت لینا۔

ایسا بھی ہوسکتا ہے بچپن میں کسی کو بہت دبا کر رکھا گیا ہو، بہت رُعب میں رکھا گیا ہو، زیادتی کی حد تک سختی کی گئی ہو، مجبور کر کے نا قابل برداشت بوجھ ڈالا گیا ہو لیکن اب وہ بڑے ہو گئے اور اب وہ سرکشی کرنا چاہتے ہیں، کوئی صحیح بات بھی سننا نہیں چاہتے، اگر ذرا بھی مزاج کے خلاف بات ہو تو وہ طیش میں آ جاتے ہیں۔ یہ وہ تمام دبے ہوئے جذبات ہیں، جو بروقت ظاہر نہیں ہو سکے تھے۔

اگر اپنے اندر کسی اتھارٹی کے خلاف بغاوت محسوس ہوتی ہے، غُصہ جمع ہوتا رہتا ہے تو انسان فکر کرے اور کسی سے مشورہ کرے کہ مجھ میں اتنی نفرت کیوں ہے۔ فی الحال تو ہم مرض کی تشخیص کے مرحلے میں ہیں، علاج تجویز کر رہے ہیں، باقاعدہ علاج تو ابھی باقی ہے۔ علاج تجویز کرنا بہت آسان ہے لیکن اُس پر عمل (application) میں وقت لگے گا اور پھر زندگی اعتدال پر آنے میں اور بھی وقت چاہیے۔ یہ بھی اہم ہے کہ یہ مرض یا زخم کتنا گہرا ہے، ان زخموں کو مندمل ہونے میں سال بھی لگ سکتے ہیں، لیکن کم از کم انسان کوشش شروع کر دے، اس غصے سے نجات حاصل کرے، یہ جو غصے کی آگ اندر ہی اندر سلگ رہی ہے، انسان کو کھوکھلا کر رہی ہے، اس کو بجھانا شروع کر دے۔

اگر زیادتی کرنے والے کو معاف کر دے تو یہ بہترین درجہ ہے اور اگر معاف نہیں کر سکتا تو معاملہ اللہ کے حوالے کرے۔ وہ سب سے بہترین بدلہ لینے والا اور اجر و صلہ دینے والا ہے۔

{وَ اُفَوِّضُ اَمۡرِیۡۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ بَصِیۡرٌۢ بِالۡعِبَادِ} (المؤمن: ۴۴)

”میں اپنے تمام کام اللہ کے سپرد کرتا ہوں بے شک اللہ اپنے بندوں کو دیکھنے والا ہے۔“

یہ سوچ کر کہ اللہ قیامت کے روز میرے گناہوں اور غلطیوں کو بھی ڈھانپ لے گا، میں بھی خطا کار انسان ہوں، مجھے بھی عفو و درگزر کی ضرورت پڑے گی، انسان کو معاف کر دینا چاہیے۔

اور اگر کوئی ایسی زیادتی ہے جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے تو پھر زیادتی کرنے والے کو احساس دلائے کہ آپ میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ بعض لوگ دوسروں کو تختۂ مشق (punching bag) بنا لیتے ہیں۔ جس طرح گھونسے باز (boxer) ایک بیگ (bag) لٹکا کر اُس کو مار مار کر مشق کرتے ہیں۔ بیگ کچھ بول نہیں سکتا، نہ بدلا لے سکتا ہے۔ اسی طرح کچھ لوگ اُٹھتے بیٹھے باتیں سنائیں گے، ڈانٹیں گے یا پھر کوئی اور ایسی حرکت کرتے رہیں گے جو دوسروں کے لیے نا قابل برداشت ہو جائے گی۔ جو لوگ اس قسم کی سرکشی کا شکار ہو جاتے ہیں، ان کے اندر بہت سا غصہ جمع ہو جاتا ہے۔ مثلاً ماں کے ہاں جانا چاہتی ہوں لیکن نہیں جا سکتی! میں ذرا آدھے گھنٹے کے لیے سہیلی کے پاس چلی جاؤں؟ کوئی ضرورت نہیں! گھر میں بیٹھو! بعض لوگوں کو زیادتی کرنے کا

شوق ہوتا ہے رُعب جھاڑنے کا خبط ہوتا ہے۔ اب اس زیادتی کا شکار بننے والے کو چاہیے، زیادتی کرنے والے کو احساس دلائے۔ اگر یہ شخص خاموشی سے نشانہ بنتا رہے اور آگے سے کچھ نہ بولے تو ہوسکتا ہے اگلے کی ظلم و زیادتی بڑھتی چلی جائے۔ لیکن اگر وہ ہمت کر کے احساس دلا دے کہ مجھے آپ کی خواہ مخواہ کی باتوں سے تکلیف ہوتی ہے، یہ جو آپ ہر وقت مجھ کو سب کے سامنے طنز کا، ڈانٹ کا، بے عزتی کا نشانہ بناتے ہیں، یہ مجھے بہت بُرا لگتا ہے تو جب اس زیادتی کا سلسلہ رُکے گا تو غصہ بھی ختم ہوجائے گا اور اگلے کو بھی اپنی زیادتی کا احساس ہوجائے گا۔

لیکن اگر زیادتی مسلسل جاری ہے۔ احساس دلانے سے بھی وہ شخص باز نہیں آتا تو اللہ تعالیٰ نے اختیار دیا ہے کہ بدلہ لے لے۔ کسی نے اگر تنگ کیا ہے تو اس کو بھی حق ہے کہ اتنا ہی تنگ کر لے لیکن اس سے بڑھ کر نہیں ورنہ یہ خود ظالم بن جائے گا۔ بس اس حد تک بدلہ لے کہ غصہ ٹھنڈا ہوجائے، اس کی اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے۔ لیکن جو بدلہ نہ لے سکے، وہ اپنے غصے کو قابو میں رکھنے کی کوشش کرے، خود کو اُس ظالم سے، زیادتی کرنے والے سے حتی الامکان دور کر لے، ذہنی طور پر، جسمانی، جذباتی طور پر، اپنے آپ کو ایک محفوظ فاصلے (safe distance) پر کر لے۔ یاد رکھیں بچھو کا تو کام ہے ڈسنا، اس سے محفوظ رہنے کے لیے اُس سے دور ہٹا جاتا ہے، بچھو کے ڈنگ کی اصلاح تو نہیں کی جاسکتی۔ یہ بہترین لائحہ عمل (strategy) ہے کہ خود دُور رہا جائے، اس کی پہنچ سے باہر رہا جائے۔ اسی طرح جس شخص سے بدلہ نہیں لیا جاسکتا، اُس کے ساتھ بھی ایسا ہی رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ ایک حد تک تعلق رکھیں، بالکل قطع تعلق کی اجازت نہیں ہے۔

اگر اس شخص کے ساتھ ہر وقت کا واسطہ ہے، رات دن اس کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ اب کیا کرے؟ ایسی صورت میں صبر کرے۔ لیکن ایک صابر اور مظلوم میں بڑا فرق ہے۔ مظلوم بن کر نہ رہے، صابر بن کر رہے۔ مظلوم کے اندر غصہ پک رہا ہوتا ہے۔ اُس کو اپنے ساتھ زیادتی کے احساس کے ساتھ یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ ظالم کو کوئی کچھ نہیں کہہ رہا، اس کا کچھ نہیں بگڑ رہا، میرے ساتھ اتنی زیادتی ہو رہی ہے۔ جب کہ صابر وہ ہے جس کو یہ احساس تو ہے کہ میرے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے لیکن وہ یہ بھی جانتا ہے کہ زیادتی کرنے والے کی پکڑ ہوگی، اس کو سزا ملے گی تو صابر شخص اپنے اندر غصے کے الاؤ نہیں جلاتا۔

دراصل صبر غصے پر قابو پانے کا سب سے بہترین طریقہ ہے۔ صابر انسان کے اندر غصہ جڑ ہی نہیں پکڑ پاتا۔ اُسے یقین ہوتا ہے کہ یہ اذیتیں رائیگاں نہیں جائیں گی، مجھے اپنے صبر کا صلہ اللہ تعالیٰ سے ضرور ملے گا۔ اور اس سے بہتر صبر یہ ہے کہ انسان زیادتی کرنے والے کو مجبور سمجھے اور درگذر

کرے، اس کی ہدایت کی دُعا کرے، اس کی اصلاح کی دُعا کرے۔ یہ اعلیٰ ترین درجہ ہے۔

{ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ} (لقمان:۱۷)

''یہ تو بڑے عزم والے کاموں میں سے ایک کام ہے۔''

ایک حدیث مبارکہ کا مفہوم ہے قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا، اُس کے نامۂ اعمال میں زیادہ نیکیاں تو نہ ہوں گی۔ لیکن ایک خاص نیکی یہ ہوگی کہ جو شخص اس پر زیادتی کرتا تھا یہ اُس کو معاف کر دیتا تھا۔ یعنی بہت عالم فاضل، عبادت گزار، تہجد گزار، روزہ دار تو نہیں تھا لیکن یہ زیادتی کرنے والوں کو معاف کر دیا کرتا تھا اور اگر کسی کے ذمے اس کا مالی حق ہوتا اور وہ ادا نہ کر پاتا تو یہ اپنا حق چھوڑ دیتا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ''جب یہ شخص میرے بندوں کے ساتھ معافی کا معاملہ کرتا تھا تو آج میں بھی اس کے ساتھ معافی کا معاملہ کروں گا۔'' اور اُس شخص کی مغفرت ہو جائے گی۔ یہ ہے اصل کامیابی۔ یہ آخرت کا احساس انسان کے غصے کو بہت جلد ٹھنڈا کر دیتا ہے کہ میں بھی تو نہ جانے کتنی زیادتیاں، نافرمانیاں یا غلطیاں کر کے اللہ کا غضب بھڑکاتا ہوں لیکن اللہ معاف کرتا رہتا ہے، بدلہ نہیں لیتا۔ سو جو شخص میرا غصہ بھڑکا رہا ہے میں بھی اس کو معاف کر دوں! اس کے بدلے میں اللہ مجھے معاف کر دے گا تو بہت اچھا ہوگا۔ انعام کا خیال غصے کو فوری طور پر ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ جیسے بچے کو چوٹ لگتی ہے تو ہم کوئی ٹافی دلا کر، کھلونا دے کر فوراً چپ کرا دیتے ہیں۔ اور بچے اُس میں مگن ہو کر اپنی چوٹ بھول جاتے ہیں۔ گڑیا کی خوشی میں بچی رونا بھول جائے گی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے غصے کی سب سے بڑی وجہ کسی کی زیادتی کا نشانہ بننا ہے۔ لہٰذا سب سے پہلے تہیہ کر لیں کہ کوئی کیسی ہی تکلیف کیوں نہ دے، کسی کو غصہ دلانے کا اختیار نہیں دینا، اپنا کنٹرول (control) اپنے پاس رکھنا ہے۔ کسی اور کو یہ اختیار نہیں دینا کہ وہ میرے اوپر غالب آ جائے یا مجھے غصہ دلانے پر پوری طرح سے قادر ہو جائے۔

غصے کی تیسری وجہ:

غصے کی تیسری وجہ جلد بازی ہوتی ہے۔ جلد بازی کی وجہ سے جھنجھلاہٹ (irritation) ہوتی ہے اور پھر غصے کا سبب بن جاتی ہے۔ مثلاً کسی چیز کی دل میں خواہش پیدا ہوئی اور بس دل چاہنے لگا جلدی سے یہ خواہش پوری ہو جائے۔ یا کوئی کام شروع کیا اور جلد از جلد مکمل کرنے کی فکر لگ جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو تو غصہ آنے لگتا ہے۔ جیسا کہ اگر بھوک لگ رہی ہے، گھر والوں سے کھانا لگانے کو کہا اور اگر پانچ منٹ تک کھانا میز پر نہیں آیا تو بپھر گئے، چیخنے چلانے لگے۔ کپڑا ادھیڑنا

شروع کیا اور جھنجلا کر پھاڑ دیا۔ کہیں پہنچنا ہے اور دیر ہوگئی تو گاڑی چلاتے ہوئے باقی گاڑیوں کو خلاف قاعدہ اوورٹیک (overtake) کریں گے، ہاتھ ہارن پر سے نہیں اُٹھائیں گے، بُرا بھلا کہیں گے، گالیاں دیں گے۔ یاد رکھیں غصہ جلد بازی کی وجہ سے بڑھتا چلا جاتا ہے۔

علاج:

اگر جلد بازی کی وجہ سے کسی کو غصہ آتا ہے تو اسے وقت کو صحیح استعمال کرنا سیکھنا چاہیے۔ اس جلد بازی کا علاج ''حِلم'' ہے۔ یہ اللہ کی صفت ہے، اللہ بڑا بردبار ہے، ''الحلیم'' ہے۔ حدیث مبارکہ ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے ایک شخص سے کہا:

((اِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ الْحِلْمَ وَالتُّؤَدَةَ)) (۱)

''تم میں 2 خوبیاں ایسی ہیں جو اللہ کو بہت محبوب اور پیاری ہیں۔ ایک ہے بردباری (غصے سے مغلوب نہ ہونا) اور دوسری جلد بازی نہ کرنا۔''

یہ بہت بڑی خوبیاں ہیں۔ ایسے لوگ اللہ کے نزدیک انتہائی پسندیدہ ہیں، جو لوگ بردبار ہوتے ہیں، جلد باز نہیں ہوتے ان کو غصہ بہت کم آتا ہے۔ ان کے مزاج میں ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ ایک حدیث مبارکہ ہے، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اَلْاَنَاةُ مِنَ اللهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ)) (۲)

''کام کو متانت سے انجام دینا اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جلد بازی شیطان کی طرف سے ہے۔''

انسان کے اندر جتنا ٹھہراؤ پیدا ہوگا، اُتنا وہ اپنا وقت اچھا استعمال کرے گا اور اس طرح غصہ نہیں آئے گا۔ سب کام خوش اسلوبی سے بروقت انجام پائیں گے۔ ترمذی میں بھی نبی اکرم ﷺ کا قول ہے:

((اَلسَّمْتُ الْحَسَنُ وَالتُّؤَدَةُ وَالِاقْتِصَادُ جُزْءٌ مِنْ أَرْبَعَةٍ وَعِشْرِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ)) (۳)

''اچھی سیرت، اطمینان اور وقار سے اپنے کام انجام دینے کی عادت اور میانہ روی۔ یہ نبوت کے چوبیس حصوں میں سے ہے۔''

غصے کی چوتھی وجہ:

غصے کی ایک وجہ جسمانی صحت ہے۔ بیماری (medical reason) کی وجہ سے مزاج

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الزهد، باب الحلم

(۲) جامع الترمذی، كتاب البر و الصلة، باب ما جاء في التأني و العجلة

(۳) جامع الترمذی، كتاب البر و الصلة، باب ما جاء في التأني و العجلة

میں کئی تبدیلیاں پیدا ہوجاتی ہیں۔ عام طور پر انسان حلیم ہوتا ہے، بردبار ہوتا ہے۔ بات بات پر غصہ نہیں کرتا۔ مگر بیماری میں عام حالات کے برعکس غصے کا تیز اور چڑچڑا ہوجاتا ہے۔ لیکن یہ ایک عارضی وقت (temporary phase) ہوتا ہے، جو گذر جاتا ہے۔ جب انسان صحت مند ہوجاتا ہے، بیماری چلی جاتی ہے، دواؤں کا اثر ختم ہوجاتا ہے تو مزاج نارمل ہوجاتا ہے۔ اگر اُس نے بیماری کے دوران غصے کا اظہار کیا بھی ہے تو اُسے معذور سمجھا جانا چاہیے کیوں کہ عام طور پر اس کا مزاج ایسا نہیں تھا۔ لیکن عام حالات میں بھی اسی طرح غصہ کرتے رہنا مناسب نہیں۔

جہاں تک زندگی کے مختلف مراحل میں جسمانی تبدیلی کا تعلق ہے، مثلاً ۱۳، ۱۲ سال کی عمر سے جسمانی تبدیلی (harmonal changes) آتی ہے، بلوغت کا عمل شروع ہوتا ہے۔ اگر کوئی اس بات کو بنیاد بنا کر غصہ کو اس عمر میں جائز قرار دے رہا ہو کہ لڑکپن (teenage) ہے، اس میں تو غصہ آئے گا۔ اس طرح کی باتوں سے اُن بچوں کو غصے کا لائسنس (license) مل جاتا ہے اور وہ سوچتے ہیں کہ اچھا ہم تو لڑکپن (teenage) میں ہیں، ہمیں تو سب کچھ کرنے کا حق ہے۔ اس لیے وہ خوب کھل کر غصہ کریں گے، کیوں کہ انھیں پتا ہے ہم میں جسمانی تبدیلیاں (harmonal changes) آرہی ہیں، اب ہم جتنا چاہے غصہ کرسکتے ہیں، توڑ پھوڑ کرسکتے ہیں، کتابیں پٹخ سکتے ہیں، دروازہ زور زور سے بند کرسکتے ہیں، برتن اُٹھا کر پھینک سکتے ہیں۔ خدارا بچوں کے ذہن میں یہ نہ بٹھائیں، اُنھیں یہ سب کرنے کی اجازت مت دیں! یہ کوئی نرالی عمر نہیں ہے، جب سے انسان اس دنیا میں موجود ہیں تب سے یہ عمر آتی رہی ہے، اس کو جواز بالکل فراہم نہ کریں۔ خاص طور پر مائیں یہ ذہن نشین کرادیتی ہیں کہ تمہارا غصہ ٹھیک (justified) ہے۔

زندگی کے اگلے دور میں مردوں پر کمانے کی ذمہ داری آجاتی ہے اور خواتین پر گھرداری اور بچوں کی ذمہ داری آجاتی ہے۔ اس دور میں خواتین وحضرات اپنی ذمے داریوں کے بوجھ کو غصے کا جواز بناتے ہیں اور کہتے ہیں چوں کہ ہم پر اتنی بڑی بڑی ذمے داریاں ہیں، ہمیں کئی ٹینشن (tension) ہیں۔ اسی لیے ہمیں بہت غصہ آجاتا ہے، بات بات پر صبر کا پیمانہ لبریز ہوجاتا ہے اور پھٹ پڑتے ہیں۔

پھر خواتین عُمر کے اُس دور کو پہنچ جاتی ہیں جب جوانی رخصت ہورہی ہوتی ہے اس دور کو ''سن یاس'' (menopause) کہتے ہیں۔ عمر کے اس حصے میں بھی جسمانی تبدیلیاں (harmonal changes) ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے غصہ آتا ہے، اسی لیے فی الحال غصہ جائز ہے کیوں کہ ڈاکٹر نے کہہ دیا ہے ان حالات میں غصہ آجاتا ہے۔

پھر چند ہی سال کے بعد بڑھاپا آ جائے گا۔ اور بڑھاپے میں ویسے ہی بہت غصہ آتا ہے کیوں کہ بوڑھا شخص پھر سے بچہ بن جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو زندگی کے ہر دور میں غصے کا کوئی نہ کوئی جواز موجود ہوتا ہے۔ لڑکپن کا دور، دورانِ حمل، سن یاس، بڑھاپا، اس سب کے بعد جو تھوڑی بہت زندگی بچتی ہے اس میں بھی عارضی جواز ملتے رہتے ہیں مثلاً بھوک کی وجہ سے غصہ آ گیا، کبھی نیند پوری نہیں ہوئی غصہ آ گیا، کبھی کام کا بوجھ زیادہ ہے تو غصہ آ گیا وغیرہ۔ اگر مخصوص حالات میں غصے کو جائز قرار دیا جائے تو غصہ ضبط کرنا بے معنی ہو جائے گا۔ کیوں کہ انسان کو کسی خاص وجہ ہی سے غصہ آتا ہے، اس طرح مزاج کی اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ کہتے ہیں نا! مزاج شریف کیسے ہیں؟ تو یہ مزاج کو شریف رکھنا آسان نہیں۔ اس میں بدمعاش ہونے کی پوری قابلیت موجود ہے! اللہ سے دُعا کرنی چاہیے کہ میرا مزاج ''شریف'' ہو جائے۔

اگر انسان غصہ کے ہاتھوں اتنا ہی مجبور ہوتا تو اسلام ہم سے کبھی تقاضا نہ کرتا کہ غصے پر قابو پاؤ۔ جس طرح انسان کے جبلّی تقاضوں (instincts) کو پورا کرنے کی اجازت ہے اگر غصہ بھی اسی قبیل سے ہوتا تو اس کو پورا کرنے کی بھی کھلی اجازت ہوتی۔ جس طرح نیند اور بھوک کو پورا کرنے کی اجازت ہے، اسی طرح اس داعیے کو بھی اسلام تسکین پہنچانے کا سامان فراہم کرتا۔ لیکن اسلام تقاضا کرتا ہے کہ غصے پر قابو رکھو، اس کا مطلب ہے کہ ہم غصے پر قابو (control) پا سکتے ہیں۔

لہٰذا غصہ کو کبھی جواز (justify) فراہم مت کیجیے۔ عام طور پر مائیں اپنے بچوں کے غصے کو بجا قرار دے کر اُن کو لاڈ کرتی ہیں۔ مثلاً تین چار سال کا بچہ ضد کر رہا ہے، چیزیں پٹخ رہا ہے، زمین پر لوٹ پوٹ رہا ہے تو ماں کہتی ہے تمھیں بھوک کی وجہ سے غصہ آ رہا ہے، چلو تمہیں کھانا کھلاؤں! اس طرح بچے کی عادت پختہ ہو جائے گی، اب جب بھی بھوک لگے گی وہ اس کا اظہار غصہ سے ہی کرے گا یا چڑچڑا پن دکھائے گا۔ آج ماں غصہ برداشت کر رہی ہے، کل بیوی کو برداشت کرنا پڑے گا۔ اسی طرح بچہ بدتمیزی پر اُتر آئے تو ماں کہتی ہے اِسے نیند آ رہی ہے اس وجہ سے غصہ کر رہا ہے۔ یا بچے کھیل کر آتے ہیں اور بدمزاجی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ماں کہتی ہے تھک گئے ہیں اس لیے غصہ آ رہا ہے۔ دیکھیے ہم نے کیا غلط کیا؟ ہم نے غصے کی اُنہیں دلیل فراہم کر دی۔ اب انھیں کوئی ندامت (guilt) نہیں رہی، کوئی شرمندگی نہیں ہوئی، اپنی غلطیوں پر مزید مُصر ہو گئے۔ پھر جب وہ بچے بڑے ہوں گے، بااختیار ہوں گے تو اپنے ماتحت سے بھی اسی طرح غصہ برداشت کرنے کا تقاضا کریں گے، مرد کا سارا غصہ اپنی بیوی پر نکلے گا۔ اور اُسے کوئی پشیمانی بھی نہیں ہوگی۔

یہ جدید نفسیات (modern psychology) کی ایک بہت بڑی خرابی ہے کہ انھوں

نے کئی رذائل کا جواز فراہم کر دیا، انسان کو دلیل دے دی کہ تم غصہ کرتے رہو، تمہارا کوئی قصور نہیں (it is not your fault)، تم مجبور ہو۔ جب کہ اسلام ہمیں غصے پر ضبط کرنے پر اُبھارتا ہے۔ کَظِمِیْنَ الْغَیْظَ ''غصے کو ضبط کرنے والے'' اچھے ہوتے ہیں۔

{لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا}(البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی جان پر ایسا بوجھ نہیں ڈالتا جو اس کی وسعت سے زیادہ ہو۔''

حضرت سہل بن معاذؓ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ کَظَمَ غَیْظًا وَھُوَ قَادِرٌ عَلٰی أَنْ یُنْفِذَہُ دَعَاہُ اللّٰہُ عَزَّوَجَلَّ عَلٰی رُؤُوْسِ الْخَلَائِقِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ حَتّٰی یُخَیِّرَہُ اللّٰہُ مِنَ الْحُوْرِ الْعِیْنِ مَا شَاءَ)) (۱)

''جو شخص غصہ کو روکے، حالاں کہ اُس کو اپنا غصہ نکالنے کا اختیار ہو تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اُس کو تمام لوگوں کے سامنے بلا کر فرمائے گا۔ جس حور کو تو چاہے پسند کر لے''

ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا ''مجھے مختصر نصیحت کیجیے''، ہم تو یہ سوال سن کر ہی غصے میں آ جائیں کہ سننا ہے تو سنو ورنہ چلتے بنو! لیکن یہ حلم تھا۔ علم کے ساتھ حلم بڑا ضروری ہے، اگر علم آ جائے اور حلم نہ ہو تو انسان متکبر ہو جاتا ہے۔ آپ ﷺ انتہائی حلیم انسان تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''لَا تَغْضَبْ'' دو لفظوں میں مختصر ترین نصیحت کی کہ ''غصہ مت کرو۔''

ایک اور شخص کے بارے میں حدیث مبارکہ میں آتا ہے اُس نے آ کر کہا کہ کوئی نصیحت کیجیے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''غصہ مت کر'' اُس نے کہا ''کوئی اور نصیحت'' فرمایا ''غصّہ مت کر۔'' اس نے پھر درخواست کی ''کچھ اور نصیحت فرمائیے۔'' آپ ﷺ نے پھر فرمایا ''غصہ مت کر۔''

جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ عَلِّمْنِی شَیْئًا وَلَا تُکْثِرْ عَلَیَّ لَعَلِّی أَعِیہِ قَالَ لَا تَغْضَبْ فَرَدَّدَ ذٰلِکَ مِرَارًا کُلُّ ذٰلِکَ یَقُوْلُ لَا تَغْضَبْ (۲)

غصے کی پانچویں وجہ:

غصہ کرنے کی ایک وجہ تکبر بھی ہے۔ ہوسکتا ہے اللہ نے کوئی خوبی عطا فرمائی ہو، حسن یا عقل و دانش وغیرہ سے نوازا ہو، جس کی وجہ سے دوسروں سے ممتاز ہو گئے۔ یا والدین نے اتنا لاڈ پیار دیا، کبھی جھڑکا نہیں، کبھی کسی چیز سے منع نہیں کیا۔ ہر خواہش اور تمنا پوری ہوتی رہی تو وہ بالکل ہی طبعِ نازک ہو گئے، قوتِ برداشت رہی نہیں، کوئی بات مزاج کے خلاف ہوتی ہے تو غصہ آ جاتا ہے اور غصہ ناک

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب من کظم غیظا

(۲) جامع الترمذی، کتاب البر و الصلۃ، باب ماجاء فی کثرۃ الغضب

پر رہنا اپنی خوبی بھی سمجھتے ہیں۔ احساسِ ندامت (guilt) تو دُور کی بات، یہ تو اس کو عین اپنا حق سمجھتے ہیں کہ جو دل چاہے، جس کو چاہے کہہ دیں۔ یہ ہے تکبّر!

اللہ تعالیٰ نے کوئی مقام دے دیا تو اُس کا غلط استعمال (misuse) شروع کر دیا۔ یہ ناشکری کی حد ہے کہ دوسروں کو آڑے ہاتھوں لیں یا جملے (bash) کسیں۔ میں بے وقوفوں کو برداشت نہیں کر سکتا، (I don't suffer fools gladly) یا میں یہ بے وقوفی کی باتیں برداشت نہیں کر سکتا، (I can't put up with nonsense) ان جملوں کے اندر تکبر ہی تکبر ہے! اگر ہم ایک دوسرے کو برداشت نہ کریں تو اس دنیا میں گزارا ممکن ہی نہیں۔ کتنے لوگ ہماری بے وقوفیاں برداشت کرتے ہیں۔ یہ جملے صرف وہ کہہ سکتا ہے جس کو اپنے اوپر یہ غرّہ ہو کہ میں تو کبھی کوئی بے وقوفی کی بات نہیں کرتا، میری تو ہر بات نپی تلی، اعلیٰ، انتہائی عقلمندی پر مبنی ہوتی ہے۔ ایسے لوگ دوسروں کی غلطیوں کو اپنے غصے کا جواز سمجھتے ہیں، بلکہ اپنے غصے پر فخر کرتے ہیں، غصہ کرنے کو اپنی شان سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اپنی من مانی کرنے کے لیے، یا دوسروں کو ڈرانے اور رُعب جھاڑنے کے لیے، لوگوں پر فوقیت ظاہر کرنے کے لیے غصہ کرتے ہیں۔

بعض لوگ اپنے بزرگوں کے غصے کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ بڑے ہی غصہ والے تھے، نوکروں کو مارتے پیٹتے بھی تھے۔ پتا نہیں نوکروں پر لوگوں کا ہاتھ کیسے اُٹھ جاتا ہے، تکبر کی انتہا ہے! نوکروں کو گالیاں دیتے ہوئے، چلّاتے ہوئے، ہاتھ چلاتے ہوئے ان کے دل نہیں کانپتے! تکبر جس دل میں ہوتا ہے، اس کا ضمیر بالکل مردہ ہوتا ہے۔

بعض لوگ اس بات پر بھی فخر کرتے ہیں کہ اُنھیں بہت جلدی غصہ آتا ہے اور جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ ہم چیخ چلّا کر ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ یہ کہاں کی خوبی ہے! تصور کریں کہ اُبلتے ہوئے پانی کی دیگچی کسی پر انڈیل دی اور وہ جل بھن گیا لیکن دیگچی ٹھنڈی ہو گئی۔ کیا یہ درست رویّہ ہے؟ غصہ آیا، دوسروں کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیا، جو دل میں آیا منہ سے نکال دیا اور پھر مطمئن ہو گئے۔ سامنے والوں کو تو جلا دیا اور پھر خود ٹھنڈے ہو کر بیٹھ گئے۔ کیا یہ زیادتی نہیں؟ کیا اللہ نہیں پوچھے گا اُن سے؟ تو یہ کوئی فخر کی بات نہیں کہ غصہ آتا ہے اور پھر جلدی ہی ختم ہو جاتا ہے۔ غصے کی حالت میں انسان کا عقل سے تعلق کٹ جاتا ہے اور یادداشت کا بٹن بھی بند ہو جاتا ہے، بعد میں کچھ یاد نہیں رہتا، خود تو بھول بھال جاتے ہیں مگر جس کو سنائی ہے وہ نہیں بھول پاتا۔ وہ معاف کر سکتا ہے مگر بھول نہیں سکتا۔ اُسے جب بھی یاد آئے گا اُس کے جسم میں اذیت کی ایک لہر دوڑ جائے گی۔ یہ کوئی خوبی نہیں

ہے، یہ کوئی شخصیت کا حسن نہیں ہے۔ ایسے غصہ کرنا شخصیت کا عیب ہے، یہ کھرا پن نہیں کمزوری ہے، یہ اعلیٰ نسل ہونے کی علامت نہیں، گھٹیا ہونے کی علامت ہے، یہ کوئی شاہانہ مزاج نہیں۔ ہمیں اپنی نسبت اپنے رسول اکرم ﷺ سے کرنی ہے، اپنے گذرے ہوئے نواب اور شاہی رشتہ داروں سے نہیں کرنی۔ ہم نے آپ ﷺ ورہنما بنانا ہے، آپ ﷺ سے رہنمائی لینی ہے۔

{ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ }(الاحزاب: ۲۱)

''رسول اللہ ﷺ میں تمہارے لیے بہترین اُسوہ موجود ہے۔''

اس رویے اور طریقے کو انسان چھوڑ دے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرے۔ جو اس طرح غصہ کر رہا ہوتا ہے، اپنا تماشا بنا رہا ہوتا ہے۔ دوسرے بالکل مرعوب نہیں ہوتے۔ وہ سوچتے ہیں ان کو اپنے اوپر قابو نہیں تو دوسروں پر کیا اثر انداز ہوں گے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اتَّقُوا الْغَضَبَ فَإِنَّهُ جَمْرَةٌ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ أَلَا تَرَوْنَ إِلَى انْتِفَاخِ أَوْدَاجِهِ وَحُمْرَةِ عَيْنَيْهِ))(۱)

''غصے سے بچو! بے شک یہ ایک انگارہ ہے جو ابن آدم کے دل میں بھڑکتا ہے۔ کیا تم دیکھتے نہیں کہ غصہ کے وقت اُس کی گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔''

جب غصہ آتا ہے تو انسان کا رنگ لال ہو جاتا ہے۔ آنکھیں آگ برساتی ہیں، کان بھی لال ہو جاتے ہیں اور گردن کی رگیں پھول جاتی ہیں۔ بدنما لگنے لگتا ہے۔ اچھی اچھی شکلیں، بدنما ہو جاتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ محبت کا اظہار بھی غصے سے کرنا چاہیے۔ مثلاً کسی بچے کا گلا خراب ہو گیا اور بخار آ گیا تو مائیں کہیں گی اور ٹھنڈا پانی پیو، بغیر چپلوں کے باہر گھومو، گرم کپڑے مت پہنو، اچھا ہوا بخار ہو گیا! منع کرتے کرتے تھک گئی، سنتے ہی نہیں تھے! یہ بچوں کو سمجھانے کا مناسب طریقہ نہیں ہے! بچوں کو تو ہمدردی چاہیے، حفاظت (care) چاہیے، پیار چاہیے۔ محض کڑوی کسیلی دواؤں سے صحت نہیں آئے گی۔ لیکن ہم نے اپنی زندگی ایسی بنالی ہے کہ ہمیں اپنی ہی پریشانیوں سے فرصت نہیں کہ بچے کے ساتھ ہمدردی کر سکیں۔ اسی لیے بہت سے بچے اگر کہیں باہر زخمی ہو جائیں تو ماؤں سے چھپاتے ہیں کہ ڈانٹیں گی باہر کھیلنے کیوں نکلے تھے؟ گھر میں کوئی بھی معمولی سے معمولی کام بگڑ جائے تو فوراً بچوں پر غصہ شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کس نے کیا؟ یہ کیوں ہوا؟ تم لوگ ہر روز کچھ نہ کچھ پریشانی ضرور پیدا کر دیتے ہو، سکون سے تو بیٹھنے نہیں دیتے۔ اس طرح معاملہ سنورنے کی بجائے اور بگڑ جاتا ہے۔ ایسے لوگ بجائے مسئلہ حل کرنے کے خود ایک مسئلہ بن جاتے ہیں۔ اس وجہ سے لوگ اسی کو عافیت سمجھتے ہیں کہ بھئی ان کو نہ بتاؤ! ان کو غصہ آ گیا تو مسئلہ سلجھنے کی بجائے اور خراب ہو جائے گا۔

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبة، کتاب الأدب، ماذکر فی الغضب۔۔۔

غصے کے بعد معذرت اور افسوس:

جب غصہ ٹھنڈا ہوجائے تو اُس پر ندامت ہونی چاہیے۔ اور جن پر غصہ کیا تھا ان کو منائیں اور تلافی کریں۔ جو ماحول غصے کی وجہ سے بگاڑا تھا اس کو درست حالت پر لائیں، یہ زندہ ضمیر کی علامت ہے۔ سارے نقصان کی ذمہ داری قبول کرلینی چاہیے، sorry کہنا چاہیے۔ یہ ایمان کی بھی علامت ہے۔ اپنے آپ کو جھکائے اور غلطی کا اعتراف کرے۔ بے حس لوگ ہی اپنا غصہ دوسروں پر نکالنے کے بعد بے فکر رہتے ہیں جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ غصہ کرنے کے بعد اگر ذرا بھی ضمیر زندہ ہے تو غصہ کرنے کے بعد سکون نہیں ملے گا۔

ناگزیر غصہ:

آپ دیکھیں غصے کا جب اظہار کیا جاتا ہے تو چھوٹوں پر، یا ماتحتوں پر کُھل کر کیا جاتا ہے اور بڑوں پر اس کا اظہار اس طرح سے نہیں کیا جاتا۔ جیسے والدین بچوں پر یا مالک ملازموں پر یا اپنے ماتحتوں پر کرتا ہے۔ تو کیا یہ غصہ ٹھیک ہے؟ ماتحتوں کو غلطی کا احساس دلانے کے لیے، تربیت کے لیے، ایک حد تک غصہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھیے اللہ نے ہمارے اندر غصہ رکھا ہوا ہے، یہ ایک توانائی (energy) ہے۔ ایک قوت (power) ہے۔ انسان اس کا استعمال دُرست کرے اور اس کے ذریعے غلط چیزوں کو معاشرے سے نکال باہر کرے۔ غصے کا مثبت استعمال (positive use) ہونا چاہیے۔ ورنہ اگر غصہ بالکل ہی نہ آئے، ٹھنڈی طبیعت کا بندہ ہو تو ہر چیز قبول کرتا جائے گا چاہے غلط ہو یا ٹھیک۔ آپ نے ایسے لوگ بھی دیکھے ہوں گے جنھیں کسی بات پر غصہ نہیں آتا۔ بچے نماز پڑھیں تو بھی ٹھیک اور نہ پڑھیں تو بھی ٹھیک۔ کوئی اللہ کا حکم مانتا ہے یا نہیں مانتا، ان کے لیے برابر ہے۔ ان وجوہ سے ان کا خون نہیں کھولتا، مزاحمت نہیں کرتے۔ ایسی لاتعلقی (indifferent) پسندیدہ نہیں ہے۔ غصے کا اظہار ناگزیر ہے۔

غصے کا غلط اور صحیح اظہار:

غصے کا اظہار کس طرح ہونا چاہیے یہ اہم بات ہے۔ ایک بزرگ اپنی کتاب میں لکھتے ہیں، جب ماتحتوں پر غصہ آئے تو فوراً اظہار کرنے سے اصلاح نہ ہوگی۔ بلکہ یہ غصہ جلے کٹے الفاظ کی شکل اختیار کرلے گا۔ جیسے آتش فشاں پہاڑ لاوا اُگلتا ہے۔ جو اگلے کو بھی سن کر دیتا ہے، بے اثر کر دیتا ہے، وہ اپنی غلطی پر افسوس کرنے کی بجائے، سبّ وشتم پر توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ لہٰذا آپ جب بھی اپنے اندر کسی بات پر غصہ کے جذبات اُبھرتے دیکھیں، محسوس کریں تو اس وقت روک لیں، کٰظِمِین

الغَیظ ''غصے کو روکنے والے۔'' ''کَظم'' کا مطلب ہوتا ہے ''روک لینا'' جیسے کسی بوتل میں گرم پانی بھر کر ڈھکنا بند کر دیں اور پھر کسی کپڑے میں لپیٹ کر سکائی کریں۔ کپڑے کی وجہ سے درجہ حرارت قابل برداشت ہو جائے گا اور کھولتے ہوئے پانی کی حرارت باعث شفا بن جائے گی۔ لیکن اگر بوتل کا پانی جسم پر گر جائے تو کیا نتیجہ ہوگا؟ آبلے نکل آئیں گے اور وہ حرارت مضر ثابت ہوگی۔

غصے کی مثال بالکل ایسی ہی ہے۔ اس کو قابو میں کر کے، اچھے الفاظ میں لپیٹ کر نصیحت کا جامہ پہنائیں تا کہ اصلاح کی صورت پیدا ہو جائے۔ اگر غصہ براہِ راست ظاہر کیا تو اگلے کو جلا دے گا۔ ایک دم پھٹ پڑنے سے، برس جانے سے اصلاح نہیں ہوتی بلکہ خرابی کے امکانات زیادہ ہو جاتے ہیں، غصے کے دوران فوری ردعمل سے انسان کو حتی الامکان بچنا چاہیے۔ بلکہ ذرا وقفہ دے کر تنبیہ (reprimand) کی جائے۔ غصے پر قابو رکھ کر اگر کسی کو ڈانٹا جائے گا تو نہ آواز بلند ہوگی، نہ الفاظ تلخ ہوں گے۔ دوسرا بھی اپنی بے عزتی محسوس نہیں کرے گا اور اپنی غلطی تسلیم کر لے گا۔

مثلاً کچن سے چھناکے کی آواز آئی، گلاس ٹوٹ گیا، بیگم صاحبہ کا پارہ چڑھ گیا۔ پیر پٹختی، گلا پھاڑتی ہوئی کچن میں پہنچ گئیں، سنانا شروع کر دیں، روز چیزیں توڑتی ہو! ہاتھوں میں سوراخ ہیں کیا؟ یا دماغ کہیں اور ہوتا ہے! میں تنخواہ کاٹوں گی! ذرا خیال نہیں! یا پھر غصہ مزید بھڑکا تو نوکرانی کو نکال باہر کیا۔ جب وہ رخصت ہو گئی تو ان کو احساس ہوا کہ اب باقی ماندہ کام کون کرے گا اور دوسری عورت کا انتظام کیوں کر ہوگا۔

غصہ ہی میں تو طلاقیں دے دیتے ہیں۔ تین دفعہ طلاق کہہ کر بیوی کو رخصت کر دیا اور پھر بیٹھ کر روتے ہیں، اسی انجام سے دین بچانا چاہتا ہے۔ اس فوری ردعمل سے روکنا چاہتا ہے کہ اس میں سراسر نقصان ہے۔ ایسے ردعمل میں اس قدر گری ہوئی زبان اور بُرے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔ اگلے کی خودداری کو، اَنا کو، عزت نفس (self respect) کو کچل کر رکھ دیتے ہیں جیسے کوئی (bull dozer) چلا دیا جائے۔ غصہ میں آ کر یہ تک بھول جاتے ہیں کہ یہ بھی انسان ہیں اور غلطی تو انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔ جب انسان اپنے آپ کو قابو میں کر کے بات کرتا ہے تو بہت سی بُرائیوں سے بچ نکلتا ہے۔

ایک خاتون نے بتایا کہ میرا غصہ بہت تیز تھا۔ ذرا سا کھانے میں کوئی چیز پسند نہ آتی تو میں کھانے کی پلیٹ زمین پر دے مارتی مگر پھر قرآن پڑھ پڑھ کر اس خرابی سے نجات پائی۔ اللہ سے دُعا کرتی رہی اور اللہ نے کرم کیا۔

غصے کا سلسلہ وار ردّعمل:

یہ جو غصے کا جنّ (monster) ہے، اگر اس کو قابو میں نہ کیا تو معاشرے میں ایک (chain reaction) شروع ہوجاتا ہے۔ مثلاً باس (boss) نے اپنے ماتحت کو خوب ڈانٹا، الفاظ کی مار ماری۔ جس وجہ سے اُس کا پورا گھر پریشان ہوگا۔ دیکھیں اللہ نے ہر انسان کو ایک مقام دیا ہے، عزت دی ہے۔ ڈرائیور ہو یا کوئی ملازم ہو اُس کے گھر میں بھی ماں، بہنیں یا بیوی بچے ہیں، جن کا وہ سربراہ ہے، وہ اس کی عزت احترام کرتے ہیں، اُس کی خدمت ہوتی ہے۔ اگر کوئی اُس کو ایسے جھاڑ دے اور بے نقط سنا دے تو اس کی عزت نفس کا کیا حال ہوگا؟ یہ ماتحت اپنے صاحب کو تو کچھ نہیں کہہ سکتا، اُس نے گھر میں بیوی بچوں کو نشانہ بنا ڈالا۔ اس طرح ایک تلخیوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ گھروں میں بھی آپ دیکھیں گے کہ اگر خانساماں کو ڈانٹ پڑی تو اُس نے ڈرائیور پر اپنی بھڑاس نکالی، اُس کو چائے نہ دی یا ٹھنڈی دے دی۔ ڈرائیور نے صفائی والے پر دل کا غبار نکالا۔ دیکھیں انسان کے غصے کی کیسی بازگشت ہوتی ہے۔ کتنی دور تک گُونج جاتی ہے، گھر کا ماحول بگڑتا ہے، خاندانوں میں دراڑیں آتی ہیں، اور پورے معاشرے میں غصے کی لہر دوڑتی ہے۔ ہر ایک کسی نہ کسی انسان سے کسی نہ کسی بات پر خفا ہے۔ گھر کا ماحول خراب کرنے کے لیے ایک بدمزاج انسان کافی ہے۔ کہتے ہیں نا ایک مچھلی پورے جل کو گندہ کر دیتی ہے، پورے تالاب کو خراب کرتی ہے۔ ایک غصہ کی بوچھاڑ سے سب سہم جاتے ہیں۔ ادھر اُدھر ہوجاتے ہیں۔ خاموشی چھا جاتی ہے۔

غصے کی ضرر رسانی:

ایسے گھروں میں جہاں بدمزاج لوگ ہوتے ہیں وہاں کے بچے ڈر کے مارے سہمے سہمے رہتے ہیں، کوئی خوشی کی آواز نہیں سنائی دیتی اور ایسے انسانوں سے کوئی نہ محبت کرتا ہے، نہ دل سے ان کی عزت اور احترام کرتا ہے۔ غصہ محبت اور سکون کا قاتل ہے۔ ماں باپ کا غصہ تیز ہوگا تو بچے کبھی محبت نہیں کریں گے، فرماں بردار رہیں گے، ذمے داریاں نبھائیں گے مگر پاس بیٹھ کر گپ شپ نہیں کریں گے۔ اگر شوہر کا غصہ تیز ہے، شوہر بدمزاج ہے تو بیوی فرائض تو نبھائے گی، مگر اُس کے دل سے محبت رخصت ہوجائے گی۔ یا بیوی کا غصہ تیز ہو تو خواہ وہ لاکھ حسین ہو، میاں خائف ہی رہے گا۔ ایسی خواتین کے شوہر بے زار ہوجاتے ہیں، مرد گھر جانا پسند ہی نہیں کرتے، دوستوں میں زیادہ خوش رہتے ہیں۔

دوسری طرف غصے والے افراد تنہائی کا شکار ہوجاتے ہیں اور اس پر انھیں مزید غصہ آتا ہے کہ

ہمیں نظر انداز کیا جاتا ہے وہ یہ نہیں سوچتے کہ ہم میں کیا کمی یا عیب یا خرابی ہے جو لوگ قریب نہیں آنا چاہتے۔ غصہ اور بدزبانی لازم وملزوم ہیں۔ بدمزاج لوگ بدزبان بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا کوئی اُن کی عزت نہیں کرتا۔

بعض لوگوں کا غلط خیال:

جو بدمزاج لوگ افسران وغیرہ ہوتے ہیں وہ اپنے غصے کو بجا سمجھتے ہیں۔ کچھ اساتذہ بھی انتہائی بدمزاج ہوتے ہیں جب تک شاگردوں کی بے عزتی نہ کر دیں، اُن کو خوب ڈانٹ نہ لیں وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت تک اُن کے دل ودماغ پڑھنے کے لیے نہیں کھلیں گے۔ حالاں کہ غصے کی وجہ سے سامنے والوں کا ذہن ماؤف (lock up) ہو جاتا ہے۔ جو سمجھ آ رہا ہوتا ہے اور یاد ہوتا ہے وہ بھی بھول جاتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ یقین رکھتے ہیں کہ جب تک ڈانٹیں گے نہیں لوگ دھیان سے بات نہیں سنیں گے۔ اُن کا خیال ہے کہ لیڈر بننے کے لیے اور نظم وضبط (discipline) قائم کرنے کے لیے چیخنا چنگھاڑنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ اگر پیار سے بات کرو تو سر پر چڑھ جائیں گے۔ اسی لیے دبا کر رکھو، عام سی بات بھی تحکمانہ انداز میں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کر کے ہدایت دی کہ مسلمانوں کے ساتھ شفیق رہیں۔ آپ ﷺ حاکم تھے، آپ ﷺ سے بڑا حاکم اور کون ہوگا؟ آپ ﷺ کامیاب ترین لیڈر تھے۔ لیکن آپ ﷺ نے لوگوں کو قابو کرنے کے لیے کبھی غصہ کو استعمال نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ}(آل عمران: ۱۵۹)

''اللہ کی مہربانی سے آپ ﷺ ان کے لیے نرم مزاج ہیں۔ اگر آپ کہیں تُند خو ہوتے سخت دل ہوتے تو یہ سب آپ ﷺ کے اردگرد سے چھٹ چکے ہوتے۔''

یہ ارشاد الٰہی ہے کہ سخت دل اور تند خو کے پاس سے لوگ چھٹ جاتے ہیں۔ عزت، ڈانٹ ڈپٹ کر نہیں کمائی جاتی، محنت اور کوشش سے کمائی جاتی ہے۔

علاج:

عموماً غصہ والے لوگ مانتے ہی نہیں کہ اُن کا غصہ تیز ہے۔ اور اگر مان بھی لیں تو تاویل یہ کرتے ہیں کہ لوگ غصہ دلاتے ہیں ہمیں خود نہیں آتا۔ حالاں کہ یہ تو خود ایک کمزوری ہے کہ اپنا اختیار (control) دوسروں کے ہاتھوں میں دے دیا کہ جب جی چاہے وہ آپ کو غصہ دلا دیں۔ یوں تو ساری خودمختاری ہی ختم ہوگئی۔ دوسروں کے رحم وکرم پر آ گئے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے اعمال

کی ذمے داری اپنے سر لے کہ یہ میرا قصور ہے، میری بیماری وعیب ہے۔ چلیں کسی نے غصہ دلا بھی دیا تو اس پر قابو پانا تو اپنے اختیار میں ہے۔ جو بیماری لگ گئی اس کا علاج تو خود ہی کرنا ہے۔ یہ کہنا تو کافی نہیں ہے کہ فلاں نے غصہ دلا دیا، غصہ کی کوئی نہ کوئی وجہ تو ہوتی ہی ہے۔ پُرسکون حالات میں تو کوئی غصہ نہیں کرتا، بلا وجہ کوئی غصہ میں نہیں آتا، غصہ کسی وجہ سے آتا ہے تب ہی تو قابو کرنے کو کہا جارہا ہے۔ تو یہ ضرور یاد رکھیں کہ جو اللہ کی رضا چاہتا ہے اور اللہ کے غیض وغضب سے بچنا چاہتا ہے وہ اپنے اوپر قابو پائے۔ سورۃ آل عمران آیت ۱۶۲ میں فرمایا:

{اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ مَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ}

''کیا وہ جس نے اللہ کی رضا کی پیروی کی وہ اس طرح ہوسکتا ہے جو اللہ کے غصے کی زد میں آ گیا ہو اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بڑی بُری جگہ ہے ٹھہرنے کی۔''

تو انسان جب اللہ کے غصے کا خیال کر لیتا ہے تو اس کا اپنا غصہ ختم ہوجاتا ہے۔ جتنا ہمیں دوسروں پر اختیار ہے، اللہ کو اُس سے کہیں زیادہ ہم پر اختیار ہے۔ جن وجوہ کی بنا پر ہمیں دوسروں پر غصہ آتا ہے ان سے کئی زیادہ وجوہ پر اللہ کو ہم پر غصہ آسکتا ہے۔ سو اگر ہم اللہ کے غضب سے بچنا چاہتے ہیں تو ہم لوگوں کو اپنے غضب سے بچائیں۔

غصے کی وجہ سے مختلف عوارض:

جو لوگ غصے کے بہت تیز ہوتے ہیں۔ اُن کو کئی نفسیاتی اور جسمانی عارضے لاحق ہوجاتے ہیں۔ مثلاً فشارِ خون (blood pressure) اور جو لوگ زیادہ غصیلی طبیعت والے ہوتے ہیں۔ وہ (depression) کا بھی شکار ہوتے ہیں۔ تناؤ کی سی کیفیت سے دوچار رہتے ہیں۔ پریشانی اُن کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے، کرختگی آجاتی ہے، ماتھے پر سلوٹیں آجاتی ہیں۔ محسوس ہوتا ہے کہ بہت تلخ زندگی گزاری ہے۔ جس طرح جو لوگ بہت ہنستے اور مسکراتے رہتے ہیں اُن کے چہرے پر خوشی (laugh lines) کی علامات بن جاتی ہیں۔

ہنسنے میں کم پٹھے استعمال ہوتے ہیں اور غصہ میں زیادہ، کیوں کہ غصہ میں انسان تناؤ (tense) میں ہوتا ہے اور خوشی میں پُرسکون (relax) ہوتا ہے۔ غصہ کرنے والے کے چہرے پر سختی آجاتی ہے۔ نرمی (softness) ختم ہوجاتی ہے۔ آواز میں بھی کرختگی آجاتی ہے اور عمر زیادہ لگنے لگتی ہے۔ آپ ہنس مکھ، خوش مزاج اور شگفتہ مزاج لوگوں کو دیکھیں کہ اُن کے چہروں پر ایک تازگی اور

شگفتگی سی ہوتی ہے، اُن سے مل کر دل خوش ہوتا ہے۔ جب کہ غصہ کرنے والے مرجھائے سے، سکڑے ہوئے رہتے ہیں، چہرے پر سختی آ جاتی ہے۔ اُن کے اعصاب (nerves) بھی جلد جواب دے جاتے ہیں اور ساتھ روحانی بیماریاں گھیر لیتی ہیں کیوں کہ غصہ گناہوں کا سبب بن جاتا ہے۔

مزید اثرات و نقصانات:

دوسروں پر ظلم و زیادتی کرنے والے دوسروں کی بددُعاؤں کا ہدف بنتے ہیں۔ خود بھی پریشان رہتے ہیں اور دوسروں کو بھی اذیت دیتے ہیں۔ غصے کی وجہ سے حقوق العباد ادا نہیں کر پاتے، غیبت کرتے ہیں، طعنے دیتے ہیں، گالی گلوچ اور بُرا بھلا کہتے رہتے ہیں، بدزبانی، بدکلامی اور بدگمانی کا شکار رہتے ہیں۔ یہ سب غصے کا شاخسانہ ہے۔ اگر کوئی اپنی آواز، چہرے پر غضب اور حرکات و سکنات غصے کی حالت میں دیکھ لے تو یقین نہ کرے کہ یہ ہم ہی ہیں۔ سورۃ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

{اِنَّ اَنْكَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِيْرِ} (۱۹)

''سب سے بُری آواز گدھوں کی آواز ہوتی ہے۔''

غصے میں آواز بھی بہت بھیانک ہو جاتی ہے اور شکل بھی مکروہ ہو جاتی ہے۔ تو سوچیں کہ جن لوگوں کو ایسے لوگوں سے روز واسطہ پڑتا ہو جو ایسی آواز اور غصے والی شکل کے مالک ہوں تو اُن کی وہ کیسے عزت کرتے ہوں گے۔

غصے میں انسان اللہ کی حدود توڑ ڈالتا ہے۔ آپے سے باہر ہو جاتا ہے، عبادت اور ایمان کی حلاوت نہیں رہتی۔ نماز بھی لطف نہیں دیتی، شیطان انسان پر سوار ہو کر قابو پا لیتا ہے۔

غصے میں ایسے فیصلے کر بیٹھتا ہے، جو انتہائی نقصان دہ ثابت ہوتے ہیں۔ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارتا ہے۔ بیوی کو طلاق دے دی یا نوکری چھوڑ دی یا اپنوں سے تعلق توڑ بیٹھے۔ اور پھر بعد میں پچھتاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں نا کہ ''کمان سے نکلا ہوا تیر واپس آ جائے گا، زبان سے نکلا ہوا لفظ واپس نہیں آ سکتا۔'' بخاری کی ایک طویل حدیث مبارکہ کا آخری حصہ یہ ہے:

''اللہ کے نزدیک قیامت کے دن درجے کے لحاظ سے بدترین شخص وہ ہوگا جس کی بدکلامی اور بدزبانی کے ڈر سے لوگ اس کو چھوڑ دیں۔''

غصے کے متعلق راہ عمل:

سب سے پہلے خود کو یقین دلائیں کہ میں غصہ کرتا ہوں اور بعض اوقات بلا جواز بھی کر بیٹھتا ہوں۔ پھر گھر والوں سے فرداً فرداً پوچھیں کہ تم بتاؤ میرا مزاج کیسا ہے؟ میرا غصہ تیز ہے؟ یہ ضرور پوچھیں اور ایک آدھ سے نہیں سب سے پوچھیں۔ نوکروں سے، بچوں سے، والدین سے، شوہر سے،

بہن بھائیوں سے، ساتھ کام کرنے والوں سے ضرور پوچھیں۔ ہوسکتا ہے کہ ہمیں احساس نہ ہو کہ ہمارا غصہ واقعی تیز ہے اور دوسروں کے لیے تکلیف دہ ہے۔

اُس کے بعد یہ جاننے کی کوشش کریں کہ کن باتوں پر غصہ آتا ہے۔ مثال کے طور پر تیار ہو کر کہیں جانے کے لیے نکلے، باہر پہنچے تو پتا چلا گاڑی کوئی اور لے گیا تو غصہ آتا ہے۔ یا گھر پہنچے تو کھانا تیار نہیں، یا بچوں کے نمبر اچھے نہیں آئے یا بچے نماز نہیں پڑھتے۔ ایسے چند موقعوں پر ضرور غصہ آتا ہے۔ ان کو لکھ لیں اور ان پر کام شروع کر دیں۔ تصور کی قوت کو کام میں لائیں۔ اُن تمام صورت حال کو ذہن میں لائیں جن میں غصہ آتا ہے اور پھر تصور کریں کہ کس طرح میں نے اپنے غصے پر قابو پایا یا میں خاموش رہا۔ اب آپ نے اُس کی اتنی مشق کر لی ہوگی کہ آپ ذہنی طور پر مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں گے اور یک دم آپے سے باہر نہیں ہوں گے۔ تو جب غصہ آئے تو بندہ خاموش ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ فَلْيَسْكُتْ)) (۱)

''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے تو وہ خاموش ہو جائے۔''

یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے 3 دفعہ دہرائی۔ مسند احمد میں یہ حدیث مبارکہ موجود ہے۔

خاموش غصہ:

غصہ کے اظہار کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ چیخ چلا کر اور چیزیں پٹخ کے، دروازے زور سے بند کر کے، چیزیں توڑ کر، برتن پھینک کر، غصے کا اظہار کرتے ہیں۔ اور کچھ لوگ غصے کا اظہار ہی خاموش رہ کر کرتے ہیں۔ احتجاجی خاموشی (they protest in silence) اختیار کر لیتے ہیں، ہرگز کسی صورت نہیں بولتے۔ یہ اُن کی ناراضی اور غصے کا اظہار ہوتا ہے، یہ بھی مناسب نہیں۔ سو غصے کو ضبط کرنے کے لیے خاموشی اختیار کرنا دوسری چیز ہے اور خاموش غصہ مختلف چیز ہے۔ اب فرض کریں خاوند سے کسی بات پر جھگڑا ہو گیا اور بیوی خاموش رہ کر اپنے غصے کا اظہار کر رہی ہے۔ شوہر لاکھ ناراضی کی وجہ پوچھے لیکن بیوی بالکل خاموش رہے تو یہ بھی غصہ ہی کا اظہار ہے۔ بخاری میں روایت ہے حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

((لَمْ يَكُنِ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَبَّابًا وَلَا فَحَّاشًا وَلَا لَعَّانًا كَانَ يَقُولُ

(۱) مسند أحمد، مسند بني هاشم، بداية مسند عبد الله بن العباس

لِأَحَدِنَا عِنْدَ الْمَعْتَبَةِ مَالَهُ تَرِبَ جَبِينُهُ)) (۱)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ فحش باتیں کرتے تھے، نہ لعنت کرتے تھے، نہ گالیاں دیتے تھے، جب ان کو غصہ آتا تھا تو کہتے تھے اُس انسان کو کیا ہو گیا ہے۔ اُس کی پیشانی خاک آلود ہو۔

غصہ کیسے ختم کیا جائے:

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے فرمایا:

((إِذَا غَضِبَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ قَائِمٌ فَلْيَجْلِسْ)) (۲)

''اگر تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو وہ بیٹھ جائے۔''

دیکھیے غصے کی کیفیت انسان کو اُبھارتی ہے۔ غصے میں انسان اُٹھنا چاہتا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا الٹ بتایا یعنی اگر غصہ آئے، کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اگر غصہ چلا گیا تو ٹھیک، ورنہ لیٹ جائے۔ اپنے آپ کو جھکائے اور ہیئت بدل لے یا جگہ بدلنے سے بھی غصہ ٹھنڈا ہوتا ہے۔ شدید غصہ آ رہا ہو تو اُس جگہ سے ہٹ جائیں، دُور ہو جائیں۔ دوسرے کمرے میں چلے جائیں، کمرے میں ہیں تو باہر صحن میں نکل آئیں یا پھر زور زور سے قرآن کی آیات تلاوت کریں یا تلاوت لگا کر سنیں یا کلمہ پڑھنا شروع کر دیں، اللہ سے دُعا کریں، تعوذ پڑھیں، شیطان سے پناہ مانگیں۔ ابو داؤد میں حدیث مبارکہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّيْطَانِ وَإِنَّ الشَّيْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ)) (۳)

''غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے اور شیطان آگ سے بنایا گیا۔''

اسی لیے انسان غصہ میں آگ بگولا ہو جاتا ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے۔ لہٰذا جب کبھی تم میں سے کسی کو غصہ آئے، اُس کو چاہیے وہ وضو کر لے، اپنے آپ کو ٹھنڈا کر لے۔ یہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ اپنے غصہ پر خود کوئی کفارہ مقرر کر لے کہ جب میں غصہ کروں گا میں سو روپے صدقہ کروں گا اور اتنا کفارہ رکھیں جس کے ادا کرنے سے جیب پر اور غصہ پر اثر پڑے۔ اگر کوئی کروڑ پتی ہے تو اُس کے لیے پانچ سو روپے تو پانچ روپے کے برابر ہوں گے۔ اس لیے اتنی رقم رکھیں کہ بار بار دینا تھوڑا سا کھلے۔ اپنی حیثیت کے مطابق مقرر کریں اور جب غصہ آئے تو نکالا کریں یا اپنے لیے کوئی

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب لم یکن النبی فاحشا۔۔۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب مایقال عند الغضب

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب مایقال عند الغضب

جرمانہ مقرر کرلیں، یہ ان شاء اللہ اثر کرے گا۔

اور غذا میں وہ چیزیں استعمال کریں، جن کا قرآن میں ذکر آتا ہے، غذا کا بھی مزاج پر اثر پڑتا ہے اور سنت کے حساب سے کھائیں۔ بہت زیادہ کھانا بھی مزاج میں فساد پیدا کرتا ہے۔ سب سے بڑا علاج اور دوا اللہ سے دُعا ہے کہ ''اے اللہ! میرا غصہ تھم جائے اور میرے قابو میں آجائے۔'' اس کے لیے کوئی وظیفہ نہیں ہے، اس کے لیے کوشش اور مشق چاہیے اور دُعا ساتھ ساتھ۔ اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ یہ بھی حدیث مبارکہ سے ثابت ہے۔ پڑھا کریں۔ اس کی مسلسل مشق کرنی چاہیے دنیا و آخرت کے نقصانات اور خسارہ سامنے رکھیں۔ ان پر غور کریں۔ پھر ان شاء اللہ العزیز اللہ مدد فرمائے گا۔

سب سے اچھے تو وہ لوگ ہیں جن کو دیر سے غصہ آئے اور جلدی ٹھنڈا ہوجایا کرے۔ (Once In a blue moon) کبھی کبھار آئے، اور جلد ختم ہوجائے۔ دوسرے نمبر پر وہ ہیں جن کو دیر سے آئے اور دیر سے جائے۔ پھر وہ جن کو جلدی آئے اور جلدی جائے۔ یہ آخری دو قسم کے لوگ پسندیدہ نہیں۔ لوگ ان کے ہاتھوں خاصے پریشان رہتے ہیں، غصہ والوں کے ساتھ انسان بے یقین (uncertain) رہتا ہے، کچھ نہیں پتا کب مزاج بگڑ جائے۔ سب سے بُرے وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو جلدی غصہ آئے اور دیر تک رہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اِذَا غَضِبَ لَمْ یُخْرِجْهُ غَضَبُهُ عَنِ الْحَقِّ، وَاِذَا رَضِیَ لَمْ یُخْرِجْهُ رِضَاهُ اِلَی الْبَاطِلِ، وَاِذَا قَدَرَ لَمْ یَتَنَاوَلْ مَا لَیْسَ لَهُ)) (۱)

''(3 چیزیں مومن کے اخلاق میں سے ہیں) ایک تو یہ کہ غصہ آئے مگر غصہ اس کو باطل کی طرف نہ لے جائے، دوسرے خوش ہو تو خوشی میں حق کے دائرے سے نہ نکلے (یعنی خوشی سے دیوانہ نہ ہوجائے)، تیسرے یہ کہ طاقت ور ہو تو وہ چیز لینے کی کوشش نہ کرے جو اُس کی نہیں۔''

غصہ پر قابو پانے کے فائدے:

اب اس بحث کو سمیٹتے ہیں کہ غصے پر قابو پانے کے کیا کیا فائدے ہیں۔ جو لوگ غصہ پر قابو پانے میں کامیاب ہوجائیں وہ بامراد ہوجائیں گے، لوگ ان سے محبت کرنے لگیں گے اور عزت بھی کریں گے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کا مفہوم ہے ''مومن تو محبت والفت کا مرکز ہوتا ہے، لوگ اس کو چاہتے

(۱) شعب الایمان للبیھقی، کتاب حسن الخلق، فصل فی ترک الغضب۔۔۔

ہیں، اور اُس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے الفت نہیں کرتا اور دوسرے اُس سے الفت نہیں کرتے۔'' جب کوئی غصہ کرتا ہے تو لوگ اس سے الفت نہیں کرتے بلکہ دور رہنا ہی ٹھیک سمجھتے ہیں۔

ہم نے عرض کیا تھا کہ کچھ لوگ چھوٹوں پر غصہ نکال لیتے ہیں، بُرا بھلا کہہ دیتے ہیں اور بڑوں کی پیٹھ پیچھے بُرائیاں کرتے ہیں، غیبت کرتے ہیں۔ جو غصے کا اظہار سامنے نہ کر سکے وہ اپنا غصہ غیبت کی شکل میں نکالتا ہے۔ اس طرح یہ غصہ اور کتنی ہی بیماریوں کا اور خرابیوں کا سبب بنتا ہے، جو غصہ نہیں کرے گا وہ دوزخ کی آگ سے بچ جائے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''میں اب تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جو جہنم کے لیے حرام ہے اور جہنم کی آگ اس پر حرام ہے۔ ہر ایسے شخص پر جہنم کی آگ حرام ہے جو مزاج کا تیز نہ ہو، نرم ہو، لوگوں سے قریب ہو، نرم خو ہو۔''

اور غصے کے ساتھ یہ سب ناممکن ہے۔ غصے پر قابو پا کر یہ سب ممکن ہو سکتا ہے۔ تو بار بار اپنے آپ کو یاد دلائیں کہ غصے کو قابو کر کے ہم کتنے فائدے حاصل کر سکتے ہیں۔

دوسرے کے غصے کے متعلق کیا کیا جائے:

اب اگر دوسرے کے غصے کا کوئی علاج کرنا چاہتا ہے تو کیا کرے؟ سب سے پہلے تو ذہنی طور پر اُس شخص سے جس کو غصہ آ رہا ہے، اپنے آپ کو علیحدہ (detach) کر لیں، یہ ضروری ہے، ذہنی طور پر اپنے آپ کو الگ کر لیں۔ ایسے ظاہر (pretend) کریں جیسے وہ کسی اور سے مخاطب ہے تاکہ آپ کو نقصان نہ پہنچے، آپ کی شخصیت مسخ نہ ہو، وہ آپ کو تختۂ مشق (punching bag) بنانا چاہتا ہے۔ آپ یہ بننے سے صاف انکار کر دیں۔ تصور کر لیں وہ کسی اور سے بات کر رہا ہے۔ آپ کہیں اور ہیں، دور سے اُسے دیکھ رہے ہیں۔ اس طرح غصہ برداشت بھی کر جائیں گے اور آپ کو نقصان بھی نہیں ہوگا۔ تو برداشت کر لینا بہترین چیز ہے، اس پر بڑا اجر ہے، بہت بڑی بات ہے کہ کوئی صبر کا اور عفو کا مظاہرہ کرے۔

قرآن میں آتا ہے:

{وَ لَمَنْ صَبَرَ وَ غَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ} (الشوریٰ:۴۳)

''جو صبر کرے، اور معاف کرے، یہ تو بڑے عظیم کاموں میں سے ہے۔''

غصے کا جواب کبھی غصے سے مت دیں۔ آگ کو آگ سے نہیں بجھایا جاتا۔ پانی سے بجھایا جاتا ہے۔ حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنی کتاب میں کہا ہے اگر بچے بہت چیخ رہے ہیں یا کوئی

بڑا غصے میں چیخ رہا ہو اور آپ اس کا جواب نہایت آہستگی سے دیں تو اُس کی چیخ پکار بھی کم ہوگی۔ وہ اپنے آپ پر قابو پانے میں کامیاب ہوجائے گا، یہ فوری علاج ہے اس کے بعد وجہ تلاش کریں کہ کس وجہ سے غصہ آتا ہے۔

بعض لوگوں کا غصے کا بھی ایک متوقع انداز (predictable pattern) ہوتا ہے۔ آپ بتا سکتے ہیں کس بات پر غصہ آتا ہے۔ بچوں کو پتا ہوتا ہے کہ نمبر اچھے نہیں آئیں گے تو ماں کو غصہ آئے گا۔ کپڑے پھٹ گئے یا بہت گندے کر دیے تو غصہ آئے گا۔ کچھ بیویوں کو پتا ہوتا ہے شوہر گھر آئیں اور میں گھر پر نہ ہوں تو شوہر کو غصہ آجاتا ہے۔ ساتھ رہتے رہتے ہمیں ان باتوں کی کافی پہچان ہوجاتی ہے۔ سو وجہ تلاش کرلیں اور اس کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کریں۔ وہ صورت حال پیدا ہی نہ ہو، یہ ہے خیر خواہی۔

جیسے بعض لوگوں کو کچھ غذاؤں سے الرجی (allergy) ہوتی ہے تو ان غذاؤں سے پرہیز کرنا ہی مناسب ہوتا ہے ورنہ بار بار الرجی (allergy) ہوتی رہے گی۔ اسی طرح بعض حالات بھی غصے کا سبب بنتے ہیں۔ اسی لیے حدیث مبارکہ میں ہم یہ بات پڑھتے ہیں کہ بیوی ایسے لوگوں کو گھر میں نہ بلائے جو شوہر کو پسند نہیں۔ اس سے کیا ہوگا؟ شوہر غصہ کرے گا، خفا ہوگا۔ تو مزاج، طبیعت، پسند نا پسند کا ضرور خیال رکھیں۔

بعض لوگوں کو سیاست پر بہت غصہ آتا ہے۔ تو سیاست پر گفتگو چھوڑ دیں۔ سیاست پر بات مت کریں۔

غصے کا ایک مثبت پہلو:

بعض اوقات غصہ میں آکر انسان کوئی حل تلاش کرلیتا ہے، بعض دفعہ اچانک ایسی توانائی (energy) آتی ہے کہ وہ فیصلہ کرلیتا ہے کہ اب اس کو ٹھیک کر کے چھوڑوں گا۔ انسان کی قوت ارادی مضبوط ہوتی ہے غصے کو صحیح جگہ استعمال کیا جائے تو بہت فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً کوئی چیز آپ کو روزانہ کوفت دلاتی ہے جیسے ایک لکڑی کا تختہ ہے جس سے راستے میں آتے جاتے، ٹھوکر لگ جاتی ہے اور آپ کو ایک دن غصہ آجائے اور آپ فیصلہ کرلیں کہ آج تو اس کا حل نکال کر رہوں گا اور اس کو راستے سے ہٹا دیں۔ بہتری کی طرف چل پڑیں۔

اور بچوں سے تو کبھی مت کہیں کہ نیند آرہی ہے، اس لیے غصہ کر رہے ہیں۔ بھوک لگ رہی ہے اس لیے غصہ کر رہے ہیں۔ جہاں ہم بچوں کی جسمانی ضروریات پوری کرتے ہیں بچوں

کوسکھاتے ہیں اپنا خیال کیسے رکھیں، ہاتھ کیسے دھوئیں، گندگی سے کیسے بچیں، چیزیں اپنی جگہ پر کیسے ترتیب سے رکھیں۔ بالکل اسی طرح یہ جو جذبات ہیں، اُن کو بھی حد میں رکھنے کی مشق کریں۔ یہ والدین کی ذمے داری ہے۔ صبر سکھائیں، وقت کا پابند بنائیں، کھانا وقت پر ملے گا۔ دودھ وقت پر ملے گا، کھیلنے کا وقت ہے، پڑھنے کا الگ وقت ہے، اور پھر سونے کا وقت ہے، اور یہ کہ اپنے منفی جذبات کو کیسے سنبھالیں گے اور مثبت جذبات کو کیسے سنبھالیں گے۔ اپنے جذبات (emotions) کا اظہار کیسے کریں گے۔ غصے پر قابو کیسے پانا ہے، یہ بھی بچوں کو سکھانا ہے اور ساتھ ساتھ حلم اور بردباری کی دُعا کیجیے، اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے بھی، انسان اپنے مزاج کے خلاف بات آسانی سے برداشت کرلے۔ تنقید کو سن سکے اور لوگ اُس سے ملنا جلنا پسند کریں۔

غصے کے وقت درست حکمت عملی:

جدید علم نفسیات (modern psychology) میں کہتے ہیں جو دل میں ہے اس کو باہر نکالو، ہلکے ہوجاؤ، بھڑاس نکالو، غصہ آئے تو اظہار کرو۔ تجربے نے الٹا ثابت کیا ہے، اگر کسی بات پر غصہ آیا اور اس کا بار بار ذکر نہ ہو، تو وقت کے ساتھ ساتھ اس پر نسیان کے، بھول کے پردے پڑ جاتے ہیں۔ وہ واقعہ مدھم ہوجاتا ہے، وہ معاملہ بھی چھوٹا لگنے لگتا ہے اور وہ جذبہ بھی مدھم پڑ جاتا ہے۔ دوسروں سے اگر بار بار اس کا تذکرہ کریں گے تو وہ زخم تازہ رہے گا۔ مندمل نہ ہونے پائے گا، اور وہ جذبات بھی تازہ رہیں گے۔ کسی بھی گزرے ہوئے تکلیف دہ واقعے کا ذکر کرکے دیکھ لیں، از سر نو پورا واقعہ زندہ اور تازہ ہوجائے گا۔ وہی تکلیف محسوس ہوتی ہے، رونا بھی دوبارہ آجائے گا، منہ سرخ ہوجائے گا، دل کی دھڑکن تیز ہوجائے گی۔ یہ اپنے آپ کو اذیت دینے والی بات ہے۔ اللہ نے ہم سے فرمایا ہے غصے کو پی جایا کرو، درگزر کردیا کرو، معاف کردو، بھول جاؤ۔ ضبط کرنے والے بنیں اور کوئی مصروفیت تلاش کریں۔ جب بھی غصہ آئے زبان کی بجائے ہاتھوں کو کسی کام میں مصروف کرلیں۔ کتب خانہ صاف کرلیں یا الماری صاف کرلیں، اپنے آپ کو مصروف کرلیں، جو توانائی آپ کے اندر غصہ کی وجہ سے آئی ہے اس کو مثبت کام میں صرف کرلیں اور آپ غور کریں گے کہ الماریاں صاف کرنا بڑا باعث سکون کام ہے، تھوڑی دیر میں سکون کا احساس ہوگا اس سے بھی فائدہ ہوگا۔

حلم اور بردباری کا ایک واقعہ:

حلم اور بردباری کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ آتا ہے جو انبیاء علیہم السلام کے نقش قدم پر چلتے ہیں، جو خود اوّاب ہوتے ہیں ان کو دیکھیں وہ کیسے غصے کو قابو میں رکھتے تھے، اور یہ صفت

کیسے پاکیزہ، متقی لوگوں میں پیدا ہوجاتی ہے، کیسا ضبط (self control) اُن میں آجاتا ہے اس واقعے سے وہ پتہ چلے گا:

''ایک روز ظہر کی نماز کے بعد گھر تشریف لے گئے اوپر کی منزل پر آپ کی رہائش تھی۔ جاکر آرام کرنے کے لیے بستر پر لیٹے ہی تھے کہ نیچے دروازے پر دستک ہوئی۔ اندازہ کیجیے، جو رات بھر جاگا ہو، عبادت کی ہو، سارا دن مصروف رہا ہو۔ اُس کی کیا کیفیت ہوگی عین آرام کے وقت کوئی ملنے آیا۔ لیکن امام صاحب اُٹھے، زینے سے نیچے اُترے، دروازہ کھولا، ایک صاحب کھڑے تھے۔ امام صاحب نے پوچھا کیسے آنا ہوا، اُس نے کہا ایک مسئلہ معلوم کرنے آیا تھا، جب امام صاحب مسائل حل کرنے بیٹھے تھے وہاں تو مسئلہ پوچھا نہیں اور اب بے وقت پریشان کرنے آگیا۔ لیکن امام صاحب نے اس کو کچھ نہیں کہا، بلکہ فرمایا، اچھا بھائی کیا مسئلہ ہے؟ اس نے کہا جب میں آرہا تھا تو مجھے یاد تھا مگر اب بھول گیا ہوں۔ یاد نہیں رہا، کیا مسئلہ پوچھنا تھا۔ امام صاحب نے فرمایا ''اچھا جب یاد آجائے تو پوچھ لینا۔'' یہاں حلم دیکھیں۔ آپ نے اس کو بُرا بھلا نہ کہا اور نہ ڈانٹا۔ خاموشی سے واپس جاکر بستر پر لیٹے کہ اتنے میں پھر دستک ہوئی۔ پھر نیچے آئے دروازہ کھولا۔ وہی شخص کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا کیا بات ہے، اُس نے کہا حضرت وہ مسئلہ یاد آگیا تھا۔ آپ نے کہا پوچھ لو۔ اُس نے کہا ابھی تک یاد تھا مگر جب آپ آدھی سیڑھیوں تک آئے تو پھر بھول گیا۔ اب اگر ایک عام آدمی ہوتا تو اس کے غصے کا کیا عالم ہوتا۔ سوچیں! لیکن یہ لکھتے ہیں کہ امام صاحب اپنا نفس مٹا چکے تھے۔ امام صاحب نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا، اچھا بھائی جب یاد آجائے تو پوچھ لینا یہ کہہ کر واپس جاکر بستر پر لیٹ گئے۔ دوبارہ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ آپ پھر نیچے آئے، دروازہ کھولا وہی شخص کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا کیوں؟ کیا بات ہے؟ اُس نے کہا حضرت، وہ مسئلہ یاد آگیا کہ انسان کی نجاست (Excretion) کا ذائقہ کڑوا ہوتا ہے یا میٹھا۔ کوئی بھی اور آدمی ہوتا اور بڑا ضبط کرتا تو اس سوال کے بعد تو اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو ہی جاتا، لیکن ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ایسے ہی تو امام نہیں بن گئے تھے۔ اتنا بڑا جو اللہ نے مقام عطا کیا، مرتبہ دیا، یوں ہی تو نہیں دے دیا۔ تھڑدِلے مزاج کے ساتھ تو امام کا رتبہ نہیں ملتا۔ امام صاحب نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔ اگر آدمی کی نجاست تازہ ہو تو اس میں مٹھاس ہوتی ہے اور جب خشک ہوجائے تو وہ کڑوا ہوجاتا ہے۔ اس شخص نے پوچھا آپ نے چکھا ہے کبھی؟ امام صاحب نے فرمایا (اور واقعی اس وقت دل سے نکل رہا ہے رحمۃ اللہ علیہ) ہر چیز کا علم چکھ کر حاصل نہیں ہوتا بلکہ بعض چیزوں کا علم عقل سے حاصل ہوتا ہے اور عقل سے یہ معلوم ہوتا

ہے کہ تازہ نجاست پر مکھیاں بیٹھتی ہیں اور سوکھی پر نہیں بیٹھتیں۔ جب امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے یہ جواب دے دیا اس شخص نے کہا امام صاحب میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں مجھے معاف کر دیجیے۔ میں نے آپ کو بہت ستایا۔ آج آپ نے مجھ کو ہرا دیا۔''

یہ ہے غصہ پر قابو پانا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دُعا کرتے تھے: ''اے اللہ! مجھ کو علم دے کر غنیٰ عطا کر دے اور حلم کی زینت عطا فرما دے۔

یہ guide Lines ہیں تھوڑی سی رہنمائی ہے کہ کن کن موقعوں پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ایک تو دُعا کیا کریں! مسنون دُعا ہے۔ ''اے اللہ! تجھ سے حق بات کا سوال کرتے ہیں، چاہے غصے میں ہوں چاہے ہم راضی ہوں۔'' تو اگر انسان مناسب بات کرتا ہے تو بھی غصہ قابو میں آجاتا ہے۔ بڑا فرق پڑتا ہے۔

غصے کا مناسب اور اصلاحی اظہار:

اب غصے کے عمومی مواقع دیکھیں۔ مثلاً اگر بچے نماز نہیں پڑھتے۔ اس موقع پر غصے کا غلط اظہار کیا ہے؟ چیخنا چلانا، ان کو باتیں سنانا، تم تو منافق ہو، تم تو جہنم میں جاؤ گے یا یہ کہنا کہ تم تو کبھی نماز نہیں پڑھ سکو گے، تم کبھی ٹھیک نہیں ہو گے، تم کبھی نماز نہیں پڑھو گے۔ زندگی بھر بے نمازی رہو گے وغیرہ۔ ایسی باتیں بچوں کو سنانا، یہ سب کرنے کی ضرورت نہیں۔ غصہ ضرور آتا ہے جب بچے نماز نہ پڑھیں۔ یا قاری صاحب آئیں تو قرآن پڑھنے میں دیر لگاتے ہیں، اس وقت اور کام یاد آجاتے ہیں۔

پہلے یہ دیکھیں غصہ کیوں آرہا ہے۔ میری نافرمانی پر، یا اللہ کی نافرمانی پر۔ اس کو الگ کر لیں۔ اگر اللہ کی نافرمانی پر غصہ آرہا ہے تو غصے کا اظہار اس طرح کریں کہ ان کی اصلاح ہو جائے۔ اُن کو پیار سے سمجھا کر، حدیثیں سنا کر، آخرت کے انعامات، تحفے، جنت کے باغوں کا وعدہ یاد دلا کر، اُن کو متوجہ کیا جائے۔ اُن کے لیے عمل آسان کرنے کی کوئی ترکیب سوچ لیں اور افہام وتفہیم کے طور پر مل جل کر اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ پہلے پتا کریں کہ نماز کیوں نہیں پڑھ رہا؟۔ کیا اُس کو یقین نہیں کہ نماز ضروری ہے۔ فرض ہے نماز پڑھنا! یا نماز یاد نہیں، وضو کرنا مشکل لگتا ہے؟ اصل وجہ کیا ہے؟۔ رات کو دیر سے سوتا ہے، اس لیے فجر کو نہیں اُٹھ سکتا تو اس مسئلے کو حل کرنے کی کوشش کریں۔ تبلیغ بھی اللہ کے لیے اور نماز بھی اللہ ہی کے لیے ہے۔ مل کر، بیٹھ کر بات کریں تو پھر کوئی حل نکل آئے گا۔ غصے سے بچے بددل ہو جاتے ہیں۔

اب ایک حساس معاملہ دیکھیں! آپ ﷺ کے کارٹون دیکھ کر غصے کا غلط استعمال۔ عام عوام توڑ پھوڑ، جلاؤ، گھیراؤ، اپنی قوم ہی کے املاک کو خاکستر کر ڈالتے ہیں، رکشے جلا دینا، بسوں کو آگ لگا دینا، دکانیں لوٹ لینا، یہ سب کس کا نقصان ہے؟ یہ سب تو رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے بالکل برعکس اور خلاف ہے۔ غصے کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے؟ انسان کے اندر تلاش کا داعیہ پیدا ہوجائے، قوتِ ارادی مضبوط ہوجائے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ کے کارٹون بنا رہے ہیں، ہم اپنے عمل سے آپ ﷺ کی ایک ایک تعلیم، ایک ایک سنت کو زندہ کریں گے۔

کہیں ٹریفک جام میں پھنس گئے، تو ہمارا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ منہ ہی منہ میں بڑبڑانا، زور زور سے ہارن بجانا، گالیاں دینا، گھور گھور کے ساتھ والوں کو دیکھنا، ہر ایک کو اپنا دشمن سمجھنے لگنا کہ اُنہی کا قصور ہے۔ اتنا غصہ آتا ہے کہ بڑی دیر میں جا کر ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اگر آپ کو مصروف اوقات میں نکلنا ہی ہے تو پھر کوئی اچھی سی تلاوت، کوئی درس (lecture) یا کوئی پڑھنے کے لیے رسالہ، کتاب وغیرہ گاڑی میں رکھ لیں۔ جو اس وقت کا بہترین مصرف ہو۔

بعض دفعہ بچے اسکول کی کتابیں لے جانا بھول جاتے ہیں یا سکول میں ٹفن (tiffin box) یا پانی کی بوتل (water bottle) یا ڈائری وغیرہ بھول آتے ہیں تو اس پر بہت شور نہ مچائیں، زیادہ مت ڈانٹیں۔ ذمے داری کا احساس دلائیں، سنجیدگی سے کوئی حل تلاش کریں، یہ دوسری انتہا (extreme) ہے۔ یعنی غصہ کا اظہار ایسے کرنا کہ صورت حال درست ہوجائے اور بچے پھر وہ غلطی نہ دہرائیں، اصلاح کے لیے غصہ کرنا چاہیے۔

غصہ کسی مسئلے کا حل نہیں:

ہماری غلط فہمی یہ ہے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ غصہ ہر مسئلے کا بذات خود حل ہے۔ کام والے نے بغیر اطلاع چھٹی کر لی تو غصہ سے اُبلنے لگیں۔ آنے دو کل، میں اس کو سمجھ لوں گا، اپنی مرضی چلانے لگا ہے، جب دل چاہا چھٹی کر لی یا دکان سے نکلے، ڈرائیور نظر نہ آیا تو فوراً دل میں سوچ لیا، کہ کہیں بیٹھا گپ شپ لگا رہا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب منفی غصے کی علامات ہیں۔

میاں کو شوگر ہے، ٹیسٹ (test) کروایا، شوگر زیادہ تھی۔ بیوی نے شور مچانا شروع کر دیا کہ ہر میٹھی چیز کھانے لگتے ہیں منع کر کر کے تھک گئی، مانتے ہی نہیں، پڑھے لکھے ہیں کم از کم اپنا خیال تو رکھا کریں۔ ہر وقت مرغن کھانے چاہییں، کوئی ورزش (exercise) نہیں کرتے اور پھر خود

رونے بیٹھ گئیں۔اب وہ بے چارا،جس کی پہلے شوگر ہائی تھی اس کا بلڈ پریشر بھی بڑھا دیا، پھر شوہر کہہ دے گا، آئندہ تمہیں رپورٹ (report) نہیں دکھاؤں گا۔

بچوں کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوتا ہے۔ماں باپ سے اپنے مسائل ان کے غصہ کے ڈر سے (share) نہیں کرتے ،اس حجاب کو ختم کرنے کی ضرورت ہے۔ذرا بیٹھ کر سوچیں، اگلے سے ہمدردی کریں، حوصلہ دلائیں، غصے کو دبائیں۔بیمار کی بد پرہیزی کرنا بُرا تو لگتا ہے مگر غصے سے پھٹ پڑنا جائز نہیں، یہ حل نہیں ہے۔

مزاح سے غصہ میں نہیں آنا چاہیے:

غصے کو دُور کرنے کا ایک طریقہ مزاح بھی ہوتا ہے۔تھوڑا سا مزاح کرلیں، یا کوئی ایسی بات کردی جائے جس سے دوسرے کو ہنسی آجائے۔بعض لوگ مزاح برداشت نہیں کرسکتے۔اگر اُن سے کوئی مزاح کیا جائے تو فوراً غصے میں آجاتے ہیں۔بھائی بہنوں میں یہ بہت ہوتا ہے، ایک دم غصہ آجاتا ہے رونا دھونا شروع ہوجاتا ہے۔آپس میں بات چیت بند ہوجاتی ہے، ان رشتوں میں تھوڑا بہت مزاح ضروری ہے۔خود بھی مزاح کو برداشت کریں اور دوسروں سے مزاح کرتے ہوئے حدود کا خیال رکھیں۔اپنے اوپر بھی ہنسنا سیکھیں۔بعض دفعہ شوہر بھی چھیڑ چھاڑ کرلیتے ہیں، مزاح کرلیتے ہیں۔یا ماں باپ کوئی بچپن کی حماقت یاد دلا دیتے ہیں، ایسے موقعوں پر غصے میں نہیں آنا چاہیے۔

خواتین تھکن وغیرہ کی وجہ سے بدمزاج نہ ہوں:

غصہ کرنا ایک طرح کا روّیہ بن جاتا ہے۔تھکن کو تو زیادہ ہی جواز بنایا جاتا ہے۔خواتین رات کو ٹھیک سے نہ سو پائیں تو دوسرے دن بات بات پر یہ یاد دلاتی ہیں کہ نہ دن کو چین ہے نہ رات کو آرام ہے۔نہ بچوں کا کام صحیح سے کرتی ہیں، نہ شوہر کے کام وقت پر کرتی ہیں۔اور جواز یہ ہے چوں کہ ہم رات کو ٹھیک سے سو نہیں پائے ،اب ہم جتنا چاہیں غصہ کریں۔اگر کبھی ایسی صورت حال ہو تو آپ آرام سے کہہ دیں کہ میں رات کو ٹھیک سے سوئی نہیں، اس لیے تھکن ہو رہی ہے۔ذرا آرام کرلوں پھر سب کردیتی ہوں۔لیکن پاؤں پٹخ کر، اور بڑبڑا کر، منہ پھلا کر کام نہ کریں۔چیخنا چلانا سب کو باتیں سنانا بھی ٹھیک نہیں۔اور جہاں تک بچوں کے ساتھ جاگنے کا معاملہ ہے، اس بے آرامی

اور تھکن کو کوئی بھی محسوس نہیں کرسکتا۔ نہ کسی کو محسوس کروانے کی کوشش کریں، یہ مشقت صرف ماں کرسکتی ہے اور وہی جانتی ہے امور خانہ داری بھی انجام دینے پڑتے ہیں۔ بچوں کی دیکھ بھال، شوہر کی ذمہ داریاں تو عورت کی تو دن رات کی (duty) ہے، تھکن تو ہونی ہے، مگر اس کی وجہ سے بدمزاج نہ ہوں۔ اپنا خیال خود رکھیں۔

خواتین کے لیے خصوصی نصیحت:

دیورانی یا ساس سے ان بن ہوگئی۔ اب بڑوں پر تو غصہ نکال نہیں سکتیں، ان کی پیٹھ پیچھے غیبت کرنے لگتی ہیں۔ نوکروں کے سامنے ساس اور جٹھانی کی غیبتیں کرتی ہیں۔ نوکر بھی ہاں میں ہاں ملاتے ہیں۔ لیکن آپ کی غیر حاضری میں یہی نوکر لگائی بجھائی کرتے ہیں اور معاملات مزید خراب ہوجاتے ہیں۔ بعض دفعہ دیورانی جٹھانی دونوں ساس کی چوں کہ (common victims) ہوتی ہیں تو اکثر یہ دونوں بیٹھ کر ساس کی غیبت کرتی رہتی ہیں اور پھر یہی باتیں ان دونوں میں سے کسی ایک کے منہ سے ساس تک پہنچ جاتی ہیں۔ ایسی حرکت کرنا خاندان کے اتحاد کے سخت خلاف ہے۔ آپس میں ساس کی، یا نندوں کی یا اپنی بھابھیوں کی بُرائیاں اور غیبت کسی بھی غیر فرد کے ساتھ نہ کریں۔ ایک تو آپ کا کوئی بھی راز (secret) محفوظ نہیں رہ سکے گا۔ دوسرے پہلی ہی فرصت میں، موقع ملتے ہی یہ باتیں اُن تک پہنچ جائیں گی۔ اس سے اجتناب کریں۔ گھر کی باتوں کو اپنے سینوں میں دفن کردیا کریں۔ کسی کی بُرائی کسی کے سامنے ہرگز مت کریں۔ اس طرح ہم اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارتے ہیں، اور نوکروں کے سامنے یہ سب کرنے سے تو اُن کے دل سے آپ کی عزت بھی جاتی رہتی ہے۔ ویسے بھی یہ اخلاق سے گری ہوئی حرکت ہے، زیب نہیں دیتا۔ جہالت اور حماقت کے علاوہ یہ سب گناہ کی باتیں بھی ہیں۔

کچھ بیویوں کو ہمیشہ بیمار بنے رہنے کا شوق ہوتا ہے، ماہواری (periods) آئے ہوئے ہیں یا آنے والے ہیں یا ہوچکے ہیں۔ ان تین میں سے کوئی ایک حالت تو رہتی ہی ہے اور اس کی سب سے زیادہ زد خاوند پر پڑتی ہے۔ ایسی بیویاں خاوند سے توقع کرتی ہیں کہ شوہر ہر وقت ناز اُٹھائے۔ اور ہمہ وقت شکوہ کرتی ہیں، نوکروں پر غصہ، بچوں پر غصہ، شوہر سے شکایت، خیال نہیں

رکھتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ضرور دیکھیں کہ کیا آپ کے اردگرد لوگ، گھر والے آپ کو بدمزاج یا تلخ مزاج کہتے ہیں؟ اگر ہاں تو ذرا اپنے اندر جھانک کر دیکھنے کی کوشش کریں اور اپنی اصلاح خود کریں۔

خلاصہ :

پہلے اعتراف کریں کہ میں غصے کی تیز ہوں، اور اس کے لیے دلیل مت تلاش کیجیے کہ مجھے فلاں غصہ دلاتا ہے یا فلاں بات پر غصہ آتا ہے۔ نہ اپنا ریموٹ کنٹرول دوسرے کے ہاتھ میں دیجیے اور نہ جواز ڈھونڈیں، یہ شیطان نے کیا تھا اپنی غلطی کی دلیل تلاش کی تھی۔ مان لیں کہ میرا غصہ تیز ہے۔ اللہ سے کثرت سے دُعا کیجیے ''اللہ مجھے صبر، حلم اور تحمل عطا کرے۔'' ''غصہ پر قابو پانے کی توفیق عطا کرے۔'' ''سوچ سمجھ کر، اپنے جذبات کا اظہار کروں، اللہ سے یہ دعا کیجیے، ایسی کیفیت میں ضرور اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ پڑھیں اور بار بار پڑھیں۔ شعوری طور پر گہرے سانس لے کر، ممکن ہو تو وضو کر لیں، ٹھنڈا پانی پی لیں، جس پر غصہ کیا تھا، اُس سے معافی مانگیں، اس طرح عاجزی آئے گی اور دوبارہ ایسی صورت حال میں محتاط رہیں۔ اپنا جرمانہ، کفارہ مقرر کیجیے اور پورا کرنے کی بھرپور کوشش کریں۔ اس طرح اپنے آپ کو سزا دیں تاکہ آخرت کی سزا سے بچیں۔

یاد رکھیے، اگر غصہ اور جھوٹ ان دو بُرائیوں پر ہم نے قابو پا لیا، اصلاح کر لی، تو نوے فی صد برائیوں سے جان چھوٹ جائے گی۔ ان دو برائیوں کی وجہ سے ہم بہت سے گناہوں سے جھولی بھر لیتے ہیں۔ ہمارے اعمال نامے ان کی وجہ سے گناہوں سے بھر جاتے ہیں۔

سوچیے غصے کے غلط اظہار کی وجہ سے نہ ہم اصلاح کر پاتے ہیں، نہ عزت رہتی ہے، یہ بھی سوچیں کیا قیامت کے دن میرے اعمال نامے میں اتنی گنجائش ہوگی کہ میں اتنے بڑے بڑے گناہوں کا بوجھ اُٹھا سکوں۔ کیا میں اس کا بدلہ چکا پاؤں گی، کوئی فدیہ دے سکوں گی۔ یقیناً ہم نہیں کر سکیں گے۔ کسی نے کہا ہے کہ وہ کیا چیز ہے جو ہے تو حرام مگر اُس کا پینا حلال ہے تو وہ غصہ ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کرتے ہیں کہ ''اللہ ہمیں اپنے غصے پر قابو پانے کی توفیق عطا فرما دے اور ہم کو بھی علم اور حلم کی زینت سے آراستہ فرما دے۔''

بغض

تزکیہ کے ضمن میں ہمارا اگلا مضمون ''بغض'' ہے۔ بغض کو کینہ، آزردگی (resentment)، بددلی (rancor) بھی کہتے ہیں، اس کے لیے عربی میں لفظ آیا ہے ''غِل''، یعنی گِلہ، کدُورت، دل کے اندر گِلہ شکوہ رکھنا وغیرہ۔

بغض کا محل:

حدیث میں آتا ہے:

((مَنْ أَحَبَّ لِلّٰهِ وَأَبْغَضَ لِلّٰهِ وَأَعْطَى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ)) (۱)

''جس نے محبت کی تو اللہ کے لیے، بغض رکھا تو اللہ کے لیے اور جس نے دیا تو اللہ کے لیے اور روکا تو اللہ کے لیے، اس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔''

اس حدیث کی رو سے پتا چلا کہ اللہ کی خاطر بغض رکھنا اچھی بات ہے، اللہ تعالیٰ وہ ہستی ہے جس کی خاطر کسی سے بغض رکھنا عین عبادت ہے، اپنے گناہوں کے خلاف بھی بغض (rancor،resentment) ہونا چاہیے۔ شیطان سے بغض رکھیں، اسی طرح گناہوں کے خلاف آپ کے دل میں کینہ ہونا چاہیے، گناہ آپ کو ایک آنکھ نہ بھائیں۔ ہمارے اندر جو بُری صفات ہیں ان سے بغض رکھنا چاہیے لیکن یہ بغض صرف بری عادتوں سے ہو اپنی ذات سے نہ ہو، اپنی ذات سے نفرت (self loathing) یا بغض نہیں رکھنا چاہیے بلکہ اس بری عادت سے رکھنا چاہیے جو ہمارے اندر ہے۔ اگر ہمارے اندر شریعت کے خلاف کوئی چیز ہے تو اس سے بغض رکھنا چاہیے لیکن ان بُرائیوں کا ذکر ہر آنے جانے والے کے سامنے نہ کیا جائے، بلکہ صرف ان کے سامنے کریں جو ان خرابیوں کا علاج بتا سکیں، جن پر آپ کو اعتماد ہو کہ وہ آپ کا راز فاش نہیں کریں گے، اور اس شخص کے سامنے اپنی برائی کا ذکر کریں جو خود اس برائی سے پاک نظر آتا ہو، اور اللہ سے دعا کریں ''اے اللہ! میری برائیوں کو دور کردے۔'' برائیوں سے بغض رکھیں گے تو ہی ان سے نجات پانے کی کوشش کریں گے اور اللہ سے مدد مانگیں گے۔ لہٰذا اپنی برائیوں سے بغض رکھنا اچھی بات ہے۔ جو چیزیں اللہ کو ناپسند ہیں، ان سے بغض رکھنا بھی اچھی بات ہے۔ بعض دفعہ دوسرے

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان۔۔۔

لوگوں میں ہمیں ایسی برائیاں نظر آتی ہیں جو اللہ کو ناپسند ہیں، مثلاً کسی میں جھوٹ بولنے کی یا چوری کی عادت ہے یا طنز کرنے کی عادت ہے تو اس برائی سے بغض رکھنا چاہیے لیکن اس شخص کی ذات سے بغض نہ رکھیں جو ان برائیوں میں مبتلا ہو۔ پتا چلا کہ شرعی وجہ سے بغض ہوسکتا ہے، مگر اس میں ضروری ہے کہ بندہ بُرائی اور بُرائی کرنے والے میں فرق رکھے، بغض انسان کی ذات سے نہ رکھے بلکہ اس بری عادت سے رکھے۔

بعض دفعہ کچھ لوگوں کی طبیعت آپس میں نہیں ملتی اس کو ہم کہتے ہیں ان کی کیمسٹری (chemistry) نہیں ملتی، یہ الگ چیز ہے، ہم اس کی بات نہیں کر رہے۔ یہ کوئی گناہ نہیں، کیوں کہ بعض لوگ آپ کو برے تو نہیں لگتے لیکن اچھے بھی نہیں لگتے، آپ ان کے ساتھ زیادہ میل جول نہیں رکھنا چاہتے، زیادہ اٹھنا بیٹھنا پسند نہیں کرتے، یہ کسی بغض، کینہ یا کدورت کی وجہ سے نہیں ہوتا بلکہ طبیعتیں میل نہیں کھاتیں، اس میں کوئی حرج نہیں اور نہ ہی یہ بغض میں شمار ہوتا ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب میں یہ بات لکھی ہے کہ وہ غصہ جو انسان کے اندر پیدا ہو اور انسان برداشت کر جائے یعنی بدلہ لینے کا اختیار رکھتا ہو مگر پھر بھی بدلہ نہ لے اور وہ غصہ پی لے، برداشت کر لے تو ایسا غصہ بہت مبارک ہوتا ہے۔ غصہ کب آتا ہے؟ جب کوئی زیادتی کرے یا کوئی ناگوار معاملہ پیش آئے، پھر آپ کا بدلہ لینے کا دل چاہتا ہے۔ لیکن اگر کسی بے بسی کی وجہ سے بدلہ نہیں لے سکے تو وہ غصہ اندر ہی اندر جمع ہوتا رہتا ہے اور کینہ بن جاتا ہے، بغض بن جاتا ہے۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں غصے کا بیٹا کینہ ہے، اور کینے کے آٹھ بیٹے ہیں، ان میں سے ایک حسد ہے۔ یعنی حسد اُن بیٹوں میں سب سے زیادہ گاڑھی چیز ہے، زیادہ بھاری چیز ہے، مہلک چیز ہے، بہت بری چیز ہے۔ غل نسبتاً ہلکی چیز ہے، بغض اور حسد میں کہیں کہیں مماثلت محسوس ہوتی ہے، ملتی جلتی سی کیفیت ہے، قریب قریب ہیں، سب ایک ہی خاندان کے ہیں کہیں نہ کہیں تو مشابہت محسوس ہوگی۔ حسد رکھنے والا جنت میں داخل نہ ہوگا، اور حسد کی کوئی شرعی وجہ بھی نہیں ہوسکتی۔ اس کی کوئی گنجائش ہی نہیں جب کہ غل نسبتاً ہلکی چیز ہے، اگر اسے کنٹرول کر لیا جائے، دل کو صاف کر لیا جائے، بغض دل سے نکال دیا جائے تو آگے بڑھ کر وہ حسد میں تبدیل نہیں ہوگا۔

سسرالی رشتوں میں بغض:

اکثر یہ بیماری سسرالی رشتے داروں میں پیدا ہو جاتی ہے، ایک دوسرے کے خلاف دلوں میں بغض پلتا رہتا ہے۔ بہو کو شکایت ہوتی ہے کہ ساس ہر وقت ڈانٹتی رہتی ہے، طعنے دیتی رہتی ہے، بہت بااختیار (powerful) ہے، اُن کا بیٹا اپنی ماں کا بہت فرماں بردار ہے، وہ ساس کو کچھ نہیں کہہ سکتی،

کمزور ہونے کی وجہ سے بدلہ نہیں لے سکتی، لہذا اپنے دل میں ساس کے خلاف بغض پالتی رہے گی۔ جب دل کے اندر بغض کا بیج پڑ جاتا ہے تو دل چاہتا ہے اس شخص کو تکلیف پہنچے، اس کو اپنے دشمن کی تکلیف سے خوشی محسوس ہوتی ہے یا چھوٹی چھوٹی باتوں میں جس کے خلاف بغض ہوتا ہے اس کی مخالفت کی جاتی ہے۔ جو چیز اس کو بری لگے گی اس کو اچھا کہہ کر خوش ہوں گے اور جو اسے اچھی لگے گی ،اس کو برا ثابت کرنے کی کوشش کریں گے۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ساس کو بہو کا کوئی بچہ اچھا لگتا ہے، پیارا لگتا ہے تو بہو اس بچے کو اذیت دیتی ہے، مارتی پیٹتی ہے اور اس طرح بالواسطہ (indirectly) ساس کو تکلیف پہنچاتی ہے، اپنے ہی بچے پر زیادتی کرتی ہے تاکہ ساس کو دکھ پہنچے۔ اس طرح یہ بغض بہت ہی تکلیف دہ صورت اختیار کر لیتا ہے، یا اگر کوئی نوکر ساس کو اچھا نہیں لگتا تو بہو اس کے کام کی تعریف کرتی ہے اور اس پر بہت مہربان ہوتی ہے۔ یہ بغض کا مظاہرہ ہے، یعنی صرف دوسرے کو اذیت دینے کے لیے اس کی پسند کی مخالفت کرنا اور کوئی آپ کے سامنے اس شخص کی برائی کرے تو خوشی محسوس کرنا۔ اسی سے پھر غیبت اور بدگمانی جیسے گناہ سرزد ہوتے ہیں، اگر اس شخص پر کوئی مشکل آن پڑے تو خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ اس جذبہ کو ''شماتت'' کہتے ہیں یعنی دشمن کی مشکلات پر خوش ہونا، یہ چیز ہلاک کرنے والی چیزوں میں سے ایک ہے۔

حدیث میں مضمون آتا ہے:

((لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيَرْحَمَهُ اللهُ وَيَبْتَلِيكَ)) (۱)

''جو کسی مسلمان کو مصیبت میں دیکھ کر خوش ہوگا، اللہ اس کو اسی مصیبت میں مبتلا کرے گا۔''

بغض سے بچاؤ:

انسان اپنے دل کو ہر وقت بغض سے پاک کرنے کی کوشش کرتا رہے، بغض کی پرورش نہ کرے اور اگر ظلم و زیادتی کا نشانہ بن رہا ہے تو صبر کے ساتھ برداشت کرے، اور یہ سوچے کہ اس کا بدلہ اللہ دینے والا ہے۔ اب اگر کسی کے ساتھ زیادتی ہوئی تو شیطان دل میں بغض پیدا کرنے کی کوشش کرے گا۔ کسی نے کسی پر ظلم کیا تو مظلوم کے دل میں بغض تو پیدا ہوگا اب اس کو دور کیسے کیا جائے؟ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے واقعۂ افک نقل کیا ہے جس میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر منافقوں نے جو جھوٹا الزام لگایا تھا سورۂ نور میں اس کا تذکرہ آتا ہے جب یہ جھوٹی تہمت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر لگائی گئی تھی تو اس میں حضرت مسطح بن اُثاثہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ حضرت مسطح رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے

(۱) جامع الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ و الرقائق، باب منہ

قریبی رشتہ دار اور زیرِ کفالت تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ میری بیٹی پر اتنا بڑا الزام لگایا چنانچہ میں اب حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کی مدد نہیں کروں گا پہلے وہ ان کی کفالت اور مدد کیا کرتے تھے۔ جب انہوں نے قسم کھائی تو یہ ایک فطری ردعمل (natural reaction) تھا۔ ان کے قسم کھانے پر قرآن میں آیات نازل ہوئیں۔

{ وَ لَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَ السَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْۤا اُولِی الْقُرْبٰى وَ الْمَسٰكِیْنَ وَ الْمُهٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖۗ وَ لْیَعْفُوْا وَ لْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ } (النور ۲۲)

''اور چاہیے کہ دینی بزرگی اور دنیاوی وسعت رکھنے والے اس بات پر قسم نہ کھائیں کہ وہ قرابت داروں کی، مسکینوں کی اور مہاجر فی سبیل اللہ کی مدد نہ کریں گے، ان کو چاہیے کہ وہ درگزر کریں اور معاف کر دیں کیا تم پسند نہیں کرتے، اس بات کو کہ اللہ تم کو معاف کر دے، اللہ غفور ہے اور رحیم ہے۔''

جب یہ آیات نازل ہوئیں تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اللہ کی قسم میں چاہتا ہوں کہ اللہ مجھے معاف کرے، اور حضرت مسطح رضی اللہ عنہ کے ساتھ انہوں نے دوبارہ حسن سلوک شروع کر دیا، مالی مدد جاری کر دی۔ یہ واقعہ نقل کر کے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ بغض اور کینہ رکھنے والا تین میں سے ایک حالت میں ضرور ہوتا ہے۔

(۱) اپنے نفس سے جہاد کرے گا اور اس متعلقہ شخص کے ساتھ نیکی اور احسان کرے گا تا کہ اس کا دل خوش اور صاف ہو جائے، یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کیا، کتنے بڑے حوصلے اور صبر والی بات ہے۔ کیوں کہ اس میں زیادتی بھی اُن صحابی کی طرف سے ہوئی، خواہ مخواہ اپنے محسن کی بیٹی پر جھوٹی تہمت لگانے والوں کا ساتھ دیا لیکن اس کے باوجود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ ایسا سلوک کیا کہ ان صحابی کا دل صاف ہو گیا اور وہ اپنی غلطی پر شرمسار ہوئے۔ اس پر امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ''صدیقوں'' کا درجہ ہے۔

(۲) جس کے خلاف بغض ہے، اس کے ساتھ نیکی تو نہیں کرتا مگر برائی بھی نہیں کرتا اس کا برا بھی نہیں چاہتا، اس کی غیبت بھی نہیں کرتا، اس کی تکلیف اور مشکل پر خوش بھی نہیں ہوتا، بلاوجہ مخالفت نہیں کرتا یہ پرہیزگاروں کا درجہ ہے، یہ بھی اچھا ہے۔

(۳) بغض اور کینے کی وجہ سے انسان خود بھی ظلم پر اتر آئے، مظلوم انسان کے دل میں بغض پیدا

ہوجاتا ہے اور نتیجتاً وہ اس ظالم شخص کو نقصان پہنچانے کی فکر میں لگ جاتا ہے، اپنا غصہ ٹھنڈا کرنے اور بغض نکالنے کی خاطر منصوبے بناتا رہتا ہے۔ اس شخص نے تو صرف ایک بار ظلم کیا جب کہ اس نے بدلے لینے کے لیے کئی بار نقصان پہنچایا، کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ لہٰذا اب یہ شخص خود ظالم ہو جاتا ہے، ہر وقت اس کی برائی میں لگا رہتا ہے، اس کے عیبوں کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے اور اس کی تکلیفیں سن سن کر خوش ہوتا رہتا ہے۔ کبھی ہم نے سوچا کہ بہویں ساسوں کی برائی سن کر اتنی خوش کیوں ہوتی ہیں۔ یہ گھر گھر کا مسئلہ ہے اس لیے سسرالی رشتوں کا خاص ذکر کیا ہے، کہ اس میں عورتیں بغض پالتی ہیں اور غیبت کر بیٹھتی ہیں۔ کینے کی وجہ سے دوسرے کی برائی کرنے لگیں اور ان کا بُرا چاہنے لگیں، یہ درجہ فاسقوں اور ظالموں کا ہے۔ اس طرح دوہرا نقصان ہوا ایک تو اپنے ساتھ زیادتی ہوئی اور اس کا اللہ کے ہاں کوئی صبر کا پھل بھی نہ ملا۔ اس صبر نہ کرنے کے بدلے جنت بھی کھوئی، دنیا میں بھی جلتے بھنتے کباب ہوتے رہے اور آخرت میں جہنم میں جا پڑے۔ بغض کتنا تباہ کن اور نقصان دہ ہوگیا۔

لہٰذا کوئی زیادتی کرے تو اُسے معاف کردو، دل صاف کرلو، دل میں بغض مت رکھو۔ حدیث میں آتا ہے عفو و درگذر کرنے والوں کی حق تعالیٰ قیامت کے دن عزت افزائی فرمائے گا، قیامت کے دن اللہ ان کو بڑے درجے دے گا۔ حضرت عتبہ بن عامر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ ''میں تجھ کو آگاہ کروں کہ اہل دنیا اور آخرت کے فاضل ترین اخلاق کون سے ہیں؟'' پھر فرمایا کہ ''جو شخص تجھ سے قطع تعلق کرے تو اس سے ملتا رہ، اور جو تجھے محروم اور ناکام کرنے کی کوشش کرے اس کے ساتھ عطا اور عنایت سے کام لے، اور جو تجھ پر ظلم کرے اس کے ساتھ عفو و درگذر سے کام لے۔

اس سے کیا ہوگا دل کے اندر بغض پیدا نہیں ہوگا۔ اگر دل میں کسی کے خلاف بغض آگیا ہے تو اللہ سے دعا کریں کہ میرا دل صاف کردے۔ تصور کریں آپ کا دل ایک آئینہ ہے جس کو آپ دھبوں سے پاک صاف کر رہے ہیں اور چمکا رہے ہیں۔ جب دل سے بغض نکل جاتا ہے تو دل صاف اور ذہن ہلکا ہوجاتا ہے۔

بغض کا نقصان:

بغض پالنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان ہر وقت اُداس (upset) رہتا ہے، جلتا بھنتا رہتا ہے، ذہن اور جسم پر بھی منفی (negative) اثرات پڑتے ہیں، اور کئی لوگوں سے تعلقات خراب ہوجاتے ہیں، کیوں کہ جس شخص سے بغض ہوتا ہے وہ اکیلا ہی اس کی زد میں نہیں آتا بلکہ جن لوگوں

سے اس شخص کی دوستی ہے یا اچھے تعلقات ہیں ان سب سے بھی دشمنی اور نفرت ہو جاتی ہے۔ اسی چیز کو دوسرے زاویے سے سمجھیں، اگر کسی کو اپنی ساس بُری لگتی ہے تو اس وجہ سے نندیں بھی بُری لگنے لگتی ہیں، کیوں کہ ساس اُن کی ماں ہے اور ماں کو اپنی بیٹیوں سے فطری طور پر محبت ہوتی ہے۔ چنانچہ پھر بہو ساس کے ساتھ ساتھ نند کی تکالیف یا پریشانیوں پر بھی خوش ہوتی ہے۔ اگر نند اپنے خاوند یا سسرال والوں کے ساتھ خوش نہیں یا جھگڑا ہو جائے تو انہیں خوشی ہوگی۔ دیکھیے یہ بغض کتنا خوف ناک جال ہے، جس میں ایک نفرت سے شروع ہو کر آپ کتنی نفرتوں کا شکار ہو جاتے ہیں، یہ خاندانی سیاست (family politics) دراصل عورتوں کی تمام تر صلاحیتوں کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے، وہ اس سے نکل ہی نہیں پاتیں، سازشوں پر سازشیں اور ارد گرد جالوں پر جال بنتے چلے جاتے ہیں، اور ان جالوں میں بالآخر کون پھنستا ہے، خود اُس کی اپنی ذات۔ لہٰذا بغض کو معمولی چیز نہ سمجھیں۔ اس سے بچاؤ کے طریقوں پر عمل کریں، اپنا تزکیہ کریں، اپنی روحانی صحت کے لیے، ذہنی سکون اور خوش حالی کے لیے بغض سے دور رہیں۔ کیوں کہ یہ انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے، تعمیری صلاحیتوں کو چاٹ جاتا ہے، جس طرح مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی مکھی یا کیڑے کا حشر ہو جاتا ہے بالکل ویسا ہی حشر بغض انسان کا کر دیتا ہے، ذہن ہر وقت منصوبے اور سازشیں کرتا رہتا ہے، اُس کی ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ کس طرح اس شخص کو تکلیف اور اذیت دی جائے۔ اس طرزِ عمل کا دنیا میں بھی نقصان ہے اور آخرت میں سخت عذاب کا خدشہ ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((وَلَا تَبَاغَضُوا))(۱)

''ایک دوسرے سے بغض مت رکھو۔''

ترمذی اور مسند احمد میں حدیث ہے

((دَبَّ اِلَيْكُمْ دَاءُ الْأُمَمِ قَبْلَكُمُ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ هِيَ الْحَالِقَةُ لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ))(۲)

''اگلی امتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد اور بغض تمہاری طرف چلی آ رہی ہے اور یہ بالکل صفایا کر دینے والی اور مونڈ دینے والی ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں کہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ دین کا صفایا کرنے والی ہے۔''

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب ایھا الذین امنو

(۲) جامع الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ، باب منہ

ایک اور حدیث میں آتا ہے:

((تُعْرَضُ الْأَعْمَالُ فِي كُلِّ يَوْمِ خَمِيسٍ وَاثْنَيْنِ فَيَغْفِرُ اللهُ عَزَّوَجَلَّ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ لِكُلِّ امْرِئٍ لَا يُشْرِكُ بِاللهِ شَيْئًا إِلَّا امْرَأً كَانَتْ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَخِيهِ شَحْنَاءُ فَيُقَالُ ارْكُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا ارْكُوا هَذَيْنِ حَتَّى يَصْطَلِحَا))(۱)

''ہر ہفتہ میں پیر اور جمعرات کو لوگوں کے اعمال (اللہ کے حضور) پیش ہوتے ہیں تو ہر بندہ مومن کی معافی کا فیصلہ کیا جاتا ہے، سوائے ان دو آدمیوں کے جو ایک دوسرے سے بغض رکھتے ہیں، ان کے بارے میں حکم دے دیا جاتا ہے کہ ان کو چھوڑے رکھو یہاں تک کہ یہ آپس کے کینہ اور دشمنی سے باز آجائیں۔''

آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ''مومن کینہ پرور نہیں ہوتا۔'' یعنی وہ دل کے اندر بغض پال پال کر نہیں رکھتا۔ اس چیز سے بچنے کی ضرورت ہے، دل بڑا کریں درگذر کریں معاف کرتے رہیں کیوں کہ اللہ بھی ہمیں معاف کرتا رہتا ہے، پردہ پوشی کرتا ہے۔

بغض کی دوسری وجہ:

بغض کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ کسی کے گھر والے یا سگے رشتہ دار ناانصافی کریں، بدسلوکی کریں یا اُس کے مقابلے میں کسی اور کو ترجیح دیں۔ مثلاً ایک گھر میں دو بیٹیاں ہیں لیکن ماں کا جھکاؤ ایک بیٹی کی طرف زیادہ ہے، اس کے ہر کام کی تعریف کرتی ہے اور دوسری بیٹی کے کسی کام پر توجہ نہیں دیتی۔ جس کے نتیجے میں اس بیٹی کو اپنی ہی بہن سے بغض ہو جاتا ہے لیکن اس معاملے میں اُس بہن کا تو کوئی قصور نہیں جسے ماں کی محبت حاصل ہے بلکہ ہوسکتا ہے وہ زیادہ فرماں بردار ہو، ماں کا ہاتھ بٹاتی ہو، ماں کا بہت خیال کرتی ہو، اسی وجہ سے ماں کا جُھکاؤ اس کی طرف زیادہ ہو۔ لیکن اس طرح ایک بہن کو دوسری سے بغض ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام پسند نہیں کرتا کہ بچوں کا آپس میں موازنہ کیا جائے۔ یہ نہیں کہنا چاہیے اُس بچے سے کچھ سیکھو، کتنا تابع فرمان اور تمیز دار ہے، اپنے بھائی کو دیکھو کتنا اچھا پڑھتا ہے، تم تو نکمّے ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کی مقابلے بازیاں اور بچوں کی ایک دوسرے کے سامنے تعریفیں کرنا بہن بھائیوں کے دلوں میں بغض پیدا کر دیتا ہے۔ لہٰذا تعریف کے معاملے میں بہت محتاط رہنا چاہیے۔ اسی طرح ایک ساس کی دو بہوئیں ہیں ساس ایک کی بہت تعریف کرتی ہے اور دوسری کو بالکل نظر انداز کرتی ہے تو دوسری کو پہلی بہو سے بغض ہو جائے گا۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ و الآداب، باب غصی عن التحناء، النھاجر

دیورانیوں اور جٹھانیوں کے اندر یہ بغض کثرت سے پایا جاتا ہے، ایک دوسرے کو بلا وجہ اذیت پہنچاتی ہیں، ہر وہ کام کریں گی جس سے دوسری کو اذیت پہنچے اور وہ ساس کی نظروں سے کسی طرح گر جائے یا میاں بیوی میں جھگڑا ہو جائے۔ اگر ایک کا بچہ بیمار ہو جائے، کوئی اور تکلیف آ جائے یا امتحان میں فیل ہو جائے تو دوسری بہو اندر ہی اندر خوش ہوگی۔ چلتے پھرتے ایک دوسرے پر طنز کریں گی، کڑوی کسیلی کہیں گی، چبھتے جملے استعمال کریں گی۔ ایک واقعہ سننے میں آیا تھا کہ ایک دیورانی جٹھانی فلیٹ (flat) میں رہا کرتی تھیں، آپس میں بالکل نہیں بنتی تھی، کم ظرفی کی وجہ سے دلوں میں بغض تھا۔ دیورانی نے اپنی دوستوں کی دعوت کی اور تیاری میں مصروف ہوگئی، انڈے بھی ابلنے رکھے، جٹھانی بھی کچن میں کام کر رہی تھی۔ دیورانی کسی اور کام میں مصروف ہوگئی اور انڈے بھول گئی جو کہ ابل ابل کر جل گئے۔ جٹھانی دیکھتی رہی مگر چولھے سے نہ اتارا۔ جب دیورانی نے پوچھا کہ آپ نے دیکھا نہیں؟ تو اس نے جواب دیا مجھے لگا تم کو جلے ہوئے انڈے ہی چاہیے تھے۔

یہ ہمارے معاشرے میں گھر گھر کی کہانی ہے۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کو جلاتے کڑھاتے رہتے ہیں، اذیت اور نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ دیورانی کو تکلیف ہوئی تو جٹھانی بہت خوش ہوئی۔ لیکن اگر جٹھانی یہ سوچے کہ اس عمل سے آخرت پر کیا نتائج مرتب ہوں گے، اس کو کتنا ثواب ملا؟ گناہ ہی گناہ کمایا، نقصان الگ ہوا، کسی کا دل دکھایا، اور اس کے دل میں جٹھانی سے مزید غصہ اور نفرت پیدا ہوئی ہوگی، اور یہ سب کر کے دوسری عورت کو کتنا سکون ملا ہوگا۔ یہ کوئی عقلمندی کا سودا تو نہیں کیا، اس عمل کے ذریعے خود کو جہنم کا ایندھن بنایا۔ ذرا سا چولھا ہی بند کر دینا تھا، لیکن بغض کی وجہ سے نہیں کیا۔

اس بغض کا علاج:

جب کبھی دل میں کسی کی تعریف سن کر بغض پیدا ہو جائے تو انسان ٹھنڈے دل سے یہ سوچے کہ آخر اس بندے یا بندی کی تعریف کیوں کی جا رہی ہے، کیا یہ بندی واقعی تعریف کی مستحق ہے؟ اُس میں ایسی کیا خوبی ہے؟ اگر کوئی قابل تعریف خوبی ہے تو میں بھی اپنا لوں اور ایسی ہو جاؤں، یہ مثبت رویہ ہے۔ دوسری طرف آپ یہ سوچیں: یہ کہاں کا انصاف ہے کہ کسی کی تعریف لوگ کر رہے ہیں اور دشمنی اس سے ہوگئی جس کی تعریف ہو رہی ہے، اس میں اُس بے چارے یا بے چاری کا کیا قصور؟ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو پہلے حضرت یوسف علیہ السلام سے حسد پیدا ہوا تھا کیوں کہ وہ اپنے والد کو بہت پیارے تھے لیکن اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کا کیا قصور تھا؟ اور یہ حسد پھر بغض کی شکل

اختیار کر گیا، اور آپ کے علم میں ہے کہ اس کے بعد انہوں نے کیا کیا ترکیبیں کیں، تو بغض سب سے زیادہ نقصان خود بغض رکھنے والے کو پہنچاتا ہے۔ دوسری طرف خاندان کا ماحول خراب کر کے رکھ دیتا ہے، آس پاس کے لوگوں کو پٹیاں پڑھاتا ہے، گروہ بندی کروا دیتا ہے۔ بعض دفعہ خواتین خانہ نوکروں کے ساتھ مل کر گھر کے دوسرے افراد کے خلاف ملی بھگت کرتی ہیں، اور جس سے بغض اور حسد ہے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی ہیں۔

بغض کی ایک اور وجہ:

بغض ہمیشہ اُن لوگوں سے ہوتا ہے جو دن رات ساتھ رہتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں جو رشتے ہم نبھاتے ہیں ان رشتوں میں ٹکراؤ (friction) ہوتا ہے، لہٰذا دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف میل (hatred) آجاتا ہے دلوں میں کینہ اور غل پیدا ہو جاتا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ مردوں میں عام طور پر کس بنا پر بغض پیدا ہوتا ہے۔ دو مردوں کی مثال دیکھیں جو ایک آفس میں ایک ہی عہدے پر کام کرتے ہیں، اب اُن دونوں کی ترقی (promotion) ہونی ہے لیکن (boss) نے ترقی (promotion) کے لیے ایک کو دوسرے پر ترجیح دے دی۔ اس وجہ سے جس کی ترقی ہوگئی اس کے خلاف دوسرے کے دل میں نفرت و بغض پیدا ہو جائے گا، حالاں کہ جس کی ترقی (promotion) ہوئی اس کا اس معاملے میں کوئی عمل دخل نہیں تھا، یہ تو (boss) کا فیصلہ تھا۔ لیکن اب دوسرا شخص چاہے گا کہ یہ کسی طرح (boss) کی نظروں سے گر جائے، اس پر کوئی مصیبت آجائے، کوئی معاملہ (case) اس کے خلاف (against) بن جائے۔ اور اگر وہ واقعی کسی معاملے میں پھنس جائے تو خوشی ملتی ہے کہ چلو اچھا ہوا، حالاں کہ اس نے آپ کا کچھ بھی نہیں بگاڑا نہ اس کے نقصان سے آپ کا فائدہ ہوا۔ بس اس کی کامیابی دیکھ کر بغض ہو گیا۔ اہل کتاب کے حوالے سے اسی بغض کا تذکرہ سورۂ آل عمران میں آیا ہے:

{قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ}(۱۱۸)

”وہ مسلمانوں سے بغض رکھتے ہیں۔ بغض ان کے منہ سے پھوٹ رہا ہے اور جو ان کے سینوں میں مخفی ہے وہ کہیں زیادہ ہے۔“

غور کریں! اہل کتاب کو مسلمانوں سے کس بات پر بغض ہوا تھا؟ بات یہ تھی کہ نبی ﷺ بنی اسماعیل میں کیوں آگئے، بنی اسحٰق میں سے کیوں نہیں آئے۔ یہ شرف کسی اور کو کیسے حاصل ہوا، یہ بغض ہو گیا چنانچہ مسلمانوں کی پریشانیاں، مصائب، اذیتیں اور شکست ان کو اچھی لگتی تھی، مسلمانوں

کی کامیابی ان کو کھلتی تھی۔ اللہ تعالی سے دعا کرنی چاہیے اللہ تعالی ہمارے دلوں کو بغض سے پاک کردے، اور جس کا دل کینہ سے، غل سے، بغض اور حسد سے پاک ہوجائے، وہ جنت کا شہری بننے کا مستحق ہے۔ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے کسی صحابی کے بارے میں متواتر تین دن جنت کی بشارت دی کہ یہ جنتی ہیں، ان صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جب یہ خوش خبری دی گئی تو ایک اور صحابی رضی اللہ عنہ نے چاہا کہ میں جا کر ان کا معمول دیکھوں کہ یہ کیا عمل کرتے ہیں جس کی وجہ سے جنت کے مستحق ہو گئے۔ کسی نہ کسی بہانے سے تین دن وہ ان کے گھر جا کر رہنے لگ گئے، کوئی غیر معمولی چیز نہ دیکھی، کوئی غیر معمولی عبادت نہ دیکھی کہ بہت زیادہ عبادت گزار ہوں، دن بھر روزہ ہو اور رات بھر جاگ کر عبادت میں گزارتے ہوں، یا صدقات اور خیرات کرتے ہوں۔ آخر انہوں نے پوچھ لیا کہ رسول اکرم ﷺ نے آپ کے بارے میں جنتی ہونے کی خوش خبری سنائی ہے، آپ کا ایسا کیا عمل ہے؟ انہوں نے جواب دیا کوئی اور چیز تو مجھے اپنے اندر نظر نہیں آتی، صرف یہ ہے کہ دن بھر کام میں گزارنے کے بعد رات کو سوتے وقت میرے دل میں کسی کے خلاف کوئی بغض نہیں ہوتا۔ کتنا پیارا اور ہلکا ہوگا وہ دل جس میں کسی کے خلاف بغض نہ ہو۔

بغض کا علاج:

اب اگر کسی کے خلاف دل میں بغض آ گیا تو انسان کیا کرے؟ اس کا علاج یہ ہے کہ انسان سوچے کہ میں جس شخص سے اتنا بغض رکھتا ہوں، کیا پتا کل کو مجھے اسی سے کوئی کام پیش آ جائے، یا اس کے ساتھ کوئی تعلقات استوار کرنے یا رشتہ قائم کرنا پڑ جائے تو پھر کیا ہوگا؟ چلیں دنیا میں نہ سہی لیکن کیا قیامت میں آپ پسند کریں گے کہ وہ آپ کی نیکیاں لے جائے۔ پھر خصوصاً اس کے لیے دعا کریں کہ اللہ اس کو دنیا اور آخرت کی بھلائیاں عطا کردے۔ جس کے لیے بغض پالا ہے اس کے لیے خاص طور پر دعا کریں، دوسروں کے سامنے اس شخص کی خوبیوں کا ذکر کریں، یہ خودکار تجویز (auto-suggestion) بھی ہوتی ہے انسان کا اپنا دل دُھلتا ہے، جب وہ اپنی زبان سے اس شخص کی تعریف کرتا ہے اور اس کے اپنے کان اس کی تعریف سن رہے ہوتے ہیں، تو جس طرح انگریزی میں کہا جاتا ہے (I have risen above my self) یعنی اپنی نفرت اور اپنے بغض پر قابو پا کر میں اس کی تعریف کر رہا ہوں، اس طرح آپ کو خود سکون ملے گا، ایسا لگے گا کہ اندر سے صفائی ہو رہی ہے، تزکیہ ہو رہا ہے۔ بغض کی وجہ سے جو گندگی اور نجاست دل میں جمع ہے اسے کھرچ کر باہر کر دیں، اور آپ آزما کر دیکھیں کہ جب آپ اپنے بغض پر قابو پائیں گے تو جس کے

خلاف بغض ہوگا وہ بھی آپ کو معاف کر دے گا، اور آپ کے قریب آجائے گا، جب وہ آپ کے رویّے میں تبدیلی (change) محسوس کرے گا تو اُسے خوش گوار حیرت کا احساس ہوگا۔ سسرالی رشتہ داروں میں، اپنے قریبی خاندان والوں کے تعلقات میں اچھی مثبت تبدیلی آئے گی جب کسی کو پتا چلے گا کہ یہ شخص میری تعریف کرتا ہے، میری بھلائی چاہتا ہے، میری غیر حاضری میں میرا دفاع (defend) کرتا ہے تو اس سے تعلقات بہت بہتر ہوں گے۔ اس شخص کی موجودگی میں بھی اور اس کے پیٹھ پیچھے بھی اس کی کسی خوبی کی، کسی نیک عادت کی یا اچھائی کی تعریف جائز طریقے پر کیجیے، ان شاءاللہ تعالیٰ فائدہ ہوگا۔

اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے ''اے ہمارے رب! تو ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لیے کوئی غل نہ بنا، اس لیے کہ تو تو بہت معاف فرمانے والا، رحم فرمانے والا ہے۔'' کیا ہم چاہیں گے کہ اللہ ہمارے گناہوں کی بدولت ہم سے بغض رکھے اور ہمارے خلاف ہو جائے، تو ہم تو ہلاک ہو جائیں گے۔ اگر ہم ایسا نہیں چاہتے کہ اللہ ہمارے خلاف بغض رکھے تو پھر ہم کیوں لوگوں کے خلاف بغض رکھیں، بغض کوئی فائدہ نہیں دیتا، کوئی معاملہ نہیں سنوارتا، اس سے کوئی بہتری نہیں ہوتی، صرف تباہی، ہلاکت، دین و دنیا اور صلاحیتوں کا ضیاع ہے۔ منفی اور غیر تعمیری جذبہ ہے، اور اس کا علاج عفو و درگذر ہے۔ اگر آپ کے دل میں کسی زیادتی کی وجہ سے بغض پیدا ہوا ہے تو درگذر کیجیے، اور اگر کسی کی میابی، کسی خوبی یا تعریف کی وجہ سے بغض پیدا ہوا ہے تو اللہ سے دعا کیجیے کہ میرے اندر بھی یہ خوبی پیدا کر دے، مجھے بھی اس طرح سے کامیابی عطا فرما دے۔ اس کی خوبی سے نفرت کی بجائے اس خوبی کو سراہیں اور اپنے اندر یہ خصوصیت پیدا کرنے کی کوشش کریں، اپنے کردار کو پسندیدہ اور قابل تعریف بنائیے، اور اگر ماں کا معاملہ ہے کہ آپ کی ماں کو آپ کی بہن نسبتاً زیادہ پسند ہے، تو اس بہن کے نقشِ قدم پر چلیں، وہ خوبیاں اپنے اندر پیدا کریں، اور دوسروں کی خوبیوں کا اعتراف کھلے دل سے کریں، اور مناسب الفاظ میں تعریف کریں۔ یاد رکھیں کامیابی تو اللہ نے مقدر کر دی ہے، جتنا جس کے مقدر میں ہے مقدر ہو چکا وہ اسے مل کے رہے گا، دعا ہے اللہ ہمارے دلوں سے بغض دور کر دے، ہمارے اخلاق سنوار دے، ہمارے خاندانی معاملات سنوار دے۔

(آمین۔ یارب العالمین)

جھوٹ

جھوٹ، منافق کی علامت:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((آيَةُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ اِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَاِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَاِذَا اؤْتُمِنَ خَانَ))(۱)

''منافق کی تین علامات ہیں۔ (پہلی) جب بات کرتا ہے، جھوٹ بولتا ہے، (دوسری) جب وعدہ کرتا ہے تو اس کے خلاف کرتا ہے، (تیسری) جب امانت رکھوائی جائے تو خیانت کرتا ہے۔''

منافق کی پہلی علامت حدیث مبارکہ کے مطابق یہ ہے کہ جب وہ بات کرتا ہے تو جھوٹ بولتا ہے۔ پھر آگے وعدہ خلافی اور خیانت یہ سب بھی جھوٹ ہی کی شکلیں ہیں۔

ایک اور روایت میں الفاظ آتے ہیں:

((وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰى وَزَعَمَ أَنَّهُ مُسْلِمٌ))(۲)

''چاہے وہ نماز پڑھے، روزہ رکھے اور اپنے بارے میں گمان کرے کہ وہ مسلمان ہے۔''

لیکن اگر وہ جھوٹ بولتا ہے، وعدہ خلافی کرتا ہے، خیانت کرتا ہے، تو منافق ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اگر ہم مسلمانوں سے جھوٹ اور غصّہ نکل جائے تو ہم منافقت سے بچ جائیں جو تمام گناہوں کی جڑ ہے اور بڑی حد تک اصلاح ہو جائے۔ محدود سے محدود اندازہ بھی لگایا جائے تو ہم کم از کم پچاس فی صد گناہوں سے بچ جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے منافقوں کے بارے میں فرمایا ہے:

{فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ}

(البقرہ: ۱۰)

''ان کے دلوں میں ایک مرض ہے تو اللہ نے ان کے مرض کو اور بڑھا دیا (نفاق کا مرض) اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے اس لیے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔''

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب قَوْلِ اللّٰهِ تَعَالٰى {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ۔۔۔

(۲) شعب الایمان للبیهقی، کتاب الجهاد، فصل فی المزاح

سورۃ المنٰفقون میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَاللّٰہُ یَشْھَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ لَکٰذِبُوْنَ} (المنفقون: ۱)

''اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ بے شک منافق البتہ جھوٹے ہیں''۔

سورۃ الزمر میں فرمایا:

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کَاذِبٌ کَفَّارٌ} (الزمر: ۳)

''بے شک اللہ نہیں ہدایت دیتا ایسے کسی شخص کو جو جھوٹا ہو اور جو کفر کرنے والا ہو''۔

سورۃ التوبہ میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

{یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ} (التوبہ: ۱۱۹)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ''

جھوٹ کی وجوہ:

جھوٹ بولنے کی کئی وجوہ ہو سکتی ہیں۔ اس کا انحصار اس بات پر ہے کہ کس وقت انسان کس حیثیت میں ہے، اپنی حیثیت کے مطابق وہ الگ الگ وجوہات کی بنا پر جھوٹ بولتا ہے۔ کہیں ماتحت کی حیثیت میں، کہیں کسی کے مہمان کی حیثیت میں، کہیں کسی کا میزبان ہوتا ہے، کہیں لوگ کاروبار کرتے ہیں، کہیں کچھ خرید رہے ہوتے ہیں اور کہیں کچھ بیچ رہے ہوتے ہیں۔ منافق کا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جب جہاں اور جس حیثیت میں ہوتا ہے، جھوٹ بولتا ہے۔

خوف کی وجہ سے جھوٹ:

جھوٹ بولنے کی ایک وجہ ''ڈر'' یا ''خوف'' ہوتا ہے۔ سچ بولنے سے سزا ملے گی، یا نقصان اٹھانا پڑے گا یا زیادہ نفع نہ ہوگا۔ کوئی کام ذمے تھا لیکن نہیں کیا، یا کوئی کام غلط ہو گیا، بگڑ گیا۔ اب ڈر ہے کہ سچ بولیں گے تو سزا ملے گی یا کوئی نتیجہ بھگتنا پڑے گا لہٰذا جھوٹ کا سہارا لیا جاتا ہے۔ عموماً ماتحت (juniors) اس وجہ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ بچے اور نوکر عموماً خوف کی وجہ سے جھوٹ بولتے ہیں۔ ایک دفعہ جھوٹ بولنے سے جان بچ جائے تو پھر لت لگ جاتی ہے۔ ہر دفعہ جھوٹ بول کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے ہیں، سزا سے، ڈانٹ ڈپٹ سے بچ جاتے ہیں اور رفتہ رفتہ عادت پڑ جاتی ہے اس کے بعد جھوٹ بولنے والوں کو کچھ بھی احساس نہیں رہتا کہ جھوٹ بولنا کوئی عیب ہے یا بُری بات ہے۔ ایک ضرورت اور مجبوری سمجھ کر جھوٹ بولتے رہتے ہیں۔ بچوں کو کسی نے بتایا نہیں ہوتا کہ

جھوٹ بولنا کتنی بُری بات ہے، اس کے کیا نقصانات ہیں، یا بتایا تو جاتا ہے لیکن ان کے سامنے بڑے طرح طرح کے جھوٹ بولتے رہتے ہیں چنانچہ بچے بھی بولتے ہیں، اور بڑے ہونے پر یہ عادت پختہ ہوجاتی ہے۔

جہاں کسی کی ناراضی کا ڈر ہوتا ہے، جہاں کوئی کام غلط ہوگیا، آرام سے جھوٹ بول دیا اور جب بڑے ہوجاتے ہیں تو مصلحت کا نام دے دیا۔ مثال کے طور پر بچے سے گلاس ٹوٹ گیا۔ اس کو ڈر ہے ماں کو پتا چل گیا تو سزا دے گی۔ وہ جھوٹ بول دے گا کہ میں نے توڑا، اس طرح بچے یہ سیکھتے ہیں کہ جھوٹ بولنے سے سزا سے بچ جاتے ہیں۔ جب بڑے ہوتے ہیں تو یہ عادت پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔ نوکروں کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ اُن سے کوئی چیز جل جائے تو چھپا لیتے ہیں۔

ناگوار صورت حال میں جھوٹ:

جہاں کہیں کسی ناگوار صورت حال سے سابقہ پیش آتا ہے، کوئی ایسی صورت پیدا ہوتی ہے جو ان کو اچھی نہیں لگتی تو جھوٹ بول کر جان چھڑا لیتے ہیں۔ مثلاً کسی کا فون آیا، بات کرنے کا دل نہیں ہے تو کہلوا دیا کہ گھر پر نہیں ہیں۔ اور کوئی احساس ندامت بھی نہیں کہ جھوٹ بولا گیا، جو ایک غلط کام ہے۔ جب احساس نہیں ہوتا تو غلطی کی اصلاح بھی نہیں ہوتی۔ جھوٹ پر جھوٹ بولتے چلے جاتے ہیں، عادی جھوٹ بولنے والے (compulsive liars) بن جاتے ہیں جیسے عادی چور ہوتے ہیں، عادی پان کھانے والے، عادی نشہ کرنے والے، بغیر جھوٹ کے گزارہ نہیں، ایسی لت پڑ جاتی ہے۔ جھوٹ ایسے ان کی زبان پر رہتا ہے کہ اس کی خرابی کا، گناہ کا، تلخی کا، اس کی کڑواہٹ کا کوئی احساس باقی نہیں رہتا۔

دل رکھنے کو جھوٹ:

بعض دفعہ دل رکھنے کو جھوٹ بول دیتے ہیں کہ کسی کا دل نہ دکھے یا نہ ٹوٹے، اگر کہہ دیا جائے کہ جو ابھی فون آیا تھا ان کو کہہ دیتے کہ ابھی بات نہیں کرسکتا تو کہتے ہیں کہ نہیں نہیں ان کا دل ٹوٹ جائے گا۔ مصلحتاً تو جھوٹ بولنا جائز ہے۔ ہم نہیں چاہتے کسی کا دل دُکھے، دل دکھانا بڑا گناہ ہے۔

ڈر والے جھوٹ کا علاج:

ڈر اور خوف کی وجہ سے جھوٹ بولنے کا علاج یہ ہے کہ گھر میں بچوں کو، نوکروں، ملازمین کو یا اگر ماتحت ہیں، ان کو جھوٹ بولنے کی برائی کا احساس دلایا جائے۔ حدیثیں سنائیں، قرآن کی آیات

سنائیں اور بتائیں کہ جھوٹ بولنے والے کی کتنی بے عزتی اور بُرا انجام بتایا گیا ہے۔ اللہ اور رسول ﷺ کی طرف سے کتنی مذمت کی گئی ہے۔ اس کے ساتھ جھوٹ بولنے کے محرّکات بھی تلاش کریں کہ کہیں ان کے ساتھ بہت سختی کا مظاہرہ تو نہیں کیا جا رہا۔ تو اس کا علاج یوں کیا جا سکتا ہے کہ بچوں اور نوکروں پر بہت زیادہ سختی اور غصہ نہ کیا جائے بلکہ کچھ عرصے کے لیے ان پر بالکل غصہ کرنا چھوڑ دیں۔ اکثر بچے جھوٹ بولتے ہیں وجہ جو بھی ہو مگر بچوں کی یہ عادت تو چھڑوانی ہے، اگر بچے ماں کے پیٹ سے سیکھے سکھائے، تربیت یافتہ، سچے مومن پیدا ہوں تو اللہ تعالیٰ کو نہ ماں باپ کا سایہ عطا کرنے کی ضرورت تھی اور نہ قرآن نازل کرنے کی ضرورت تھی۔

{يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ} (آل عمران: ۱۶۴)

''رسول ﷺ قرآن کی آیات پڑھ کر سناتے ہیں اور ان کا تزکیہ فرماتے ہیں۔''

جہاں خرابی کا خدشہ ہوگا، وہیں تزکیہ کی ضرورت پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ نے بچوں کی تربیت کی ذمہ داری ماں باپ پر عائد کی ہے۔ صرف پیدا کرنا کافی نہیں، تربیت کرنا اصل مرحلہ ہے، بچے کو انسان بنانا مشکل ہے، اُس کے اخلاق سنوارنا نازک کام ہے۔ جب ہم بچوں کو ڈانٹتے ہیں تو وہ اور ڈر جاتے ہیں، اور زیادہ جھوٹ بولتے ہیں، سہم جاتے ہیں۔ اسی لیے بالکل ڈانٹنا چھوڑ دیں۔ بچوں کے خراب نمبر آتے ہیں تو وہ ٹیسٹ کاپی چھپا لیتے ہیں، بچے ڈائری چھپا دیتے ہیں یا خود ہی دستخط کر کے لے جاتے ہیں۔ سو کچھ دن اپنے غصے پر قابو پالیں۔ بچوں کو یہ باور کرائیں کہ اگر اُن سے غلطی ہو بھی گئی تو کوئی مسئلہ نہیں، اُس کا رزلٹ دیکھ کر بھی سختی نہ کریں، اگر وہ صفر بھی لے کر آیا ہے تو آپ غصہ نہ کریں اور اس کو سچ بولنے پر شاباش دیں، تعریف کریں کہ آپ نے مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ پہلے بڑی چیز کا علاج کریں نمبر اچھے لانے کا تعلق تو دنیاوی قابلیت سے ہے لیکن جھوٹ تو جہنم میں لے جائے گا۔ آپ بچے کو پہلے بڑی برائیوں سے بچائیں۔ اس کے بعد چھوٹے مسائل کی طرف توجہ دیں، ایسا نہیں ہے کہ دنیا کے معاملے میں بالکل بے نیاز ہو جائیں، یہ بھی غلط ہے۔ اس کا بھی علاج کرنا ہے لیکن جو زیادہ خطرناک ہے اس پر پہلے توجہ دیں۔ مثلاً ایک طرف مچھر ہے، دوسری طرف سے سانپ بچھو ہے، پہلے کس سے بچائیں گے؟ کیا ہم مچھر سے بچانے کے لیے خود کو سانپ کے حوالے کر دیں گے؟ کبھی بھی نہیں، پہلے بڑے نقصان سے بچائیں، پھر چھوٹے نقصان کا بھی ازالہ ہو جائے گا۔

اسی طرح نوکروں سے بھی غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ برتن ٹوٹتے ہیں، کھانا خراب ہوجاتا ہے، جل جاتا ہے، کچھ دن صبر سے کام لیں بجائے ڈانٹنے کے، سمجھانے کی کوشش کریں۔ بُرا کہنا چھوڑ دیں۔ اللہ نے چاہا تو یہ عادت جاتی رہے گی۔ اسی طرح بچوں پر توجہ دیں اور اُن کے عیبوں اور برائیوں کو کھوج کھوج کر ختم کریں لیکن بڑی حکمت ودانائی سے، جہاں پیار کی ضرورت ہو، وہاں پیار سے اور جہاں دھمکانے یا غصے کی ضرورت ہو، وہاں سختی سے نمٹیں۔

علاج کی ضرورت:

بجائے ناراض ہونے کے، چیخنے چلانے کے ہمیں علاج اور تربیت کی فکر کرنی چاہیے۔ یہ احساس دلائیں کہ جھوٹ بولنا بہت بُرا ہے۔ پھر ان کو ڈر اور خوف سے نجات دلانے کی کوشش کریں۔ ساتھ ہی ساتھ تعمیرِ سیرت کی ضرورت ہے کہ دیکھو جھوٹ بول کر ہم نے ایک برائی کی ہے ایک گناہ کیا ہے، غلط کام کیا ہے، سچ کا اور جھوٹ کا انجام بتانا چاہیے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقًا)) (۱)

''تم سچائی کو لازم پکڑ لو اور ہمیشہ سچ ہی بولو کیوں کہ سچ بولنا نیکی کے راستے پر ڈال دیتا ہے اور نیکی جنت تک لے جاتی ہے اور آدمی جب ہمیشہ سچ ہی بولتا ہے اور سچائی ہی کو اختیار کرتا ہے تو وہ مقام صدیقیت تک پہنچ جاتا ہے اور اللہ کے ہاں صدیقین میں لکھ لیا جاتا ہے۔''

ایک اور حدیث مبارکہ میں آتا ہے۔

((وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ وَمَا يَزَالُ الْعَبْدُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا)) (۲)

''اور جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو کیوں کہ جھوٹ کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستے پر ڈال دیتی ہے اور بدکاری اس کو دوزخ تک پہنچا دیتی ہے اور آدمی جب جھوٹ بولنے کا عادی ہوجاتا ہے اور اس کو اختیار کر لیتا ہے تو انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے ہاں کذّابین یعنی انتہائی جھوٹ بولنے والوں میں لکھ دیا جاتا ہے۔''

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر و الصلۃ، باب ماجاء فی الصدق و الکذب

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب

مشہور ہے ایک جھوٹ چھپانے کے لیے ستر جھوٹ اور بولنے پڑ جاتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، وہ وہیں کا وہیں ہوتا ہے اور پکڑا جاتا ہے۔ اس کے علاج کے لیے ''ترغیب'' اور ''ترہیب'' دونوں ساتھ ساتھ استعمال کرنا ہوں گے۔ اُمید بھی دلانی ہے اور خوف بھی باقی رکھنا ہے۔ سزا کا خوف بھی ہو اور انعام کی کشش بھی تا کہ وہ سچائی اختیار کریں اور رفتہ رفتہ جھوٹ کو چھوڑ دیں۔

سستی اور کاہلی کی وجہ سے جھوٹ:

جھوٹ کی ایک اور وجہ ''سستی'' اور ''کاہلی'' ہے۔ پتا ہے ایک کام کرنا ہے لیکن نہیں کر رہے، ٹالتے جا رہے ہیں، پھر بہانے بناتے ہیں اور جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں۔ کہیں وقت پر پہنچنا ہے، دیر سے اٹھے، تیار ہونے میں بہت سا وقت لیا، اگلا شخص انتظار کر رہا ہے۔ جب اس نے پوچھا دیر کیوں ہوگئی؟ تو کہہ دیا کہ راستے میں ٹریفک بہت زیادہ تھا، جھوٹ بول کر جان چھڑائی حالانکہ دیر کی وجہ اپنی سُستی کاہلی اور غیر ذمہ دارانہ روّیہ تھا۔

بعض لوگ دیر سے پہنچنے پر یہ جھوٹ بول دیتے ہیں کہ نکلنے ہی والے تھے کہ مہمان آ گئے۔ بڑے آرام سے جھوٹ بول دیا، کوئی کہیں کام کرتا ہے تنخواہ لیتا ہے، مگر ایک دن دل چاہا گھر پر پڑے رہیں، آرام کر لیں، تو بیماری کا بہانہ بنا کر چھٹی لے لی، جھوٹ بول دیا۔ یہ تو بہت عام ہے، بیوی اچانک بیمار ہوگئی، یا بچہ بیمار ہو گیا یا کوئی اور جھوٹا بہانہ بنا کر چھٹی کر لی۔ یہ بہانہ بڑے بڑے افسروں سے لے کر چپراسی تک سب کے سب بناتے ہیں۔ لہٰذا علاج کاہلی کا کرنا چاہیے۔ احساسِ ذمہ داری پیدا کرنا چاہیے، وقت کی پابندی کو اپنا شعار بنائیں، اچھے طریقے سے ہر وعدہ پورا کریں۔ وقت کا صحیح حساب کتاب رکھیں تا کہ کاہلی اور سستی کی وجہ سے جھوٹ نہ بولنا پڑے۔ جس کام کا جو وقت ہے اس وقت پر وہ کام مکمل کر لیں۔ جب انسان بروقت کام کرنے کا عادی ہوتا ہے تو پھر بہت سے موقعوں پر جھوٹ نہیں بولنا پڑتا۔

غیر حقیقی وعدہ:

ایک اور وجہ غیر حقیقی وعدے ہوتے ہیں، جذبات میں آ کر وعدہ کر لیا، مگر اب نبھا یا نہیں جا رہا۔ مثلاً کسی بچے کی ماں ملی، جس کا بچہ اُسی سکول میں ہے جس میں آپ کا بچہ پڑھتا ہے۔ اس نے ذکر کیا کہ مجھے اپنے بچے کو اسکول لانے اور لے جانے میں بہت مشکل ہو رہی ہے اور میرے میاں بھی یہاں نہیں ہوتے، بڑی مشکل میں ہوں۔ آپ کا دل اتنا نرم ہوا کہ فوراً وعدہ کر لیا کہ میں آپ

کے بچے کو روز لے لیا کروں گی اور واپسی پر چھوڑ بھی دیا کروں گی، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ اس وقت تو ترس کھا کر وعدہ کر لیا۔ لیکن خود اپنا بچہ وقت سے کچھ دیر بعد ہی تیار ہو کر گھر سے نکلتا ہے۔ خود اس کو اسکول پہنچتے پہنچتے دیر ہو جاتی ہے۔ دوسرے کے بچے کو کیسے راستے سے لیں گے، بغیر سوچے سمجھے وعدہ تو کر لیا مگر پھر روز جھوٹ بول رہے ہیں۔ اس کا علاج یہ ہے کہ پہلے سوچ سمجھ کر وعدہ کریں کہ پورا کر پائیں گے یا نہیں، اس کے ساتھ جن لوگوں پر اس وعدے کو نبھانے میں مدد لینی ہے ان سے بھی پوچھ لیں کہ کیا روز کسی دوسرے بچے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں؟ فوراً وعدہ مت کریں۔ پہلے سوچ لیں، اور اس کے بعد اگر ممکن ہے تو ضرور مدد کریں اور اگر ممکن نہیں تو وعدہ مت کریں۔

اور اگر وعدہ کر لیا اور نبھانے میں کوئی مشکل پیش آ رہی ہے تو قرآن نے اس کا بھی ہمیں راستہ بتا دیا ہے۔ ''ان کے سامنے تم اس چیز کو رکھ دو۔'' بتا دو کہ ہم یہ وعدہ پورا نہیں کر سکتے، آپ اپنا کوئی اور انتظام کر لیں۔ اس کی بھی اجازت ہے۔ اگر وعدے پر عمل کرنا ممکن نہیں تو سامنے والے کو اطلاع دے دیں کہ ہم مجبور ہیں، یہ کام نہیں کر سکتے آپ اپنا کوئی اور بندوبست کر لیں اور اگر کسی سے ملنے کا وقت طے کر لیا ہے اور آپ وقت پر نہیں پہنچ پائیں گے اور وہ انتظار کرے گا تو قبل از وقت مطلع کر دیں کہ میں ذرا دیر سے پہنچوں گا۔

بھول جانے کی وجہ سے جھوٹ:

جھوٹ بولنے کی ایک اور وجہ بھول جانا ہے۔ کسی سے کوئی وعدہ کیا مگر بالکل بھول گئے، آنکھ لگ گئی، ذہن سے نکل گیا کہ ان سے ملنا تھا، یا فون کرنا تھا۔ اب ان کو فون کر کے ساری صورت حال بتا دیں کہ میں بالکل بھول گیا تھا یا سو گیا تھا۔ بجائے اس کے کہ کوئی جھوٹی کہانی بنائیں، کہہ دیں معافی چاہتا ہوں آپ کو انتظار کرنا پڑا۔ اس معاملے میں عام طور پر جھوٹ کہا جاتا ہے کہ ہم مسلسل فون کر رہے تھے مگر مل نہیں رہا تھا یا کوئی اٹھا ہی نہیں رہا تھا۔ ایسا مت کریں بلکہ اعتراف کر لیں کہ کیا ماجرا ہوا۔ اپنی غلطی مان لینے سے وقتی شرمندگی اور ندامت ہوتی ہے مگر آئندہ انسان محتاط رہتا ہے، اس کے برعکس جھوٹ بولنے سے اصلاح کا موقع جاتا رہتا ہے، جان چھوٹ جاتی ہے اور ندامت بھی نہیں ہوتی۔ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر پوری کوشش کریں کہ جھوٹ کی نوبت نہ آئے۔

بچوں کو بہلانے کے لیے جھوٹ:

بچوں کو بہلانے کے لیے بھی اکثر جھوٹ بولا جاتا ہے۔ بچہ رو رہا ہے، اسے بہلانے کے لیے

کہہ دیا کہ کل تمہیں پارک لے جائیں گے، چڑیا گھر لے جائیں گے یا کوئی چیز دلوادیں گے۔ ابھی ابو آجائیں تو باہر لے جائیں گے یا کوئی چیز چھپا کر کہہ دیا کہ چڑیا لے گئی، بلی لے گئی۔ یا ڈرانے کے لیے کہہ دیا کہ کتا آجائے گا، کاٹ کھائے گا، باہر مت نکلو، بڈھا بابا بوری میں باندھ کر کے لے جائے گا۔ اس طرح خوف ان کے ذہن پر مسلط کر دیا۔ جس سے وہ زندگی بھر نکل نہیں پاتے۔ اس بارے میں بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ اس معاملے کی نزاکت ایک حدیث میں ملاحظہ فرمائیں، حضرت عبداللہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((دَعَتْنِي أُمِّي يَوْمًا وَرَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَاعِدٌ فِي بَيْتِنَا فَقَالَتْ هَا تَعَالَ أُعْطِيكَ فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَا أَرَدْتِ أَنْ تُعْطِيهِ قَالَتْ أُعْطِيهِ تَمْرًا فَقَالَ لَهَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَمَا إِنَّكِ لَوْلَمْ تُعْطِهِ شَيْئًا كُتِبَتْ عَلَيْكِ كِذْبَةٌ)) (۱)

''میری ماں نے مجھ کو ایک دن بلایا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے گھر تشریف فرما تھے، میری ماں نے کہا ادھر آ، میں تجھ کو ایک چیز دوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''تم نے کیا دینے کا ارادہ کیا ہے؟'' میری ماں نے کہا کھجور یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کہا کہ'' اگر تو اس کو کھجور نہ دیتی تو تیرے اوپر ایک جھوٹ لکھ دیا جاتا۔''

اور ہم کتنے آرام سے بچوں سے جھوٹ بول دیتے ہیں بلکہ انھیں جھوٹ سے بچانے کے لیے بھی جھوٹ بول دیتے ہیں۔ ان سے کہتے ہیں کہ اگر جھوٹ بولا تو زبان کالی ہو جائے گی۔ غیر شعوری طور پر جھوٹ بولے چلے جاتے ہیں۔

اپنا یا دوسروں کا مرتبہ بڑھانے کے لیے جھوٹ:

اسی طرح بعض دفعہ اپنے رشتے داروں کی عزت رکھنے کے لیے، ان کا رتبہ بڑھانے کے لیے یا کسی سے اپنا خاص تعلق ظاہر کرنے کے لیے غلط بات بول دی جاتی ہے۔ مثلاً بیوی بہت سی چیزیں خود شوہر کی کمائی سے خرید کر لاتی ہے، ساس، نند یا دیورانی پوچھ لے تو کہہ دیتی ہے امی نے دی ہے تاکہ میکے کا مرتبہ بلند ہو جائے۔ یا پھر جمعہ بازار، اتوار بازار سے کوئی اچھا جوتا یا بستہ خرید کر لائی اور پوچھنے پر بتایا کہ بھائی نے باہر سے بھجوایا ہے، یہ بہت عام جھوٹ ہے۔ اس سے بھائی کا

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب

بھی رُعب ہوگیا کہ کتنا خیال کرتا ہے اور یہ بھی کہ ہم کیسی مہنگی مہنگی چیزیں استعمال کرتے ہیں۔ ایسے جھوٹ کو گناہ بھی نہیں سمجھتے ہیں حالانکہ یہ سراسر جھوٹ ہے۔

اس بارے میں بخاری اور مسلم میں ایک روایت ہے کہ:

((أَنَّ امْرَأَةً قَالَتْ يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ لِي ضَرَّةً فَهَلْ عَلَيَّ جُنَاحٌ إِنْ تَشَبَّعْتُ مِنْ زَوْجِي غَيْرَ الَّذِي يُعْطِينِي فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ الْمُتَشَبِّعُ بِمَا لَمْ يُعْطَ كَلَابِسِ ثَوْبَيْ زُورٍ)) (۱)

''ایک عورت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا'' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میری ایک سوکن ہے، کیا مجھے اس بات کا گناہ ملے گا اگر میں اس پر یہ ظاہر کروں کہ مجھے اپنے خاوند کی طرف سے خوب مل رہا ہے جب کہ وہ یہ چیزیں مجھ کو نہیں دیتا۔'' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا'' جو چیز اُس کو نہیں دی گئی اس کا جھوٹ موٹ اظہار کرنے والا، جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔''

اسی طرح کوئی دعوت کی اور سارا کھانا باورچی سے پکوایا۔ سب انگلیاں چاٹتے رہ گئے، بہت تعریف ہوئی! تعریفیں وصول کرتے ہوئے کسی کو یہ نہیں بتایا کہ یہ کھانا کس نے بنایا ہے، یہ دراصل خانساماں کے ہاتھ کا مزہ ہے، تھوڑی سی ہمت کر کے بتا دیتے کہ اس ساری تعریف کا اصل حق دار باورچی ہے مگر نہیں! کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے سارا کریڈٹ (credit) خود لے لیا اور جھوٹ کا ارتکاب کیا۔ جھوٹ موٹ کی اپنی تعریف کروالی اور لوگوں پر اپنی دھاک بٹھادی۔

ٹالنے کے لیے جھوٹ:

پھر ٹالنے کے لیے بھی جھوٹ بولا جاتا ہے۔ فقیر دروازے پر خیرات مانگ رہا ہے۔ نوکر سے کہلوادیا گھر پر کوئی نہیں ہے۔ یا کوئی ملنے والا آ گیا تو نوکر سے کہلوایا کہ سب باہر گئے ہوئے ہیں۔ یا کوئی ملنے آ رہا ہے، آنا چاہ رہا ہے، جھوٹ کہہ دیا کہ ہم نے تو باہر جانے کا پروگرام بنا رکھا ہے، ہم اس وقت گھر پر نہیں ہوں گے۔ اس کو ٹالنے کے لیے یہ بھی خیال نہ آیا کہ کتنا بڑا گناہ کر بیٹھے۔

پیسا دینے میں جھوٹ:

بعض دفعہ دکان دار سے معاملہ ہوتا ہے، بل بنا ۴۶۰ روپے، اس کو ہزار کا نوٹ دے دیا۔ وہ کہتا ہے جناب کھلا دے دیں تو کہہ دیا کُھلا (change) نہیں ہے۔ اچھا خاصا کُھلا

(۱) صحیح البخاری، کتاب النکاح، باب المتشبع بما لم ینل---

(change) بیگ میں موجود ہے، مگر جھوٹ کہہ دیا کہ کُھلا (change) نہیں ہے۔ یہ عام کرتے ہیں اور یہ احساس نہیں کہ جھوٹ کا گناہ سر زد ہو رہا ہے۔ تھوڑی سی کاہلی کی وجہ سے کہ کون گن گن کر بل ادا کرے، دکان دار کو کرنے دو۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے اتنے بڑے گناہ کو سر مول لے لیتے ہیں۔

عجلت اور تاخیر والا جھوٹ:

عجلت، جلد بازی کی وجہ سے بھی جھوٹ بولا جاتا ہے۔ کوئی کپڑا خریدا اور سلنے کے لیے دیا پہننے کی جلدی میں درزی سے کہا کہ تین دن بعد شادی ہے یا پارٹی ہے اور مجھے پہننا ہے، بس جلدی سے دیں۔ یا مجھے شہر سے باہر جانا ہے، مجھے جلدی چاہیے۔ حالاں کہ ایسی کوئی بات نہیں، صرف بے صبری ہے۔ یہ بہت بُری بات ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو سچ بولنے کی توفیق عطا کرے اور پچھلے جھوٹ کو معاف فرمادے۔ آمین! نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی ہے:

((طَهِّرْ لِسَانِي مِنَ الْكَذِبِ))(۱)

''(اے اللہ) میری زبان کو جھوٹ سے پاک کردے۔''

ہنسی مزاح کے لیے جھوٹ:

جھوٹ بولنے کی ایک وجہ مزاح بھی ہوتی ہے۔ ہر وقت لطیفہ گوئی کی عادت۔ صرف لوگوں کو ہنسانے کے لیے، تفریح (entertain) کی خاطر جھوٹ بولا جاتا ہے، جھوٹے قصے، کہانیاں مختلف لوگوں کے بارے میں بنائی جاتی ہیں۔ اسٹیج شو اور کامیڈی شو (comedy shows) دکھائے جاتے ہیں۔ بڑے ذوق وشوق سے یہ پروگرام دیکھے جاتے ہیں اور ٹھٹھے مارے جاتے ہیں۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((وَيْلٌ لِلَّذِي يُحَدِّثُ فَيَكْذِبُ لِيُضْحِكَ بِهِ الْقَوْمَ وَيْلٌ لَهُ))(۲)

''ہلاکت اور بربادی اس شخص کے لیے، جو بات کرے تو جھوٹ بولے تاکہ وہ لوگوں کو ہنسائے، افسوس اس کے اوپر، افسوس اس کے اوپر۔''

مزاح کی اسلام میں یقیناً اجازت ہے، مزاح سے کام لیا جاسکتا ہے۔ کسی کے اندر حسِ مزاح

---

(۱) کنز العمال فی سنن الاقوال والأفعال، کتاب الدعا، الفصل السادس جوامع الأدعیة

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی التشدید فی الکذب

(sense of humour) ہو۔ کسی بات کو اس طریقے سے بیان کر دیا جائے کہ شگفتگی پیدا ہو جائے یہ اور چیز ہے اور اس کی مثالیں ہمیں خود رسول اکرم ﷺ کی سنت سے بھی ملتی ہیں اور صحابہؓ کے عمل سے بھی ملتی ہیں۔ لیکن صاف جھوٹ بول دینا کہ ایک سِکھ تھا، سردار تھا، پٹھان تھا یا میمن تھا۔ یہ پورے طبقے اور قوم کا مذاق اڑانے کے مصداق ہے، بداخلاقی کا مظاہرہ ہے، حد سے بڑھی بدتمیزی کی ہے۔

لاڈ میں جھوٹ:

بعض دفعہ لاڈ میں بھی جھوٹ بولا جاتا ہے اور یہ احساس بھی نہیں ہوتا کہ ہم نے جھوٹ بول دیا، یہ اعتراف بھی نہیں کر پاتے کہ غلط بیانی ہوگئی۔ بڑے بڑے جھوٹ سے تو ہم بچ جاتے ہیں لیکن بعض دفعہ غیر شعوری طور پر چھوٹے چھوٹے جھوٹ بول دیتے ہیں، بلا وجہ غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ کسی نے محفل میں پوچھ لیا یہ بریسلٹ (bracelet) آپ کے شوہر نے دیا ہے؟ اب بتانا نہیں چاہتی تو کہہ دیتی ہے نہیں، انہوں نے تو کبھی کچھ نہیں دیا۔

لطیفہ گوئی کی عادت:

لطیفہ گوئی کی عادت اچھی نہیں ہے۔ اس کی شناعت حدیث مبارکہ میں بھی موجود ہے، اس سے بچنا چاہیے، ہاں اگر کوئی سچا واقعہ مزاح کے طور پر سنایا تو ٹھیک ہے۔ اس کی اجازت ہے، گنجائش ہے۔ لیکن گھڑ گھڑ کر لطیفے بنانا اور محفلوں میں سنانا اور داد پانا، لوگوں کو ہنسا ہنسا کر لوٹ پوٹ کرنا۔ بعض لوگ لطیفے سنانے کے ماہر ہوتے ہیں۔ اور باقاعدہ پیشے کے طور پر اختیار کر لیتے ہیں، میڈیا پر یا اسٹیج ڈراموں میں اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں، لوگ لاکھوں روپے دے کر انھیں بُلاتے ہیں۔ یہ سب بھی جھوٹ کا کاروبار ہے، جھوٹ کی محفلیں ہیں۔

ہر سنی سنائی بات بیان کرنا:

پھر ایک وجہ ہے ہر سنی سنائی بات آگے بیان کر دینا۔ مسلم میں روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((كَفَى بِالْمَرْءِ كَذِبًا أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ))[1]

''کسی انسان کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات آگے بیان کر دے۔''

---

(1) صحیح مسلم، مقدمة الكتاب، باب النهي عن الحديث بكل ما سمع

یعنی جھوٹ افواہیں پھیلانے کا باعث بنتا ہے۔ حتی الامکان پہلے بات کی تصدیق کریں پھر اگر ضرورت ہے تو بات کو آگے بیان کریں ورنہ نہ کریں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر سنی سنائی بات جھوٹ ہوتی ہے اور ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھا جائے، بس کوئی بات آگے بتانے میں احتیاط سے کام لیں۔ مثلاً ڈاکٹر کوئی مرض تشخیص کرتا ہے کہ آپ کو یہ بیماری ہے تو ہم اسے سنی سنائی نہیں کہتے بلکہ اس حدیث سے مراد یہ ہے کہ اُدھر سے بات سنی اِدھر بیان کر دی اور اِدھر سے سنی اُدھر بیان کر دی، اس طرح معاشرے میں افواہوں کا بازار گرم کر دیا، بے چینی پھیلا دی۔ بھارت حملہ کرنے والا ہے، فلاں دن گھروں سے باہر نہ نکلنا، اس قسم کی افواہیں پھیلانے کو سنی سنائی کہتے ہیں۔

خوابوں میں جھوٹ:

پھر ایک وجہ ہے جھوٹے خواب بیان کرنا۔ بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ تَحَلَّمَ بِحُلْمٍ لَمْ يَرَهُ كُلِّفَ أَنْ يَعْقِدَ بَيْنَ شَعِيرَتَيْنِ وَلَنْ يَفْعَلَ)) (۱)

''جس شخص نے ایسا خواب بیان کیا، جو اُس نے نہیں دیکھا تو قیامت کے دن اس کو مجبور کیا جائے گا کہ جو کے دو دانوں کے درمیان گرہ لگائے، جو وہ نہیں کر سکے گا۔''

یہ بھی جھوٹ میں شامل ہے کہ لوگوں کو متاثر (impress) کرنے اور لوگوں پر اپنے تقویٰ وزُہد یا عبادت گزاری کا رعب قائم کرنے کے لیے خواب جوڑ جوڑ کر بیان کیے جائیں۔ اوّل تو ویسے ہی لوگوں کو اپنے خواب بیان کرنے سے گریز کرنا چاہیے اور اگر کبھی خواب بیان کریں تو پھر حاشیہ آرائی (embroidery) نہ کریں۔ خوابوں کو زیبِ داستان کے لیے بڑھا چڑھا کر بیان نہ کریں، جتنا دیکھا ہے اتنا بیان کریں۔ کسی کی نیکی، بزرگی اور جنتی ہونا خوابوں سے نہیں پتا چلتا، عمل سے پتا چلتا ہے، اخلاق اور کردار سے پتا چلتا ہے۔ سو خوابوں کو صرف سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے سامنے بیان کریں اور بُرے خوابوں کا کسی سے ذکر مت کریں، بڑھا چڑھا کے بیان نہ کریں۔

بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من کذب فی حلمه

((اِنَّ مِنْ أَفْرَی الْفِرَی أَنْ یُرِیَ عَیْنَیْهِ مَالَمْ تَرَ))(۱)

''سب سے بڑا جھوٹ یہ ہے کہ آدمی اپنی آنکھوں کو وہ چیز دکھائے جو اس نے نہیں دیکھی۔''

یعنی کسی چیز کے متعلق کہے کہ میں نے دیکھا ہے حالاں کہ اس نے نہیں دیکھا۔ اس میں بھی غیر شعوری طور پر جھوٹ شامل ہو جاتا ہے۔ اگر اپنی آنکھوں سے کوئی چیز نہیں دیکھی تو کبھی مت کہیں کہ ہاں ہم نے یہ دیکھا ہے۔

تعریف میں جھوٹ:

ایک جھوٹ کی وجہ جو سب کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے، وہ ہے: ''جھوٹی تعریف۔'' اس کا رواج ہم اپنے معاشرے میں کافی حد تک دیکھتے ہیں اور لوگ نیکی سمجھ کر جھوٹی تعریفیں کرتے ہیں۔ اب کوئی خاتون جو فربہ (over weight) تھیں، چہرہ بہر حال خوب صورت تھا، چمکتا تھا، جِلد تر و تازہ تھی لیکن ڈائٹنگ (dieting) کر کے اپنے آپ کو بہت دبلا کر لیا، وزن گھٹا تو چہرے کی رونق بھی ختم ہو گئی، جِلد ڈھلک گئی، آنکھوں کے نیچے حلقے پڑ گئے، لیکن لوگ اُس خاتون کو دیکھ کر زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے۔ آپ تو دوبارہ جوان ہو گئیں، کتنا وزن کم کر لیا ہے، بہت ہی کم عمر لگ رہی ہیں حالاں کہ یہ سب اس کو خوش کرنے کے لیے کہا جا رہا ہے اور سب جھوٹ ہے۔ وزن کم ہوا ہے مگر چہرے کا نکھار چلا گیا۔ اگر وہ دُبلی ہونے کے بعد اتنی حسین اور جوان نہیں لگ رہیں تو جھوٹ کیوں بولیں! اسی طرح کوئی مناسب سا کھانا بنا ہو اور دل رکھنے کے لیے بہت زیادہ تعریف کرنا بھی جھوٹ ہے۔

پھر کسی نئے فیشن کے کپڑے جو آپ کو زیادہ پسند نہیں ہوں گے مگر جس نے پہنے ہیں، اس کی حد سے زیادہ تعریف کر ڈالی، اس کے بالوں کی بہت تعریف کی۔ اس کی بالکل ضرورت نہیں یا تو چپ رہیں یا بالکل سچ کہیں، جھوٹ بالکل مت بولیں یا مناسب الفاظ استعمال کریں۔ اچھا ہے تو کہہ دیں اچھا ہے اور اگر نہیں ہے تو جھوٹی تعریف مت کیا کریں، چپ رہیں، جھوٹ اور مبالغہ آرائی کی بالکل ضرورت نہیں۔

ٹکٹ وغیرہ میں رعایت کے لیے جھوٹ:

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ تفریح گاہوں میں بچوں اور بڑوں کا ٹکٹ الگ الگ قیمت کا ہوتا ہے۔ یا ایسا ہوتا

(۱) صحیح البخاری، کتاب التعبیر، باب من کذب فی حلمه۔۔۔

ہے کہ چھ یا آٹھ برس کے بچوں کا داخلہ مفت ہے۔ایسی جگہ پر اگر آپ اپنے دس گیارہ سال کے بچے چھ یا آٹھ سال کا بنا کر مفت لے جانا چاہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے یا پورے ٹکٹ کی جگہ آدھا ٹکٹ چلانا چاہیں تو یہ بھی جھوٹ ہے۔وہ آپ سے ثبوت نہیں مانگتا۔لیکن یہ سوچیں کہ ایک جھوٹ بول کر کتنا بچا لیا؟ اور جھوٹ کا کتنا بڑا گناہ کما لیا؟ بعض اوقات جہاز کا ٹکٹ، بسوں کے ٹکٹ یا کسی میوزیم کا ٹکٹ لیتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لے کر کچھ روپے بچا لیتے ہیں۔ یہ انتہائی گری ہوئی حرکت ہے۔ چند روپوں کی خاطر ایمان کا سودا کر لیتے ہیں۔آخرت کا نقصان، ناقابلِ تلافی نقصان۔ان چیزوں میں یہ احساس بھی نہیں ہوتا، کہ غلط کام کیا ہے، پروا بھی نہیں کرتا بلکہ فاتحانہ انداز سے مسکرا مسکرا کر اندر داخل ہو جاتے ہیں، جیسے بڑا تیر مار ڈالا۔

بعض دفعہ کوئی چیز خریدی، اپنی لاپروائی سے خراب ہوئی تو دکان دار کو واپس کر دی کہ یہ خراب نکلی یا کیسٹ لے آئیں گے، دیکھ کر پسند نہ آئی تو واپس کر دی کہ یہ تو خراب نکلی، چلی نہیں یا ٹوٹ گئی تھی وغیرہ وغیرہ۔پچیس تیس روپے بچا کر کیا کمایا؟ ایسا نہیں کرنا چاہیے اور اگر کبھی کیا ہے یا کرتے رہتے ہیں تو بہت غلط ہے، مت کریں! دھوکا بھی ہے اور جھوٹ بھی۔

دام کم کروانے کے لیے جھوٹ:

کپڑا یا کوئی اور چیز خریدنے گئے، دام کم کروانے کے لیے جھوٹ کہہ دیا کہ ساتھ والی دکان میں تو کم قیمت میں مل رہا ہے۔اور پھر اس طرح کے ہتھکنڈوں کو عقل مندی کی دلیل سمجھتے ہیں۔بعض دفعہ دکان دار سے کپڑا سستا حاصل کرنے کے لیے یہ جھوٹا وعدہ بھی کر لیتے ہیں کہ آئندہ ہم آپ کی دکان سے خریداری کریں گے، جاننے والوں کو بھی آپ کی دکان کا پتا دیں گے۔حالاں کہ گھر جاتے جاتے بھول جاتے ہیں کہ کیا وعدہ کیا تھا۔منافق کی نشانی یاد کریں کہ جب وعدہ کرتا ہے تو خلاف ورزی کرتا ہے۔اس طرح کا لالچ دینے کی کیا ضرورت ہے۔اگر گنجائش بن رہی ہے تو لے لیں ورنہ چھوڑ دیں، بازاروں میں زیادہ پھرنا ویسے بھی پسندیدہ نہیں، بہت آوازوں کا بلند کرنا، بہت بھاؤ تاؤ کرنا، لڑنا جھگڑنا، بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ اُس نے قیمت بتائی، آپ نے اپنی قیمت بتائی۔ معاملہ طے ہوتا ہے تو ٹھیک ورنہ چل دیں، بات طویل مت کریں۔

یہ تو جھوٹ کی عام اقسام ہیں، حقیر فائدوں کے لیے، اٹھتے بیٹھتے، گفتگو کے اندر جھوٹ بولا جاتا ہے، اگر ہم اپنی دن بھر کی فہرست بنائیں، تو جانے کتنے ہی جھوٹ ہم دن بھر بولتے ہیں، کچھ لوگ اتنا جھوٹ بولتے ہیں کہ ان کو خود جھوٹ اور سچ کی پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ جو موقع بہ موقع

جھوٹ گھڑ لیتے ہیں۔کوئی ملنے والا آیا کہ آپ اتنے دن سے ہمارے ہاں ملنے نہیں آئے۔فوراً کہہ دیا میرے پاس تو گاڑی ہی نہیں تھی یا میں آنا چاہتا تھا،فون بھی کیا،مگر تم گھر پر نہیں تھے۔

ترمذی میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا(متن)

''جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فرشتہ اس کے جھوٹ کی بو سے ایک میل دور چلا جاتا ہے۔''

تو سوچیں جب فرشتہ چلا جائے گا تو پھر اس کی جگہ کون لے گا۔شیطان ہی آئے گا۔

احادیث میں جھوٹ:

کچھ جھوٹ پیشہ چلانے کے لیے بولے جاتے ہیں۔ایک زمانے میں جھوٹی احادیث گھڑنے کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا۔نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جھوٹ گھڑا گیا،آپ کا نام لے کر ایسی باتیں بیان کیں جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں فرمائی تھیں ان کو موضوع احادیث کہا جاتا ہے۔صحیح مسلم میں سمورۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے،رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ حَدَّثَ عَنِّي بِحَدِيثٍ يُرَى أَنَّهُ كَذِبٌ فَهُوَ أَحَدُ الْكَاذِبِينَ)) (۱)

''جو شخص میری طرف منسوب کر کے کوئی بات بیان کرے اور وہ جانتا ہے یہ جھوٹ ہے،بس وہ بھی جھوٹوں میں سے ایک جھوٹا ہے۔''

یعنی معلوم ہے کہ یہ حدیث ہے ہی نہیں، پھر بھی لوگوں کے دل نرم کرنے کے لیے،وعظ اور بیان میں تاثیر پیدا کرنے کے لیے اگر وہ حدیث بیان کی جائے گی تو بیان کرنے والا بھی جھوٹا ہے۔ دھیان رکھیں،ایک ہوتی ہیں ضعیف احادیث اور ایک ہیں موضوع احادیث۔موضوع حدیث تو صریحاً جھوٹ ہے۔ضعیف حدیث یہ ہے کہ روایات میں کہیں نہ کہیں راویوں کا سلسلہ مجہول ہے،یا کسی راوی کے ثقہ ہونے میں شک ہے۔ضعیف احادیث ترغیب کے لیے بیان کی جاسکتی ہیں مگر ان سے احکام نہیں نکالے جاسکتے۔بدقسمتی سے ایک دور میں باقاعدہ لوگوں نے یہ پیشہ بنالیا تھا اور اپنی طرف سے احادیث گھڑ کر بیان کرتے تھے،ہزاروں کا مجمع ہوا کرتا تھا،خود بھی روتے تھے اور لوگ بھی ساتھ روتے جاتے تھے۔تو یہ نہ سمجھیں کہ جھوٹ میں تاثیر نہیں ہوتی۔جھوٹ میں بھی تاثیر ہوسکتی ہے۔اللہ تعالیٰ اپنی رحمت نازل فرمائے ان محدثین کے اُوپر امام بخاری،امام مسلم،امام ترمذی،امام نسائی و دیگر ائمہ رحمہم اللہ انہوں نے بڑی مشقت،محنت،عرق ریزی کر کے موضوع احادیث کو الگ کیا۔

---

(۱) صحیح مسلم، مقدمة الكتاب، باب وجوب الرواية عن الثقات

بخاری کی حدیث ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَذَبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ)) (۱)

''جو جان بوجھ کر مجھ پر جھوٹ گھڑتا ہے، اس کو چاہیے کہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنالے۔''

اتنا بڑا گناہ ہے، جھوٹی حدیث گھڑنا۔ یا کسی بات کو جو حدیث نہ ہو اس کو حدیث کہہ کر بیان کیا جائے، یہ بڑی جرأت ہے اور بہت بڑا گناہ ہے، اس معاملے میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

بعض دفعہ لوگوں نے تفسیر یا تو خود پڑھی ہوتی ہے یا پھر سنی ہوتی ہے تو تفسیر بیان کرتے وقت ادھر ادھر کی کئی باتیں کہہ دیتے ہیں۔ قرآن کی ایک آیت کی جب تفسیر ہوتی ہے کئی مثالیں اور قصے اس کے اندر آجاتے ہیں، جو مفسر کا اپنا بیان ہوتا ہے۔ لوگ ایسے قصّوں کو بھی کہتے ہیں قرآن میں لکھا ہے، یا قرآن میں آیا ہے، اگر ہم اپنی طرف سے قرآن میں اضافہ کریں گے تو ہم اللہ پر جھوٹ باندھیں گے۔

{وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهٗ}

(العنکبوت:۶۸)

''اس شخص سے بڑا ظالم کون ہوگا، جس نے اللہ پر جھوٹ باندھا اور جب سچائی اس کے سامنے آئی تو اس کو جھٹلا دیا۔''

اسی طرح ہم جو لطیفوں کی بات کر رہے تھے، اس میں بھی لوگوں کی اتنی جرأت ہو جاتی ہے کہ وہ باقاعدہ خدا اور انسان کا مکالمہ بیان کرنے لگتے ہیں۔ آپ نے ایسے مکالمے سنے ہوں گے کہ فلاں صاحب اللہ سے ملنے گئے، انہوں نے اللہ سے یہ کہا اور اللہ نے ان سے یہ کہا۔ اللہ پر جھوٹ گھڑتے ہیں، لطیفوں کے لیے، قہقہے لگوانے کے لیے یا فرشتوں پر جھوٹ گھڑ دیتے ہیں، پیسے کمانے کے لیے، اس معاملے میں بھی بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضروت ہے۔

جھوٹی قسم:

پھر ایک جھوٹ بولا جاتا ہے جھوٹی قسم کے طور پر، جس کو ''یَمِیْنِ غَمُوْس'' یعنی ڈبو دینے والی قسم کہا گیا ہے۔ کوئی فائدہ حاصل کرنے کے لیے جھوٹی قسم کھالی جاتی ہے۔ بخاری اور مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۱) صحیح البخاری، کتاب العلم، اثم من کذب علی النبی

((مَنْ حَلَفَ عَلَى يَمِينٍ يَقْتَطِعُ بِهَا مَالَ امْرِئٍ مُسْلِمٍ هُوَ عَلَيْهَا فَاجِرٌ لَقِيَ اللهَ وَهُوَ عَلَيْهِ غَضْبَانُ)) (۱)

''جس شخص نے حاکم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی، تاکہ اس کے ذریعے کسی مسلمان کا مال مار لے تو قیامت کے دن اللہ کے سامنے اس حال میں پیشی ہوگی کہ اللہ اس شخص پر غضب ناک ہوگا۔''

مسلم میں حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ وَإِنْ قَضِيبًا مِنْ أَرَاكٍ)) (۲)

''جس شخص نے قسم کھا کر، کسی مسلمان کا حق ناجائز طور پر مار لیا تو اللہ نے ایسے آدمی کے لیے دوزخ واجب کر دی اور جنت کو اس پر حرام کر دیا'' حاضرین میں سے کسی شخص نے پوچھا ''یارسول اللہ! اگرچہ وہ کوئی معمولی چیز بھی ہو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''ہاں'' اگرچہ پیلو کی ٹہنی ہی ہو۔''

اتنی معمولی اور حقیر چیز بھی اگر لے لی جھوٹی قسم کھا کر تو یہ حال ہوگا ایسا شخص اب جنت میں نہیں جا سکتا کہ اللہ نے اس پر اپنی جنت حرام کر دی۔

ابوداؤد میں حضرت اشعث بن قیس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَقْتَطِعُ أَحَدٌ مَالًا بِيَمِينٍ إِلَّا لَقِيَ اللهَ وَهُوَ أَجْذَمُ)) (۳)

''جو شخص کسی کا مال، جھوٹی قسم کھا کر مار لے گا وہ اللہ کے سامنے کوڑھی بن کر حاضر ہوگا۔''

کوئی مال، زمین، مکان یا دکان جھوٹی قسم کھا کر حاصل کر لی، کہ یہ میرا ہے اور ناجائز طور پر اپنا لیا۔ اپنے حق میں قسم کھا کر فیصلہ کروا لیا تو قیامت کے دن اس کا یہ انجام ہوگا۔ مگر آج کل تو یہ جھوٹی قسم کھا کر دوسروں کا مال ہتھیانا بہت عام ہے، جو قوم حقیر اور معمولی چیزوں کے لیے جھوٹ بولتی ہو، وہ بڑی بڑی چیزوں میں کس حد تک جا سکتی ہے۔ جھوٹ تو اب مزاج بن چکا ہے۔ ایک قوم کی کیا بات ہے، پوری دنیا میں یہ عام ہے۔ کمزور تو کمزور، بڑے بڑے طاقت ور، ڈکٹیٹر جھوٹ بولتے ہیں، بڑے بڑے ملکوں کے سربراہ جھوٹ بولتے ہیں، سفید جھوٹ بولتے ہیں۔

جھوٹی قسم کھا کر سودا بیچنے والا ان تین لوگوں میں سے ہے جن سے قیامت کے دن اللہ نہ کلام

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب المساقاۃ، باب الخصومۃ فی البئر و القضاء فیھا

(۲) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم۔

(۳) سنن ابی داؤد، کتاب الأیمان و النذور، باب فیمن حلف یمینا۔۔۔

فرمائے گا، نہ ان کو دیکھے گا، نہ ان کو پاک کرے گا اور ان کے لیے عذاب الیم ہے، یہ عام طور پر دکان دار کرتے ہیں، کپڑا خریدنے گئے۔ قیمت بتائی کہ اتنے میں میٹر دو یا سوٹ اتنے میں دو۔ فوراً کہیں گے۔ اللہ کی قسم اتنے کی تو خرید بھی نہیں ہے۔ شاید کوئی سچ کہہ رہا ہو، مگر اکثر جھوٹ ہی بولتے ہیں۔ دنیا میں تھوڑا بہت فائدہ حاصل ہو گیا لیکن آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کی طرف دیکھے گا بھی نہیں۔ اتنا بڑا گناہ ہے یہ! اسی لیے ایمان دار تاجر کا مرتبہ، انبیاء، صدیقین اور شہداء کے مرتبہ کے برابر بتلایا گیا ہے۔

جھوٹی گواہی:

جھوٹی گواہی بھی اب پیشہ بن گئی ہے۔ مقدمات میں فیصلے اپنے حق میں کروانے کے لیے کچھ معاوضے پر جھوٹے گواہ بھی مل جاتے ہیں۔ عدالت میں جا کر جب جھوٹی گواہیاں عام اور آسان ہو جاتی ہیں انصاف تو پھر ایک جنس بازار (commodity) بن کر رہ جاتا ہے، خریدی بیچی جانے والی چیز بن جاتا ہے۔ بخاری، مسلم میں حضرت ابی بکرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''کیا میں تم کو سب سے بڑے گناہ کی خبر نہ دوں؟ ہم نے کہا ضرور یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''

((اَلْکَبَائِرِ قَالَ الشِّرْکُ بِاللّٰہِ وَعُقُوْقُ الْوَالِدَیْنِ)) (۱)

فرمایا ''اللہ کے ساتھ شریک کرنا اور والدین کی نافرمانی کرنا۔''

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرما رہے تھے اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدھے ہو کر بیٹھ گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''اور جھوٹی گواہی! سنو جھوٹی گواہی کبیرہ گناہ ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ بات دہراتے رہے، دہراتے رہے یہاں تک کہ ہم نے تمنا کی کہ کاش آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اموش ہو جائیں۔ یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پریشانی دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چاہا کہ آپ خاموش ہو جائیں تو جھوٹی گواہی اتنا بڑا جرم ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گواہی صرف عدالت میں لی جاتی ہے، حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ گواہی کی اور بھی کئی شکلیں ہیں۔

جھوٹی گواہی کی مختلف شکلیں:

مثال کے طور پر (medical certificate) اس بات کی گواہی ہے کہ یہ آدمی بیمار ہے، جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ جس ڈاکٹر نے بھی بنایا اس نے جھوٹی گواہی دی۔ بچہ اسکول نہیں گیا تو لکھ کر بھیج دیا کہ بیمار ہے، جھوٹی گواہی دے دی۔ اتنی حقیر چیز کے لیے اتنا بڑا گناہ کمایا۔ یا عمرے یا حج کا

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، بیان الکبائر و اکبرھا

ویزا چاہیے ویسے ہی باہر ملک کے سفر کے لیے ویزا چاہیے۔ان کی شرط ہوتی ہے کہ ٹیکے لگوائیں، کچھ لوگ جھوٹا سرٹیفکیٹ لے لیتے ہیں۔جاننے والے ڈاکٹروں سے بنوا لیتے ہیں۔ ٹیکے نہیں لگوائے مگر سرٹیفکیٹ لے لیا۔ یا جیسے خواتین کے لیے شرط ہے کہ بغیر محرم حج پر یا عمرہ پر نہیں جاسکتیں تو کسی کو بھی پکڑ لیا۔دور پرے کا رشتہ دار ساتھ لے لیا،بعض دفعہ تو صرف جان پہچان والوں کو محرم بنا کر، دکھا کر ویزے لے لیتے ہیں اور وہ محرم نہیں ہوتا،جھوٹی گواہی دے کر اللہ کے گھر جاتے ہیں تو کیا عبادت قبول ہوگی؟

اسی طرح ڈگری بھی گواہی ہے کہ آپ نے یہ تعلیم حاصل کی ہے۔ بی اے، ایم اے کرلیا ہے۔جعلی ڈگری جاری کرنا جھوٹی گواہی ہے۔

پھر برتھ سرٹیفکیٹ (birth certificate) بھی گواہی ہے کہ یہ بچہ،اس دن ،اس سال پیدا ہوا ہے۔اگر عمر کم کرنے کے لیے غلط سرٹیفکیٹ بنایا تو جھوٹی گواہی حاصل کی۔ پھر امتحانوں کے پرچوں پر نمبر دینا بھی گواہی ہے،جان بوجھ کر کمی بیشی کرنا،کسی تعصب کی وجہ سے یا کسی کی رعایت کی وجہ سے یا سفارش کی وجہ سے نمبر کم یا زیادہ کرنا۔ یا شانِ بے نیازی، لاپروائی اور غیر ذمہ دارانہ روّیے کے نتیجے میں جو جی چاہا نمبر دے دیے یا امتحانی پرچے اپنے ماتحتوں سے چیک کروانا۔ یہ سب جھوٹی گواہی اور خیانت ہے۔(character certificate) بھی گواہی ہے،اگر آپ کسی کو جانتے ہیں تو سرٹیفکیٹ دیں اور اگر نہیں جانتے تو کیسے کہہ سکتے ہیں کہ تسلی بخش کردار رہا ہے۔

اس کا ایک نقصان یہ ہوتا ہے کہ جو شخص جھوٹا مشہور ہوجائے،لوگ اس کے سچ پر بھی یقین نہیں کر پاتے۔شک رہتا ہے،لوگ عزت نہیں کرتے اور جھوٹ ایک دن کُھل ہی جاتا ہے۔جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔انسان خود بھی خوف کا شکار رہتا ہے کہ نہ جانے کب جھوٹ کُھل جائے، پھر یاد بھی نہیں رہتا کہ کس موقع پر کیا جھوٹ بولا تھا۔کب تک یاد رکھیں گے،اپنے اتنے سارے جھوٹ کو۔تو یہ یقین دلانا چاہیے لوگوں کو کہ یہ کبیرہ گناہ ہے۔

وہ مواقع جن میں جھوٹ بولنا جائز ہے:

کچھ مواقع ایسے ہیں کہ جن پر جھوٹ بولنا جائز ہے۔ریاض الصالحین میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ اس طرح بیان کرتے ہیں یاد رکھو اگرچہ بالاصالہ جھوٹ بولنا حرام ہے لیکن بعض حالات میں چند شرائط کے ساتھ جھوٹ بولنا جائز ہوجاتا ہے۔میں نے ان شرائط کا ذکر کتاب الاذکار میں کیا ہے،مختصراً سن

لیجیے کہ چوں کہ کلام کرنا مقاصد کا ذریعہ ہے تو ہر وہ مقصود جو صحیح ہو اور جھوٹ کے بغیر اس تک پہنچنا ممکن ہو تو وہاں جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر مقصود کا حصول جھوٹ بولے بغیر ممکن نہ ہو تو جھوٹ بولنا جائز ہو گا پھر اگر مقصود کو حاصل کرنا جائز ہے تو جھوٹ بولنا بھی جائز ہے اور اگر مقصود ضروری ہے تو جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ مثلاً کوئی مسلمان آدمی کسی ظالم سے چھپا ہوا ہے، جو اس کو قتل کر دینا چاہتا ہے یا اس سے مال غصب کرنا چاہتا ہے لیکن اس نے اپنے مال کو چھپا دیا ہے تو اگر کسی آدمی سے اس کے بارے معلوم کیا جائے (جب کہ وہ جانتا ہے) تو اس کو چھپانا اور جھوٹ بولنا ضروری ہے، اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس امانت ہے اور کوئی ظالم اس سے چھیننا چاہتا ہے تو اس کو پوشیدہ کرتے ہوئے جھوٹ بولنا ضروری ہے۔ ان تمام صورتوں میں احتیاط یہ ہے کہ وہ توریے سے کام لے۔ مقصد یہ ہے کہ وہ عبارت کے ساتھ صحیح مقصود کا ارادہ کرے کہ مقصود کے لحاظ سے وہ جھوٹا نہیں ہے، اگرچہ ظاہری الفاظ اور اس مفہوم کے لحاظ سے وہ جھوٹا ہے جس کو مخاطب سمجھتا ہے اور اگر توریہ چھوڑ دے اور بالاطلاق عبارتاً جھوٹ کہے تو اس حالات میں جھوٹ کہنا حرام نہیں ہے، اس حالت میں کذب کے جواز پر حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی حدیث سے استدلال کیا جاتا ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ

((لَيْسَ الْكَذَّابُ الَّذِي يُصْلِحُ بَيْنَ النَّاسِ فَيَنْمِي خَيْرًا أَوْ يَقُولُ خَيْرًا)) (۱)

''وہ انسان جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان مصالحت کراتا ہے اور بہتر بات کی نسبت کرتا ہے یا اچھی بات کہتا ہے''۔

((لَمْ أَسْمَعْ يُرَخَّصُ فِي شَيْءٍ مِمَّا يَقُولُ النَّاسُ كَذِبٌ إِلَّا فِي ثَلَاثٍ الْحَرْبُ وَالْإِصْلَاحُ بَيْنَ النَّاسِ وَحَدِيثُ الرَّجُلِ امْرَأَتَهُ وَحَدِيثُ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا)) (۲)

امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے روایت میں ایک اور اضافہ کیا کہ حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ میں نے آپ سے نہیں سنا کہ آپ کسی بات میں (جھوٹ بولنے کی) اجازت دیتے ہوں مگر تین باتوں میں! جہاد میں، لوگوں کے درمیان صلح کرانے میں اور خاوند کا اپنی بیوی سے باتیں کرتے ہوئے یا بیوی کا اپنے خاوند سے باتیں کرتے ہوئے جھوٹ کہنا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں جھوٹ کی ہر صورت سے بچنے کی توفیق عطا فرمائے!

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب العلم، باب لیس الکاذب الذی یصلح بین لناس۔

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر و الصلۃ و الاداب، باب تحریم الکذب۔

حسد

حسد کا بنیادی مطلب ہے ''کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھ کر جلنا، اور دل میں تکلیف محسوس کرنا'' یہ حسد ہے۔ حدیث پاک میں مضمون آتا ہے:

((كُلُّ ذِيْ نِعْمَةٍ مَحسُوْدٌ))(۱)

''ہر نعمت والے پر حسد کیا جاتا ہے۔''

اس دنیا میں ذرائع محدود ہیں، ہر شخص کے پاس ہر نعمت نہیں۔ اس وجہ سے جس انسان کے پاس نعمت ہوتی ہے، اُس سے جلنے والے، اُس سے حسد کرنے والے پیدا ہو ہی جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا میں پہلا قتل بھی حسد کی وجہ سے ہوا۔ ایک بھائی نے دوسرے بھائی کے پاس نعمت دیکھی، اُس سے برداشت نہ ہوا، دل میں حسد پیدا ہوا اور اُس نے اپنے بھائی کو جان سے مار ڈالا۔ شیطان جب کسی کو علم، مال، دولت یا حسن سے محروم یا دوسرے کے مقابلے میں کمتر دیکھتا ہے تو ان محروم لوگوں پر کام شروع کر دیتا ہے۔ شیطان کو یہ فکر لاحق ہو جاتی ہے کہ یہ محروم افراد کہیں صابر، شاکر بن کر آخرت کا دائمی ثواب حاصل نہ کر لیں۔ بہترین اور ہمیشہ رہنے والی نعمتیں نہ حاصل کر لیں۔ چنانچہ وہ کوشش کرتا ہے کہ دنیا میں تو محروم ہے ہی، آخرت میں بھی محروم ہو جائے لہٰذا اس کو حاسد بنا دیتا ہے۔

حسد کی وجوہ:

حسد بنیادی طور پر دو وجہ سے ہوتا ہے: حُبِّ جاہ اور حُبِّ مال۔ دنیا میں یا تو جاہ وحشمت کی وجہ سے حسد کیا جاتا ہے یا مال و دولت کی وجہ سے حسد کیا جاتا ہے۔ یعنی دنیاوی چیزوں کے بارے میں لوگ حسد کا شکار ہو جاتے ہیں۔

حسد کی ابتدا:

اس کی ابتدا کیسے ہوتی ہے؟ اگر اللہ کی مدد سے اس کو پہچان لیا جائے اور یہیں پر اس کو قابو کر لیا جائے تو زیادہ پریشانی کا باعث نہیں بنے گی۔ اگر وقت پر علاج کر لیا جائے تو بیماری سے شروع ہی میں چھٹکارا پانا آسان ہو جاتا ہے۔ اگر بڑھ جائے تو سرطان (cancer) کی طرح انسان کی پوری شخصیت کو نگل جاتی ہے اور ناقابل علاج ہو جاتی ہے۔

---

(۱) شعب الایمان للبیهقی، باب فی الحث علی ترک الغل والحسد، الثالث والأربعون...

حسد کی ابتدا احساس محرومی (sense of deprivation) سے ہوتی ہے۔ کسی کے پاس نعمت دیکھ کر دل میں حسرتیں اُٹھتی ہیں، انسان ٹھنڈی آہیں بھرتا رہتا ہے اور اسی بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ یہ بڑی خطرناک علامت ہے، کسی اور کی نعمت پر ڈیرہ لگا لینا، اُسی کی نعمت کے بارے میں سوچتے رہنا، دوسروں سے بھی وہی ذکر کرنا، دوسروں کی خوش بختی پر جلتے رہنا اور اپنے آپ سے اس کا موازنہ (comparison) کرنا کہ میں کتنا محروم ہوں وہ کیسے نعمتوں میں کھیل رہا ہے۔ میں بدقسمت ہوں، میرے پاس وہ سب کیوں نہیں۔ پھر اس احساس محرومی کے ساتھ ساتھ اپنے اوپر ترس کھانے لگنا، خود کو بے چارا سمجھنا۔ کچھ عرصے بعد یہ خودترسی (self pity) کی کیفیت جلن، کڑھن میں تبدیل ہوجاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ النساء آیت ۳۲ میں فرمایا ہے:

{وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ}

''تم مت تمنا کرو اس فضیلت کی، جو اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر عطا کی ہے۔''

حسد کا علاج:

اس سے پہلے کہ یہ احساس محرومی حسد میں تبدیل ہوجائے، اس کا علاج کرلیں۔ جیسے ہی کسی کی نعمت کو دیکھ کر دل میں احساس محرومی پیدا ہو، فوراً اس آیت کو یاد کرلیں، اللہ کا ارشاد ہے کہ'' دنیاوی فضیلت کے بارے میں ایک دوسرے سے مقابلہ نہ کرو۔'' ایک حدیث میں بھی یہی اصول بیان کیا گیا کہ دنیا کے بارے میں اس کو دیکھو جو تم سے کمتر ہے، ہاں دین کے بارے میں اُن کو دیکھو جو تم سے اعلیٰ ہیں۔ کیوں کہ دین میں اونچے درجے حاصل کرنا سب کے اختیار میں ہے، جو چاہے جنت کا اعلیٰ سے اعلیٰ درجہ حاصل کرلے۔ اس کی کوئی حدود نہیں، اس کو حاصل کرنے لیے کسی سے جلنے کی، کسی سے کوئی نعمت چھیننے کی ضرورت نہیں۔ لیکن دنیاوی معاملات میں کوشش کے بعد جب نتیجہ برآمد نہ ہو تو پھر حسد میں تبدیل ہوجائے گا جو کہ کبیرہ گناہ ہے۔ اس کے بارے میں فرمایا:

{اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ} (النساء ۵۴)

''کیا یہ حسد کرتے ہیں لوگوں سے اس پر جو اللہ نے اُن کو اپنے فضل سے دیا ہے۔''

حسد کی ابتدا اتنی غیر محسوس طریقے سے ہوتی ہے کہ انسان کو پتا بھی نہیں چلتا۔ جب ہم اُٹھتے بیٹھتے کسی شخص کی کسی نعمت کی، کسی خوبی کی تعریفیں کرتے ہیں تو ہمیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ چیز ہمیں

حسد کی طرف لے جارہی ہے۔ دراصل اپنی احساس محرومی کا باعث اور ذریعہ ہم خود بنتے ہیں۔ کسی خوب صورت شخص کو دیکھ کر اُس کی بے تحاشا تعریف کرنا ہمارے اس احساس کا پتا دیتا ہے کہ ہم خود ایسے خوب صورت نہیں، ہم میں یہ کمی ہے، اس لیے اسلام میں یہ چیز پسندیدہ نہیں کہ دوسروں کی نعمتوں اور خوبیوں پر زیادہ توجہ (focus) کی جائے، دوسروں کی نعمتوں کو بہت زیادہ موضوع بنایا جائے۔ اسلام نے کسی کے سامنے اُس کی تعریف کرنے سے منع کیا ہے اور نہ ہی پیٹھ پیچھے بہت زیادہ تعریف کرنا چاہیے۔ لہٰذا جو فضل و کرم اللہ نے دوسروں پر کیا ہے، اُس کی تمنا مت کرو اور اُس کے لیے کوشش کرو جو تم حاصل کر سکتے ہو۔ ہاں اگر کسی سے دینی معاملات میں حسد ہوتا ہے تو اس کا علاج بہت آسان ہے، اُس شخص جیسی محنت شروع کر دے، وہ بھی دین کا علم پالے گا۔

حسد کے درجے:

حسد کے تین درجے ہوتے ہیں: پہلا درجہ یہ ہے کہ دل میں خواہش پیدا ہو کہ مجھے بھی ایسی نعمت مل جائے جو فلاں کے پاس ہے۔ اب اگر دل میں حسرت ہے اور وہ شخص غیبت نہیں کرتا، اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کرتا، بلکہ دل میں پریشان بھی ہوتا ہے کہ مجھے ایسے خیالات کیوں آتے ہیں تو یہ حسد کا ہلکا درجہ ہے۔ وہ یہ نہیں چاہ رہا کہ اگر میرے پاس نہیں تو اُس سے بھی چھن جائے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ مجھے ملے لیکن اگر یہ تمنا بڑھ کر ایسی صورت اختیار کر لے کہ یہ اُس سے چھن کر مجھے مل جائے، یہ خطرناک درجے میں شامل ہو گیا۔

اگر کوئی یہ سوچتا ہے کہ فلاں چیز مجھے ملے اور دل میں ایک جلن کا احساس ہے، لیکن جس کے پاس ہے اُس کا بُرا نہیں چاہ رہا، اُس کی حق تلفی نہیں کرتا، غیبت نہیں کرتا، اُس کی ٹوہ میں نہیں رہتا، بس اُس کی نعمت کو دیکھ کر دل میں خواہش اور تمنا ہوتی ہے کہ وہ اس کو بھی مل جائے اور یہ چیز اُس کو پریشان بھی کرتی ہے، یہ حسد ہے مگر ہلکا درجہ ہے۔ اس صورت میں انسان اپنی حق تلفی اور ناقدری کرتا ہے، خود اپنے آپ کو ذہنی تکلیف اور اذیت پہنچاتا ہے، اپنی ذات کو نقصان دے رہا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب انسان کی توجہ کسی اور کی نعمت پر مرکوز ہو جاتی ہے تو پھر اللہ نے جو نعمتیں اُس کو دی ہیں وہ نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی ہیں اور اُن نعمتوں کی ناقدری اور ناشکری شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا احساس نہیں رہتا کہ اللہ نے اُس پر کیا کیا مہربانیاں کی ہیں۔ یہ تو اپنی ذات کی ناقدری ہے اور اس کے نتیجے میں نفسیاتی بگاڑ پیدا ہوتا ہے، احساس کمتری پیدا ہو جاتا ہے، شخصیت میں اعتماد کی کمی پیدا

ہونا شروع ہوجاتی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص حسین ہے اور دوسرا شخص ذہین ہے، اگر ذہین بندہ حسین کو دیکھ دیکھ کر حسن کی تمنا اور خواہش میں کڑھتا رہے تو اُس سے اپنی ذہانت کی قدر جاتی رہے گی۔ اسے وہ نعمت نظر نہیں آئے گی جو اس کے پاس ہے، اُس کے اعصاب پر یہ فکر چھا جائے گی۔ جب اپنی ذہانت کی قدر نہیں ہوگی تو ذہانت سے کوئی مثبت کام بھی نہ لے سکے گا، اندر ہی اندر گھٹنا شروع کردے گا۔ یہ اپنی ذات کے ساتھ زیادتی ہے اور اللہ کی نعمتوں کی ناشکری بھی ہے۔ تو حسد کا یہ ادنیٰ ترین درجہ بھی نقصان پہنچاتا ہے۔

علاج:

اس کا علاج یہ ہے کہ دنیا کی حقیقت پر غور کرے کہ یہ دنیا ہے کیا؟ قرآن حکیم پڑھے، قرآن اس کا علاج کرے گا۔ اللہ نے قرآن میں فرمایا:

{وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ} (آل عمران:۱۸۵)

''دنیا کی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے۔''

یعنی اللہ کی نظر میں، دنیا کی چیزوں کی کوئی وقعت نہیں۔ تو انسان کو بھی ان چیزوں کو اتنا سر پر نہیں چڑھانا چاہیے۔ یہ پڑھ کر اندرونی تسکین ہوتی ہے کہ جو ہمارے پاس نہیں اُس کی اللہ کی نظر میں کوئی حیثیت نہیں۔

دوسری بات یہ کہ اگر کسی کے پاس کوئی نعمت موجود بھی ہے، کسی کو کسی پر فضیلت حاصل بھی ہے تو اللہ تعالیٰ نے اس کے بارے میں فرمایا:

{وَرَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ} (الانعام:۱۶۵)

''اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے درجوں کے لحاظ سے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہاری آزمائش کرے''

ایسا کیوں ہے؟ کسی کو پیسا بہت دیا، کسی کو حسن بہت عطا کیا، کسی کو علم سے بہت زیادہ نوازا، کسی کو عزت شہرت اور رتبہ عطا کیا تاکہ وہ تم کو آزمائے اس نعمت میں جو اُس نے عطا کی۔ یہ سوچ لینا چاہیے کہ یہ تمام نعمتیں آزمائش کا ذریعہ ہیں۔ ان نعمتوں کے ذریعے سے ہمارا امتحان مقصود ہے۔ اور

پھر جن کو نوازا گیا ہے، اُن کے لیے دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ ان کو ان نعمتوں کا حق ادا کرنے والا بنائے، اور اللہ کا شکر ادا کرے کہ اللہ نے مجھ کو اس آزمائش سے بچالیا ہے، میرا حساب قیامت کے دن ہلکا ہوگا۔

ایک بزرگ کہتے ہیں میں نے کبھی کسی سے حسد نہیں کیا کیوں کہ اگر وہ اہل جنت میں سے ہے تو اُس کی نگاہوں میں دنیا کی کیا وقعت ہوسکتی ہے۔ اور اگر وہ اہل جہنم میں سے ہے تو دنیا کی یہ نعمتیں اُس کے کس کام کی۔ کتنا آسان (simple) طریقہ ہے اپنے آپ کو حسد سے بچانے کا! سو حسد کا پہلا علاج یہ ہے کہ جب احساس محرومی پیدا ہو تو اپنی نعمتوں کا جائزہ لیا جائے۔

حسد کا دوسرا درجہ:

دوسرا درجہ یہ ہے کہ خود بھی بندہ، جلتا کڑھتا رہے اور اللہ کے خلاف بھی بدگمانی رکھے۔ ذہنیت یہ بن جائے کہ فلاں کو دے کر اللہ نے میرا حق مار لیا، مجھے ملنا چاہیے تھا، اس کو کیوں ملا۔ اللہ کے فیصلوں پر اعتراض پیدا ہوگا۔ اللہ کے خلاف غصہ اور شکایتیں ہوں گی کہ پتا نہیں ہم نے اللہ کا کیا بگاڑا تھا۔ کسی نے بہت اچھے اس پر دو اشعار کہے ہیں ؎

جب کھینچ کے آہِ سرد کہتا ہے کوئی بندہ
جس حال میں بھی رکھے صد شکر ہے اللہ کا
میں سوچنے لگتا ہوں یہ شکر کیا اُس نے؟
یا طعنہ دیا اُس نے رزّاق دوعالم کو

شکوے کے بجائے شکر کریں:

ہمیں غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم بھی اللہ کا شکر اسی انداز سے ادا کرتے ہیں؟ بے دلی سے، مجبوری کا اظہار کر کے اللہ کا شکر ادا کرنا جیسے شکر ہے زندہ تو ہیں، مر تو نہیں گئے! یہ کس طرح کا شکر ہوا؟ دراصل شکر کے پردے میں کفر! شکر کے پردے میں ناشکری! اس کے بجائے بندہ اللہ سے دُعا کرے کہ ''اے اللہ تو نے اس کو دیا مجھے بھی نواز دے۔'' بجائے شکوے کے اللہ سے التجا اور دُعا کرے۔ اور اللہ تو وہ دینے والا داتا ہے کہ جو اس سے نہ مانگے اس پر ناراض ہوتا ہے۔

((مَنْ لَّمْ یَسْئَلِ اللّٰہَ یَغْضَبْ عَلَیْہِ))(۱)

''جو اللہ سے سوال نہیں کرتا اللہ اس پر غضب نازل فرماتا ہے۔''

وہ تو فرماتا ہے:

{اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ} (المؤمن: ۶۰)

''مجھے پکارو، میں تمہیں جواب دوں گا۔''

اور حکم دیتا ہے یوں دُعا کرے:

{رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الْاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ}

(البقرۃ: ۲۰۱)

''اے اللہ دنیا کی بھلائیاں بھی عطا کر اور آخرت کی بھلائیاں بھی عطا فرما اور جہنم کی آگ سے بچالے۔''

یہ حسد کا علاج ہے۔ جلنے کڑھنے کی بجائے رب سے دُعا کرے اور اللہ کی تقسیم سے ناراض نہ ہو۔ اللہ اپنی حکمت سے اس دنیا کو چلاتا ہے، اپنی چیزوں کو تقسیم کرتا ہے، یہ سوچے کہ کیا پتا یہ نعمت میرے پاس ہوتی تو میں اس نعمت کا حق ادا نہ کر پاتا۔ یہ اُس کے لیے نعمت ہے میرے لیے ہوسکتا ہے زحمت بن جاتی، میں اس کی وجہ سے ہلاک ہوجاتا۔ اللہ اپنی حکمت سے اپنی نعمتیں بانٹتا ہے، اُس کے علم میں ہے کہ کون کتنا بوجھ اُٹھا سکتا ہے! کس کو وہ نعمت جچتی (suit) ہے، کس کو نہیں جچتی۔ بعض دفعہ دوسرے کی نعمت ہمیں بہت بھلی لگتی ہے مگر اُس کے ساتھ وابستہ ذمے داری ہمیں محسوس نہیں ہوتی کہ یہ نعمت اس شخص کے لیے کتنی بڑی آزمائش ہے، اس شخص کو کتنی بڑی ذمے داری سونپی گئی ہے۔ یہ تو اللہ کی مہربانی اور کرم ہے کہ مجھ کو یہ ذمہ داری نہیں دی۔ میں شاید اس قابل نہیں۔ مجھ میں کوئی ایسی کمزوری ہے کہ میں اس نعمت کا بوجھ نہ اُٹھا سکتا۔ اس طرح میرا آخرت کا حساب ہلکا اور دنیا کی مشکل بھی ہلکی۔ لہٰذا اللہ کی تقسیم پر انسان کبھی ناراض اور دل برداشتہ نہ ہو اور زیادہ سے زیادہ کلمۂ شکر ادا کرے۔ اپنی نعمتوں ہی پر نظر رکھے اور اُن کی ذمہ داری کو ادا کرنے کی کوشش کرتا رہے۔ اسی میں بھلائی ہے۔

حسد کا تیسرا درجہ:

تیسرے درجے کی علامات یہ ہیں کہ خود بھی دوسرے کی نعمتوں کو دیکھ دیکھ کر جل بھُن کر کباب

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب منہ

ہوتا رہے، اللہ سے بھی ناراض رہے اور یہ خواہش دل میں اُبھرنے لگے کہ یہ اُس سے بھی چھن جائے۔خواہ مجھے نہ ملے لیکن اُس سے چھن جائے۔اور اگر اُس سے نہیں چھنتی تو اُس کے لیے باعث عذاب بن جائے، اُس کو ہضم نہ ہو۔اُس کو اس نعمت کے ذریعے نقصان اور اذیت پہنچے اور اُس کو تکلیف میں دیکھ کر خوشی محسوس ہو۔فرض کریں کسی کے پاس اولاد نرینہ کی نعمت ہے۔اور اُس کے بیٹے نالائق ہو گئے، نافرمان گمراہ نکل گئے تو اس پر خوش ہونا کہ چلو میرے بچے نہیں، اُس کے ہیں، لیکن اُس کو ان کی طرف سے کوئی خوشی، کوئی اطمینان، کوئی نیک نامی حاصل نہیں ہے۔کسی کا گھر دیکھا، بہت شاندار ہے، آرام دہ ہے۔دل میں آیا کہ ان کے گھر کو کچھ نہ کچھ ہو جائے، کوئی آفت پیش آ جائے اور اگر گھر کو کچھ نہیں ہوتا تو ان کو اس گھر میں سکون سے رہنا نصیب نہ ہو۔اس نعمت سے فائدہ نہ اُٹھا سکیں۔یہ حسد کا بدترین درجہ ہے۔مجھے ملے نہ ملے اس کو نہ ملے، اُس کو فائدہ نہ ہو۔یہ سب سے مہلک درجہ ہے۔اسی درجے کے متعلق اس قسم کی روایتیں وارد ہوئی ہیں چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اِیَّاکُمْ وَالْحَسَدَ فَاِنَّ الْحَسَدَ یَاْکُلُ الْحَسَنَاتِ کَمَا تَاْکُلُ النَّارُ الْحَطَبَ)) (۱)

''تم حسد سے بچو! کیوں کہ حسد نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے کہ آگ سوکھی لکڑیوں کو کھا جاتی ہے۔''

حضرت زبیر سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((دَبَّ اِلَیْکُمْ دَاءُ الْاُمَمِ قَبْلَکُمْ الْحَسَدُ وَالْبَغْضَاءُ ھِیَ الْحَالِقَةُ لَا أَقُوْلُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ وَلٰکِنْ تَحْلِقُ الدِّیْنَ)) (۲)

''ایک بیماری ہے جو پچھلی قوموں میں تھی، اور اے مسلمانو! وہ تمہاری طرف بھی چلی آ رہی ہے۔وہ ہے حسد اور بغض'' ''یہ مونڈ دینے والی ہے اور میں یہ نہیں کہتا کہ یہ بالوں کو مونڈ دیتی ہے، بلکہ یہ دین کا صفایا کر دیتی ہے۔''

حاسد اگلے کو ہر ممکن نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔محفل میں ہو گا تو اُس کی بُرائی کرے گا، غیبت کرے گا، تنہائی میں ہو گا تو اُس کو بددُعائیں دے گا، تجسّس میں رہے گا، کھوج کرید کرے گا، محسود کا کوئی عیب، کوئی خرابی، کوئی بُرائی پتا چل جائے تو ہمدردی کے بھیس میں ہر مجلس میں بیٹھ کر

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الادب، باب فی الحسد...

(۲) جامع الترمذی، کِتَاب صِفَةِ الْقِیَامَةِ وَالرَّقَائِقِ، باب منه

اُس کا تذکرہ کرے گا۔ لوگوں کو بتاؤں گا، ''مجھے بڑا افسوس ہوا، یہ جان کر کہ اُن کے اندر یہ عیب ہے۔ یہ خرابی ہے۔'' اندر اندر سے خوشی سے پھولے نہیں سماتا اور ظاہراً ہمدردی جتاتا ہے۔ اپنے بچوں سے ہمدردی ہوتی ہے، محبت ہوتی ہے تو کیا ہم بیچ بازار میں بیٹھ کر اُن بُرائیوں کا تذکرہ کرتے ہیں؟ یہ جو ہمدری کے نام پر عیب جوئی کی جارہی ہوتی ہے، یہ صرف حسد کا اظہار ہے۔ دوسرے کو بدنام کرنے کا مقصد ہے۔ اب اگر اللہ نے چاہا تو نعمت والے کا تو یہ کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔ ہاں! غیبت کر کے اپنی نیکیاں دوسرے کو دے دیتا ہے اور بلاوجہ کسی کو بدعا دینے والا، خود اس آفت کا شکار ہوتا ہے، جس کے لیے اس نے دوسرے کو بددُعا دی ہوتی ہے۔

شماتت:

جامع ترمذی میں حدیث مبارکہ ہے:

((لَا تُظْهِرِ الشَّمَاتَةَ لِأَخِيكَ فَيَرْحَمُهُ اللهُ وَيَبْتَلِيكَ)) (۱)

''تم اپنے بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو، ہوسکتا ہے اللہ اس کو مصیبت سے نجات دے دے، اور تم کو اس میں مبتلا کر دے۔''

دوسرے کی مشکل پر خوش ہونے کو ''شماتت'' کہا جاتا ہے۔ حاسد خواہش کرتا ہے کہ فلاں شخص نعمتوں سے محروم ہوجائے۔ خود تو اُس کو محروم نہیں کرسکتا لیکن اپنی نیکیاں اُس کے حوالے کر دیتا ہے اور خود آخرت کا عذاب مول لے لیتا ہے۔ حاسد خود اپنا دشمن ہوتا ہے۔ جس بندے میں حسد کی بیماری ہوتی ہے وہ کسی کو اپنے سے آگے جاتا دیکھ نہیں سکتا۔ وہ یہ برداشت نہیں کرسکتا کہ کوئی اور کسی کی توجہ کا مرکز بن جائے۔ استاد کی نظروں میں، والدین کی یا باس (boss) کی نظروں میں اونچا ہوجائے۔ مثال کے طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے اپنے بھائی کے خلاف چالیں چلیں، نقصان پہنچانے کی کوششیں کیں۔

ایسے لوگ جن کے اندر حسد ہوتا ہے اُن کے بارے میں کہتے ہیں کہ **اَلْحَسُوْد لَا یَسُوْد** ''حسد کرنے والا سردار نہیں بن سکتا''، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ہمیں سکھایا ہے کہ حاسد کے شر سے بچنے کے لیے بھی تم اللہ کی پناہ طلب کرو:

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب صفة القیامة والرقائق، باب منه

{وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ} (الفلق:۵)

''میں حاسد کے شر سے پناہ مانگتا ہوں، جب وہ حسد کرنے لگے۔''

ایک دفعہ حاسد شر پر آمادہ ہوجائے تو دوسرے کو تکلیف پہنچانا، اُس کی زندگی کا مقصد بن جاتا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ یہ حسد کس معاشرے میں بڑھتا ہے؟ ایسے معاشرے میں حسد زیادہ ہوتا ہے جہاں اسراف وتبذیر، دکھاوا ونمائش جیسی چیزیں زیادہ ہوں۔ لوگ زیادہ ایک دوسرے سے حسد کرتے ہیں۔

حسد کا علاج:

حسد کا علاج یہ ہے کہ قناعت کی عادت ڈالے، اپنی نعمتوں پر نظر رکھے، اللہ کا شکر ادا کرتا رہے اور اپنے سے نیچے لوگوں کو دیکھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَا يَجْتَمِعَانِ فِي قَلْبِ عَبْدٍ اَلْاِيْمَانُ وَالْحَسَدُ)) (۱)

''کسی بندے کے دل میں دو چیزیں جمع نہیں ہوسکتیں؛ ایمان اور حسد۔''

سو ایمان کو بڑھائیں تاکہ حسد دل میں نہ آنے پائے۔ جس پر حسد ہے، اُس کے لیے تنہائی میں دُعا کریں اور محفل میں اُس کی تعریف کریں۔ اُس کی اچھائیوں کو بیان کریں اور بُرائیوں اور عیبوں پر پردہ ڈالیں۔ ان باتوں سے حسد میں کمی ہوگی۔ دوسروں کو آگے بڑھ کر سلام کریں، تحفے تحائف دینے کی کوشش کریں۔ حضرت ابودردہ رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ ''جسے موت یاد رہتی ہے، اُسے نہ حسد ہوتا ہے، نہ خوشی۔''

اب اگر کسی کا تقویٰ، دین داری یا نیکی دیکھ کر حسد پیدا ہورہا ہے تو یاد رکھیں اس میدان میں اللہ نے سب کو برابر کا موقع دیا ہے۔ اپنی کوشش رکھے، عملِ صالح میں آگے بڑھے، کاہلی چھوڑ دے، اپنے اندر اعتماد پیدا کرے اور اس شخص کے معمولات کو دیکھے کہ وہ کیسے یہ کام کرلیتا ہے۔ اب اگر کوئی بڑا خوب صورت قرآن پڑھتا ہے اور لوگوں کو اُس سے حسد پیدا ہوتا ہے تو بجائے حسد کرنے کے وہ یہ دیکھیں کہ وہ اتنا خوب صورت قرآن کیسے پڑھتا ہے۔ اگر ہمارے اندر کسی صلاحیت کی کمی ہے تو اس کمی کی وجہ سے جنت کے کسی درجے سے محروم نہیں ہوگا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

---

(۱) سنن النسائی، کتاب الجهاد، فَضْلُ مَنْ عَمِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ عَلَى قَدَمِهِ

{لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا} (البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی جان پر اُس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

کسی اور نام سے حسد:

دیکھیں آج کل بہت سے مسلمان بے عمل ہیں، اپنے آپ کو سیکولر مسلمان کہتے ہیں۔لیکن کافروں کو بُرا بھلا بھی کہتے رہتے ہیں، اور کافروں پر پڑنے والی مشکلات پر خوش بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں بُرا بھلا کہہ رہے ہیں؟ کیوں اُن کی مشکلات پر خوش ہو رہے ہیں؟ اس لیے نہیں کہ وہ کافر ہیں یا وہ اسلام کے دشمن ہیں، یہ تو خود اسلام سے وفاداری نہیں رکھتے۔ یہ کافروں کا بُرا صرف حسد کی وجہ سے چاہتے ہیں کہ کافروں کے پاس جو دنیا ہے وہ ان کے پاس نہیں ہے۔ دنیا نے اشتراکیت (communism) کا چرچا دیکھا، وہ بھی بہت حد تک حسد کا نتیجہ تھا۔لیکن اس حسد کو انصاف کا نام دے دیا، برابری کا نام دے دیا۔ امیروں سے زبردستی دولت چھین لی اور کہا یہ غریبوں کا حق ہے۔اُن چیزوں پر قابض ہو گئے اور اُن چیزوں کو اپنے استعمال میں لے لیا۔

بچوں کے حسد کی حقیقت:

بچوں میں بھی کہا جاتا ہے کہ حسد ہوتا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے؟ حسد کا احساس خود حسد کرنے والے کو ہوتا ہے کہ مجھے فلاں شخص سے حسد ہے، جلن ہے۔ جہاں تک بچوں کا تعلق ہے آپ کا تجربہ ہوگا کہ پہلا بچہ دوسرے بھائی یا بہن پیدا ہونے پر اُنھیں مارتا ہے، پیٹتا ہے، رُلاتا ہے، ستاتا ہے، ماں کی گود میں اُنھیں دیکھ کر رونا شروع کر دیتا ہے۔ ماں کو اُس کے نزدیک نہیں جانے دیتا۔ یہ بچوں کے ساتھ عام طور پر ہوتا ہے، اس کو حسد کا نام دینا تو زیادتی ہوگی۔ پہلے بچے کو عدم توجہی کا احساس ہوتا ہے کہ ماں اب مجھ کو توجہ نہیں دے رہی اور یہ مشترکہ خاندان (joint family) کے بچوں میں یہ جذبہ کم ہوتا ہے۔ چوں کہ مشترکہ خاندان میں ماں کے نئے آنے والے بچے کے ساتھ مصروف ہونے کے باوجود دادا، دادی، پھوپھی وغیرہ پہلے بچے پر توجہ برقرار رکھتے ہیں اس لیے اس نظام میں پلنے والے بچے پھر دوسرے بہن بھائیوں کو مارتے پیٹتے نہیں ہیں، اور اُن کے آنے پر بہت زیادہ دُکھی (upset) نہیں ہوتے۔ سو اس تصور کو حسد کی بجائے عدم توجہی (lack of attention) سے جوڑنا چاہیے۔ اس لیے کہ بچہ حسد نہیں کر سکتا، اُسے شعوری

طور پر یہ احساس نہیں کہ ماں کوئی نعمت ہے یا میں اس بھائی یا بہن سے بدلہ لوں، اسے تکلیف پہنچاؤں۔ اِس کو (sibling jealousy) کا نام دے دیا جاتا ہے مگر یہ جلن (jealousy) نہیں۔ بلکہ جیسے ہم بچوں کو بے حیا کہہ دیتے ہیں حالاں کہ بچے بے حیا تو نہیں ہوتے۔ بے حیائی کیا ہے؟ جان بوجھ کر اپنے آپ کو اس طرح نمایاں کرنا یا جان بوجھ کر لباس نہ پہننا، یہ بے حیائی ہے۔ اُن کو یہ اندازہ نہیں ہے کہ اپنے آپ کو کیسے ڈھانپنا چاہیے۔ اسی طرح اُن کو یہ شعور نہیں کہ جو ہم کر رہے ہیں، اس سے بہن یا بھائی کو تکلیف ہوگی، ان کو یہ احساس نہیں ہوتا، وہ صرف توجہ چاہتے ہیں، اس کو حسد کا نام دینا مناسب نہیں۔

حسد کی خرابی:

ایک انگریزی کہاوت ہے:

"Envy is like the acid which eats up the vessel, it is stored in"

یعنی حسد اس تیزاب کی طرح ہے جو اس برتن کو کھا جاتا ہے جس میں اس کو رکھا جائے۔ حسد دل کے اندر ہوتا ہے اور اندر ہی اندر انسان اپنے آپ کو ختم کرتا رہتا ہے۔

رشک:

کسی کی نعمت کو دیکھ کر ایک اور صورت حال یہ ہوسکتی ہے کہ کسی کے پاس اچھی چیز دیکھی اور اُس کی اچھی چیز دیکھ کر خوشی ہوئی۔ دل چاہا کہ اللہ اس کو یہ چیز مبارک کرے اور ساتھ ہی ساتھ وہ چیز اتنی اچھی لگی کہ دُعا کی ''اے اللہ اپنے خزانے میں سے مجھ کو بھی یہ نعمت عطا فرما۔'' اس میں کوئی حرج نہیں، اس کو ''رشک'' کہا جاتا ہے۔ یہ تمنا انسان کے دل میں قدرتی طور پر پیدا ہوتی ہے۔ یعنی انسان کسی کے پاس کوئی نعمت دیکھے تو دُعا کرے کہ اللہ اس کو یہ چیز مبارک ہو۔ اللہ نے اُسے اپنے حکیمانہ فیصلے کے مطابق یہ عنایت فرمایا ہے۔ سو وہ خوش رہے اور یہ نعمت اس کو نصیب ہو۔ بخاری شریف میں حدیث مبارکہ ہے:

((لَا حَسَدَ اِلَّا عَلَى اثْنَتَيْنِ رَجُلٌ آتَاهُ اللهُ الْكِتَابَ وَقَامَ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَرَجُلٌ أَعْطَاهُ اللهُ مَالًا فَهُوَ يَتَصَدَّقُ بِهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ))(۱)

(۱) صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب اغتباط صاحب القرآن

''مگر دو آدمیوں، ایک وہ جس کو اللہ نے مال دیا اور پھر وہ اس کو حق کے راستے میں خرچ کرتا ہو، دوسرا وہ جس کو اللہ تعالیٰ نے علم دین اور دانائی عطا کی ہو پھر وہ اس سے فیصلے کرے اور لوگوں کو تعلیم دے۔''

شریعت کے مطابق ان ہی دو لوگوں پر رشک کیا جا سکتا ہے اور ایسا کرنا چاہیے۔ اللہ سے ایسی نعمتوں کا سوال بھی کرنا چاہیے۔

اب اپنا جائزہ لیں کہ ہم میں حسد ہے یا رشک ہے۔ حسد اور رشک کی شروعات اکٹھی ہوتی ہے، ایک جیسی کیفیت ہوتی ہے۔ کسی کے پاس نعمت دیکھی، جو آپ کے پاس نہیں ہے تو حسد سے بچ کر رشک کی طرف اس جذبے کو موڑ لیں۔ رشک بھی ہر نعمت پر پسندیدہ نہیں جیسے ہم نے ابھی حدیث مبارکہ دیکھی کہ صرف دو لوگوں پر رشک کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال حسد کی نسبت رشک میں پھر بھی عافیت ہے۔

حسد کی ابتدا اور ظہور:

کسی کی نعمت دیکھ کر دل میں محرومی محسوس ہوئی۔ دل میں ایک تمنّا، خواہش پیدا ہوئی، یا پھر کسی کے پاس نعمت دیکھی تو دل میں جلن اور تنگی محسوس ہوئی اور یہ سوچا کہ اس نعمت پر میرا حق زیادہ تھا۔ مثلاً ایک خاتون نے کسی کے پاس سونے کا زیور دیکھا جو اُس کے پاس نہیں ہے۔ اُسے بہت اچھا لگا، بہت پیارا لگا، دل کے اندر جلن پیدا ہونے لگی کہ اس کی تو شکل بھی عام سی ہے، یہ زیور اس پر بالکل نہیں جچتا۔ میں جوان ہوں، خوش شکل ہوں، میں پہنتی تو مجھ پر بہت اچھا لگتا۔ اس کو تو اللہ نے بے کار دے دیا مجھ کو دینا چاہیے تھا۔ اب اللہ سے دُعا مانگنے کے بجائے اس کے لیے بد دعا ہونے لگی، اس کی بُرائیاں شروع کر دیں، اُس کے عیب نکالنے شروع کر دیے۔ مثلاً اس عمر میں بھی زیور پہننے کا شوق قائم ہے، اس کا تو بڑا گہرا رنگ (dark complexion) ہے۔ اس پر تو بالکل نہیں جچتا۔

یہ معاملہ صرف زیور تک محدود نہیں۔ اولاد پر، گھر پر، کپڑوں پر، ہر چیز پر تنقید ہی کرتے ہیں۔ عیب ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالیں گے، موقع ملتے ہی بُرائیاں شروع کر دیں گے، اگر کوئی تعریف کرے تو تعریف پر منہ بنائیں گے۔ اس کی تعریف پر تکلیف محسوس کریں گے، ایک تو اُس کے پاس نعمت بھی ہے اوپر سے لوگ تعریف بھی کر رہے ہیں لہٰذا تعریف کرنے والوں کو بدگمان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے چاہنے والوں کو بھی اس سے بدظن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ غور کریں حسد کی بیماری

کتنی بُرائیوں کو جنم دیتی ہے۔ چغلی، بدگمانی، تجسّس، غیبت جیسے کبیرہ گناہ سرزد ہوتے ہیں۔

حسد سے اصل نقصان حاسد ہی کا ہوتا ہے:

حسد میں مبتلا شخص، ذہنی اور جسمانی، ظاہری و باطنی ہر طرح سے اپنی ذات کا نقصان کرتا ہے۔ اپنی عزت کھو بیٹھتا ہے، لوگ پہچان جاتے ہیں کہ یہ فلاں سے جل رہا ہے۔ لوگ حسد کرنے والے کی خاک بھی عزت نہیں کرتے۔ کتنا ہلکا انسان ہے، کن چیزوں پر جل رہا ہے! کن چیزوں کی اس کی نظر میں اہمیت ہے!

رشک کی صورت حال:

رشک کی ابتدا بھی نعمت سے ہوتی ہے۔ دوسرے کے پاس کوئی نعمت دیکھی، دل میں تمنا پیدا ہوئی اور پھر نعمت دینے والے سے فوراً اپنا تعلق جوڑ لیا یعنی اللہ سے دُعا کی کہ اللہ یہ نعمت مجھ کو بھی عطا فرمادے اور جس کے پاس نعمت ہے اُس کے لیے شعور اور کھلے دل کے ساتھ، نیک نیتی سے، برکت اور سلامتی کی دُعا کی۔ جوں ہی انسان نعمت دینے والے سے تعلق جوڑتا ہے اس کی کیفیت ہی بدل جاتی ہے، ساری حسرت، ساری جلن، ختم ہوجاتی ہے۔ استغنا کی کیفیت طاری ہوجاتی ہے اور بندہ پرسکون ہوجاتا ہے۔ سو انسان اپنی توجہ نعمت پانے والے پر نہ کرے بلکہ نعمت دینے والے پر کرے۔ اپنے آپ کو بتائے کہ یہ نعمت اس کی اپنی ذاتی نہیں ہے، کسی نے اس کو دی ہے۔ وہ ذات اس پر قادر ہے کہ مجھے بھی عطا کردے۔ اگر نعمت پانے والے کو کوئی نقصان پہنچے تو دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ کو جو نعمتیں دی ہیں انھیں نظر بد سے، حاسد کے شر سے اور ہر نقصان سے بچالے، اور جس کو نقصان پہنچا اس کو بہترین بدلہ عطا فرمادے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ نعمت ملنے پر انسان اللہ تعالیٰ کا بھرپور شکر ادا کرے گا اور نہ ملنے پر بھی رب سے پُرامید رہے گا۔ اس طرح دین دنیا دونوں کا بھلا ہوگا۔

حسد کا علاج:

اس کا علاج یہ ہے کہ کثرت سے استغفار کرے، پہلے تو پہچانے اور اقرار کرلے کہ ہاں مجھ میں حسد ہے اور مجھے شعوری طور پر اس سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مجھے پتا نہیں تھا یہ اس قدر خطرناک بیماری ہے۔ اگر ہم اپنی بُرائی کو ڈھانپ دیں، اقرار نہ کریں تو پھر ہم اپنی بُرائی کو دُور نہیں کرسکتے۔ سو پہلے مان (confess) لیں کہ یہ کمزوری ہے اور پھر اللہ سے استغفار کرلیں کہ اللہ میرے اندر یہ بیماری ہے تو اس سے مجھے شفا عطا کردے۔

بعض حاسد جن سے حسد کرتے ہیں، اُن کی منہ پر بڑھ چڑھ کر تعریف کرتے ہیں۔ جو خوبیاں اُن میں نہیں ہیں وہ بھی گنوائیں گے تاکہ لوگ کہیں کہ یہ خوبیاں اُن میں تو ہمیں نظر نہیں آتیں۔ اس طرح تعریف کے بھیس میں ان کے عیب نمایاں کرنے کی نیت ہوتی ہے۔ کیا کیا چالاکیاں ہیں انسان کے اندر! اللہ سب نیتوں کا حال جانتا ہے، ہم کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں اور ہمارا مقصد کیا ہے۔ اللہ سے کچھ چھپا نہیں۔ انسان اللہ سے ڈرے اور جائز تعریف کرے۔

جو نعمتیں ہمارے پاس ہیں ہم اُن کی ذمے داری محسوس کریں اور حق ادا کریں۔ ان ہی کے حقوق ادا کر کے آخرت میں چھوٹ گئے تو بڑی بات ہے۔ کہاں اور نعمتیں مانگ کر اپنے اوپر مزید پوچھ گچھ کا بوجھ لادنے کی فکر میں ہیں۔ اس لیے جب اللہ سے کوئی نعمت مانگیں تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دُعا مانگیں کہ اللہ ان نعمتوں کا حق ادا کرنے کی توفیق بھی عطا فرما تاکہ تیری رضا اور مرضی کے مطابق ان کو استعمال کر سکیں اور آخرت کے لیے کچھ کمائی جمع کر سکیں۔ یہ نہ ہو کہ دنیا کی نعمتیں آخرت کی مصیبت بن جائیں۔ نعمت کے ساتھ ساتھ ذمے داری کا شعور بھی انسان میں ہونا چاہیے۔ جو نعمتیں ہمارے پاس ہیں ان کے حساب کتاب کے بارے میں محتاط رہیں اور اللہ کا شکر ادا کرتے رہیں۔

سب سے پیاری چیز جو انسان کو حسد سے نجات دیتی ہے وہ ہے قرآن پڑھنا اور جنت کا تصور۔ آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ ہر نعمت ملنے والی ہے، ہر خواہش پوری ہونے والی ہے۔ ہمارے ہی لیے تو اللہ نے جنت بنائی ہے، پھر کسی پر کیا رشک کرنا۔ دنیا کی نعمتیں تو دنیا کی طرح فانی ہیں۔ اس دنیا میں خواہ کتنی ہی بڑی نعمت کسی کے پاس ہے تخت و تاج، محلّات، مال و اولاد، خزانے اور زیورات، سب ختم ہو جانے والے ہیں، دنیا کی طرح ناپائیدار ہیں، سب مٹی اور نیست و نابود ہو جائیں گے۔ کیوں نہ جنت کی نعمتیں، آخرت کی نعمتیں جمع کر لیں، جنت کا کثرت سے ذکر کریں اور سوچیں۔

جس کو یہ اندیشہ ہو کہ لوگ مجھ سے جلتے ہیں وہ کیا کرے:

اگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ دوسرے ہم سے جلتے ہیں تو اس کے لیے بھی صبح و شام کی مسنون دُعائیں اپنا معمول بنائیں۔ آیت الکرسی، معوذتین پڑھیں، سورۃ البقرہ کی آخری دو آیات پابندی سے پڑھیں۔ اپنی نعمتوں کا ذکر ہر وقت دوسروں کے سامنے نہ کریں، دکھاوے سے، تبذیر سے، اترانے سے بچیں۔

بعض دفعہ قصور ہمارا اپنا ہوتا ہے اور ہم شکایت کرتے ہیں کہ لوگ ہم سے حسد کرتے ہیں۔ مثلاً شوہر کا رویّہ بدلا یا خاندان میں انتشار کی صورت پیدا ہوئی تو اس کی ذمہ داری لوگوں کے حسد پر ڈال دی کہ حاسدوں نے کچھ پڑھ پھونک دیا ہے۔ اپنی غلطیوں اور اپنی ذمے داری، اپنے کردار اور اپنے رویوں کی تبدیلی کا جائزہ نہیں لیا کہ ہم سے کہاں غلطی ہوئی ہے لہٰذا اپنا بھی جائزہ لیا کریں۔

بعض لوگ تو اس بات میں بھی فخر محسوس کرتے ہیں کہ لوگ ہم سے جلتے ہیں، جیسے یہ کوئی خوبی ہے۔ بعض لوگوں کا پہننے اوڑھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگ ہم سے جلیں۔ ایسا کرنا دراصل اپنی ہی شامت کو دعوت دینا ہے۔ کیوں کسی کے اندر حسد کی آگ بھڑکاتے ہیں! ایسا نہ ہو کہ روزِ قیامت اللہ ہمیں ہمارے کرتوتوں اور نیتوں کی وجہ سے اپنی آگ میں جلائے۔ اس سے پرہیز کریں۔

اگر آپ کے پاس کوئی نعمت ہے جس کے بارے میں آپ کو یہ احساس ہوجاتا ہے کہ لوگ اُسے دیکھ کر جلیں گے، حسد کریں گے۔ سو ایسی چیزوں کے استعمال سے پرہیز کریں۔ کیوں کہ دوسروں کو احساسِ کمتری کا شکار کرنا بُری چیز ہے۔ ذرا حساس ہوکر زندگی گزارنے کی ضرورت ہے۔ اگر اللہ نے کوئی نعمت دی ہے، تو بہت تذکرہ مت کریں۔ نیت، دکھاوے اور نمائش کی نہ ہو۔ اگر آپ کو احساس ہوجائے کہ کوئی آپ سے حسد کرتا ہے تو اُس کی طرف خصوصی توجہ دیں، دوستانہ رویہ اختیار کریں، اپنائیت کا احساس دلائیں، اُس کے احساس کمتری کو کسی طرح دور کرنے کی کوشش کریں۔

کسل

کاہلی ایسی کمزوری ہے جس سے خود نبی اکرم ﷺ نے پناہ مانگی۔

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ))(۱)

''اللہ میں تیری پناہ چاہتا ہوں، کمزوری سے، کسلمندی سے، بزدلی سے اور بخل سے۔''

رسول اللہ ﷺ نے ان برائیوں اور خرابیوں سے خود پناہ مانگی ہے۔ اگر یہ کاہلی عبادت میں شروع ہوجائے تو پھر انسان کو نفاق تک لے جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں منافقین کی علامات بیان ہوئی ہیں، وہاں پر سستی کا ذکر بھی ہمیں ملتا ہے۔

سورۃ النساء آیت نمبر ۱۴۲ میں فرمایا:

{وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی}

''اور جب یہ کھڑے ہوتے ہیں نماز کے لیے تو سستی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔''

سورۃ التوبہ آیت نمبر ۵۴ میں فرمایا:

{وَلَا یَاْتُوْنَ الصَّلٰوۃَ اِلَّا وَھُمْ کُسَالٰی}

''اور یہ نہیں آتے نماز کے لیے، مگر سستی کے ساتھ''

سورۃ الانبیاء آیت نمبر ۱۹ میں فرمایا:

{وَمَنْ عِنْدَہٗ لَا یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِہٖ وَلَا یَسْتَحْسِرُوْنَ}

''اور جو اس کے پاس ہیں (فرشتے) وہ اس کی عبادت سے نہ تکبر کرتے ہیں، اور نہ وہ سُستی کرتے ہیں (نہ اکتاتے ہیں، نہ تھکتے ہیں)۔''

کاہلی سے اچھے مواقع ضائع ہو جاتے ہیں:

ایک چیز جس سے مومن کو نجات حاصل کرنے کی ضرورت ہے جس سے ہمیں اپنا تزکیہ کرنا ہے وہ ہے سُستی، کاہلی۔ زندگی میں نیکی کے چھوٹے چھوٹے مواقع آتے ہیں۔ بعض دفعہ کاہلی کی وجہ سے ہم اُن کو ضائع کر دیتے ہیں، کھو دیتے ہیں۔ چھوٹا سا کام کسی نے کہا، پانی پلا دو، پانی پلا دیتے، کتنا ثواب ملتا؟ وہیں کرسی پر بیٹھے بیٹھے نوکر کو یا کام والی کو آواز دے دی کہ اُس کو پانی پلا دو، کوئی مشکل

(۱) صحیح البخاری، کتاب الدعوات، باب التعوذ من فتنۃ المحیا والممات

کام تھا؟ ماں نے مانگا، کسی اور بزرگ نے پانی پلانے کو کہا آپ نے اُٹھ کر پلا دیا۔ کتنا ثواب تھا۔ آسانی سے نیکی کمائی جاسکتی تھی۔ کسی اور کو حکم جاری کر کے کہ تم پلا دو یہ موقع گنوا دیا ضائع کر دیا صرف سُستی کاہلی کی وجہ سے۔

کاہلی کو چھپا کر عذر پیش کرنا:

بعض دفعہ ہم اپنے آپ کو تھکن کے نام پر کاہل کر لیتے ہیں۔ کچھ لوگوں کا تو یہ تکیہ کلام بن جاتا ہے کہ کام کر کر کے تھک گئے، تھکن کو ذہن پر سوار کر لیتے ہیں۔ اپنے آپ کو یہ یاد دلاتے رہتے ہیں کہ اب ہم بہت تھک گئے، اب یہ ہم سے نہیں ہوسکتا۔ جو جتنا سست اور کاہل ہوتا ہے وہ اپنے کاموں کی اتنی ہی لمبی فہرست گنواتا ہے۔ میں تو صبح اُٹھ کر یہ بھی کرتا ہوں، یہ بھی کرتا ہوں، یہ بھی کرتا ہوں، اتنا کچھ کرنے کے بعد اب میں کچھ نہیں کرسکتا۔ بعض لوگ اپنے ماضی کے کارنامے گنواتے رہتے ہیں اور حال سے مستغنی ہوجاتے ہیں، ماضی کی تھکن کو یاد کر کر کے ہلکان ہوئے جاتے ہیں۔ مثلاً جب بچے چھوٹے تھے تو رات بھر جاگنا پڑا، پھر ذرا بڑے ہوئے تو اسکول کی فکر لگی رہی، تعلیم کے مسائل سے نپٹنے میں خود کو لگائے رکھا اس کے ساتھ پورا گھر سنبھالنا، کھانا پکانا، یہ سب کچھ یاد کر کر کے تھکن کو اپنے اوپر حاوی کیے رکھا ہوتا ہے۔ نتیجتاً بے کار بیٹھے بیٹھے وزن چڑھا لیتے ہیں، ماضی کے کاموں نے اتنا تھکا دیا ہوتا ہے کہ آرام پورا ہی نہیں ہو پاتا، تھکن اترنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ اس طرح ماضی کو بہانہ بنا کر حال میں کام نہیں کرتے اور بعض لوگ حال کو سامنے رکھ کر مستقبل کے لیے فراغت طے کر لیتے ہیں کہ بس آج یہ کام کر لیں، آگے چل کر کچھ نہیں کریں گے۔

تھکنا ایک نعمت:

غور کریں تو تھکنا ایک بڑی نعمت ہے! اور تھکنے کے بعد آرام کی نیند سو جانا کتنی بڑی نعمت ہے! پھر دوبارہ تر و تازہ اُٹھتے ہیں۔ اگر ہمیں روزانہ ایک نئے دن کا سامنا کرنے کا احساس ہوجائے تو ہم میں ایک تازہ ولولہ پیدا ہوجائے۔ ہم سمجھتے ہیں تھکنا عذاب ہے جب کہ نہ تھکنا عذاب ہے۔ کبھی اُن لوگوں کو دیکھیں جو دائم المرض (bed ridden) ہوتے ہیں، فالج ہوجاتا ہے، ٹانگیں کام نہیں کرتیں۔ ایسے لوگ چلتے پھرتے، بھاگتے دوڑتے لوگوں کو حسرت سے دیکھتے ہیں۔ ان مریضوں کو دیکھ کر اللہ کی نعمتوں کا احساس ہوتا ہے کہ اللہ کا کتنا کرم ہے کہ ہمارے ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ سمجھ نہیں آتا کن الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کریں! کتنا بڑا احسان ہے اللہ کا! جن لوگوں کو نیند نہیں آتی کبھی اُن

سے پوچھیں گہری نیند کتنی بڑی نعمت ہے۔ ایسے وقفے وقفے سے سارا دن اونگھتے رہتے ہیں، نہ جاگے ہوتے ہیں، نہ سوئے ہوتے ہیں۔ رات اتنی لمبی ہوجاتی ہے کہ اذیت بن جاتی ہے، سو نہیں سکتے۔

سو تھکن کا احساس نہ ہونا اذیت کا باعث ہوجاتا ہے۔ تھکنا اللہ کی ایک نعمت ہے جو تھکنے کو نعمت سمجھتا ہے وہ کاہلی سے دور رہتا ہے۔ جو تھکنے کو عذاب اور مصیبت سمجھتا ہے وہ کاہل سے کاہل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اللہ نے ہمارا جسم ہمارے بس میں دیا ہوا ہے، میری ٹانگیں اور میرا ہاتھ میرا کہنا مانتے ہیں۔ اللہ کا کتنا کرم ہے۔ اگر ہمارا جسم ہماری مرضی سے چلنا چھوڑ دے تو کیا زندگی کے کوئی معنی ہوئے! سرگرم عمل رہنا، تھکن محسوس کرنا تو زندگی کی علامات ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اُس نے ہمیں مصروف عمل رکھا ہے۔ حدیث شریف میں مضمون آتا ہے کہ ''مومن عیش کوش نہیں ہوتا، مومن کاہل وسُست نہیں ہوتا'' مومن کے لیے کاہلی سے زیادہ اذیت دینے والی کوئی چیز نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ سے دُعا کرنی چاہیے کہ ''اے اللہ! میں کبھی فارغ نہ رہوں! اللہ مجھے فارغ کر کے بستر پر نہ بٹھا!۔''

کاہلی اتنی تکلیف دہ چیز ہے کہ انسان کسی قابل نہیں رہتا، دوسروں کا محتاج اور ان کے لیے بوجھ بن جاتا ہے۔ نہ اپنی زندگی میں کوئی سدھار لا پاتا ہے، نہ دنیا میں کوئی کارنامہ سرانجام دیتا ہے اور نہ آخرت میں سرخرو ہوتا ہے۔ ہر طرف سے فارغ ہوجاتا ہے۔

مصروفیت کی اہمیت:

مصروفیت خود اللہ کی کتنی بڑی نعمت ہے۔ انسان مصروف رہتا ہے تو خوش رہتا ہے۔ ذہن کام کرتا ہے، صحت قائم رہتی ہے، اور انسان بہت سی برائیوں سے بچ جاتا ہے۔ فراغت میں انسان بہت سی بُرائیوں میں مبتلا ہوجاتا ہے، مصروف رہ کر، انسان بُرائیوں سے بچ جاتا ہے۔ جو فارغ رہتے ہیں، ان کو غصہ بھی زیادہ آتا ہے، مصروفیت کے ساتھ انسان کا ردِّعمل معتدل ہوجاتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی اپنے کام میں مصروف رہنا چاہتا ہے تو زیادہ اِدھر اُدھر کی باتوں پر کان نہیں دھرتا، اپنی صلاحیت کو ضائع نہیں کرتا۔ حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے:

((نِعْمَتَانِ مَغْبُونٌ فِيهِمَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ الصِّحَّةُ وَالْفَرَاغُ)) [1]

''دو نعمتوں کی بابت بہت سے لوگ نقصان میں ہیں صحت اور فرصت،

---

[1] صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الصحۃ والفراغ

یہ دونوں بڑی نعمتیں ہیں تو فرصت کو کاہلی میں ضائع مت کریں۔

کاہلی کی وجہ سے محرومی:

یقین کیجیے زیادہ تر ہم نفسیاتی کسل میں مبتلا ہیں۔ یہ محض ہمارا خیال ہے کہ ہم بہت تھک گئے ہیں۔ بعض اوقات ہم کاہلی کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے کام بھی نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر نماز کے لیے کچھ جلدی اُٹھ گئے، وضو کیا، اب نماز سے پہلے دو رکعت تحیّۃ الوضو کے نفل پڑھ سکتے ہیں۔ صرف دو منٹ لگتے ہیں، لیکن کاہلی کی وجہ سے ہم یہ موقع ضائع کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ یہ عمل جنت میں لے جانے والا عمل ہے۔ ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لِبِلَالٍ عِنْدَ صَلَاةِ الْفَجْرِ يَا بِلَالُ حَدِّثْنِي بِأَرْجَى عَمَلٍ عَمِلْتَهُ فِي الْإِسْلَامِ فَإِنِّي سَمِعْتُ دَفَّ نَعْلَيْكَ بَيْنَ يَدَيَّ فِي الْجَنَّةِ قَالَ مَا عَمِلْتُ عَمَلًا أَرْجَى عِنْدِي أَنِّي لَمْ أَتَطَهَّرْ طَهُورًا فِي سَاعَةِ لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ إِلَّا صَلَّيْتُ بِذَلِكَ الطُّهُورِ مَا كُتِبَ لِي أَنْ أُصَلِّيَ))[1]

”بلال میں نے اپنے آگے آگے تمہارے جوتوں کی آواز سنی۔ پوچھا تم کیا عمل کرتے ہو؟ تو اُنہوں نے جواب دیا، میں کوشش کرتا ہوں کہ جب بھی وضو کروں، اس وضو سے میں کچھ نہ کچھ نماز جتنی اللہ توفیق دے ضرور پڑھ لوں۔“

سوچیں یہ دو چار منٹ اگر ہمیں جنت میں لے جائیں، تو کیا بُرا ہے۔ کیوں ہم کاہلی کی وجہ سے یہ قیمتی وقت ضائع کر دیتے ہیں۔ صرف بیٹھے بیٹھے، کھڑے کھڑے، کسی کے انتظار میں گھنٹوں گزار دیتے ہیں۔ اسکول سے آئے، کھانا کھا کر وہیں بیٹھ گئے، تھکے ہوئے ہیں، اُٹھ کر کپڑے بھی نہیں بدلتے۔ ذہن کے اندر ایک چیز بٹھالی ہے کہ ہم تھک گئے۔ نماز پڑھ کر آپ فارغ ہوئے، سو دفعہ تسبیح نہیں پڑھ سکتے، سلام پھیر کر جائے نماز لپیٹی اور کھڑے ہو گئے۔ یا فارغ ہو کر بیٹھ گئے یا لیٹ گئے مگر وہ دو تین منٹ صرف کر کے تسبیح نہیں پڑھی جاتی۔ لیٹ کر ہی پڑھ لیں زبان ہی تو ہلانی ہے۔ چار گھنٹے گپ شپ، باتیں کروالیں کچھ تھکن کا احساس نہیں ہوتا اور اتنا سا اللہ کا ذکر اگر کر لیں، تو شیطان وسوسہ ڈال دیتا ہے کہ بہت تھک گئے تو یہ کاہلی بھی شیطان کی طرف سے آتی ہے اور وہ چھوٹی چھوٹی نیکیوں کے مواقع ضائع کرا دیتا ہے۔ جو ہمارے بس میں ہیں۔ بڑی بڑی نیکیوں سے تو روکتا

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب فضل الطهور باللیل و النهار.....

ہے ہی، کہ یہ تو تم کر ہی نہ پاؤ گے۔ تمہاری اتنی سکت اور طاقت، توفیق نہیں۔ یہ ذرا ذرا سی نیکیوں سے بھی محروم کر دیتا ہے۔ کوئی کاغذ، نیچے پڑا ہے اُٹھا کر کچرادان (dustbin) میں ڈال دو۔ یہ بھی نیکی ہے۔ حدیث میں آتا ہے:

((اِمَاطَةُ الْأَذٰى عَنِ الطَّرِيق))(۱)

''مسلمان کے راستے سے تکلیف دہ چیز کو دُور کر دینا صدقہ ہے۔''

آپ کچن میں کام کر رہی ہیں، باہر بلی میاؤں میاؤں کر رہی ہے۔ آدھا کپ دودھ چھوٹی سی پلیٹ میں ڈال کر اُس کے لیے رکھ دیا نیکی کمالی۔ چیونٹیوں کو باہر دیکھا اُن کے راستے میں تھوڑا آٹا یا چینی ڈال دی۔ وہ اُٹھا اُٹھا کر اپنے گھر کی طرف لے گئیں، اس کا بھی اجر و ثواب ہے۔ اس کا ہم کبھی سوچتے ہی نہیں۔ بجائے کچرے میں پھینکنے کے، بچا ہوا کھانا، دال، چاول، روٹی وغیرہ کو ہم ذرا وقت لگا کر دیواروں پر یا صحن میں کہیں بکھیر دیں تو پرندے اور کیڑے مکوڑے کھالیں۔

بعض اوقات لوگ جانوروں کو بھی ڈانٹتے ہیں۔ پالتو جانوروں پر برس پڑتے ہیں، دھتکار دیتے ہیں۔ ان بے زبان جانوروں پر ظلم کر کے کوئی جنت نہیں جا سکا، ہاں ان کی بھوک پیاس مٹا کر ضرور جنت میں جا سکتے ہیں۔ ایک حکایت سنی ہوگی کہ ایک عورت نے دیکھا کہ ایک کتّا پیاس کے مارے کیچڑ چاٹ رہا ہے۔ اُس کو رحم آیا اور اس نے اپنے جوتے کے اندر پانی بھر کر اُس کے آگے رکھ دیا۔ اس پر وہ عورت بخشی گئی، اگر وہ کاہل ہوتی تو یہ سب نہ کر پاتی۔ یہ احساس بھی نہ ہوتا کہ کتّا پیاسا ہے، اپنی راہ لیتی۔ یہ بھی یاد رکھیں جتنا غصہ انسان کو کاہل کرتا ہے کم ہی چیزیں کرتی ہیں۔ ایک اپنے اوپر ترس کھانا اور دوسرا غصہ، انسان کی توانائی کو ختم کر دیتا ہے۔ انسان غصے کے بعد تھک جاتا ہے۔ جو بہت غصیلے ہوتے ہیں ان کے اندر بھی کاہلی بہت پائی جاتی ہے۔ سو اپنے آپ سے یہ مت کہا کریں کہ ہم تھک گئے ہیں۔ اس لفظ کو اپنی زندگی سے نکال دیں اور اگر تھکنے کا ذکر کریں تو اللہ کے احسان کے شعور کے ساتھ، یعنی تھکن نعمت لگنی چاہیے۔ اگر تھکن نہ ہو تو آرام کی کیا قدر و قیمت رہ جائے، اپنے ہاتھ پاؤں سے دوسروں کے کام کر دینا، ان کی مدد کر دینا، گھر میں بڑوں بزرگوں کی خدمت کر دینا، یہ بہترین صدقہ ہے۔ اگلے زمانے کی بڑی بوڑھیاں دوسروں کے کام کرنے کو ہاتھ پیروں کی زکوٰۃ کہا کرتی تھیں۔ اس میں بڑی برکت اور خیر ہے۔ اسی کی برکت سے ہو سکتا ہے اللہ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان...

ہمارے ہاتھ پیروں میں برکت دے۔اس میں سستی نہیں کرنی چاہیے۔

سستی کا مقابلہ کیا جائے :

حضرت مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کے اصلاحی خطبات میں لکھا ہے اگر کسی معمول کو پورا کرنے میں سُستی ہورہی ہو،تو وہی وقت انسان کے امتحان کا موقع ہے۔فرض کریں آپ روزانہ چاشت کے دو یا چار نفل پڑھتے ہیں۔ایک دن بلاوجہ سُستی آ گئی اور دل میں آیا کہ آج چھوڑ دیتا ہوں کون سے فرض ہیں۔یہی دراصل امتحان کا موقع ہے!ایک صورت تو یہ ہے کہ سُستی کے آگے ہتھیار ڈال دیں اور شیطان کی بات مان لیں۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آج ایک معمول پر ہتھیار ڈالا،کل یہ دوسرے معمول پر ہتھیار ڈلوائے گا اور آہستہ آہستہ آپ سستی کے تابع اور کاہلی کے عادی ہوجائیں گے۔دوسری صورت یہ ہے کہ سُستی کا مقابلہ کرکے اس معمول پر قائم رہیں اور اُسے کرگزریں،محنت ومشقت کا ثواب ملے گا اور اس محنت ومشقت کی برکت سے اللہ تعالیٰ آئندہ بھی معمولات کا پابند بنادے گا۔ فرماتے ہیں سستی کا واحد علاج اس کا مقابلہ کرنا ہے۔اس کے آگے ڈٹ جانا ہے،ہمت سے مقابلہ کریں اور اس کا علاج سوائے ہمت کے اور کچھ نہیں۔انسان سوچ لے کہ مجھے سستی کا مقابلہ کرنا ہے اور کوئی علاج نہیں اور کوئی وظیفہ یا آسان راستہ نہیں ہے۔خود ارادہ کرنا ہے کہ مجھے اپنے وقت کا بہترین استعمال کرنا ہے،میں نے نیکیوں میں سستی نہیں کرنی،مومن کی متاع تو وقت ہے اور اگر وقت ہی ضائع کردیا تو پھر کیا پایا۔

نعمتوں کو بھول جانا

سورۃ النحل آیت نمبر ۵۳ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

{وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ}

''اور جو بھی نعمت تمہارے پاس ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔''

ہر نعمت اللہ کی دی ہوئی ہے۔ قرآن میں ہم بار بار اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کا ذکر پڑھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں احساس دلاتا ہے کہ تم میری عطا کردہ نعمتوں کو محسوس کرو تا کہ تمہارے اندر شکر گزاری پیدا ہو۔ تم اللہ کی عبادت شکر کے جذبے کے ساتھ کرو، قرآن حکیم شروع ہی اس آیت ہوتا ہے:

{اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ} (الفاتحة: ۱)

''کُل شکر کُل حمد اللہ کے لیے جو تمام جہانوں کا رب ہے۔''

اللہ کی صفت ''رحمان'' و ''رحیم'':

''اللہ تعالیٰ کے ان دو ناموں، ''الرحمن'' اور ''الرحیم'' کے بارے میں علماء نے بہت کچھ لکھا ہے، بہت خوب صورت باتیں لکھی ہیں۔ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ رحمان میں ایک شان ہے تو اللہ کی صفت رحمٰن کا مطلب ہوا ایسی ہستی جس نے وہ نعمتیں دیں جو ہم محسوس کر سکتے ہیں، حواسِ خمسہ کی گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اور رحیم کون؟ لطیف نعمتوں (Subtle blessing) کا دینے والا۔ جن کا اس وقت تک شعور نہیں ہوتا، جب تک وہ واپس نہ لے لی جائیں۔

مثال کے طور پر ہم سب جانتے ہیں کہ آنکھ نعمت ہے۔ اس آنکھ کے اندر جو نمی (moisture) ہے وہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ بعض لوگوں کی آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں، اُن کو آنکھوں میں شدید کھجلی رہنے لگتی ہے، مرچیں (soreness) لگتی ہیں، پھر اُن کو وہ دوا استعمال کرنے کو دی جاتی ہے جو آنکھوں کو نم رکھتی ہے۔ ہم آنکھیں کھول کے بیٹھتے چلتے پھرتے ہیں کبھی یہ احساس ہوا کہ یہ پپوٹا جو اس وقت اُٹھا ہوا ہے یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ بھی ایک بیماری ہوتی ہے کہ آنکھ کے پپوٹے یا تو بند نہیں ہو سکتے یا کُھل نہیں سکتے۔ اس تکلیف میں مبتلا لوگ نہ گاڑی چلا سکتے ہیں، نہ پڑھ سکتے ہیں، نہ پڑھا سکتے ہیں۔ یہ آنکھ کا پٹ خود بخود دکھلا رہنا، کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ نعمتیں جب اللہ لے لیتا ہے تب ان کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے۔

انگوٹھے کی نعمت:

یہ انگوٹھا جس کو ہم غیر شعوری طور پر استعمال کرتے رہتے ہیں، کبھی اس نعمت کا احساس ہوا؟ سکندر اعظم جب کوئی ملک فتح کرتا تو وہاں کے قیدیوں کے انگوٹھے کٹوا دیتا تھا۔ انگریز جب ہندوستان آئے تو بنگال میں بہت ہی خوبصورت ململ بنائی جاتی تھی۔ جس وجہ سے مانچسٹر کی فیکٹریوں میں بننے والا کپڑا نا کام ہوگیا، انگریزوں نے اُس ململ کے تمام ماہر کاریگروں کے انگوٹھے کٹوا دیے، اس طرح ململ کی صنعت ختم ہوگئی۔ اس ململ کا تھان روایت کے مطابق چھوٹی سی ڈبیہ میں سما جاتا تھا۔ انگوٹھا نہ ہو تو ہاتھ کام ہی نہ کر سکیں، نہ پکڑ سکیں، نہ باندھ سکیں، نہ توڑ سکیں، نہ کوئی چیز اُٹھا سکیں۔ کتنے کام ہیں جن میں ہمیں انگوٹھے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اگر انگوٹھا نہ ہو تو ہم ایک چائے کا مگ تو کیا ایک قلم، پنسل، سوئی تک نہ اُٹھا سکیں۔

اگر کوئی ہم سے کہتا کہ ایک ہاتھ کا نقشہ (design) بنا دو تو ہم تو پانچوں انگلیاں ایک جیسی بنا کر لے جاتے۔ خیال بھی نہ آتا کہ اس انگوٹھے کا سائز اتنا ہو جتنا اللہ نے بنایا ہے۔ ذرا اس سے لمبا ہوتا تو بے کار ہو جاتا۔ اللہ نے ہر چیز کو مناسب رکھا، ذرا بڑا، ذرا چھوٹا رکھا ہوتا تو گڑبڑ ہو جاتی۔ ہر انسان کو اُس کے جسم کے مطابق ہاتھ پاؤں دیے۔ انگلیاں ہاتھ پاؤں کی مناسب سائز کی دیں اور کمی خرابی نہیں رکھی۔ یہ انگوٹھا کتنی بڑی نعمت ہے۔ یہ خیال ہم کو کبھی نہیں آتا۔ اتنی نعمتیں ہیں جو ہمارے رب نے ہمیں دی ہیں۔

نعمتوں کی بڑی تقسیم:

نعمتوں کو ہم دو بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ایک ہے ''اُصُوْلُ النِّعْمَة'' اور دوسری ''فُرُوْعُ النِّعْمَة۔'' اصول بنا ہے اصل سے، اصل کہتے ہیں جڑ کو۔ یعنی وہ نعمتیں جو جڑ ہیں (primary blessings) اور فروع (blessings secondary) شاخوں (branches) کو کہا جاتا ہے۔

(1) اُصُوْلُ النِّعْمَة یعنی اصل نعمتیں کیا ہیں، واقعی جن کو نعمت کہنا چاہیے وہ کیا ہیں؟ ان میں زندگی، ایمان، ہدایت، صبر کی صفت، شکر کی صفت، نیکیوں میں دوڑ لگانا، عبادت میں تیزی دکھانا، اخلاق کا اعلیٰ ہونا وغیرہ۔ یہ ہیں اصل نعمتیں، یہ جڑ ہیں۔ یہی تو دراصل نعمتیں ہیں۔ یہ جتنی زیادہ ہوں گی نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا، عبادت میں خشوع ہوگا، اخلاق بہترین ہوں گے، اتنا ہی آخرت

میں حساب ہلکا ہوگا، آدمی آگ سے دُور اور جنت اور کامیابی کے قریب ہوگا۔

خود اللہ تعالیٰ نے نعمتوں کے بارے میں فرمایا:

{ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا}(المائدۃ:۳)

''آج میں نے تمہارا دین کمال کو پہنچا دیا (مکمل کر دیا) اور میں نے اپنی نعمت تم پر مکمل کر دی اور میں نے اسلام کو بطور دین تمہارے لیے پسند کر لیا۔

(2) فُرُوْعُ النِّعْمَة کیا ہیں۔ اس میں بہت سی چیزیں آتی ہیں۔ مثلاً صحت ہے، ذہانت ہے، زندگی کی سجاوٹ ہے۔ یہ بھی سب نعمتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الکہف میں فرمایا ہے کہ:

{ اَلْمَالُ وَ الْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا}(الکھف:۴۶)

''مال اور اولاد دنیا کی زندگی کی زینت ہیں۔''

''فروع النعمة'' کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ جتنی زیادہ ہوں اتنا ہی آخرت میں حساب کتاب زیادہ ہوگا۔ حساب دینا ہوگا کہاں سے آیا اور کہاں خرچ کیا اور کیسے خرچ کیا۔ اسراف کیا یا بخل کیا۔ اپنی نعمتوں کی حفاظت بھی ہماری ذمے داری ہے۔ ہم انہیں خوش نصیبی اور خوش بختی کی علامت سمجھتے ہیں۔ مگر یہ سخت آزمائش کا باعث بھی ہیں۔ ان کے بارے میں قیامت میں بہت کچھ پوچھ گچھ ہونی ہے اور اگر نافرمان ہے لیکن ساتھ ساتھ نعمتیں بھی بہت ملی ہوئی ہیں، روپے پیسے کی فراوانی ہے، خوب کھاتا پیتا ہے، اولاد بھی بہت ہے تو اس کو ''استدراج'' کہتے ہیں۔ اللہ رسی دراز کر رہا ہے یہ بہت سخت آزمائش اور امتحان ہے۔ جب اللہ کا غصہ بہت زیادہ بھڑکتا ہے، تو پھر نافرمانی اور گمراہی کے ساتھ ساتھ نعمتوں کی فراوانی بھی ہو جاتی ہے۔

نسیان النعمة:

''نسیان النعمة'' کیا ہے؟ یہ کہ اصل نعمت کو بھول جانا۔ بڑی بڑی نعمتوں کو نظر انداز کرنا، مثلاً ایمان اور ہدایت سب سے بڑی نعمتیں ہیں، عبادت اور شکر بڑی نعمتوں میں سے ہے، یہ سب یکسر بھول جانا اور ان کی کوئی قدر نہ کرنا۔ اس کے برعکس دوسرے اور تیسرے درجے والی نعمتوں کو مثلاً صحت، ذہانت اور زینت وغیرہ کو کُل سمجھ لینا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی کے پاس ''اصول النعمة'' نہ ہوں، بنیادی نعمتیں نہ ہوں لیکن دوسرے درجے کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔ اگر کسی میں نہ ایمان

ہے نہ ہدایت ہے نہ شکر گزاری ہے نہ صبر ہے، نہ زندگی میں نیکیاں ہیں، کردار اور اخلاق بھی نہیں ہے اس کے باوجود بھی ایسے لوگوں کو اللہ صحت، اولاد، مال کی نعمت دے سکتا ہے اور دیتا بھی ہے۔ بلکہ ان میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے اور جب یہ نعمتیں بہت زیادہ مل جاتی ہیں تو انسان سوچتا ہے کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے، اللہ کو یہ لوگ پسند ہیں۔ یہ نعمتیں، ہمارے ہاں اکثر، اللہ کی رضا اور پسندیدگی کی علامت سمجھی جاتی ہیں۔ اس وجہ سے وہ مزید گمراہی اور نافرمانی میں آگے سے آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ بال آخر وہ ہلاک کر دیے جاتے ہیں، اور قیامت کے دن کا ان کا حال تو قرآن میں بار بار بیان ہوا ہے۔

اصول النعمۃ کے بغیر فروع النعمۃ، نعمت ہی نہیں:

آپ خود سوچیں کہ جب بنیاد ہی مضبوط نہ ہو یا موجود نہ ہو تو اس پر ایک مضبوط عمارت کھڑی رہ سکتی ہے؟ یا پھر کمزور جڑوں پر بھاری بھرکم درخت قائم رہ سکتے ہیں؟ وہ پھل اس پودے کی ہلاکت کا سبب بن جائیں گے، اگر پھل اور درخت کا بوجھ جڑیں نہ سنبھال سکیں تو یہ پھل درخت کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں گی۔ ایسا درخت جڑوں سمیت گر جائے گا۔ یہی حال اُن لوگوں کا ہوتا ہے جن کے پاس بنیادی نعمتیں نہیں ہیں لیکن دنیاوی نعمتوں کی بہتات ہے، ایسے لوگ انہی نعمتوں میں مگن ہو جاتے ہیں۔ علماء فرماتے ہیں کہ بھٹکنے سے زیادہ بُری صرف ایک چیز ہے کہ گمراہی کے ساتھ ساتھ خود کو اللہ کا پسندیدہ سمجھا جائے۔ یہ گمراہی سے بھی بدتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ ہود میں فرمایا ہے:

{ وَ لَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ؕ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ } (ھود: ۱۰)

”جب ہم اس کو اپنی نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں کسی نقصان کے بعد جس نے اسے چھوا، وہ ضرور کہے گا میری بُرائیاں مجھ سے چلی گئیں۔ پھر وہ اترانے والا اور فخر کرنے والا بن جاتا ہے۔“

دنیاوی نعمتوں میں آزمائش:

اگر کسی کے پاس بنیادی نعمتیں ہیں، اسلام ہے، ایمان ہے، ہدایت ہے، تقویٰ ہے، اخلاق ہے، نیک اعمال کی توفیق ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ فروع النعمۃ، دنیاوی نعمتیں بھی ہیں۔ دولت، صحت اور اولاد بھی ہے، آرزوئیں اور تمنائیں بھی پوری ہو رہی ہیں۔ لیکن اُس کی توجہ (focus) اولاد پر، دولت پر، زینت پر بڑھ گئی۔ یعنی ایسا انسان جس کو اللہ نے دنیاوی نعمتوں کے ساتھ ساتھ،

اُخروی نعمتوں سے بھی نواز رکھا ہے مگر اس کا جھکاؤ دنیا کی طرف زیادہ ہو رہا ہے تو کبھی اللہ تعالیٰ کسی نعمت کو فوت کر دیتا ہے، دنیاوی نعمتوں میں سے کچھ واپس لے لیتا ہے تاکہ وہ دائمی نعمت کی طرف متوجہ رہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ثانوی چیزوں کی وجہ سے اصل نعمتوں کا احساس ختم ہو جائے۔ ابدی نعمتوں کو بچانے کی غرض سے سجاوٹ، زینتِ دنیاوی کو تھوڑا سا کم کر دیتا ہے۔ یہ اللہ کا کرم اور بڑی رحمت ہوتی ہے۔ یہ اللہ کی طرف سے اشارہ (knocking) ہوتا ہے کہ سنبھل جاؤ!

کسی جگہ ایک کمزور سا امرود کا پیڑ تھا، اس پر بہت زیادہ پھل آئے، کسی نے کہا اس کے پھل اُتروالیں۔ یہ اتنے پھلوں کا بوجھ نہ سہار سکے گا۔ تو اس کے جتنے پھل اُتر سکتے تھے اُتار لیے، باقی چھوڑ دیے گئے۔ اگلی دفعہ اُس پر اور زیادہ پھل آ گئے، اس وجہ سے وہ پیڑ کچھ فصلیں دے کر سوکھ گیا۔ انسانوں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہم بعض چیزوں کی خواہش اور تمنا کرتے ہیں کہ مل جائیں، اللہ نہیں دیتا۔ ہم گلہ شکوہ کرتے ہیں کہ اللہ سنتا نہیں، ہماری دُعائیں قبول نہیں ہوتیں حالاں کہ ہم زینت، سجاوٹ اور دنیاوی چیزوں ہی کی خواہش کرتے ہیں۔ مال سے متعلق، اولاد سے متعلق، اپنی ذہانت، اپنی شکل وصورت سے متعلق کوئی چیز ہوتی ہے، مگر اللہ نہیں دیتا۔ اس لیے روک لیتا ہے کہ اگر وہ چیز مل گئی تو ایسا نہ ہو کہ ہم اتنے بھاری ہو جائیں کہ اپنی جڑوں پر قائم نہ رہ سکیں، اصل نعمتیں عدم توجہی کا شکار ہو جائیں۔ اس پیڑ کی مثال سے سمجھ لیں۔ اس پیڑ کی جڑ بالکل مضبوط نہیں تھی اور وہ کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اس پر پھل لگ گئے تو بے چارہ پورا پیڑ ہی ختم ہو گیا۔ بعض دفعہ اگر ایمان انسان کے اندر مضبوطی سے جڑ نہ پکڑے یا اللہ سے تعلق بہت مضبوط نہ ہوا ہو اور دنیا بہت خوب صورت بنا کر دے دی جائے تو ہو سکتا ہے کہ انسان بھٹک جائے اور اُس کا ایمان بے موت مر جائے۔ سو اصل چیز کیا ہے کہ انسان اپنی اصل نعمت کو پہچانے کہ اللہ نے مجھے کیا نعمت دی ہے۔ کیوں کہ اگر اسلام ہے، ایمان ہے تو سب کچھ ہے، یہی کافی ہے اور کسی نعمت کی پھر ضرورت نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ نعمت کی تین شاخیں ہیں۔

۱۔ ایک وہ نعمت جو دنیا اور آخرت میں فائدہ مند ہو، اس کے لیے دُعا کرنی چاہیے۔

{رَبَّنَا اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ}

(البقرۃ: ۲۰۱)

''ہمیں دنیا و آخرت دونوں طرح کی بھلائیاں عطا فرما اور آخرت کے عذاب سے بچا!!''

۲۔ کچھ نعمتیں ہوتی ہیں، دنیا کے لیے فائدہ مند اور آخرت کے لیے نقصان دہ۔

"Short term gains, long term loss"

یہ بہت تکلیف دہ، بہت بُری اور آخرت کا خسارہ ہی خسارہ ہے۔

۳۔ کچھ ایسی نعمتیں ہیں، جو دنیا کے لیے نقصان دہ مگر آخرت کے لیے فوز وفلاح، کامیابی و کامرانی اور نجات کی باعث ہوتی ہیں مثلاً فروع النعمۃ میں سے، یعنی دنیاوی زینت اور سجاوٹ میں سے کچھ کا کم ہوجانا یہ بذات خود ایک نعمت ہے۔ اگر کوئی نعمت جسے ہم نعمت سمجھتے ہیں وہ ہاتھ سے چلی جائے، چھن جائے تو ہم زیادہ افسوس نہ کریں۔ بس اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ پڑھ لیں۔ اللہ نے فرمایا ہے۔

{وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَھُوْا شَیْئًا وَّھُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّھُوَ شَرٌّ لَّکُمْ}

(البقرۃ:۲۱۶)

''ہوسکتا ہے ایک چیز تم کو بُری لگ رہی ہو لیکن اُسی میں تمہارے لیے خیر ہو اور ایک چیز تم کو اچھی لگ رہی ہو لیکن وہی تمہارے لیے نقصان دہ ہو۔ کیوں کہ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔''

ہوسکتا ہے دنیا کا کوئی چھوٹا سا نقصان ہوا ہو لیکن اس کی نسبت پتا نہیں، آخرت کے کتنے بڑے نقصان سے اللہ نے تم کو بچالیا جو تم کو لاحق ہوجاتا۔

مسند احمد میں حدیث مبارکہ ہے۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''چار باتیں، اور چار عادتیں ایسی ہیں کہ اگر وہ تم کو نصیب ہوجائیں، تو پھر دنیا اور اُس کی نعمتوں کے فوت ہوجانے اور ہاتھ نہ آنے میں کوئی مضائقہ اور کوئی گھاٹا نہیں۔ امانت کی حفاظت، باتوں میں سچائی، حسن اخلاق اور کھانے میں احتیاط اور پرہیز گاری۔ اگر یہ چار نصیب ہوگئی ہیں تو ساری دنیا کی نعمتیں بھی چلی جائیں، تب بھی گھاٹے کا سودا نہیں۔''

اللہ سے دُعا ہے کہ ''ہمیں نسیان النعمۃ سے اپنی پناہ میں رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ ہم اپنے اسلام، اپنے ایمان اور اپنی زندگی کی قدر نہ کریں اور ہم ثانوی چیزوں کے اندر الجھ کر رہ جائیں۔''

کراہیت الذم

''کراہیت''(revulsion) کے معنی ہیں ناگواری اور''ذم'' کہتے ہیں، کسی کی مذمت کرنا، بُرا بھلا کہنا۔ کراہیت الذم کا مطلب ہے کسی کی طرف سے مذمت کو ناپسند کرنا، اس سے ناخوش ہونا۔ کراہیت الذم دین پر عمل کرنے میں حائل ہوجاتی ہے۔ اس بیماری کی وجہ سے انسان معصیت کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے، گناہ کر بیٹھتا ہے۔ یہاں تک کہ فرائض اور واجبات کو چھوڑ دیتا ہے صرف اس لیے کہ اس کے اندر کراہیت الذم پائی جاتی ہے۔

لوگوں کی طرف سے مذمت کی پروانہ کریں:

انسان کو فطری طور پر تنقید ناپسند ہے۔ بلکہ تنقید کو پسند کرنا تو غیر فطری چیز ہے اور یہ چیز اچھی بھی نہیں کہ بلاوجہ انسان اپنے آپ کو تنقید کا ہدف بنائے۔ یہ چیز اسلام میں پسندیدہ نہیں کہ بلاوجہ ایسا کام کیا جائے جس پر تنقید ہو۔ ہاں اصولوں کی خاطر اور حق کی خاطر اگر تنقید سننی پڑ جائے تو اس پر کراہت نہیں ہونی چاہیے، یہ مطلوب ہے اگر یہ نہ کریں گے تو دین پر عمل نہ کرسکیں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اسلامی اقدار کے ساتھ مکمل وفاداری تھی۔ اُنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کے دوران بہت سے ایسے کام کیے، ایسے فیصلے کیے جن کی وجہ سے اردگرد کے قبائل کے لوگ ناراض ہوئے اور سخت مذمت کرنے لگے مگر وہ اس تنقید سے بے نیاز رہے۔ اپنے عمل پر اُس تنقید کو اثر انداز نہ ہونے دیا۔ قرآن مجید میں جب رسولوں کے قصے پڑھتے ہیں تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ رسولوں پر کس شدت کی تنقید ہوئی۔ کون سا الزام تھا جو کفار نے اور اللہ کے نافرمانوں نے رسولوں کی ذات پر نہ لگایا ہو۔ جادوگر، ساحر، مجنون کہنے سے لے کر اُن کی نیت پر شک کہ یہ ہم پر فضیلت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور یہ کہ یہ تو ہمیں اپنے آباؤ اجداد کا نافرمان بنانا چاہتے ہیں۔ غرض یہ کہ لوگوں نے ہر طرح کی تنقید کی۔ لیکن رسولوں کے نمونے میں ہمیں ایک چیز نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنا موقف نہ چھوڑا۔ ثابت قدم رہے اور بالآخر اللہ نے اُنہی کو کامیاب فرمایا اور تنقید کرنے والے نامراد ٹھہرے۔ جو طریقہ رسولوں کا تھا، اُن کے ساتھیوں کا تھا اور ہمارے پیارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تھا، اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا، ہمیں بھی وہی طریقہ اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ دین کے معاملے میں ہمارے اندر کراہیت الذم نہیں ہونا چاہیے۔ دین کے معاملے میں اگر ہم اس بات کی فکر

کریں گے کہ ہمارے اس فیصلے کا لوگوں پر کیا اثر ہو رہا ہے؟ اگر ہم نے یہ کام شروع کیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ وہ تنقید کریں گے، ناخوش ہو جائیں گے۔ اگر ہم بہت زیادہ ان چیزوں پر سوچیں گے اور لوگوں کی تنقید پر کراہیت محسوس کریں گے تو اتنی ہی اللہ سے دُوری بڑھتی چلی جائے گی۔ یعنی کراہیت اللہ اور بندے کے بیچ میں رکاوٹ بن جائے گی۔ تو اس کو ہٹانا ہوگا اور جب اس کو ہٹا دیں گے تو تیزی سے ہم سیدھے راستے پر چل نکلیں گے۔ کراہیت الذم، محسن بننے کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہماری ذمہ داری رکھی ہے:

{ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ }

(آل عمران: ۱۱۰)

''ہم نے بنایا ہے تم کو بہترین اُمت تاکہ تم لوگوں پر گواہ بن جاؤ''

گواہی دینے والا جب گواہی دینے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ اس کی گواہی کا کسی پر کیا ردّعمل ہو رہا ہے۔ اس کی گواہی سے ملزم ناراض ہو رہا ہے، یا ملزم کا وکیل خفا ہو رہا ہے، یا اُس کے جان پہچان والے ناراض ہو رہے ہیں۔ اگر وہ یہ سوچتا رہے تو وہ گواہی دے نہیں سکتا۔ وہ یہ نہیں سوچتا کہ میری گواہی کس کو بُری لگ رہی ہے اور اگر بُری لگ رہی ہے تو گواہی نہ دوں۔ اس کو تو سچ کہنا ہے۔ چاہے کسی کو کتنی ہی ناگوار گزرے۔

اسلام ہمیں جو اقدار (values) دیتا ہے، ان کو اگر ہم آگے بڑھانا چاہتے ہیں تو کراہیت الذم کو راستے سے ہٹانا ہوگا۔ اسلامی اقدار دائمی ہیں۔ ان کا ہمیں پرچار کرنا ہے، اُن کا بول بالا کرنا ہے۔ اس کے علاوہ اسلام کے جو اصول ہیں قرآن اور سنت کے جو احکام ہیں، یہ انسانوں کی پسند ناپسند کے تابع نہیں، بلکہ یہ انسانوں کو تابع کرنے کے لیے آئے ہیں اور جب انسانوں کو ان کے ہی فائدے کے لیے کچھ اصول دیے جاتے ہیں یا احکام دیے جاتے ہیں تو اکثر لوگوں کو اچھے نہیں لگتے، پسند نہیں آتے۔ لیکن بہرحال اُن کو نافذ کرنے کے لیے کوشش کرنی ہے۔ اسلام کی دعوت عین حق ہے۔ اور حق میں یہ طاقت ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں تک پہنچ جائے۔ انسانیت کا یہ حق ہے کہ انسانوں میں سے ہی کچھ گواہ کھڑے ہوں جو حق کی گواہی دیں، حق کی حفاظت کریں، چاہے حق کتنا ہی غیر مقبول کیوں نہ ہو۔ کوئی بات نہیں۔ حق اور حق بتانے والے کتنے بھی غیر معروف (unpopular) ہو جائیں، کتنے بھی ناپسندیدہ ہو جائیں، یہ کرنا تو ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيبًا وَسَيَعُودُ كَمَا بَدَأَ غَرِيبًا فَطُوبَى لِلْغُرَبَاءِ))(۱)

''اسلام کا جب آغاز ہوا تو اسلام اجنبی تھا، لوگ پہچانتے نہ تھے اور عنقریب یہ دوبارہ ایسا ہی اجنبی ہوجائے گا تو مبارک باد ہے اجنبی لوگوں کے لیے۔''

یعنی جو تنقید برداشت کرلیں لیکن اسلام کا ساتھ نہ چھوڑیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشن گوئی کردی تھی کہ یہ عروج جو اسلام کو حاصل ہورہا ہے یہ مستقل نہیں ہے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ لوگ پھر اسلام کو بھول جائیں گے، قرآن وسنت سے بالکل غافل ہوجائیں گے، بدعتیں عام ہوجائیں گی، غیر اسلامی رسوم عام ہوجائیں گی اور اسلامی شعائر اجنبی ہوجائیں گے۔ ایسے زمانے میں جو بھی سنتوں کو زندہ کرنے کے لیے کھڑا ہوگا وہ غیر مقبول ہوگا، تنقیدیں ہوں گی، طنز اور طعنہ زنی ہوگی، اس کو برداشت کرنا ہے، جھیل جانا ہے۔ ایسے لوگ جو اسلام کی تعلیم دیں، قول اور عمل سے، پورے وجود سے، حال سے تو پھر وہ اجنبی ہوجائیں گے۔ لیکن یہ فکر کی بات نہیں، یہ سب برداشت کرلیں ورنہ اگر یہ نہ کیا تو دین کے معاملے میں سمجھوتا کرنا پڑے گا۔ کراہیت الذم کے ساتھ ریاکاری ہوئی ہے یعنی اللہ کے دین کے بس وہ کام کرنا جو لوگوں کی نظر میں پسندیدہ ہوں۔

جس کو تنقید بُری لگتی ہے پھر وہ یہ چاہتا ہے کہ میری تعریف ہوتی رہے، دین کا بس ایسا کام کروں کہ لوگ میری تعریف کریں۔ وہ چاہے گا کہ جو کام کروں لوگوں کو اُس کے بارے میں پتا چلے اور پھر میری تعریف ہو۔ اس طرح دکھاوے کا اور ریا کا شکار ہوجائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ المائدہ میں فرمایا ہے:

{يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَ يُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۫ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ} (المائدۃ:۵۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو، جو کوئی تم میں سے پھر جائے گا دین سے تو عنقریب اللہ ایسی قوم لے آئے گا کہ وہ محبت کرے گا اُن سے اور وہ لوگ محبت کریں گے اللہ سے۔ بہت نرم ہوں گے مومنوں پر اور بڑے سخت ہوں گے کفار کے اوپر، وہ جہاد کریں گے اللہ کی راہ میں اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔ یہ تو اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی وسعت والا علم والا ہے۔''

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان أن الاسلام بدأ غریبا...

یہ خوبیاں معمولی نہیں بلکہ یہ تو اللہ سے مانگنے کی چیز ہے کہ ''اے اللہ! ایسا نہ ہو کہ ہم کراہیت الذم کا شکار ہو کر دین کا کام چھوڑ دیں۔'' اللہ تعالیٰ سے بہت دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس بیماری سے بچالے۔ یہ چیز دین کے معاملے میں انسان کو آگے نہیں بڑھنے دیتی، جو بھی دین کے راستے پر چلے گا، خاص کر ایسے معاشرے میں جہاں دین اجنبی ہے اُس کو تنقید کا سامنا تو لامحالہ کرنا ہوگا۔ لہٰذا اس کے لیے پہلے سے تیاری کرلیں۔ جب انسان ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے تو مشکل حالات میں اُلٹے قدموں نہیں لوٹتا۔ اس معاملے میں قوتِ تصوّر کو بھی استعمال کرنا چاہیے۔ یوں تصور کریں کہ ہم دین کے راستے میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ہمارے راستے میں جو مشکلات آرہی ہیں اُن کا ہم سامنا کر رہے ہیں۔ خود سے حقیقی توقعات لگائیں گے تو صحیح تصور کو استعمال کر کے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کریں گے، پھر ان شاء اللہ اس راہ میں کراہیت الذم ہمیں نقصان نہیں پہنچائے گی۔

کراہیت الموت

موت کے ذکر کو ناپسند کرنا، موت کے ذکر سے کترانا (Death Revulsion of) یہ ایک رواج بن چکا ہے اور یہ بات تہذیب کے خلاف سمجھی جاتی ہے کہ کہیں موت کا ذکر کیا جائے۔ یہ حقیقت ہے کہ انسان کو فطری طور پر موت پسند نہیں اسلام کا نکتۂ نظر یہ ہے کہ موت کی تمنا نہ کی جائے یا موت کی دُعا تو نہ مانگی جائے لیکن موت سے کراہیت بھی نہ رکھی جائے یعنی اب نہ ہو کہ تم موت سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرو، موت کے بارے میں بالکل سوچو ہی نہ! اپنی گفتگو سے، اپنی سوچ سے موت کے لفظ کو اور موت کے تصور کو بالکل خارج کر دو، یہ ہے دراصل کراہیت الموت اور یہ دل کی کئی بیماریوں کا سبب بن جاتی ہے۔

موت سے چارہ نہیں:

موت تو آنی ہے۔ یہ ایک غیر متنازعہ حقیقت (undisputed fact) ہے، بلکہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ کوئی اللہ کو نہیں مانتا، رسول ﷺ کو نہیں مانتا، آخرت کے حساب کتاب کو نہیں مانتا لیکن موت کو تو سبھی مانتے ہیں کیوں کہ موت کو، مرتے ہوئے لوگوں کو سب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ عقلمندی یہ ہے کہ انسان اس کو زندگی کی ایک حقیقت سمجھ کر اس کے لیے تیاری کرے۔

اللہ تعالیٰ نے سورہ آل عمران میں فرمایا:

{كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ} (۱۸۵)

''ہر جان موت کا مزہ چکھنے والی ہے''

موت کے بارے میں کہا جاتا ہے ''Death is the best guard'' موت بہترین محافظ ہے۔ جب تک موت کا وقت نہیں آ جائے گا موت نہیں آ سکتی۔

{وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا} (آل عمران: ۱۴۵)

''اور کوئی جان مرنے والی نہیں مگر یہ کہ اللہ کی اجازت سے اور ایک وقت جو مقرر کر دیا گیا ہے۔''

صحیح مسلم میں ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰهِ أَحَبَّ اللّٰهُ لِقَائَهُ وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللّٰهِ كَرِهَ اللّٰهُ)) (۱)

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء و التوبۃ، باب من احب لقاء اللہ...

''جو اللہ کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ بھی اُس کی ملاقات کو پسند کرتا ہے، اور جو اللہ سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے تو اللہ بھی اس سے ملنے کو ناپسند کرتا ہے۔''

((قَالَتْ عَائِشَةُ اِنَّا لَنَكْرَهُ الْمَوْتَ قَالَ لَيْسَ ذَاكِ وَلَكِنَّ الْمُؤْمِنَ اِذَا حَضَرَهُ الْمَوْتُ بُشِّرَ بِرِضْوَانِ اللهِ وَكَرَامَتِهِ فَلَيْسَ شَيْئٌ أَحَبَّ اِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ فَأَحَبَّ لِقَائَ اللهِ وَأَحَبَّ اللهُ لِقَائَهُ وَاِنَّ الْكَافِرَ اِذَا حُضِرَ بُشِّرَ بِعَذَابِ اللهِ وَعُقُوبَتِهِ فَلَيْسَ شَيْئٌ أَكْرَهَ اِلَيْهِ مِمَّا أَمَامَهُ كَرِهَ لِقَائَ اللهِ وَكَرِهَ اللهُ لِقَائَهُ))[1]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ میں نے عرض کیا ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مراد موت کو ناپسند کرنا ہے تو پھر تو ہم سب ہی موت کو ناپسند کرتے ہیں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نہیں! بلکہ موت کے وقت جب مومن کو اللہ کی رحمت، اُس کی رضامندی اور جنت کی خوش خبری دی جاتی ہے تو وہ اللہ کی ملاقات کو پسند کرنے لگتا ہے، پس اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ملنے کو پسند کرتا ہے اور کافر کو موت کے وقت جب اللہ کے عذاب اور اُس کی ناراضی کی خبر دی جاتی ہے، تو وہ اللہ سے ملاقات کو ناپسند کرنے لگتا ہے۔ اللہ بھی اس سے ملنے کو پسند نہیں کرتا۔''

موت کی تیاری:

بات یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس طرح تیار رکھے، کہ موت کے بعد اس کا انجام اچھا ہو، ورنہ اگر کراہیت رکھے گا تو وہ موت کی تیاری بھی نہ کرے گا۔ یہ ہے اسلام کا موت کے بارے میں تصور، موت کے ذکر سے کراہیت نہ ہو۔ موت کو حقیقت سمجھ کر انسان اُس کی تیاری کرتا رہے۔ اسی لیے ہم دیکھتے ہیں کہ موت کے بعد سوگ صرف تین دن کا ہے۔ بہت لمبا سوگ منانا، بہت زیادہ سوگ منانا، یہ حب دنیا کی علامت ہے۔ حد سے زیادہ افسوس کا اظہار کرنا دراصل کس بات کی علامت ہے! مومن تو ہمہ وقت موت کے لیے تیار رہتا ہے۔ اپنی بھی اور اپنوں کی بھی، اس کو پتا ہے مرنا سب کو ہے، جو پیدا ہوتا ہے وہ مرتا بھی ہے۔ چوں کہ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہوتا ہے تو وہ کسی کی موت کی خبر سن کر زیادہ پریشان نہیں ہوتا، اُس کے اعصاب بے کار (nervous break down) نہیں ہوتے، غشی اور بے ہوشی طاری نہیں ہوتی۔ اسلام تو موت کی خوب تیاری کروا دیتا ہے۔

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر و الدعاء و التوبۃ، باب من احب لقاء اللہ...

موت کی تیاری کے بارے میں سورۃ الجمعہ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِیْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِیْكُمْ}(۸)

''اے نبی ﷺ اِن سے کہہ دیجیے بے شک وہ موت جس سے تم فرار حاصل کرنا چاہتے ہو وہ تو تم سے ضرور مل کر رہے گی۔''

تم اس سے ملنا چاہو یا نہ ملنا چاہو، موت تم سے ضرور آ کر ملے گی۔ ہم اپنے معاشرے میں ایسے موقعوں پر جملے سنتے ہیں کہ اگر فلاں سے علاج کروالیتا تو نہ مرتا اگر اس بس یا جہاز پر نہ بیٹھتا تو نہ مرتا یہ سب کراہیت الموت کا اظہار ہے۔ یہ بھی سنتے ہیں کہ بے وقت مر گیا۔ حالاں کہ بے وقت کوئی نہیں مرتا۔ ہر مرنے والا اپنے وقت پر ہی مرتا ہے نہ اُس سے پہلے، نہ اُس کے بعد بلکہ مقررہ وقت پر۔ اس کو کوئی ٹال (avoid) نہیں سکتا۔ یہ چیز ذہن اور دل میں جما دینی چاہیے، کہ وقت پورا ہو جائے تو نہ کسی کی عمر دیکھی جاتی ہے نہ ضرورت۔ نہ ہی رتبہ درجہ دیکھا جاتا ہے۔

سورۃ النساء آیت ۷۸ میں فرمایا:

{اَیْنَ مَا تَكُوْنُوْا یُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَ لَوْ كُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَةٍ}

''جہاں کہیں تم ہو گے موت تم کو پالے گی، چاہے تم زبردست مضبوط کچ کیے ہوئے قلعوں کے اندر ہو۔''

موت کو یاد رکھنے کے فوائد:

جو شخص موت کی تیاری کرتا رہتا ہے، جیسے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ''کثرت سے موت کو یاد کرو'' تو اس کا فائدہ کیا ہوتا ہے؟ انسان کے اندر قناعت (Contentment) آ جاتی ہے، اس کو یاد رہتا ہے کہ اس دنیا میں بہت تھوڑی دیر رہنا ہے، اس لیے جتنا اُس کے پاس ہوتا ہے، اُسی پر مطمئن ہو جاتا ہے۔ دوسرا فائدہ یہ کہ اس میں نیکی کرنے کا شوق اور رغبت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کو پتا ہے کہ موت کے بعد نیکیاں ہی فائدہ دیں گی، نیکیاں کمانا آسان ہو جاتی ہیں، ہلکی ہو جاتی ہیں بلکہ انسان کی زندگی کا مقصد بن جاتی ہیں۔ انسان نشاط کے ساتھ نیکی کرتا ہے۔ نشاط ایک قسم کی قوت (energy) ہے جو انسان کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہ نیکیاں کرنا خوش گوار اور دل چسپ بنا دیتی ہے۔ جس کو ہم شرح صدر بھی کہتے ہیں یعنی کھلے دل کے ساتھ، خوشی خوشی عبادت کرتا ہے۔ انسان نیکیوں کی طرف لپکتا ہے۔ موت کو یاد رکھنے کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ جوں ہی کوئی گناہ ہو جائے تو فوراً

ہی استغفار کر لیتا ہے اور اللہ سے مغفرت اور معافی چاہتا ہے اور فوراً رجوع کر لیتا ہے، منیب ہو جاتا ہے، اللہ کی طرف رجوع کرنے والا ہوتا ہے۔

موت سے فرار کفار کی علامت:

موت سے فرار کفار اور منافقوں کی خاص نشانی ہے۔ ہمیشہ زندہ رہنے کی تمنا ان کا خاصّہ ہوتا ہے۔ دنیا میں مگن، خوش اور مطمئن لیکن موت بھولی ہوتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ہے:

{يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ} (البقرۃ: ۹۶)

''کہ ان میں تو ہر ایک چاہتا ہے کہ اس کی ہزار برس کی زندگی ہو جائے۔''

یعنی مرنا نہیں چاہتے، دنیا ہی میں رہنا چاہتے ہیں۔ علّامہ اقبال کا ایک فارسی شعر ہے:

نشان مرد مومن با تو گویم چوں مرگ آید تبسم بر لب اوست

یعنی مردِ مومن کی نشانی یہ ہے کہ جب موت آتی ہے تو اُن کے چہروں پر مسکراہٹ آ جاتی ہے۔ اس لیے کہ محبوب سے ملاقات میں جو چیز حائل ہے وہ یہ زندگی ہی تو ہے۔

یہ زندگی ختم ہوگی، موت آئے گی تو اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوگی۔ ایک بہت متقی اور اللہ والے ہمارے جاننے والے ہیں۔ اُن کا ایک دفعہ فون آیا۔ کہنے لگے: مجھے آپ کو دو خبریں سنانی ہیں، ایک بُری خبر اور ایک اچھی۔ بُری خبر یہ ہے کہ مجھے سرطان ہو گیا ہے اور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میں اب چند مہینے کا مہمان ہوں اور اچھی خبر یہ ہے کہ عنقریب میں اپنے رب سے ملنے والا ہوں۔

یہ بات وہی کہہ سکتا ہے جس کے دل میں واقعی اللہ سے محبت ہے۔ ایسے انسان کے لیے موت اتنی ڈراؤنی، خوفناک اور بھیانک نہیں رہتی۔ اسلام کا ایک بڑا احسان یہ ہے کہ موت سے کراہیت نکال دی، خوف اور ڈر نکال دیا ہے کہ پتا نہیں کیا ہوگا، وسوسے اور اندیشے نکل گئے ہیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ ہمیں ٹھیک ٹھیک بتا دیا گیا ہے کہ ہمارے ساتھ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ ہم خود اپنی آخرت کو بنانے اور بگاڑنے والے ہیں۔ قرآن اور حدیث مبارکہ نے پوری طرح تیار اور باخبر کر دیا ہے موت سے، یہ تو سارے موت کو یاد رکھنے کے فائدے ہیں۔

موت سے فرار ہونے کی خرابیاں:

جو شخص موت سے فرار حاصل کرنا چاہتا ہے اُس میں تین خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں: حرص اور طمع آ جاتی ہے اور قناعت ختم ہو جاتی ہے۔ بس نہیں چلتا کیا کچھ جمع کر لے، جو ہاتھ آئے اُس کو بٹورتا

چلا جاتا ہے۔ اُس کی ہوس اور حرص پوری نہیں ہوتی۔ دوسرے گناہوں کی کثرت ہوجاتی ہے، کیوں کہ موت اُس کو یاد ہی نہیں رہتی۔ تیسرے یہ کہ گناہوں اور نافرمانیوں پر کوئی شرمندگی اور افسوس نہیں ہوتا۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((أَكْثِرُوا ذِكْرَ هَاذِمِ اللَّذَّاتِ))(۱)

''کثرت کے ساتھ لذتوں کو ختم کرنے والی چیز موت کو یاد کیا کرو''

حقیقت کو جاننا ہی علاج ہے:

ایک پیاری سی دعا ہے

((اَللّٰهُمَّ اَرِنَا حَقِيْقَةَ الْاَشْيَاءِ كَمَا هِيَ))(۲)

''اے اللہ! تو دکھادے مجھے چیزوں کی اصل حقیقت جیسی کہ وہ ہیں۔''

ہم بھی اللہ تعالیٰ سے یہ دُعا کریں کہ اس دنیا کی حقیقت جتنی ہے وہ ہمیں بتادے اور ہمارے دل کو قرار دے دے۔

تو اللہ کرے ہمیں چیزوں کی حقیقت صحیح طرح سے نظر آجائے۔ ہم موت سے فرار حاصل کرنے کا نہ سوچیں! اس لیے کہ موت سے فرار ممکن نہیں۔ موت کو یاد رکھیں گے تو تیاری بھی کریں گے۔ شیطان کا سب سے بڑا حملہ یہی ہوتا ہے کہ وہ ہمیں ہماری موت بھلا دے۔ زندگی کو آنکھوں میں سجا دے، خوب صورت کردے اور اتنا اس میں مصروف اور مشغول کردے کہ ہم ہر حقیقت سے غافل ہوجائیں۔ یہ دنیا فانی ہے ختم ہوجانے والی ہے اور ہمیں اس کو چھوڑ کر جانا ہے۔ اللہ کرے ہم موت کو یاد رکھ سکیں اور تیاری بھی کرسکیں۔

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب من احب لقاء اللہ...

(۲) جامع الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق، باب منہ...



اغراض ومقاصد

- عربی زبان کی تعلیم وترویج
- قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب وتشویق
- علومِ قرآنی کی عمومی نشرواشاعت
- ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو تعلّم وتعلیم قرآن کو اپنا مقصدِ زندگی بنالیں
- ایسی قرآن اکیڈمی کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے

انجمن خُدّامُ القُرآن

سندھ، کراچی، رجسٹرڈ

مرکزی دفتر: B-375، پہلی منزل، علامہ شبیر احمد عثمانیؒ روڈ، بلاک 6

گلشن اقبال، کراچی۔ پاکستان۔ +92-21-34993436-7

info@QuranAcademy.com

